



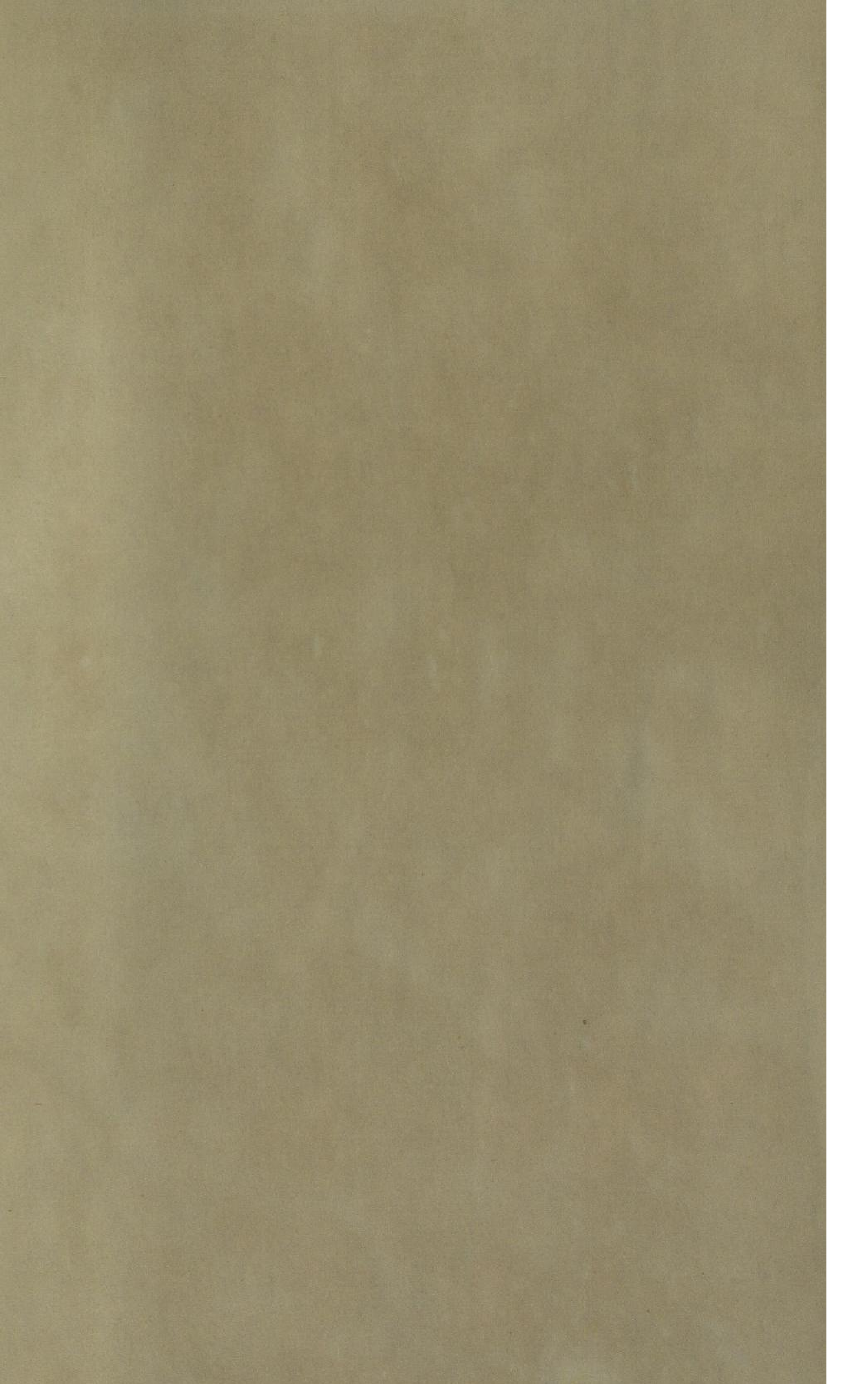
سکنت الاعین

تصنیف لطیف

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی



نعمانی کتب خانہ برحق سٹریٹ اردو بازار لاہور



مَدَنی لکچر و لکچر شیکار عکس
 محمد رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں۔ وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں۔

ہُدِیۃ الشَّیعۃ

تصنیف لطیف

حجۃ اللہ حجۃ الاسلام، آیت من آیات اللہ، رئیس المسلمین،
 استاذ الاساتذہ، مینع الحکمۃ ومعدن العلوم
 حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نور اللہ
 ضریحہ، ویرد مصنفہ (بانی دارالعلوم دیوبند)

ناشران

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
 مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ

قیمت: چھپیس روپے/36



نام کتاب ہدیۃ الشیعہ
مصنف مولانا محمد قاسم نانوتوی
ناشر نعمانی مکتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
تعداد پانچ صد (۵۰۰)
صفحات ۵۳۸
پریس معارف پرنٹنگ پریس - لاہور
ملنے کا پتہ نعمانی مکتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
" " مکتبہ نعمانیہ - اردو بازار گوجرانوالہ
سائز ۲۰ x ۲۴
قیمت ۳۶ روپے

فہرست مضامین ہدیۃ الشیعہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸	ادائیگی حق میں دونوں فرقوں کی اکثریت کا لحاظ	۲	تقدیم الکتاب از ناشر
۱۹	شیعوں کی راہ گزیر اور اس کا انسداد	۵	سرسید کے تاثرات مولانا کے بارے میں
	اہلسنت کی کلام اللہ سے عقیدت اور شیعوں کی نفرت	۹	سبب تالیف
۲۰	شیعوں کی نظر میں کلام اللہ کی حیرناک بے وقعتی	۱۰	کتاب کے جواب کی صحیح راہ
	حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے میں نہ شیعوں کی مطلب باری ہو اور نہ یہ احتمال آیت شریفہ پر چسپاں ہے۔	۱۱	ایک شبہ کا ازالہ
۲۱	خشوع و خضوع مراد ہو تو ترتیب معانی الٹ جائیگی		نقل روایات میں مصنف کا رویہ
۲۲	حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد ہو تو ترتیب معانی درست ہوگی۔		تحفہ اثنا عشریہ پر اعتماد
	آیت مذکورہ میں ایک شبہ کا ازالہ	۱۲	شیعہ کو ہمدردانہ مشورہ
۲۳	آیت مذکورہ کے ذیل میں ایک اور فائدہ		شیعہ کی دلیرانہ غلط بیانی
۲۴	استدلال مذکورہ پر ایک شبہ کے رد جواب	۱۳	عمار علی شیعہ کی دروغ گوئی کا ایک دلچسپ پہلو
۲۵	کلام اللہ پر بے اعتباری اپنے پاؤں پر کھڑی ہو		باب۔ مذہب اہلسنت موافق قرآن مجید
	کلام اللہ غیر معتبر ہو تو حدیث بھی غیر معتبر ہوگی۔	۱۴	وحدیث پاک ہے اور مذہب شیعہ مخالف ہر دو
	اہل بیت کا عمل کی بیشی کے خیال کو لغو ثابت کرنا		اہل سنت اہل حق اور شیعہ اہل باطل ہیں دلائل
۲۶	قرآن کا حد درجہ شیوع کی بیشی پر ضرب کاری ہے		مضمون آیت پر تفصیلی نظر اور حق تلاوت میں
	قرآن کی بے پناہ شہرت عثمان کی عفت نشان ہے		ایمان کا انحصار
۲۷	قرآن کی حفاظت کا ثبوت خود قرآن مجید سے	۱۵	اہل سنت سے ادائیگی حق تلاوت اور شیعہ کی اس سے قطعی محرومی۔
۲۸	موجودہ قرآن دو تہائی کم ہے (عقیدہ شیعہ)		بروئے آیت قرآنی قرآن کا حفظ ہونا حق ہونے
۲۹	حفاظت قرآن کے دو غلط مفہوم		کی نشانی
۳۰	الذکر کے عجیب فوائد		شیعوں کے حافظ نہ ہونے کا واقعات ثبوت
۳۱	حفاظت قرآن کے غلط معنوں کا جواب	۱۶	شیعہ ادائیگی حق تلاوت سے کیوں محروم ہیں۔
۳۲	حفاظت کا شیعہ معنی۔ یہ ہر روز نھار کو لکشی کا موقع دیتا ہے	۱۷	شیعہ اپنے اساتذہ کے حق میں گستاخ ہیں۔
			تلاوت کا حق ادا کرنے والوں کے پیرو بھی حصر
			ایمانی میں شامل ہیں۔
		۱۸	آیت کے شان نزول سے بیان مذکور کی تائید

۵۷	صاحب بمعنی صحابی نہ ہو تو کچھ قریح نہیں	۳۳	شیعہ ائمہ کو حلت و حرمت میں مختار ماننا چھوڑیں
۵۸	نقل معنی کی حقیقی صورت	۳۴	تو نصائے سے مقابلہ ممکن ہے۔
۵۹	لفظ صاحبہ میں بہ نسبت لفظ صحابی زیادہ	۳۵	تفویض کے خیال کی قرآن۔ یہ کئی کرتا ہے۔
۶۰	فصلیت ہے۔	۳۶	عقیدہ تفویض قرآن کو کتب منسوخہ کی حیثیت دیتا ہے
۶۱	خلافت صدیقی پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۷	امام ہدی نزول کے وقت احکام قرآن پر عمل نہ کرینگے
۶۲	باب وعدہ خلافت و استخلاف	۳۸	تفویض کا انکار اعتراضات سے بچاتا اور ختم نبوت
۶۳	آئینہ ممکن مقدمات شیعہ کے کسی طرح مطابق	۳۹	پر ایمان بختم کرتا ہے۔
۶۴	نہیں	۴۰	حق کے زور سے ابن بابویہ آخر سنیوں کا ہمنوا ہو گیا
۶۵	جن سے وعدہ تھا۔ انکو ممکن ہی حاصل نہ ہو سکی	۴۱	آیت مذکورہ سے سنیوں کی فضیلت کا انکشاف
۶۶	تو وعدہ پھر بھی غلط ہی نکلا۔	۴۲	آیت سوم کی بصیرت امروز شرح
۶۷	استخلاف بمعنی توطن نہیں بلکہ بمعنی تسلط ہے	۴۳	حزن کے معنی سمجھنے میں بعض نا انصافی کی فاش غلطی
۶۸	آیت سے صرف خلافت ہی نہیں بلکہ ترتیب خلافت	۴۴	شیعوں کی غلط فہمی کی ایک پر منلاق توجیہ
۶۹	بھی معلوم ہوتی ہے	۴۵	اللہ کی معیت کی وضاحت
۷۰	آئینہ استخلاف کے مصداق صرف خلفائے اربعہ ہیں	۴۶	آیت معیت سے حضرت ابو بکر کی مدد کا ثبوت
۷۱	آئینہ استخلاف کی بنیاد مہاجرین کی قربانیاں ہیں۔	۴۷	آیت معیت میں شیعوں کی طرف سے ایک عبارت
۷۲	آیت استخلاف سے حقیقت خلافت قریش بھی	۴۸	دھوکہ اور جواب
۷۳	ظاہر ہے۔	۴۹	دارالندوہ کے واقعہ کی اصل شکل
۷۴	آیت مرقومہ حضرت فاروق کی منابہت کی دلیل ہے	۵۰	ملا عبد اللہ مشہدی کی بے اختیارانہ حق گوئی
۷۵	وصال کے وقت فرمان نبوی کی تعمیل نہ ہو سکنے	۵۱	سفر ہجرت میں صدیق کو ساتھ لینے کے وجہ
۷۶	کے اسباب	۵۲	آیت معیت کی منصفانہ ترجمانی
۷۷	حضرت عمر کی رائے کا مذکر	۵۳	آیت میں شیعوں کی ایک تاویل اور اس کا جواب
۷۸	کاغذ قلم دوات نہ لانے میں کبھی شریک تھے	۵۴	آیت معیت کے الفاظ بھی شیعوں کو منہ توڑ
۷۹	صرف فاروق کیوں؟	۵۵	جواب دے رہے ہیں
۸۰	یہ خواب کہاں سے آیا کہ مقصد نبوی کتابت	۵۶	معیّت حق صدیق کی ذات کے ساتھ تھی
۸۱	خلافت علی تھا۔	۵۷	آیت میں معنا کا لفظ صدیق کے رتبہ کا آئینہ دار
۸۲	کتابت و تحریر خلافت صدیق قرین قیاس ہے	۵۸	لا تخزن کی ایک غلط تاویل اور اس کا جواب
۸۳	خلفائے اربعہ اصناف اور دوسرے لطیف خلفاء	۵۹	تقیہ کا غدر لنگ۔
۸۴	نعمت خلافت سے نوازے گئے۔	۶۰	صاحبہ کی لطیف تشریح اور صحابی و صاحب
۸۵	ومن کفر شیعوں کفران نعمت کی طرف عجزاری اشارہ	۶۱	کا مفہوم

تبرّاج حضرت علی کی نہیں، امیر معاویہ کی تقلید و اتباع ہے۔

الفاظ آیت تحفظ فضیلت صحابہ کے لئے سنگین حصار کھینچتے ہیں

خلفائے ثلاثہ پر اتنا دوا کی تہمت خدا پر جھوٹ کا بہتان بھی ہے

ومن کفر کے اصل مصداق

باب مناقب صحابہ بذیل تفسیرات آیہ محمد رسول اللہ

امت میں آنحضرت کے بعد صحابہ اور رسالت کے بعد بغض فی اللہ کا درجہ ہے۔

صفات صحابہ میں اشد ۱۲ کو باقی صفات پر مقدم کرنے کی وجہ۔

محبوب کے متعلقین کی محبت محبوب ہی کی محبت ہے متعلقین محبوب کی محبت محبوب کی محبت کا جزو ہے

بدخواہان سے عداوت محبت کا جزو نہیں، لازم ہے طرح میں ہلکی پھر بڑھیا پھر اور بڑھیا خوبی بیان کرنا صحیح ترتیب ہے

محبت کرنا آسان اور دشمنی مشکل خصوصاً اقربا سے نفس و شیطان کی آیزش بغیر غلط فہمی سے کوئی غلطی ہو تو امید ٹو اب ہے

مشاہرات صحابہ کا باعث نفس و شیطان نہیں بلکہ بغض فی اللہ تھا۔

نفس و دب سکتا ہے لیکن اس کا مزاج نہیں ل سکتا نیکی کی اصل روح۔ اور بدی کی اصل نفس ہے

روح عالم ملائکہ کی ایک چیز ہے۔ اور نفس طبقہ شیاطین میں سے ہے۔

انسان میں نیکی بدی کے مختلف دور۔ ملائکہ اور شیاطین کی تقویت اور تاخیر سے ہوتے ہیں

نفس و دب چائے تو اشد علی الکفار کا مقام ہاتھ آتا ہی

نفس و دب جائے تو بھی قابل اعتبار نہیں انسان ہمیشہ ایک ہی حال میں نہیں رہ سکتا

غلبہ نفس اور مغلوبیت نفس سے سرزد ہونے والی خطاؤں میں بے حد فرق ہے۔

اشد علی الکفار سے خطا ممکن لیکن ان پر تسلط شیطان ناممکن۔

اشد اور رحماؤ کے لئے اخلاص لازم اور پانا ممکن غلط فہمی کے سبب بڑوں بڑوں سے خطا ہو جاتی ہے

امکان خطا کے باوجود اتنی تعریف دلیل غفران و عبادت تعریف صحابہ کا ایک مقصد آنے والے دشمنوں کو چڑانا اور جلانا بھی ہے

صحابہ کرام شیعوں کے بھی محسن ہیں۔ صحابہ کی تعریف قرآن کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ صحابہ کے بدگو پیدا ہوں گے۔

صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ غیر مشروط ہی ایمان کے معنی اور مراتب یقین

علم الیقین۔ عین الیقین۔ اور حق الیقین محبت حق الیقین کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے

صحابہ حق الیقین کے مراتب پر فائز اور حب فی اللہ و بغض فی اللہ میں راسخ تھے

صحابہ کا مقصد صرف رضا الہی تھا صحابہ کی محبت و تسلیم سے اوپر کسی محبت و تسلیم کا درجہ نہیں۔

حق الیقین کے مراتب میں تفاوت ہے باہمی مناقشات رحماؤ بینہم کے منافی نہیں ہیں۔

صحابہ کی رنجش کا سبب بھی محبت تھی جن روایات پر تشیع کی بنیاد ہے ان کے راویوں کی ثقاہت کا حال

آیت ہجرت میں رضائے الہی کا مدار صرف ہجرت پر ہے

۱۰۱ ۱۰۲ ۱۰۳

۱۰۴

۱۱۶	بداء کا عقیدہ رکھنے والوں کیلئے حضرت جعفر کی بددعا	۱۰۴	ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ میں ایک عجیب ق
۱۱۷	حق واضح ہونے کے بعد منافذوری ہے۔	۱۰۵	آیت السابقون میں صرف ہجرت مدینہ منورہ مراد ہے
۱۱۸	پھر کسی اور بات کا انتظار حماقت ہے۔	۱۰۶	آیہ ہجرت سے صرف رضائے الہی ہی نہیں بلکہ اعلیٰ
۱۱۹	بداء جیسے وہی عقیدہ کی غلط بنیادیں		درجہ کا ایمان اور اعلیٰ درجہ کے اعمال حال بھی ثابت
۱۲۰	ابتلا و امتحان سے مقصود خداوندی قطع حجت ہے		ہوتے ہیں۔
۱۲۱	نہ کہ تحصیل علم		دوام جنت کی خوشخبری سے بڑھ کر حسن خاتمہ کی دلیل
۱۲۲	امتحان بغرض قطع حجت کی ایک قرآنی مثال		اور کیا ہو سکتی ہے۔
۱۲۳	بعثت انبیاء اور کالیف شریعہ کی وجہ بھی قطع حجت		آیت فضائل صحابہ میں شیعہ جو طرح کریں گے وہی
۱۲۴	بنی آدم ہے		خارجی اہل بیت کے بارے میں کریں گے۔
۱۲۵	دوزخی اور جنتی پہلے ہی طے ہیں۔		صحابہ کے لئے قیامت میں رسوائی نہیں اور کفار و
۱۲۶	آخبار کذب کے تفسیری فوائد۔	۱۰۷	فساق کے لئے رضائے الہی نہیں۔
۱۲۷	جیسے بعض جگہ بالفاق ماضی سے مجازاً مستقبل مراد		صحابہ کے مشاہیرات نہ کفر تھے نہ فسق۔ کیونکہ دونوں
۱۲۸	اسی طرح بعض جگہ مستقبل سے بھی ماضی مراد ہے	۱۰۸	رضائے الہی کے منافی ہیں۔
۱۲۹	حوادث اندرہ یقینیہ کو ماضی اور وقائع مخفیہ ماضیہ	۱۰۹	عقیدہ تفصیل الممۃ پر آیت اعظم درجہ کی قرب کا
۱۳۰	کو مجازاً مستقبل سے تعبیر کرنا صحیح ہے۔ اس کی مثال	۱۱۰	باب عقیدہ بدائی تفصیل میں۔
۱۳۱	ازلی سعادت و شقاوت کی عام فہم مثال		بدائی پر خار وادی اور علمائے شیعہ کا اضطراب
۱۳۲	تینوں زمانے مجتمعتہ موجود ہیں فنا نہیں ہوئے۔		بداء کے ایک معنی
۱۳۳	سب زمانے احاطہ خداوندی میں ہیں		بداء کے دوسرے معنی
۱۳۴	ماضی مستقبل بھی خدا کے لئے حال کا حکم رکھتے		بداء کے تیسرے معنی
۱۳۵	ہیں مگر باہم مقدم مؤخر ہیں۔	۱۱۱	بدائی تین قسمیں
۱۳۶	کلام الہی میں ماضی و حال و استقبال کے استعمال		بداء اور نسخ میں ایک اشتباہ کا ازالہ
۱۳۷	کی ترتیب	۱۱۲	بدائی تینوں قسمیں ایک دوسرے کو لازم ہیں
۱۳۸	وقائع عالم قدیم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ مستمر نہیں	۱۱۳	عقیدہ بداء کے نتائج۔ (۱) چارہ معصوم کی مغفرت مشکوک
۱۳۹	حصول علم کے دو طریقے۔ بالواسطہ و بلاواسطہ		امام آخر الزماں کی طویل روپوشی اندیشناک ہے
۱۴۰	اکثر ایک چیز کا علم بواسطہ اور بے واسطہ دونوں	۱۱۴	پس امام کو امام بننے میں خدا کو شاید بدائع واقع ہوا ہو
۱۴۱	ساتھ آتے ہیں۔		امام زماں کو شاید بدائی وجہ سے خدا معزول کر چکا ہو
۱۴۲	کبھی علم بواسطہ علم بے واسطہ میں محو ہو جاتا ہے	۱۱۵	عقیدہ بداء کا استیصال قرآن مجید سے
۱۴۳	کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ یا ایک کا بے واسطہ		قواعد عقائد شیعہ کی رو سے خدا سے خطا ممکن۔
۱۴۴	دوسرے کا بواسطہ بھی اکٹھے ہی حاصل ہو جاتے ہیں		معصوم سے ناممکن

۱۵۲	مناقب صدیق رضی
۱۵۳	صدیق رضی کی شجاعت اور استقامت
۱۵۴	مقام تعریف مقام تصریح ہوتا ہے۔ نہ کہ مقام خفا
۱۵۶	مناقب عمر رضی زبان امیر رضی
۱۵۷	باب - عقیدہ تقیہ - عقیدہ تقیہ اور اس کے عقلی و نقلی مباحث
۱۵۸	تقیہ شیعہ اپنی روایات کے آئینہ میں موت پر اعتقاد علم غیب، بے انتہا شجاعت، پھر تقیہ کیوں؟
۱۵۹	حضرت امیر نے وفات کے بعد صدیق کے مناقب حلفاً بیان کئے۔ اس وقت خوف بھی نہ تھا۔
۱۶۱	حکایات تقیہ کی کتب شیعہ، پر زور تکذیب کی ہیں
۱۶۲	انبیاء اور ائمہ کا منصب حق گوئی اور صبر و تحمل ہی تقیہ اگر فرض تھا تو امام حسین کی شہادت معصیت ہوگی۔
۱۶۳	امام کا اپنی اہمیت سے حضرت عمر کو مرعوب کیا
۱۶۵	تقیہ از روئے عقل و نقل و عرف
۱۶۶	تقیہ از روئے کلام اللہ
۱۶۷	تقیہ جنت سے محرومی کا سبب ہے
۱۶۸	خوف کفار سے سست ہونا ممنوع ہوتا تو تقیہ تو دور کی بات ہے
۱۶۹	تقیہ سبب عتاب ہے نہ کہ موجب ثواب۔
۱۷۰	انبیاء خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔
۱۷۱	خاتم الانبیاء کو تبلیغ کا تاکید ہی امر
۱۷۲	انبیاء اور ان کے نائبین، سب کا مقصد انذار و تبشیر ہے
۱۷۳	آنحضرت کی بعثت کا مقصد ہی اہل ہمارے دین تھا
۱۷۴	تبلیغ دین انبیاء، علماء، ائمہ پر فرض ہے۔
۱۷۵	آنحضرت کی مکی زندگی تقیہ کا استیصال ہے۔
۱۷۶	صبر کے فضائل اور ترغیب جس تقیہ کی حقیقت کھلتی ہے

۱۳۲	بے واسطہ اور بواسطہ حاصل ہونے والے علم الہی میں کوئی تقدم تاخر نہیں۔
۱۳۳	کلام الہی میں ماضی و حال علم بے واسطہ سے تعبیر ہے اور استقبال علم بالواسطہ سے۔
۱۳۴	بنی آدم کے علوم چونکہ بواسطہ ہیں، اسلئے البصیغہ استقبال (بواسطہ) تکمیل فرمایا۔
۱۳۵	اگر علوم بے واسطہ سے تکمیل فرماتے تو وہ بنی آدم پر حجت نہ ہوتے۔
۱۳۶	محو اثبات کی بحث اور علم الہی کے دو دفتر عقیدہ ہدایہ کا قرآن مجید سے مضحکہ خیز ثبوت
۱۳۷	علم الہی قدیم، غیر متغیر، محیط ہے
۱۳۸	عقیدہ ہدایہ خدا کے لئے جہل مرکب بخیر کرتا ہے
۱۳۹	عقیدہ ہدایہ تمام موجودات کو ایک طرح خدا پر فضیلت دیتا ہے
۱۴۰	تمام عالم علم الہی کے محو اثبات کا دفتر ہے
۱۴۱	لیکن اجل کتاب کی عجیب تفسیر
۱۴۲	محو اثبات علم الہی میں نہیں، لہذا ہدایہ کی گنجائش بھی نہیں
۱۴۳	محو اثبات احکام میں ہو تو حقائق ہے ہدایہ میں
۱۴۴	عقیدہ ہدایہ تیسرا استدلال اور اس کے جوابات
۱۴۵	لفظ میقات کی تفسیر
۱۴۶	ہدایہ کے لئے کذب لازم ہے۔
۱۴۷	مخاطب کی غلط فہمی سے علم الہی میں ہدایہ ثابت نہیں ہو سکتا
۱۴۸	آئیہ میقات کی دو دیگر تفسیریں اور ہدایہ کا استیصال
۱۴۹	خاتمہ مباحث ہدایہ
۱۵۰	ہدایہ کے ضمن میں ائمہ کے علم غیب پر بحث
۱۵۱	علم ماکان و مایکون تسلیم کرنے میں مساوات لازم ہے
۱۵۲	ایک عجیب تفسیری لطیفہ
۱۵۳	بفرض اگر علوم غیب ائمہ کے لئے ثابت بھی ہو تو ہدایہ کا خدشہ دور نہیں ہوتا۔

۲۰۸	ذی النورین کے لئے امیر کی مدافعت	۱۷۴	جہاں اظہار حق نہ ہو سکے ہتہر واجب،
۲۰۹	حضرت امام کا کوئی معاملہ ظاہر داری نہ تھا	۱۷۵	اگر اہل حق اظہار حق افضل ہے
۲۱۰	دفاع عثمان کے لئے دیگر صحابہ کا رویہ	۱۷۶	سیدنا ابراہیم کے کسی واقعہ سے اخفادین ثابت نہیں
۲۱۱	حضرت علی پر بزدلی کا بہتان	۱۷۷	اخفائے علاقہ زوجیت اخفائے دین نہیں ہے۔
۲۱۲	حضرت علی تمام دنیا پر بھاری تھے	۱۷۸	بچاؤ اور تقیہ میں عظیم فرق
۲۱۳	حضرت علی (بزرگ شیعہ) شجاعت میں بے مثل اور	۱۷۹	حضرت امیر (بزرگ شیعہ) سنت احمدی و موسوی
۲۱۴	اپنی موت پر قابو یافتہ تھے	۱۸۰	واہم بھی کسی پر بھی عمل پیرا نہ ہو سکے
۲۱۵	حضرت علی نے پوری زندگی خوف و ذلت سے گزاری	۱۸۱	دوران خلافت میں بھی امیر پر تقیہ واجب تھا۔
۲۱۶	حضرت علی باوجود بٹیل شجاعت کے سید کو فک دلا	۱۸۲	خلافت امیر میں تقیہ کو بہتان کا پس منظر
۲۱۷	حضرت ام کلثوم کے نکاح کی بحث	۱۸۳	حضرت امیر و سائل رکھتے ہوئے بھی اظہار حق کر کے
۲۱۸	فاروق سے ام کلثوم کا نکاح حضرت عباس نے پڑھایا	۱۸۴	صدیق نے بے سرو سامانی میں اظہار حق کیا۔
۲۱۹	ابزرگ شیعہ حضرت عباس اعراف میں ہوں گے	۱۸۵	مقربان الہی کا طریقہ اظہار حق کرنا اور حقائق کھانا
۲۲۰	محبوب سول اعراف میں اور یہودی و نصرائی جنت میں	۱۸۶	تقیہ عرف اور دستور کی کسوٹی پر
۲۲۱	حضرت علی کی خاموشی بوجہ رضا مندی تھی	۱۸۷	حضرت صدیق کو صدیق نہ کہنے والے کے لئے
۲۲۲	فاروق اگر کافر ہوں تو امام پہلے ہوں گے۔ معاذا اللہ	۱۸۸	حضرت جعفر کی بددعا
۲۲۳	تزوید ام کلثوم کا کتب شیعہ سے ثبوت	۱۸۹	امام جعفر پر تقیہ حرام تھا
۲۲۴	شیعہ کو اہلبیت سے محبت نہیں صحابہ سے عداوت	۱۹۰	امام جعفر کی بددعا سے حقانیت اہلسنت ظاہر ہو گئی
۲۲۵	حب علی اگر کافر کو جنت میں لے جائے تو قربت بھی	۱۹۱	امام جعفر پر ایک اعتراض جو خود کشی کی نوعیت رکھتا ہے
۲۲۶	لے جائے گی	۱۹۲	نقل خط مولوی عمار علی شیعہ
۲۲۷	حضرت ام کلثوم سے فاروق کی اولاد	۱۹۳	جواب خط
۲۲۸	باب مباحثہ فک	۱۹۴	نبات طبیات از روئے کلام اللہ شریف
۲۲۹	حب اہل بیت و حب صحابہ ایمان کے دو ہیں	۱۹۵	نبات طبیات کی تعداد از روئے کتب شیعہ
۲۳۰	حب اہلبیت و صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں	۱۹۶	مذکورہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے
۲۳۱	شیعوں نے عترت میں سے بعض کی تکریم کی اور اکثر	۱۹۷	عمار علی کی تاریخ دانی
۲۳۲	پر تبر کیا۔	۱۹۸	مسلمان عورتوں کو قید کفار سے رہائی دلا نیک حکم
۲۳۳	اہل بیت سے مراد کون ہیں۔	۱۹۹	ذی النورین کے فضائل اور شہادت کی تفصیل
۲۳۴	خاندان امام کو عباد میں لے کر دھا، گریہ کی وجہ	۲۰۰	عمار علی کی فتون عربیہ میں ہمارت
۲۳۵	شیعہ اولاد فاطمہ کی اکثریت کے دشمن ہیں	۲۰۱	ذی النورین کے بچاؤ کے لئے صحابہ اور اہلبیت
۲۳۶	شیعہ کی امیر سے محبت جو دشمنی سے بھی بدتر ہے	۲۰۲	کی جان کا ہی۔

۲۳۱	انبیاء ائمہ سے بلکہ تمام مخلوق سے افضل ہیں	۲۳۱	اہلسنت کے ہاں روایت کے صدق و کذب کا معیار
۲۳۲	افضلیت انبیاء، کتب شیعہ سے	۲۳۲	قرآن مجید ہے
۲۳۳	شیعہ نے خدا اور ائمہ کی گواہی صدیق کے ہائے	۲۳۳	روایت فدک آیت کے سیاق و سباق کے مخالف ہے
۲۳۴	میں رد کردی	۲۳۴	وآت ذالقرنی مخاطب خاص و خطاب عام ہے
۲۳۵	حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ کج فہمیوں	۲۳۵	حقہ کا معنی مذک کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔
۲۳۶	کے لئے عبت ہے۔	۲۳۶	ابن سبیل اور مسکین بھی استحقاق میں ذالقرنی ہے
۲۳۷	بالغرض اگر صدیق سے گناہ ہو تو وہ نیکی بن چکا	۲۳۷	کے ہم پلہ ہیں۔
۲۳۸	ورنہ ائمہ تعریف نہ فرماتے۔	۲۳۸	آت ذالقرنی اگر مدنی ہے تو واعلموا کی طرف
۲۳۹	گناہ سے توبہ پر جنت میں داخلہ سب کو مسلم ہے	۲۳۹	اشارہ ہے۔
۲۴۰	نیکیاں زیادہ ہونے پر جنت میں داخلہ متفق علیہ ہے	۲۴۰	فصل۔ کتاب و مصنف کتاب کے قابل قبول ہونے
۲۴۱	ہاجرین اولین سے جنت عدن، مغفرت، رضاء	۲۴۱	کی چھ شرطیں۔
۲۴۲	کا وعدہ ہو چکا۔ اور خدا وعدہ خلاف نہیں	۲۴۲	اہلسنت کی کتب میں اہل شیعہ کے الحاقات
۲۴۳	حضرت کلیم کا بچھڑے کو جلاتا مبنی بر حکمت تھا	۲۴۳	اہلسنت کا نظام حفاظت
۲۴۴	غضب فدک پر آیہ ذالقرنی سے استدلال	۲۴۴	مصنف معتبر ہو تو ضروری نہیں کہ تصنیف بھی معتبر ہو
۲۴۵	غضب فدک کے بہتان کا تاریخی جائزہ	۲۴۵	مصنف تحفہ قدس سترہ کی ایک عبارت
۲۴۶	آت ذالقرنی میکہ ہی مکہ میں فدک کہاں تھا؟	۲۴۶	عمار علی نے بعض کتب شیعہ بھی اہلسنت کی طرف
۲۴۷	کسی آیت کے مکی یا مدنی ہونے سے کیا مراد ہے؟	۲۴۷	منسوب کر دیں۔
۲۴۸	ذالقرنی سے سیدہ اور حقہ سے فدک مراد ہو تو	۲۴۸	علامہ سیوطی کی تصانیف پر مصنف کتاب کی رائے
۲۴۹	کئی مخدور لازم آئیں گے۔ پہلا مخدور خویش پروری	۲۴۹	واقعی کے ہائے میں ائمہ محدثین کی رائے۔
۲۵۰	دوسرا مخدور بلاغت کی مخالفت، تیسرا بقیہ اقرباء، ظلم	۲۵۰	عمار علی کی تاریخ دانی
۲۵۱	چوتھا آنحضرت کی طرف ادائیگی حقوق میں کوتاہی کی	۲۵۱	فدک فی تھا۔ مہربوب و مملوک نہ تھا
۲۵۲	نسبت۔ پانچواں مخدور بنی ہاشم کے لئے خمس حرام	۲۵۲	فدک کے مختلف تاریخی دور
۲۵۳	چھٹا بعد وفات سید جو غنائم آئیں وہ ان کی	۲۵۳	ہبہ اور عطاء میں فرق
۲۵۴	فدک نہ تھیں تو حقہ کیوں فرمایا۔	۲۵۴	اہل شیعہ کی مستندات رطب و یابس سے زیادہ نہیں
۲۵۵	ساتواں مال غنیمت ائمہ کے لئے حرام ورنہ دیگر	۲۵۵	اہل سنت نے جو روایات بغرض تردید نقل کی ہیں
۲۵۶	مستحقین کے لئے بھی جائز	۲۵۶	شیعہ ان کو شذیبتے ہیں۔
۲۵۷	اکٹھواں سیدہ کے لئے صرف فدک، اغیار کے	۲۵۷	در منشور کے حوالہ کی حقیقت
۲۵۸	لئے سب کچھ	۲۵۸	سیوطی نے اس روایت کو موضوع سمجھ کر
۲۵۹	نواں۔ خدا پر بے انصافی کا الزام	۲۵۹	نقل ہی نہیں کیا

۲۰۵	فدک کے بارہ میں حضرت زید کا قول ہی صحیح ہے	۲۶۸	فدک کے معاملہ میں حضرت علی کا رویہ اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے
۳۰۶	شیعہ قرآن و حدیث کے کسی لفظ کے معنی متبادرہ مراد نہیں لے سکتے۔	۲۸۰	اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل اور روئے قواعد شیعہ سیدہ کا مطالبہ فدک غلط تھا
۳۰۷	روایت فدک منقطع ہے	۲۸۱	قواعد شیعہ کی رو سے حضرت علی کا خلافت قبول کرنا بھی درست نہ تھا۔
۳۰۸	مشکوٰۃ کی روایت مرفوع متصل ہے۔	۲۸۲	حضرت علی کے رویہ کی دوسری تاویل۔ اور اس کا جواب
۳۰۹	فدک تا دم آخر خاتم الانبیاء کے تصرف میں تھا	۲۸۳	تیسری تاویل اور اس کا جواب
۳۱۰	اگر فدک وراثت تھا تو شخص واحد کا قبضہ تھیہ وراثت پر ظلم تھا۔	۲۸۴	چوتھی تاویل اور اس کا جواب
۳۱۱	دعوائے ہبہ بغیر قبض مسلم نہیں علامہ علی کا بیان دعوائے ہبہ فدک کے بطلان پر احادیث طرہین سے استدلال۔	۲۸۵	خلیفہ چہارم کے پاس خلیفہ اول کی نسبت اعوان و انصار کی کثرت
۳۱۲	مسئلہ شہادت اور شہادین کی تعداد پر محققانہ بحث	۲۸۶	کتب اہل سنت میں دعوائے سیدہ برائے فدک بروایت ضعیف بھی مذکور نہیں
۳۱۳	سیدہ فاطمہ شہادت کی زیادہ پابند ہونی چاہیے	۲۸۷	روایت ہبہ کے غلط ہونے کی دو دلیلیں
۳۱۴	منہج الکرامت کی روایت کے مطابق حضرت صدیق نے فدک سیدہ کو واپس دے دیا تھا	۲۸۸	کتب محمولہ کے مؤلفین نے صحت کا التزام نہیں کیا۔
۳۱۵	حضرت عمرؓ پر عمار علی کا بہتان	۲۸۹	تقیہ کے پردے میں اہل شیعہ کی خطرناک خبیث
۳۱۶	حضرت صدیق کے حضرت جابر کو بغیر شہادت کے مال دینے کے وجہ	۲۹۰	لسان المیزان میں چند فریب روئی نشان دہی
۳۱۷	حضرت جابر کو نہ دینے میں خلاف وعدہ کا احتمال	۲۹۱	دعوائے فدک کی روایت اگر صحیح بھی ہو تو بھی کام نہیں چلتا۔
۳۱۸	آنحضرت کی طرح عاید ہوتا ہے۔	۲۹۲	شیعوں کی پیش کردہ روایات بشرط صحت بھی ہبہ فدک ثابت نہیں ہوتا۔
۳۱۹	شیعوں کی اہل بیت اور انصاری کی حضرت جیلے سے ایک جیسی محبت ہے۔	۲۹۳	لفظ عطا، ہبہ اور عاریت میں مشترک
۳۲۰	اگر ام ایمن اور ام کی گواہی اتنی اہم ہے تو خلاؤ رسول اور قرآن و ائمہ اہل بیت کی گواہی صحابہ کے بارے میں کیونکر اہم نہ ہوگی	۲۹۴	اس پر مسلمہ حدیث سے استدلال
۳۲۱	سید سے گواہی طلب کرنا خطار اجتہادی تھی جو بات قدح نہیں۔	۳۰۱	لفظ عطا، کو بمعنی ہبہ بنانے کی ناکام کوشش
۳۲۲	حضرت سجاد اگر باوجود ابلیس کے کلی تصرف کے مومن ہیں تو ابوبکر صدیق بطریق اولیٰ ہیں	۳۰۲	تعیین معانی کے لئے قرآن کی بحث
۳۲۳		۳۰۳	فدک کے لئے سید کی شہادت بھی نامکمل تھی۔
۳۲۴		۳۰۴	حضرت زید کے بارے میں دریدہ دہنی اور اس کا جواب

۳۶۹	مصارف فے کی ترتیب لفظی کی حکیمانہ تشریح	۳۳۲	فصل حدیث ماترکناہ صدقہ کی تحقیق انیق
۳۷۰	اموال فے آپ کی ملک تھے چوتھی اور پانچویں دلیل		گواہوں کی شرعی تعداد اور آنحضرت کا تادم آخر
۳۷۱	چھٹی دلیل	۳۳۳	تبضہ صدیق کی برات کا مضبوط سامان ہے۔
۳۷۳	ساتویں دلیل	۳۳۶	حدیث مذکور کلام اللہ کے عین مطابق ہے
	ذوالقربے کو اگر فے کا مالک مانیں تو دو خرابیاں	۳۳۷	شیعہ کا ماترکناہ صدقہ پر اعتراض اور اس کا جواب
۳۷۴	موجود ہیں۔	۳۴۱	یوسفیکم اللہ سے آنحضرت متشے ہیں اسکے دلائل
۳۷۵	مملکت یمینک سے دعوائے وقف پر اشکال اور	۳۴۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمشاکی دیگر نظیر
	اس کا جواب	۳۴۶	حدیث مذکور مخصوص آیت توریث ہے نہ کہ معارض۔
۳۷۷	وقف کا معنی کیا ہے؟ اور کونسی اشیاء وقف کے قابل ہیں		جیسے آنحضرت فانکوا مطاب کے متشے ہیں۔ ایسے ہی
۳۷۸	اشیاء منقولہ میں سے پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں	۳۴۷	یوسفیکم اللہ سے ہیں
۳۷۹	سواریاں اور کپڑے بھی وقف کے قابل نہیں۔	۳۴۹	یوسفیکم اللہ کی مخصوص دوسری آیت بھی ہے۔
۳۸۰	امام ابوحنیفہ کا اشیاء منقولہ کو غیر قابل وقف کہنے کی وجہ	۳۵۱	آنحضرت فدک کے مالک تھے متولی تھے۔
۳۸۱	صاحبین کے اشیاء منقولہ کو وقف کہنے کے وجہ	۳۵۳	آیت کے ہر لفظ سے فدک کا مملوک ہونا ظاہر ہے
	صاحبین کی رائے بھی مقصود کے مخالف نہیں	۳۵۵	لام تملیک کے لئے ہوتا اموال فی غیر مملوکہ خدا ہونے
۳۸۲	اشیاء منقولہ کا وقف فقراء مساکین کو مقید ہی نہیں		آیت کا مقصد بیان تملیک نہیں ہے
	بعض اشیاء منقولہ جو حاجت براری نہیں کرتیں	۳۵۸	آیت میں لام تم کے کئی معنی لینے میں مفاسد
۳۸۳	مگر ان میں قابلیت ہے۔		آپ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ
۳۸۵	مملکت یمینک کے لفظی فوائد	۳۶۰	آپ زندہ ہیں
	اموال فی میں آنحضرت کے حصہ کی نوعیت		خدا کی مالکانہ شان آپ کو اتنی مشاہد تھی کہ اپنی ہر چیز
۳۸۷	مصارف کے مقرر کرنے کی وجہ اہل مصارف کی ناداری		کو عاریت یقین کرتے تھے۔
۳۸۹	مما افاء اللہ کے لغوی فوائد	۳۶۱	ایک شبہ کا ازالہ
	فہی کے معنی کی تعیین	۳۶۲	آیت میں لام بیان مصارف کے لئے ہے
۳۹۰	آنحضرت سے ہم قرآنی میں غلطی ناممکن تھی کیونکہ		شیعہ کا اعتراض کہ آیت کا مقتضی زمین کی تقسیم
	اصلاح کے لئے وحی جاری تھی	۳۶۳	تھا۔ اور آپ آمدنی تقسیم فرماتے رہے۔
۳۹۱	آیتہا فاما اللہ یوسفیکم اللہ کی مخصوص ہے	۳۶۵	اعتراض کا جواب کہ اموال فے وقف ہیں کہ ملکیت
۳۹۲	یوسفیکم اللہ فدک کو شامل ہی نہیں۔	۳۶۶	فے اور صدقات کا ایک دقیق فرق
	یوسفیکم اللہ کی جیسے بہت سی احادیث مخصوص ہیں	۳۶۷	معصوم سے خطا سرزد ہونا محال نہیں
	ایسے ہی ماترکناہ بھی ہے۔	۳۶۸	اموال فی آپ کی ملک تھے تیسری دلیل
۳۹۳	بعض آیات اور روایات شیعہ میں کلی تضاد		مصارف مندرجہ آیت کی تعیین و استحقاق کی
۳۹۴	قول قابل اتہاع ہر فعل میں خصوصیات کے احتمالات ہیں		باریک حکمت

۳۲۶	صادق اور صدیق کی روایت کا فرق	۳۹۵	حدیث لا نورث مفسر و مبین آیت ہے اور روایت شیعہ مخالف
۳۲۷	کلینی کی دوسری مؤید حدیث	۳۹۶	اگر ائمہ نے روایت مذکور بلا واسطہ آنحضرت بیان کی ہے تو دو خرابیاں لازم آئیں۔
۳۲۸	تارک الدنیا اور زاهد فاضل نہیں ہو سکتا۔	۳۹۷	حدیث لا نورث اگر غلط بھی ہو تو بھی مذکور ہوتا ہے نہیں آتا۔
۳۲۹	ترکہ نبوی میں تمام اہل بیت کا عمل	۳۹۸	فصل وراثت انبیاء پر بحث کہ وہ مالی ہی علمی؟
۳۳۰	آنحضرت نے سیدہ کو یہ حدیث نہ بتائی کیونکہ وہ	۴۰۰	وراثت سلیمان میں وراثت مالی مراد نہیں۔
۳۳۱	بزرگ علم غیب جانتی تھیں۔	۴۰۱	وراثت سے مراد علم دین ہے (بروایت ائمہ شیعہ)
۳۳۲	صرف صدیق سے حدیث بیان کرنے کی چار حکمتیں	۴۰۲	سیاق و سباق آیت سے بھی وراثت علمی ظاہر ہے
۳۳۳	حکم خدا چھپانے کی ایک مثال (بروایت شیعہ)	۴۰۳	کلام اللہ میں وراثت کو صرف علم کے لئے کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔
۳۳۴	سیدہ کو سمجھانے پر صدیق نے مذکور واپس کر دیا تھا	۴۰۴	کلام اللہ میں وراثت بمعنی قائم مقام وراثت بمعنی حاوی و مسلط
۳۳۵	مسلم شریف کے حوالہ کی حقیقت	۴۰۵	وراثت علمی اگر معنی مجازی ہو تو مجاز متعارف ہے
۳۳۶	امام کا حضرت عباس کو بے دخل کر دینا عدم وراثت پر کھل دلیل ہے۔	۴۰۶	کلینی کی روایت جس میں وراثت علمی کی صراحت ہے
۳۳۷	حضرت عباس و علی نے بکلی حدیث صدیق کی تصدیق کی۔	۴۰۷	حضرت زکریا صرف خلیفہ سلج چاہتے تھے (سورہ موم)
۳۳۸	خان وغیرہ الفاظ مبالغہ حسب محاورہ استعمال ہوئے	۴۰۸	حدیث لا نورث حضرت صدیق کے لئے متواتر سے بڑھ کر تھی۔
۳۳۹	حضرت عمر کا غصہ مبالغہ کی کھلی دلیل ہے۔	۴۰۹	روایت کے فنی درجات ان رواۃ کے لئے ہیں جنہیں آنحضرت سے سماعت اور روایت حاصل نہیں
۳۴۰	مبالغہ کلام اللہ میں بطور محاورہ	۴۱۰	روایت لا نورث کے راوی دس بارہ صحابی ہیں۔
۳۴۱	حضرت عباس نے وہی الفاظ امام کے حق میں کہے جو حضرت عمر نے ان کی نسبت کہے۔	۴۱۱	اہل شیعہ کے نزدیک حضرت علی اور خدیجہ کا اعتناء لازمی ہے۔
۳۴۲	حضرت علی اور حضرت عباس خطا بردگان ہوئے	۴۱۲	بخاری شریف میں حدیث لا نورث بروایت حضرت امیر
۳۴۳	امام کی اتباع میں شیعہ اگر صدیق کو برا کہیں تو حضرت عباس کی اتباع میں امام کو بھی کہیں۔	۴۱۳	احادیث و آیات میں کوئی مخالف نہیں ہے
۳۴۴	ترکہ نبوی کے میراث ہونے پر استدلال۔ اور اس کے جوابات	۴۱۴	عقلی سے کہیں دہم ہو جاتا ہے۔
۳۴۵	حضرت علی و عباس نے بھول سے مطالبہ کیا۔ اور بھولنا عیب نہیں۔	۴۱۵	روایات شیعہ سے لا نورث کی حمایت
۳۴۶	صدیق سے علم و ابن علم کی بدگمانی بشریت کی وجہ سے تھی۔	۴۱۶	
۳۴۷	قرآن نہیں میں تمام امتی آنحضرت کے محتاج ہیں۔	۴۱۷	

۴۸۱	بہ سلسلہ برات صدیق روایت کے چند فائدے	۴۶۳	وما اوتیم سے سرور عالم مستثنیٰ ہیں۔
۴۸۲	روایات اہل سنت میں سیدہ کی خوشنودی	۴۶۴	حضرت فاطمہ بھی قرآن فہمی میں آنحضرت کی متبع تھیں
۴۸۳	کا بیان موجود ہے۔	۴۶۵	اگر کسی ایک بات کے جاننے سے فضیلت ہو تو
۴۸۴	جنازہ میں شرکت سے روکنے کا افسانہ	۴۶۶	خضر حضرت موسیٰ سے افضل ہوتے۔
۴۸۵	سیدہ کی وصیت میں عام ممانعت تھی کسی	۴۶۷	سیدہ نے سماع حدیث کے بعد ممانعت سے
۴۸۶	کی تخصیص نہ تھی۔	۴۶۸	بات چیت بند کی
۴۸۷	سیدہ کا جنازہ صدیق ہی نے پڑھایا	۴۶۹	سماع حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت
۴۸۸	خدا اور رسول راضی ہوں تو سیدہ کی ناراضی	۴۷۰	ہی نہ رہی
۴۸۹	سے کچھ نقصان نہیں۔	۴۷۱	وحدت کی لفظی تشریح
۴۹۰	بضعة منی سے اشکال اور اس کے جوابات	۴۷۲	وحدت کے صلیہ پر بحث
۴۹۱	بضعة منی کا شان و رود حضرت علی رضی	۴۷۳	اہل کمال کے کلام نکادہ محمل تلاش کیا جائے
۴۹۲	نہ کہ صدیق۔	۴۷۴	جس سے حسن ظن قائم رہے
۴۹۳	پیغام نکاح گناہ نہ تھا مگر سیدہ کو کو بوجہ	۴۷۵	سید صدیق سے بوجہ غلطی آزر دہ ہوئیں۔
۴۹۴	بشریت غصہ آیا۔	۴۷۶	حضرت موسیٰ غلطی سے حضرت ہارون پر ناراض ہوئے
۴۹۵	خلاصہ جواب طعن مذکور۔	۴۷۷	بالفرض اگر صدیق ہی کی غلطی تھی تو توبہ کرنی

ہر قسم کے

قرآن مجید مترجم و معرّ، اور تفاسیر عربی و فارسی

اور اردو

نیز کتب درس نظامی کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں و

قاعدے، سیپارے اور تبلیغی نصاب وغیرہ

بہترین کتابت و طباعت کے مرتب

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ حق شریٹ اردو بازار لاہور

اعتذار

ناشر

بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مُحَمَّدًا وَنُصَلِّيَ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اَمَّا بَعْدُ! زیر نظر کتاب ”ہدیتہ الشیعہ“ کے بارہ میں کچھ لکھنا غیر ضروری بلکہ بے ادبی ہے کیونکہ اس کتاب کے مصنف حجۃ الاسلام استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند ہیں اور ان کا نام نامی اس کے مستند ہونے کی پوری ضمانت ہے۔

دراصل یہ کتاب ایک شیعہ عالم مولوی غمار علی صاحب کے خط کا مفصل جواب ہے جس میں مسئلہ خلافت اور مسئلہ فدک کے موضوع پر بحث فرما کر حضرت نے اہلسنت کے موقف کو خوب واضح فرمایا ہے۔ یہ کتاب حضرت نانوتویؒ کے وہی علوم کا منظر ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر مقبول خاص عام ہوئے۔ لیکن اس وقت کی طباعت میں پیرا گراف اور عنوانات نہیں تھے جس کی وجہ

سے استفادہ مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب سابق خطیب مسجد مہیڈ کوثر ٹرنڈ کراچی کو کہ انہوں نے پوری کتاب میں پیرا گراف اور عنوانات اس خوبی سے لگائے کہ کتاب کے سارے مضامین فہرست کے آئینے میں نظر آنے لگے اور کتاب کی ذاتی جاذبیت نمایاں ہو گئی۔ نیز مولانا موصوف نے اس بات کی بھی پوری کوشش فرمائی کہ حضرت مصنفؒ کی اصل عبارت میں تصرف بھی نہ کیا جائے۔

مولانا موصوف نے عربی عبارات کے تراجم بھی ساتھ دے دیئے ہیں تاکہ اردو خواں حضرت کے لئے بھی استفادہ آسان ہو جائے۔

عنوانات صرف اصل مضمون کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں اور پوری کتاب کی اصل عبارت جوں کی توں ہے۔ یہ فہرست والا ایڈیشن مولانا محمد اسلم صاحب نے تقریباً ۱۹۶۲ء میں اپنے مکتبہ حقانیہ کراچی سے شائع کیا تھا لیکن اب عرصے نمایاں تھا اس لئے اس کو جدید طباعت کے ذریعہ اب "نعمانی کتب خانہ لاہور" سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو قبول و منظور فرمائے آمین۔

بندہ ناچیز بشیر احمد ناظم نعمانی کتب خانہ، لاہور

تائید و ترغیب: خادم اہلسنت مولانا بشیر محمد علوی

وحدت روڈ۔ لاہور

۱۵ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء

۷۸۶

تقدیم الکتاب

:- اننا نشر:-

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین
 اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے محض اپنے فضل و کرم سے میرے جیسے بے بضاعت اور
 کم سواد طالب علم کو اس عظیم الشان علمی یادگار کے احیاء کی توفیق بخشی۔ ایک مدت
 تک تو طباعت کا خیال ہی خیال رہا۔ کیونکہ طباعت سے پہلے خود کتاب کا موجود ہونا بھی ضروری
 ہوا۔ اور کتاب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کائن لہ یکن۔ اچانک ایسا ہوا کہ ایک علم دوست بزرگ
 تشریف لائے۔ اور کچھ کتابیں میرے سامنے رکھ دیں۔ کہ ان کی جلد بندی مطلوب ہے۔
 کتابیں دیکھیں، تو ان میں وہ مقصود بھی موجود تھا جس کی خلش عرصہ دراز سے دل
 میں رہتی تھی۔

اس وقت تو ان کو بہت اچھا کہہ کر رخصت کیا، اور پھر مختلف تدابیر عمل میں لانی پڑیں
 جن سے وہ بزرگ بہت منت سماجت کے بعد کتاب دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کام بڑا تھا۔
 جس کے لئے بڑی ہمت درکار تھی۔ اور یہاں ضعف ہی ضعف تھا۔ کتاب پڑی رہی۔
 اور سوچ بچار میں کافی وقت گزر گیا۔ اس درمیانی وقفہ میں ایک بڑے ادارہ نے طباعت
 کا ارادہ کیا۔ اور کتاب بھی لے لی مگر کچھ عرصہ بعد مصروفیت کا غدر کر کے واپس کر دی گویا
 ع۔ ب۔ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

جس طرح کتاب ہاتھ آئی۔ ہاتھ سے نکلی۔ نکل کر پھر ہاتھ آئی۔ اس سے صاف
 ظاہر تھا۔ کہ اب پس و پیش کی مزید گنجائش نہیں۔ کام شروع ہونا چاہیے۔ لیکن جب کتاب
 کا مطالعہ شروع کیا۔ تو معلوم ہوا۔ ع۔ کہ عشق آساں نمود اول و لے افتاد مشکہا۔
 کیونکہ کتاب مسلسل تھی۔ کوئی پیرا گراف۔ کوئی عنوان یا فصل اور باب وغیرہ اس میں موجود
 نہ تھا۔ جیسا کہ مقدمہ میں کا طریقہ تھا۔ اور یہ طریقہ اس وقت کے لئے ناموزوں بھی نہ تھا، وہ لوگ

محتی تھے۔ کتابوں کے کیڑے تھے۔ علوم کے قدردان تھے۔ عالی ہمت تھے مطالعہ اور کتب بینی ان کے لئے تفریح و نشاط کے ذرائع تھے۔

مگر اب جبکہ ہمتیں لپٹ ہو چکیں۔ ذہنی سکون و اطمینان بجائے علمی مشاغل کے جھوٹی روایتوں اور قصوں میں تلاش کیا جانے لگا۔ تو ضروری ہوا کہ اب علوم کو سہل و خوبصورت بنا کر پیش کیا جائے تاکہ شائقین کو استفادہ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس لئے ایک صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ کتاب کی تبویب و تصحیح کریں مگر شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا۔ عن ظہر الغیب ہی لکھا۔ یعنی کتاب دیکھے بغیر اپنی علمی قوت اور زور سے لکھا۔ یہ ایک نئی مشکل تھی جس سے بچاؤ کی یہی صورت نظر آئی۔ کہ دست خود ہمارے خود پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ تبویب کا کام خود کرنا پڑا مضامین کی مناسبت سے چند ابواب قائم کئے۔ اور ان کے ذیل میں عنوانات لکھے۔

مگر اس کے باوجود بھی کتاب کے مضامین کا احاطہ نہیں ہو سکا۔ کیونکہ کتاب کی علمی شان کچھ اتنی وسیع اور عالی ہے کہ ہر دو سطر کے بعد ایک نیا استدلال، نیا نکتہ، نیا مضمون موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کثرت سے عنوانات نہیں لکھے جاسکتے تھے۔ اس لئے کتاب کی وسعت اور جامعیت کو فہرست بھی تہمام و کمال پیش نہ کر سکے گی۔ یہاں تشویق و ترغیب کا کام ضرور دے گی

کتاب میں مصنف قدس سرہ کی اپنی ایک خاص شان جلوہ گر ہے۔ سوز و گداز اس وجہ ہے۔ گویا ٹرپ رہے ہیں کہ مخاطبین حق کو کیوں قبول نہیں کرتے، یا مصنف خود ہی ان کے قلوب میں کسی طرح یہ حقائق کیوں نہیں ڈال سکتے۔ علوم عالیہ کی اس رفعت کے باوجود منزل کا یہ حال ہے کہ بے انتہا بلندیوں سے اتر کر مشقت کے ساتھ ایک بات کو عام فہم اور سادہ بنا کر پیش فرما رہے ہیں۔ امد کا یہ حال ہے کہ مضامین ہاتھ باندھے چلے آ رہے ہیں۔ اوسبات سے بات پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اس اعلیٰ علمی شرف کے باوجود ہر جگہ تواضع اور انکسار کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں تعلیٰ اور ادعا نہیں ہے۔ پھر خاص بات یہ ہے کہ اہل بیت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تمام مباحث میں ادب و احترام بہت ہی نمایاں ہے۔ ورنہ آج کل تو

یہ توازن جوش و خروش اور قلم کی جولانیوں کی نذر ہو چکا ہے۔

کتاب کی خصوصیات کے بارے میں اگر کچھ عرض کیا جائے۔ تو سب سے پہلی اور بڑی خصوصیت تو یہی ہوگی کہ بانی دارالعلوم قدس سرہ کی تالیف ہے۔ اور یہ کسی عقیدت مندی کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت ہے کیونکہ مولانا کی علمی اور تحقیقی رفعت و امتیاز کے اپنے اور پائے سب ہی قائل تھے۔ اور ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ استدلال میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یعنی روایت کے ساتھ درایت اور نقل کے ساتھ عقل کا سلسلہ پوری کتاب میں قائم ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ عرف اور محاورہ بھی مد نظر ہے۔

تیسری خصوصیت صحابہ کرام سے متعلقہ آیات کی تفسیر و تشریح ہے جو ہر اہل ایمان کے لفظی اور معنوی فوائد ایسے عجیب و غریب ہیں۔ کہ بڑی بڑی تفسیر ان سے خالی ہیں۔ اور مالاہعین رأت ولا اذن سمعت کے مصداق ہیں۔ چوتھی خصوصیت بعض ایسی آیات اور احادیث پر محققانہ بحث ہے جن کو فریق ثانی استدلال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر اس بحث کا امتیاز یہ ہے کہ مصنف قدس سرہ کی تحقیق کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث یا آیت کو فریق ثانی نے اپنی دلیل کیسے سمجھ لیا ہے، یہ تو ہماری دلیل ہے۔ نکات حکم کا بیان اس پر مزید ہے جو انسانی علم و ادراک کا شکار نہیں بلکہ محسوس طور پر عطاۓ ربانی ہے۔

پانچویں خصوصیت کتاب کے مباحث و مضامین کا تنوع اور توسع ہے جس کے ضمن میں ذیلی علوم و معارف کافی مقدار میں آگے ہیں جو بے حد قیمتی اور نادر و نایاب ہیں۔ جن سے کتاب کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ کا یہ ارشاد بالکل بجا اور درست ہے کہ ہدیتہ الشیعہ میں مخفہ بمع زوائد ہے۔ چھٹی خصوصیت کتاب کی سلاست اور سادہ بیانی ہے۔ جو مولانا قدس سرہ کی باقی کتب کے مقابلہ میں بالکل نمایاں ہے۔ کتاب کا اکثر حصہ روزمرہ کی زبان ہے۔ بعض مقامات میں (جو بہت قلیل بلکہ اقل ہیں) علمی زبان کی وجہ سے کچھ دشواری پیدا ہوئی ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کہ خالص فنی مسائل کے بیان میں یہ دشواری ہر ایک

کو پیش آتی ہے۔

آخر میں اپنی اس حقیر کاوش کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس امر کی کوشش تو پوری پوری کی گئی کہ عنوانات کو کتاب کے ساتھ کامل ارتباط و مناسبت ہو۔ اور کتاب کی علمی شان کا عکس اور پرتو ہوں۔ مگر چہ نسبت خاک را بعالم پاکٹ؟۔ کہاں یہ کتاب اور اس کی رفعت اور کہاں ہم اور ہماری کاوش؟ بس مقصد اتنا تھا کہ پڑھنے والے کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ کتاب میں کیا ہے۔ وہ کسی قدر انشاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یوں جی چاہتا ہے کہ سولج قاسمی میں سے سرسید کا وہ بیان نقل کر دیا جائے جس میں مولانا سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی سرسید کی نظر میں

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر سرسید مرحوم نے ”علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ“ کی اشاعت مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۹۱ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتوی کے متعلق سرسید نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے، وہ الفاظ معاصرانہ چشمک مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدہ مندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو، ظاہر ہے کسی بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ تصنیف العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے۔ اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں۔

”والہر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لادیں تو میری سعادت ہی میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا“

متذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ

”ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دُرمدی اہل اسلام کا معتقد ہوں۔ اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں، تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔“

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرہ صدر مضمون درج ذیل ہے۔

روافسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۷ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا زمانہ بہتوں کو روایا ہے۔ اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے۔ نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقوٰے اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا۔ کہ اس دلی کی تعلیم تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقوٰے اور ورع اور نیک بخئی اور

خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعرا ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش زہوشمندی پے می تافت ستارہ بلندی ^{سورج}
 زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امجد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کامل بنا دیا تھا، خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے۔ اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بانیہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیرو و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزار ہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تجھے بلاشبہ لہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے۔ اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے۔ اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا۔ اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے

کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے۔ خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ مسئلہ حب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحق سے بڑھ کر نہ تھا۔ تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔ اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے۔ زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صر حنید کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور مال سی پوچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں، دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے۔ اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے۔ اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمار ہے۔

(نقل باصلہ از علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ)

مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۶۶ و ۶۷

نوٹ:- فہرست کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین والصلوة والسلام علی رُسُلہ سیدنا

مکتب نبی الرحمة والہ وازواجه واهل بیتہ وذریقہ واصحابہ اجمعین۔

سبب تالیف بعد حمد و صلوة کے بندہ محمد ان گنا محمد قاسم نام مخلص نکاح کپاء علماء ناظران اوراق کی خدمت میں عرض پر داری ہے کہ اواخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سو ترسی ہجری میں مخدوم العلماء مطاع الفضل ابرہیم کمالا مینع المحسنات زیب طریقت حامی شریعت فخر احباب افتخار اصحاب ملجاء انام مرجع خاص و عام معلم قوانین اطاعت والقیاد محرک سلسلہ رشد و ارشاد جامع کمالات ظاہری و باطنی مخدوم مولانا مولوی رشید احمد گنگوہی دام رشدہ و ارشادہ نے ایک خط متضمن بعض خرافات شیعہ جو مولوی عمار علی صاحب کی طرف سے بنام میرزا در علی صاحب ساکن کر تھل نواح الوردیہ، اس پیمان کے پاس بایں غرض بھیجا کہ ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح کروں۔ اتفاقات سے ان ایام میں حسب ایماء بعض احباب کہ ان سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے اوقات فرصت میں دربارہ اثبات توحید و رسالت بدلائل عقلیہ اوراق سنیاہ کرتا تھا، سو کچھ تو اس وجہ سے، اور کچھ بوجہ کابلی طبع زاد، اس کے جوابات کا لکھنا سخت دشوار معلوم ہوا اور پھر بوجہ پیمانی اور بے سرو سامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا، قصہ بہر طور یہ کار دشوار تھا، مگر مولانا ممدوح کے ارشاد سے ناچار تھا لہذا تحریر مضامین توحید و رسالت کو اور وقت پر موقوف رکھ کر خط مذکور کے پہنچنے سے دو تین روز ہی بعد تحریر سابق کے عوض میں خط مذکور کے جوابات لکھنے شروع کئے۔ مگر کچھ تو پیمانی اور بے سرو سامانی اور کچھ قلت فرصت اور کچھ سرگردانی اس لئے ایک دفعہ تو زہن پڑا، پر اوقات متفرقہ میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر ۱۲۸۳ھ بارہ سو چوراسی میں تمام کیا اور بعد اختتام "ہدیۃ الشیعہ" اوراق کا نام رکھا۔

انتخاب نام کا دواز اور وجہ اس نام رکھنے کی حالانکہ یہ رسالہ بظاہر موید اہلسنت ہے اور اس وجہ سے ہدیہ اہل سنت کہنا مناسب تھا، یہ ہے کہ نسبت اہل سنت شیعوں کے حق میں یہ رسالہ زیادہ تر مفید ہے، اہل سنت کے لئے تو اس میں اتنا ہی فائدہ ہے کہ کچھوں کے لئے مفید یقین اور پکوں کے لئے باعث اطمینان ہے، پر شیعوں کے حق میں اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے، کیونکہ ان اوراق میں اگر استدلال ہے تو تین چیزوں سے استدلال ہے۔ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ کتب معتبرہ شیعہ یا دلائل عقلیہ واضحہ الدلالات سوانہ تینوں کا مسلم ہونا شیعوں کے نزدیک مسلم کتاب کی کھلی صداقت | مگر یہ منکر ہو جو گمنامی احقر شاید کسی کو یہ بدگمانی ہو، کہ استدلال بھی کرتے ہیں، پر استدلال کرنا کسی کسی کو آتا ہے، سو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ رسالہ موجود ہے۔ ہمارا کہنا باور نہ کیجئے۔ اس مسئلہ ہی کو دیکھ لیجئے۔ صاحبو دیوانہ ہوں و لیکن بات کہتا ہوں ٹھکانے کی۔ ببرکت اہل بیت کرام اور صحابہ عظام امید یوں ہے کہ انشاء اللہ منصفان ہمیں آفریں ہی کریں گے اور کوئی کہے تو یہ کہے گا

گاہ باشد کہ کو دک نادان

بغلط بردہ دند تیرے

سو یہ سب سچ ہے۔ اپنے آپ کو کون نہیں جانتا۔ غرض اپنی نسبت جو کچھ کہئے بجلہ ہے پر اس رسالہ کے مضامین کی حقانیت کا دعوائے بھی بجا نہیں۔ انشاء اللہ بعد ملاحظہ معلوم ہو جائے گا۔

کتب کے جواب کی صحیح راہ | ہاں نادان متعصب اگر دو چار باتوں میں تکرر کریں، تو نادانوں کا کام یہی ہے، ان کی زبان سے قرآن تو چھوٹی نہیں یہ سچچاں تو کس شمار میں ہے۔ البتہ دانشمند ذی علم ایسا کریں، تو ہمیں بھی شکایت ہے کیونکہ کسی رسالہ یا کسی کتاب کے جواب کے یہ معنی ہیں کہ تمام استدلال کو باطل کر دیجئے۔ جیسا کہ اس سچچاں نے نسبت خط مولوی عمار علی صاحب کیا ہے چنانچہ انشاء اللہ واضح ہو جائے گا وہ ایک دو بات تو ہر کسی کی قابل گرفت ہوتی ہے جناب من شریہوں اور بشر بھی سب کے کتر، خدا نہیں سول نہیں جو غلطی کا احتمال نہ ہو، بھول چوک سزا کا نہیں کیا جاتا، پر کتاب کی صحت اور اعتبار باعتبار اکثر کے ہوتی ہے۔

سو اگر کسی صاحب کو خیال جواب ہو تو بندہ سچچاں کی روش پر چلیں یعنی ہر مضمون کے ہر پہلو پر گرفت کریں نہیں تو اس سے بھی کیا کم کہ موافق قواعد علم مناظرہ ہر دعویٰ کے استدلال پر اعتراض

کریں ورنہ دو چار باتوں کی تخیط سے کام نہیں چلتا۔ اس کا تو میں بھی خود مقرر ہوں کہ خطا و نسیان سے متبرک نہیں کیا عجب ہے کہ کچھ غلطی ہو گئی ہو القصہ اہل انصاف سے امید تو یہ ہے کہ قطع نظر پریشانی تقریر اس رسالہ کے دعووں اور دلائل پر حتم گیر نہ ہوں۔ بلکہ آفرین اور تحسین ہی سے پیش آئیں۔

ایک شبہ کا ازالہ | اور اگر بہ نسبت انبیاء و مرسلین یا بزرگان اہل بیت و اصحاب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس رسالہ میں کوئی حرف نامناسب دیکھ کر الجھیں تو مجھے اس سے بری الذمہ سمجھیں ایسا مذکور کہیں کہیں ناچار ہی بغرض الزام شیعہ آگیا ہے اس کا بار انہی کی گردن پر ہے یہ سب انہوں نے ہی کر لیا ہے خدا شاہد ہے کہ ایسے عقائد سے میں ہزار جان و ہزار زبان سبزا ہوں۔ محبت بزرگان مذکور کو اپنی سعادت اور ان کے حسن اعتقاد کو ذریعہ نجات سمجھتا ہوں مگر مردمان فہمید سے یوں امید ہے کہ میرے غلط سے پیشتر ہی لشہادت مذہب مجھے معذور سمجھیں۔

نقل روایات میں مصنف کا رویہ | ہاں بوجہ بے سرو سامانی احقر کسی شیعہ کو نقل روایات میں کچھ مامل ہو تو البتہ چند وجہ سے بجا ہے، اول تو کتب شیعہ کے میسر و سنیتوں کو کیا غرض جو فراہم کریں شیعوں کو حکم مثل مشہورہ اہل البیت ادری بما فیہ یعنی گھروالے گھر کی بات کو خوب جانا کرتے ہیں بلحاظ خوبی مضامین سنیتوں کے دینے میں دار و گیر اور طعن و تشنیع اور مضحکہ کا اندیشہ پھر کوئی سنتی لائے تو کہاں سے لائے جو کوئی روایت مفید مطلب سنیاں کسی رسالہ میں درج کی جاتے دوسرے کتابیں اگر غرض کروٹیں بھی تو مجھ سے بے سروسامان کے ملنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں کیونکہ اپنی کتابیں جب پاس نہ ہوں تو دوسروں کی کتابیں کیا ہونگی تیسرے نقل مشہور ہے "المردء یقیس علی نفسہ" شیعوں کی دروغ مذہبی نے شیعوں کے نزدیک سنیتوں کا اعتبار بھی نہیں رکھا پھر حسب مثل مذکور اگر شیعہ اس سنتی مشرب کو بھی جھوٹا سمجھیں تو سمجھ کی بات ہے۔ بالجملہ بوجہ مذکور خاص کر وجہ اول اس بات میں کسی شیعہ کو مامل ہو تو بجائے خود ہے تحفہ اثنا عشریہ پر اعتماد اس لئے یہ استباز بھی عرض پر داز ہے کہ "الصدق یُنحی وَالکُذِبُ یُجْلِسُ" یعنی پس میں نجات ہے اور جھوٹ میں تباہی، واقعی اس کے سروسامان پاس اس قسم کا سامان کچھ نہ تھا، پر ایک تحفہ اثنا عشریہ تھا اور جب تحفہ تھا تو جاننے والے جانتے ہیں کہ سب کچھ تھا۔ موافق مصرعہ مشہور

کافی ہے تسلی کو تری ایک نظر بھی

اور کتابیں نہ سہی۔ ایک تحفہ ہی بہت ہے کیونکہ مولف تحفہ حجتہ اللہی العالمین خاتم المحدثین المفسرین

عمرہ المتکلمین زبدۃ المناظرین مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے نام کے سنی تو دیوانے ہیں پر علماء شیعہ بھی (جہلوں کو) نہیں کہتا، ان کے تجر و تحقیق کو بہ نسبت دونوں مذہبوں کے اپنے دل میں تو خوب ہی جانتے ہیں۔ زبان سے کہیں یا نہ کہیں۔ سو جو روایت روایات کتب شیعہ میں سے اس رسالہ میں منقول ہوئی ہے، ناخدا اس کا یا متن تحفہ مطبوعہ دہلی ہے، یا اس کے حواشی ہیں جو غالباً منہیہ معلوم ہوتے ہیں۔ سو تحفہ کا حوالہ اہل الصاف کے نزدیک خود ان کتب کے حوالے سے کم نہیں جن کا نام اس سال میں لکھا گیا۔ اسی وجہ سے اس احقر نے بے تامل ان کتب کا حوالہ رقم کر دیا ہے۔

شیعہ کو مہمدانہ مشورہ اور صاحب تحفہ کی راست بازی اور تبحری کے بھروسے منصفانہ شیعہ کی خدمت میں عرض پر دانہ ہوں کہ فقط میری بے مرسامانی کے خیال سے بے دماغی نہ فرمائیں نقل کو اصل سے مطابق کر دیجیےں، اکثر کتب فقہی و علمائے مشہورہ معتبرہ شیعہ ہیں: نادرا لوجود کیا نہیں اس کا اندیشہ نہ کریں کہ مطابقت ہوئی تو ماننا پڑے گا۔ خدا نے خود فرمایا ہے: "مَنْ يُضِلَّ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ" پھر کیا اندیشہ ہے، خدا کی فرمائی ہوئی باتوں میں تو یہ بات پائی نہیں جاتی کہ سمجھ میں آجائے۔ تو ماننا ہی پڑے۔؟ اس گنہگار پچھراں کی بات میں یہ بات کہاں۔؟

معہذا حق تو ماننے ہی کے لئے ہے۔ اگر حق کو تسلیم ہی کر لیا تو کیا نقصان ہے۔ الغرض تطبیق میں کلامی نہ کریں، بعد مطابقت اگر فرق نکلے تو وہ میرے ذمہ

شیعہ کی دلیرانہ غلط بیانی مگر میں جانتا ہوں کہ میرے بے کہے شیعہ اس بات کو جانتے ہو گئے، کون یہ جانتا کہ اہلسنت کے نزدیک جھوٹ یونان خصوصاً دین کے مقدمہ میں سخت ممنوع اور منجملہ کبار ہے ہم وہ نہیں کہ مثل مولوی عمار علی صاحب مشار الیہ پیشوا و پیش امام شیعہ کہ وہ بظاہر مولوی عمار علی صاحب سونی تہی معلوم ہوتے ہیں غلط اور موصوع کو صحیح اور ضعیف کو قوی اور غیر معتبر کو معتبر کہہ دیں یا محض اصل کے جھوٹ سچ کوئی اصل گھڑ دیں چنانچہ ناظران رسالہ اٹھنا پر واضح ہو جائے گا کہ مولوی صاحب موصوف نے خط مذکور میں کیا کیا ستم کئے ہیں۔ ہم کو یہ گمان تھا کہ شیعوہ دروغ بندی زمانہ سابق کے علماء شیعہ پر ختم ہو چکا مگر غنیمت ہے کہ انکے خلف الرشید اب تک بہت باقی ہیں۔ دعوے یہہ فدک حضرت زہرا کی طرف سے سینوں کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بیان کرنا اور حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن و حتران رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع

کرنا یہ مولوی عمار علی صاحب جیسے مقتدار و پیشوا شیعہ ہی سے ہو سکتا ہے کیونکہ متابعت بزرگان ایسے ہی بزرگواروں کا کام ہے۔

اگر جھوٹ ہی بولنے کو جی چاہتا تھا تو ایسا بولتا تھا کہ پیش جاسکتا اور کسی کے خیال میں آسکتا مگر ایسا طوفان کہیں نہیں سنا تھا کہ ایک شخص کے سنی ہو جانے کے اندیشہ سے نہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمائے اور نہ ائمہ معصومین کا کچھ پاس و لحاظ کیا حضرت ام کلثوم بنت سیدہ النساء کے خلیفہ ثانی سے نکاح کو ذکر نہ کرنا تو اس پر بھی تبکلف محمول ہو سکتا ہے کہ اگر ایک ذکر نہیں کیا تو یاقینوں سے انکار بھی تو نہیں کیا، پر یہ بات کہ حضرت رقیہؓ غیر عارضی اللہ عنہا خیران سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہ تھیں اور حضرت زہراءؓ کا دعوائے پیہ فدا کرنا اہلسنت کی معتبر کتابوں میں ایسا دروغ صریح ہے کہ کسی اقبال صحیح پر کسی طرح منطبق نہیں ہو سکتا چنانچہ بعد ملاحظہ رسالہ "هذا الشارح للامام" میرے اس قول کی صحت بخوبی معلوم ہو جائے گی۔ یہ وہی مثل ہی "دروغ گویم بر روئے تو"۔

مولوی صاحب کی دروغ گوئی کا ایک لچپ پہلو لیکن بغور دیکھئے، تو مولوی صاحب کی بھی اس میں کچھ نقیصہ نہیں، آخر مذہب اہل سنت شہادت کلام اللہ اور عزت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح اور مذہب شیعہ شہادت کلام اللہ اور عزت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر امر غلط ہے۔ اور باوجود اس کے پھر اپنے پیشواؤں کو دیکھا کہ مذہب شیعہ کو حق اور مذہب اہل سنت کو باطل کہتے ہیں، تو مولوی صاحب موصوف بحسن اعتقاد و بزرگ گائیہ سمجھ بیٹھے کہ حق غلط ہی باتوں کو کہا کرتے ہیں اور کیونکر نہ سمجھیں۔ آخر مولوی صاحب عمدۃ علماء شیعہ ہیں۔

بعد ازیں کلام اللہ کی تلاوت کا جو کچھ بولے چو کے اتفاق ہوا تو سورہ احزاب میں یہ آیت نکال آئی۔
واللہ لایستعی من الحق یعنی اللہ تعالیٰ حق بات سے شرم نہیں کرتا چونکہ مولوی صاحب کو بزرگ خود کمال اتباع خداوندی مد نظر ہے تو اپنے غدیہ میں غلط باتوں سے پرہیز کرنا خلاف اخلاق خداوندی سمجھ کر جھوٹ بولنے کی شرم طاق میں اٹھا دھری اور بے ساختہ مثل پیشوایان قدیم کہ ان کی متابعت بھی بزرگ مولوی صاحب موجب سعادت ہے اور حضرات ائمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کے حق میں بددعائیں کی ہیں اور ان کو جھوٹا بتلایا ہے اور ان کی باتوں سے ربغ اٹھایا ہے، انہوں نے بھی افسر پر وازیوں پر کمر باندھی تاکہ ان کی متابعت کے صدقے حضرات ائمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بددعائیں میں شریک ہو جائیں۔
رس کی رس کی اے سکھی تیرے دونوں مہرہاں چہ ٹھنڈی تھی نیرجوں دونوں آگ بجھائے

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

باب

مذہب اہلسنت موافق قرآن مجید و حدیث پاک، اور مذہب شیعہ مخالف ہر دو

اہل سنت اہل حق اور شیعہ اہل باطل ہیں۔ دلائل تفصیل اس بات کی کہ اہل سنت کا مذہب موافق ثقلین یعنی کلام اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے اور شیعوں کا مذہب مخالف ثقلین اور یہ بات کہ پیشوایان شیعہ کے حق میں حضرات ائمہ نے کیا کیا کچھ کہا ہے اس رسالہ مختصر میں سما نہیں سکتی لیکن بطور نمونہ ایک ایک دو دو باتیں عرض کر فی ضرورت پڑیں اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے، مشتے نمونہ خرداری بعد ازاں اس خط کی تردید مناسب وقت کی جائیگی۔ مخدوم من کلام اللہ میں سورہ بقرہ میں پہلے سپارہ میں یہ آیت ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْثَرُ النَّاسِ تِلْكَ الْأَوَّلُونَ
مَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ

(حاصل اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ اسکو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا ذہنی اس یقین لاتے ہیں اور جو منکر ہو گا اس سے سوا نہیں کو نقصان ہے

اس آیت کے مضمون کے دیکھنے کے بعد تصور میں نہیں آتا کہ کسی کو دربارہ حقیقت مذہب اہل سنت شک ہے اور جب اس میں شک نہ ہو تو اس کا پہلے یقین ہو جائے گا کہ مذہب شیعہ باطل ہے۔ مضمون آیت پر تفصیلی نظر تفصیل اس اجمال کی یہ کہ یہ آیت ہر خبیث بعض اہل کتاب کے حق میں نازل اور حق تلاوت میں ایمان کا انحصار ہوئی ہے لیکن اس آیت میں گو کسی کی شان میں نازل ہو کتاب اللہ پر ایمان لانے کو انہیں میں منحصر کر دیا ہے جو اسے خوب پڑھتے ہیں حق پڑھنے کا جب یہ بات انہیں میں منحصر ہوئی تو معلوم ہوا کہ کتاب اللہ پر ایمان کی علامت یہی ہے کہ اس کو خوب تلاوت کیا کرے کوئی سی خدا کی کتاب کیوں نہ ہو تورات ہو یا انجیل یا قرآن شریف۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ذہین آدمی کوئی مشکل بات حل سمجھ جائے اور خوب سمجھے۔ اور دوسرے اس کی تعریف میں یوں کہیں کہ بات کو ذہن سے سمجھتے ہیں تو گو یہ تعریف اسی کے سننے کے لئے کی گئی ہے پر حقیقت میں سارے ہی ذہنیوں کی تعریف ہے

سور نسبت قرآن شریف کے یہ نشانی سوا اہل سنت کے اور کسی فرقے میں پائی نہیں جاتی خصوصاً شیعہ کہ ان کا تلاوت کرنا تو سب ہی جانتے ہیں۔

اہل سنت سے ادائیگی حق تلاوت یہاں تک کہ کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں ضرب لمثل ہو گئے ہیں اور شیعہ کی اس سے قطعی محرومی سو اس کا باعث بجز اس کے اور کیا ہے کہ جیسی تلاوت چاہیے ان سے ویسی تلاوت نہیں ہو سکتی۔ جب قدر کلام اللہ کے پڑھنے میں محنت چاہیے ان سے محنت نہیں ہو سکتی باقی اہل سنت کا ایسا تلاوت کرنا، جیسا تلاوت کا حق ہے۔ عیاں ہے اور عیاں راہ بیان، اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ پڑھتے پڑھتے بزدبان ہو جاتا ہے۔

بڑے آیت قرآنی قرآن کا حفظ اس آیت سے اشارتاً معلوم ہوا کہ جتنے فرقے اہل اسلام میں معدود ہو تا حق ہونے کی نشانی ہیں ان میں سے جو نسا فرقہ حقانی ہو گا۔ اسی کو کلام اللہ یاد ہو گا۔ اور دوسرے یاد نہیں ہو سکتا، ورنہ لازم آئے کہ باطل پر ہو کر ممدوح خداوند کریم ہوں۔ سو بجز اللہ تعالیٰ یہ دولت نصیب اہل سنت ہوئی۔ ماسوا ان کے اور سب فرقے اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہے چنانچہ آج ہمک مسوع نہیں ہوا، کہ سوائے اہل سنت کے کسی اور کو روافض و خوارج میں سے یاد ہوا ہو اور فرقوں کا تو ہندوستان میں وجود ہی نہیں، پر سوائے اہل سنت، روافض البتہ کثرت ہیں کوئی قصبہ اور کوئی شہر نہ ہو گا کہ وہاں ان کے غول کے غول نہ ہوں، علاوہ ہمیں نواح لکھنؤ اور اطراف دکن اور اضلاع سندھ میں باوجود کثرت کے تسلط بھی انہیں کا ہے یہاں تک کہ اسی باعث سے شیعہ کو ہندوستان میں کمال درجہ کو شیوع حاصل ہوا، ہزاروں عالم شیعہ مذہب موجود، پر حافظ نام کوئی دیکھا نہ سنا اور کسی کے ذمہ اگر شیعوں نے حفظ قرآن کی تہمت لگا بھی دی تو اسے یوں ہی کہتے ہوئے سنا کہ یاد تو تھا پھر آج کل کچھ بچا ہو گیا ہوا اسلئے فی الحال سنائے معذور ہوں۔ اور جو سنائے پر آئیں بھی تو ایک ایک سیارہ کے سنائے پر آتے ہیں، یہ نہیں کہ ایک جلسہ میں یا دو جلسہ میں پڑھ کر ادھر سے ادھر کر دیں۔

شیعوں کے حافظانہ ہونے کا واقعات ثبوت | منجملہ حفاظ شیعہ مولوی جعفر علی صاحب پیش امام دہلی جو دربار و تقوایہ و علم و فضل میں مجتہد زمانہ نہیں تو مجتہد ثانی تو بیشک شبہ ہیں ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں خود سے پہلے بچشم خود اس احقر نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خاں کی مسجد میں ہوا کرتا تھا۔ مثل دیگر حضار شیعہ مذہب حامل میں

دیکھ دیکھ کر پڑھتے تھے۔ تیسرے بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے۔ اور خداوند کریم کی حق نمایاں دیکھئے کہ اسی جلسہ میں حفاظ اہل سنت جو بطور سیر آجاتے تھے اور اہل تشیع دہ کران کو بھی پڑھنے کے لئے کہتے۔ تو وہ بزبان ہی پڑھتے تھے۔ مگر تاہم دیدہ عبرت شیعہ کشادہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک شخص سنی المذہب مولوی حافظ عبدالعزیز نام ساکن نجیب آباد کہتے تھے کہ میں کچھ کتب درسیہ میں سے مولوی جعفر علی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ اتفاقاً کچھ اس کا مذکور آگیا کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا، شکر فرمانے لگے کہ تم سنو گے؟ میں نے عرض کیا کیا مضائقہ ہے، اگر ایک جلسہ میں ہو، یا یوں کہا کہ زیادہ زیادہ پڑھئے تو کیا مضائقہ ہے، مگر پھر مولوی صاحب کہاں تھے۔ بحر اس کے نہ بن پڑی کہ ایک ایک سیپارہ ہر روز سن لیا کرو، جائے غور ہو کہ ایک ایک سیپارہ روز تو بعضے بعضے بندگان خدا از سر نو یاد کر سکتے ہیں؟ وہ حافظ ہی کیا ہوا کہ جس نے ایک جلسہ میں کلام اللہ نہ پڑھ لیا، اور میں جالوں کہ مولوی صاحب سے ایک ایک سیپارہ بھی نہ سنایا جاتا، یہ بھی ایک مہم تھی، مولوی عبدالعزیز صاحب مذکور یوں سمجھ کر کہ شاید اب یاد کر کر سنادیں اور پھر یاد نہ رہے، اتنی بات میں سر دست میرا دعویٰ تو غلط ہو جائے گا یاد چار سیپارہ ان کو یاد ہوں اور ان کو جو توں سنا کر پھر کچھ حیلے بہانے لے دیں، اور ان کو کہنے کو جگہ ہو جائے اس بات پر پکے نہ ہوئے اور نیز یہ بھی مرکوز خاطر ہو گا کہ سب پر عیاں ہو جائے کہ مولوی صاحب کو یاد نہیں، ان کا حافظ کہنا ایک حرف غلط ہے کہ منجملہ اور دروغوں کے زبان زد شیعہ ہو گیا، اور اگر مراد کر ایک ہونے بالفرض بغرض محال کچا پکا یاد بھی کر لیا، تو غیرت مندان شیعہ کے لئے تو یہی بات ڈوب مرنیکو بہت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک ایک شہر بلکہ بعضے بعضے ایک قصبہ میں اہل سنت میں سو سو بلکہ زیادہ زیادہ حافظ ہوتے ہیں اور طرفہ یہ کہ بعضے بعضے قصبات میں اہل سنت ہی کے برابر شیعہ ہوتے ہیں، لیکن اہل سنت میں سینکڑوں حافظ ہوتے چلے جاتے ہیں اور شیعوں میں ایک بھی نہیں ہوتا، چنانچہ سہارنپور اور پانی پت اور کراچی میں یہی حال ہے اور وجہ اس یاد نہ ہونے کی (حالانکہ متقضاء طعن اہل سنت یہ تھا کہ کلام اللہ چھوڑ شیعہ تفسیر کبیر بھی یاد کر لیتے، یہی بات ہے کہ جیسا تلاوت کا حق ہوتا ہے ان کو میسر نہیں آتا۔

شیعہ ادائیگی جن تلامذات سے کیوں محروم ہیں | اور باعث اس کا واللہ علم یا تو یہ ہے کہ طبائع انسانی و حیوانی شیعوں کو کلام اللہ سے طبعی لگاؤ نہیں | باعتبار غذا کے جیسے مختلف ہیں کہ کسی کو میٹھا بھاتا ہے۔ کسی کو نمکین

کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ کسی کو نفرت۔ اگر نیکوں کو عطر نفیس سے متنفر اور پھلی کے اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں رغبت پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خورم و شاد و عیش و آرام سے رہیں اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں۔ ایسے ہی باعتبار امور دینی کے جو غذا ارواح ہیں۔ ارواح بنی آدم مختلف ہیں کسی کو رغبت ہے کسی کو نفرت، کسی کو لذت آتی ہے کسی کی جان نکل جاتی ہے۔ سو حضرات شیعہ کو بھی کلام اللہ پر محنت کرتے موت نظر آتی ہے شیعہ اپنے اساتذہ کے حق میں گستاخ اور بے ادب ہیں اور یہ ہے کہ جو شاگرد استاد کی خدمت میں گستاخ

ہوتا ہے عادت الہی یوں جاری ہے کہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتا، وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ شکر پر وعدہ مزید نعمت ہے چنانچہ فرمایا ہے لَنْ شُكْرُكُمْ لَا يَبْلُغَ نِكْمًا یعنی اگر شکر کر دگے تو البتہ ہم اور زیادہ دیں گے۔

تو اس صورت میں بے شہادت عقل کفران پر زوال نعمت متفرع ہونا چاہیے ادھر حدیث میں ہے مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ یعنی جو کوئی آدمیوں کا شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا بھی شکر نہ کرے گا، اور ظاہر ہے کہ ہر چند منعم حقیقی خداوند کریم ہے پر دولت علم بواسطہ استاد ہی حاصل ہوتی ہے اور نعمت عظمیٰ کلام اللہ کے استاد حضرات صحابہ ہیں جنہیں سے خلیفہ اہل اور ثالث کو تو بوجہ تالیف مصنف مجازی کہئے تو بجا ہے پھر ان گستاخوں کو یہ نعمت عظمیٰ عطا ہو کیوں کر۔؟

تلاوت کا حق ادا کرنے والوں کے سیرہ مگر جیسے اشارہ خداوندی ہے نہ کہ تذکرہ معلوم ہوا یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایمان بھی حصر ایمانی میں شامل ہیں

حق تلاوت ہے وہ بجالاتے ہیں تو یہ نسبت ان لوگوں کے ہے جو کلام اللہ کی تلاوت میں تو مقصر ہیں اور باہمہ اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرتے ہیں، یا ان لوگوں کے حق میں جو ان کے اتباع و توالع میں اور مطلق کم پڑھنے والوں یا بالکل نہ پڑھنے والوں کی نسبت حصر نہیں کیونکہ وجہ اس حصر کی ان لوگوں میں جو حق تلاوت ادا کریں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جو کسی کتاب کو کثرت سے دیکھے بھالے گا وہی اس کو خوب سمجھے گا اور اس کی حقیقت کو پہنچے گا۔ اور کتاب اللہ پر ایمان اسی کا نام ہے کہ اس کے احکام اور مضامین کو حق سمجھے جو لوگ ان لوگوں کے متبع ہوں گے کہ وہ جیسا تلاوت کا حق ہے تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے اس کی اہل حقیقت کو پہنچ گئے ہیں اور ان کے تملانے موافق عمل کریں گے وہ بھی ایمان سے محروم نہ ہوں گے اور فرقہ مشاریعہ بلفظ و متن تکفیر میں داخل نہ ہوں گے، ہاں جو

شخص اس کی تلاوت میں مقصر رہا اور بے تقلید کسی اور کے اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تو ایسی محنت والے تو قانون انگریزی میں بھی بہکتے ہیں، جس میں چنداں دقائق نہیں ہوتے، کلام اللہ کو جو مخزن تمام علوم اور مجموعہ جملہ دقائق ہے کیا خاک سمجھیں گے بلکہ بالیقین کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے، سو ایسے لوگ جو کتاب اللہ کچھ کہے اور وہ کچھ کہیں، گو اپنے عندیہ میں کتاب اللہ پر ایمان رکھتے ہوں کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور ان پر یہ قول خداوندی سر ایا مطابق ہو ومن یكفر به فاولئک هم الخاسرون یعنی جو لوگ کتاب اللہ پر ایمان نہ لائے۔ سو وہی ٹوٹے میں ہیں اور اس آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے یُضِلُّ بِهِ کَثِیرًا یعنی خدا تعالیٰ اس قرآن سے بہت لوگوں کو بہکا بھی دے ہے۔ آیت کے شان نزول سے بیان مذکور کی شہادت اور اس تقریر کی صحت کا موید قطع نظر اس کے کہ ظاہر ہے ایک یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جو کتاب اللہ کو خوب تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامتیں جو اس کتاب میں تھیں خوب یاد ہو گئی تھیں اور انکے مطالب کے سبب ان کے ذہن نشین ہو گئے تھے اسی سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ ہی ہیں ہر طرح کی ان اوصاف کو آپ مطابقت پایا اس میں اختلاف ہے کہ کتاب کو کسی بھی تورات یا انجیل اور وہ لوگ ان پر یہودی یا نصاریٰ ادائیگی حق تلاوت میں سستی اور شیعہ فرقوں میں کثرت کا لحاظ بایں ہمہ یہ بھی اہل فہم پر روشن ہے کہ ہدیت مجموعی کی

رو سے تمام فرقہ اہلسنت اور علیٰ ہذا القیاس تمام فرقہ شیعہ ایک گنا جاتا ہے۔ سو ہدیت مجموعی اہلسنت کو جدا لحاظ کیجئے اور ہدیت مجموعی شیعہ جدا پیش نظر رکھئے۔ اور دیکھئے کہ اس فرقہ میں کثرت تلاوت اور تلاوت کا جیسا حق ہے پائی جاتی ہے یا فرقہ شیعہ میں اور ہدیت مجموعی کی رو سے سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے ایک کی بات سب کی طرف منسوب ہوتی ہے تھوڑی ہے تھوڑی اور بہت ہے تو بہت ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کے احوال کو تمام عالم مجموعہ کی طرف یعنی اپنی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہاتھ میں کچھ تکلیف ہو تو یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوں، یا قلنا بیمار ہے، علیٰ ہذا القیاس، میں نے کسی کو مارا یا جھکو کسی نے مارا یا میں نے کسی کو دیکھا یا جھکو کسی نے دیکھا یہ ساری اضافیتیں چیز کی کل کی طرف باعتبار مجموعہ کے ہوتی ہیں، یعنی مجموعہ کو ایک سمجھ کر جز کے حال کو کل کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

معند الا اکثر حکم الكل سب ہی کا سنا ہو اجملہ اور سب ہی کے نزدیک مستم ہے اکثر کی بات و صفات کل ہی طرف منسوب ہوتی ہے سو اکثر دینداران اہلسنت بکثرت تلاوت میں مشغول ہوتے ہیں بخلاف شیعہ کہ ان کا حال

خود عیاں ہے۔

شیعوں کی ایک گریڈ اور اس کا اسناد اس تقریر کے بعد شاید فاضلان شیعہ اپنے بچاؤ کی یہ سبیل کریں، کہ حق تلاوت کے ہمارے نزدیک یہ معنی ہیں کہ خشوع و خضوع و حضور قلب تدبیر آیات تلاوت کی جائے۔ سو اس بات کی سنیں میں ہونے کی اور شیعوں میں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے اس لئے بندہ کمترین بھی بطور پیش بندی یہ گزارش کرتا ہے کہ موافق مثل مشہور ہمارا ادھر بھی لکھا ہے اس بات کے تسلیم سے بھی ہمیں انکار نہیں کیونکہ خشوع و خضوع کا باعث بجز حسن عقیدہ یا کثرت تلاوت بہ نسبت کلام اللہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ حسن عقیدت کا باعث خشوع و خضوع ہونا تو ظاہر ہے یہی کثرت تلاوت سو اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر بنی آدم خدا سے غافل دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ساعت دو ساعت کے ذکر یا تلاوت سے ان کی غفلت اور رغبت زائل نہیں ہوتی، ہاں تھوڑے دراز تک اگر ذکر کی مشق کیجئے تو مثل اور کاموں کے البتہ بعد دیر یادداشت اور حضور کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اس وقت خشوع و خضوع آپ پیدا ہو جائے گا مگر ان فرقوں کو ذکر کرنے والے اور تلاوت کرنے والے ہی جانیں تو جانیں شیعہ کیا جانیں؟

اہل سنت کو کلام اللہ سے حسن عقیدت شیعوں کو نہیں | خیر غرض یہ ہے کہ باعث خشوع و خضوع یا حسن عقیدت یا کثرت تلاوت، بلکہ دونوں مل کر باعث حصول خشوع و خضوع ہوتے ہیں۔ سو حسن عقیدت کا ان لوگوں کے دلوں میں ہونا معلوم جو کلام ربانی کو میاں عثمانی سمجھتے ہوں ہاں اہلسنت کے لئے جو کلام اللہ کو بلا کم و کاست و تغیر و تبدل حرماً حرفاً بجہ کلام اللہ منزل سمجھتے ہیں، قہراً کہتے تھوڑا ہے معہذا موافق نقل عربی **الْإِنشَاءُ يُؤْتِي شَيْئاً فِيهِ** یعنی برتن میں سے وہی چیز چھلک کر نکلے گی جو اس کے اندر ہوگی۔ احوال شیعوں اور سنیوں کو مطابق کر کے دیکھ لیجئے کس کو اس کلام سے زیادہ اعتقاد ہے اہلسنت کا حال تو ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ حزر جان سمجھتے ہیں اور جہاں شیعہ جزدانوں اور مکانوں میں رکھتے ہیں سنی بوجہ محبت سینوں میں اور جانوں میں رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ کی تعلیم و تعلم سے زیادہ اور کسی چیز کی تعلیم و تعلم کا اہتمام نہیں۔ سب میں پہلے بچوں کو کلام اللہ ہی پڑھاتے ہیں اور تمام مقدور حفظ ہی کرتے ہیں، کلام اللہ کے سامنے کسی کی نہیں سنتے یہاں تک کہ احادیث کو بھی اس پر مطابق کر کے دیکھتے ہیں اگر موافق نکلی تو فیہا ورنہ موافق مثل مشہور کالائے زبور پریش

خاوند اس کو راویوں کے سمراتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ راوی کا قصور ہے القصد عقل و نقل کی کسوٹی اور دین و دنیا میں امام سمجھے ہیں چنانچہ سب جانتے ہیں۔ باقی ہے حضرات شیعہ ان کی بے اعتقادی بھی اسی درجہ کی ہے اور کیونکر نہ ہو، علامہ کلینی اپنی کتاب کافی میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے، وہ روایتیں رقم فرماتے ہیں کہ جن کے دیکھنے سے کلام اللہ کی طرف سے نعوذ باللہ بالکل جی ٹھنڈا ہو جاتا ہے شائقین کی نظر سے انشاء اللہ جلد ہی گذرتی ہیں

شیعوں کی نظر میں کلام اللہ کی حیرت ناک وقعتی | بالجمہ کلام اللہ کی بے اعتباری تورات و انجیل کی بے اعتباری سے بھی چند نمبر زیادہ ہر ناظرین روایات مشار الیہا انشاء اللہ اس قول کو آپ تسلیم کریں گے غرض تو یہ یہاں تک پہنچی ہے کہ کلام ربانی کا نام ہی ان کی اصطلاح میں بیاض عثمانی ہو گیا ہے۔ اور اپنے آپ بے کہے سنے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ منجملہ نقلین کلام اللہ کے ساتھ تو ہمیں تمسک مقدر نہیں اور تلاوت کلام ربانی کے انداز اور مجلس مرثیہ و کتاب خوانی کی تعظیم و توقیر کے موازنہ سے خود ظاہر ہے کہ شیعوں کے دل میں کلام اللہ کی مرثیوں کے برابر ہی قدر و منزلت نہیں گزربان سے نہ کہیں ورنہ اس کے کیا معنی کہ کلام اللہ کے پڑھنے والے کو بھی حقہ پی لینے میں کچھ دریغ نہ ہو اور محفل مرثیہ و کتاب میں کیا مقدور جو کوئی حقہ کی طرف دیکھ بھی سکے، بہر حال اکثر شیعہ اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ کی عظمت ان کے دلوں میں چنداں نہیں گواقل قلیل اہل سنت میں بھی ایسے ہوں کہ ان کا حال ان کے قال کے موافق نہ ہو مگر یہی کثرت تلاوت اس کے کہنے کی کچھ حاجت نہیں یہ تو شیعوں کے اقرار سے بھی بفضلہ تعالیٰ نصیب اہلسنت ہی ہوا ہے۔

حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے میں شیعہ کی مطلبیاری | القصہ اگر علماء شیعہ حق تلاوت کو بمعنی خشوع و خضوع رکھیں تو ہمیں تو کچھ انکار نہیں کیونکہ خشوع اور نہ یہ احتمال آیت شریفہ پر چسپاں ہوتا ہے

و خضوع بھی اگر ہے تو اہل سنت ہی میں ہے پر اس کو کیا کیجئے کہ نظم و نسق کلام اللہ اسی طرف ہے بلکہ حق تلاوت سے کثرت تلاوت ہی مراد ہے کیونکہ اول تو حق تلاوت میں لفظ مفعول مطلق ہے اور مفعول مطلق سب جانتے ہیں کہ بمعنی فعل مذکور یا اس کے اقسام میں سے ہوتا ہے سو کثرت تلاوت تو بیشک اقسام تلاوت میں سے ہے پر خشوع و خضوع داخل تلاوت نہیں بلکہ امور خارجہ میں سے ہے، کون نہیں جانتا کہ تلاوت زبان کا کام ہے اور خشوع و خضوع دل کے احوال میں سے ہے اور یہ بھی نہ ہی اذکر

يُؤْمِنُونَ بِهِ كَمَا الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ بِمُحْمَلٍ كَمَا اس بات کو مقتضی ہے کہ ایمان تلاوت موصوف پر متفرع ہو
چنانچہ جو لوگ فنون بلاغت سے آشنا ہیں وہ اس بات سے بھی آشنا ہیں اور اسی واسطے یومنون بصیغہ
استقبال فرمایا آمنوا نہ فرمایا۔

حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے کی طرف یہ ہے کہ در صورتے کہ حق تلاوت بمعنی خشوع و خضوع ہو
صوت میں ترتیب معانی کا الٹ جانا معاملہ برعکس ہو جائے گا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایمان سے
یا تو معنی مشہور مراد لیجئے یا بمعنی کمال انقیاد و تسلیم جسے ایمان کامل کہتے ہیں رکھئے یا تصدیق معانی
مقصودہ جو مراد خداوندی ہو قرار دیجئے سو ہر صورت معاملہ برعکس ہے ایمان بمعنی مشہور یعنی تصدیق لا الہ
الا اللہ محمد رسول اللہ کا خضوع و خشوع سے پہلے ہونا تو کسی پر مخفی ہی نہیں سمجھتے ہیں کہ ایمان ہی
سے بقدر ایمان خضوع و خشوع پیدا ہوتا ہے نہ کہ برعکس۔ رہا ایمان بمعنی کمال انقیاد سو وہ بھی اسی طرح خضوع
و خشوع تلاوت سے مقدم ہے کیونکہ وہ سبب ہے اور یہ مسبب مہذا آیت

الَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّخِذُوا قُلُوبَهُمْ بذكرِ اللَّهِ إِلا
بذكرِ اللَّهِ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوبُ۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں انکے دل
اللہ کی یاد سے سُن لو اللہ کی یاد ہی سو چین پاتے ہیں

بھی اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان کامل باعث کثرت ذکر اور موجب حصول اطمینان قلب جو عین توجہ الی اللہ
اور حضور قلب ہے ہوتا ہے کیونکہ اطمینان قلب کا حاصل ہونا بجز نفوس مطمئنہ کے جو کامل الایمان ہوتے
ہیں متصور نہیں چنانچہ بدیہی ہے باقی رہا ایمان بمعنی تصدیق و علم مراد خداوندی سو وہ بھی بشہاد آیت
اِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ
تَفِئُضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ۔ اور جب سنتے ہیں اس کو جو اتر رسول پر تو دیکھے
تو ان کی آنکھوں کو ابلتی ہیں آنسوؤں کے اس وجہ
سے کہ انہوں نے پہچان حق بات کو۔

حال خضوع سے جو اس آیت میں لفظ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِئُضُ مِنَ الدَّمْعِ مذکور ہے مقدم ہے
وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جب نہیں وہ لوگ کہ جن کا اوپر ذکر ہے اس کلام کو جو رسول
پر نازل کی گئی ہے تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو کہ آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں بسبب اس کے کہ جان لیا
انہوں نے حق بات کو۔ سو اس سے یہ بات صاف روشن ہے کہ انہوں نے کلام اللہ کو شکر مضامین حق
دریافت کئے اس سبب ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسوؤں کا تار بندھ گیا ہے یعنی بسبب حق کے دریافت

ہو جانے کے انکے دلوں میں خشوع و خضوع پیدا ہو گیا، نہ یہ کہ رونے اور خشوع و خضوع کے باعث ان کو حق بات معلوم ہو گئی ہو غرض در صورتے کہ حق تلاوت بمعنی خشوع و خضوع ہو تو بہر طور ترتیب بالعکس ہوتی جاتی ہے۔

حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد لینے کی صوت | ہاں اگر حق تلاوت کثرت تلاوت مراد ہو، تو تینوں صوتوں میں ترتیب معانی کا ٹھیک اور درست رہنا

میں ترتیب بطور خود رہے گی۔ کیونکہ بے ایمانوں اور

ضعیف الایمانوں کو تو کثرت تلاوت موجب آگاہی حقائق و دقائق کلام ربانی ہی ہوتی ہے اور باعث ہدایت اور رفع شکوک اور سبب حسن عقیدت جو عین ایمان ہے ہو جاتی ہے۔ سو اگر ایمان سے بمعنی مشہور

مراد ہو تو بایں طور کثرت تلاوت باعث حصول ایمان ہے اور اگر کمال ایمان مراد ہے تب بھی یہی بات ہے۔ کیونکہ کثرت تلاوت سے دم بدم غفلت زائل ہوتی جاتی ہے اور لمحہ بلمحہ ملکہ یادداشت اور حضور

قلب سے پیچڑتا ہے اور صفا آئینہ قلب کی زیارتی اور انوار تجلیات کے ہجوم کا باعث ہو جاتی ہے اس وجہ سے تصدیق قلبی محکم اور محکم ہو جاتی ہے اور کمال انقیاد پیدا ہوتا ہے، باقی بے ایمان بمعنی علم مراد خداوندی سو اس کا

کثرت تلاوت پر متفرع اور مرتب ہونا تو سب ہی پر ظاہر ہے، کون نہیں جانتا کہ ایک کتاب کا کثرت سے مطالعہ کرنے والا اس کے مطلب کو بہ نسبت ان لوگوں کے جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اکثر صحیح ہی سمجھتا ہے

آیت مذکورہ میں ایک شبہ اور اس کا ازالہ | اب ایک شبہ باقی ہوا یہ ہے کہ آیت الذین آمنوا وکملوا ایمانہم سے ایمان کا تلاوت

موصوف پر متفرع ہونا ہر خیر ظاہر ہے چنانچہ مبتدیان کو بقید مذکور مقید کرنا اور اذکیک یؤمنون بہ کا اس پر محمول کرنا اور یؤمنون کہنا اور آمنون کہنا سب اسی طرف مشیر ہیں مگر احتمال یہ بھی تو ہے

کہ بطور معلوم تلاوت کرنا ایمان کی فقط علامت ہو۔ اور ترتیب اور تفرع کا کچھ لحاظ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ بعضی اشیاء کی علامتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ان اشیاء ہی کے سبب پیدا ہوتی ہیں جیسے دھواں

دوسے جہاں سے آگ نظر نہ آتی ہو، آگ کی علامت ہے اور اسپرگ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا وجود آگ کے وجود کی فرع ہے آگ کا وجود اس کے وجود کی فرع نہیں۔ سو ایسے ہی اگر تلاوت موصوف، ایمان

کی علامت بھی ہو اور پھر ایمان ہی سے پیدا بھی ہوتی ہو اور بغرض بیان علامت ہی جناب باری کی یہ فرمایا ہو تو کیا ہرج ہے، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عمدہ توجیہ کو چھوڑ کر ایسے احتمال ضعیف کو لینا اول تو یہی دلیل

کم فہی ہی خصوصاً خدا کے کلام میں کہ اس میں بالاتفاق اگر ہوگی تو عمدہ توجیہ مراد خداوندی ہوگی دوسرے

مستَحْضًا لیکن اس کا کیا جواب کہ بیان علامت سے تو غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ شے جس کی یہ علامت متمیز اور متبیین ہو جائے، سو جب تک علامت خود متمیز اور متبیین نہ ہوگی تب تک یہ علامت بیکار ہے خدا کے کلام میں یہودہ بیکار باتوں کا ہونا منجملہ محالات ہے، اور چونکہ خشوع و خضوع امر مخفی ہے اس کو علامت ایمان مقرر کرنا تعریف مجہول بالمجہول اور تشریح مخفی بالمخفی کی قسم میں سے ہے البتہ کثرت تلاوت ایک امر محسوس ہے اس کو اگر علامت کہیے تو زیبا ہے اور پھر قطع نظر اس کے مفید ترتیب مذکور معہذا خضوع و خشوع کو باعتبار عادت کے مستلزم، چنانچہ مذکور ہوا۔ سو اس صورت میں علامت ہونا بھی صحیح ہو گیا اور خضوع و خشوع کی طرف بھی اشارہ ہو گیا اور ترتیب و تفریع بھی ہاتھ سے نہ گئی اور حق تلاوت کا مفعول مطلق ہونا بھی صحیح و درست رہا اور کسی طرح کی تکلیف کی ضرورت نہ پڑی،

آیت مذکورہ کے ذیل میں ایک اور فائدہ | جب اس شیعہ کی تردید سے فراغت پائی تو ایک اور فائدہ گوش گزار اہل فہم پر وہ یہ ہے کہ قیداً یُنْتَهِمُ سے یوں خیال میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو کتاب نہیں دی گئی یعنی اس کو مانتے ہی نہیں، چہ جائیکہ مانکر غلط سمجھ جانا، ان لوگوں میں اگر کوئی حافظ ہو جائے تو مضائقہ نہیں، یا یوں کہیے کہ اس کو ایسی تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں میسر آجائے تو آجائے، پر ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب ملی ہے یعنی انہوں نے انکو تسلیم کیا، کثرت تلاوت وہاں ہوگی جہاں حق ہی حق ہو گا کچھ کبھی نہ ہوگی کیونکہ کثرت تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں، علامت ایمان ہے تو فقط انہی کی نسبت ہی جو اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں، نہ کہ ہر کسی کے حق میں، اس صورت میں یہ جو مشہور ہے کہ برنس نصرانی کو کلام اللہ یاد تھا۔ کیا عجیب ہے کہ صحیح ہوئے ہر حال بعلامت یَتْلُوْنَ فُحْوَ تِلَاوَتِہِ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بشارت اُولَئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بہ فرقہ اہلسنت کے لئے ہے اور حضرات ردافض منجملہ وَ مَنْ یَکْفُرْ بِہِ فَاُولَئِکَ ہُمُ الْخَاسِرُوْنَ ہیں جس کے یہ معنی ہیں اور جو لوگ کتاب اللہ سے پھر گئے۔ سو وہی ٹوٹے میں ہیں۔ اس ایک آیت کی طرح اور بھی آیت قرآنیہ مذہب اہلسنت کو حق اور اب التماس یہ ہے کہ سو آیت مذکورہ آیات کثیرہ مذہب یسکوا بطل قرار دیتی ہیں بغرض اجمال قرآنیک پر اکتفا کی گئی۔ حقیقت مذہب اہل سنت، اور بطلان مذہب

شیعہ پر دلالت کرتی ہیں۔ اور کیونکہ دلالت ذکر میں جس قدر عقائد مخصوصہ مذہب شیعہ اور فروع خاصہ مذہب مذکور ہیں، بتماہما مخالف کلام اللہ ہیں۔ اور مذہب اہلسنت ملایا کلام اللہ پر مطابق، اور وجہ اس کی یہی ہے کہ بسبب تلاوت کے حق ادا کرنے کے اہلسنت تو مغز سخن ربانی کو پہنچے اور شیعہ بسبب

اس کے کہ کثرت تلاوت بوجہ مذکورہ ان کو میسر نہ آئی، دقائق کلام اللہ کو نہ سمجھے مگر چونکہ آیت مذکورہ کے ذکر کرنے سے یہ نکتہ معلوم ہو گیا۔ تو اہل عقل بالا جمال سمجھ جائیں گے کہ بیشک آیات ربانی مخالف مذہب شیعہ ہوں گی اور مذہب اہل سنت تمام ہمارا موافق قرآن مجید، تو قطع نظر اس کے کہ آیت مذکورہ حقیقت مذہب اہلسنت بطلان مذہب شیعہ پر جداگانہ بھی دلالت رکھتی ہے چنانچہ ملاحظہ فرما کر بالاسود واضح ہو جائیگا اور آیات کے حوالہ سے بھی حقیقت مذہب اہلسنت اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہے چونکہ اس وجہ سے یہ آیت اور آیات کی بھی نیابت کرتی ہے تو اس کو کیا بیان کیا گیا یا سب کو بیان کر دیا اس وجہ سے اور آیات کے بیان سے مقصود ہوں معہذا اگر تمام آیات مخالف مذہب شیعہ کو لیجئے تو ایک دفعہ ہمیں جو سہل ہو بکثرت بلکہ اکثر آیات کلام اللہ عقائد و احکام و اصول و فروع مذہب شیعہ کو رد کرتی ہیں اور مذہب اہلسنت کی حقیقت اور حقانیت پر شاہد ہیں، اس رسالہ مختصر میں سب کی گنجائش کہاں؟ خصوصاً جبکہ بقدر فہم انکی شرح بھی کیجئے اور ان کے اہلسنت کی حقانیت اور ان کے مذہب کی حقیقت اور اہل شیعہ کے مذہب کے بطلان پر استدلال بھی لائیے۔

استدلال آیت مذکورہ پر شیعوں کی طرف سے ایک پھر شک و شبہ | لہذا ایک ہی آیت پر کہ وہ ایک سب کے قائم مقام اور مفید خاص و عام ہے اکتفا کر کے اس قدر اور گزارش کرتا ہوں کہ شاید کسی شیعہ مذہب کو اس آیت کی ہدایت کو شکر بسبب کجی طبیعت اور ضلالت طبع زاد اور تعصب و یہ شبہ ہو کہ یہ آیت ہے تو کیا ہوا ایک جملہ قرآنی ہے سو قرآن کا لغو و باللہ منہ کیا اعتبار ہمارے اعتقاد کے موافق کی کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ بیشی اور افزائش اور تبدیلی الفاظ بھی ظہور میں آئی ہے۔ پھر عجیب نہیں کہ یہ آیت بھی منجملہ الحاقات اہل سنت ہووے

شبہ کا ایک پہلو سے جواب | سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مذہب محققین شیعہ اس بات میں یا تو یہ ہے کہ کلام اللہ میں نہ کمی ہوئی نہ بیشی چنانچہ استاد علامہ کلینی حضرت صدوق اس کے قائل ہیں یہاں ہے کہ کمی تو ہوتی ہے زیادتی نہیں ہوتی بغرض زیادتی کا نہ ہونا اجماعی۔ اور آیت مرقومہ سے انکار نہیں ہو سکتا مگر یہ چونکہ دونوں مذہب مخالف مرویات کلینی ہیں جو اصح الکتاب شیعہ ہے۔ اور نیز وہیں نشین اکثر شیعہ بھی یہی ہے کہ کلام اللہ میں کمی زیادتی دونوں ہوتی ہیں۔ اور ہمارے بعض مطالب مذکور بھی اسی پر مبنی ہیں اس جواب پر فضاوت نہیں ہو سکتی۔

شبہ کا دوسرا پہلو سے جواب | اس لئے دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اور شیعوں کے مذہب کے بطلان

ہی کی دلیل ہے۔ بحمد اللہ باقر شیعہ اتنا تو معلوم ہوا کہ مذہب شیعہ کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ ماخذ احکام دین سب میں اول کلام اللہ ہی تھا جب اس کا اعتبار نہیں تو جو بایں شیعہ بزعم خود کلام اللہ سے ثابت کرتے ہیں اگر بضر محال ثابت بھی ہو جائیں تو بدرجہ اولیٰ قابل اعتبار نہ ہوں گی۔

کلام اللہ پر بے اعتباری ظاہر کرنا خود اپنے خیال کی بیخ کنی ہے | معہذا تعلیل جو متفق علیہ طرفین ہیں اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ اور عترت دونوں کے ساتھ تمسک ہے گا تو گمراہی پیش نہ آئے گی۔ پھر جب کلام اللہ سے جو موافق حدیث مذکور دونوں میں اعظم ہو تمسک میسر نہیں تو بہ شہادت عقل سلیم ہدایت بھی نہیں سراپا گمراہی ہے۔ غرض حضرات شیعہ اگر یہ احتمال پیش کریں تو یہ تو اور الٹے اپنے ہی پاؤں میں تیش مارتا ہے۔

کلام اللہ پر سے اعتبار اٹھ جانا احادیث پر سے اعتبار کو پہلے کھڑتا ہی | ادھر بالبدلت اور بالاجماع کسی فرقے کی کوئی حدیث اس درجے کو شائع و ذائع نہیں ہوتی جس درجے کو کلام اللہ شائع ذائع ہوا ہے اور نہ اس طرح سے کسی حدیث کے سائے راوی اس کی روایت میں متفق اللفظ پھر جب کلام اللہ کا اعتبار نہیں اس کا کاہے کو ہو گا۔ پھر جس میں راویان احادیث شیعہ کے احوال کو اور ان احادیث کے تعارض کو دیکھے تو بے اعتباری میں نہایت ہی کو پہنچ جائیں گی۔ بہر حال اگر یہ مشہور علماء شیعہ پیش کریں اور اکثر مواقع میں پیش کرتے ہیں تو ہمارے لئے بہت تخفیف تصدیق ہے۔

ع۔ عدد شود سبب خیر گر خدا خواہد

کلام اللہ میں کمی و بیشی کا خیال تلاوت اور حفظ قرآن کا خاتمہ کر دیتا ہی | معہذا شیعوں ہی کے اقرار سے ہمارا وہ دعوائے جو تقریر شریع آیت مسطورہ میں گنہگار ہے۔ خدا ساز ثابت ہو گیا کیونکہ جب قرآن میں اس درجہ کی و بیشی ہے تو پھر جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن ہی نہ ہوا۔ اب اگر شیعہ اسے یاد بھی کر لیں۔ اور تلاوت کا جیسا حق ہے ویسی طرح تلاوت کریں تب بھی فی الواقع تلاوت قرآن اور حفظ قرآن نہ ہو گا حضرات اہل بیت کا اہل قرآن میں کمی و بیشی کے خیال کو لغو ثابت کرتا ہے | دوسرے تمام روایات امامیہ میں موجود کہ تمام اہلیت اسی قرآن کو پڑھتے تھے اور اسی کے عام و خاص سے تمسک کرتے تھے اور بطور استدلال اسی قرآن کی آیات کو پیش کرتے تھے اور اسی کی آیات کی تفسیر کرتے تھے اور حضرت امام حسن عسکری کی طرف جو تفسیر منسوب ہے تو اسی قرآن کی ہے لفظاً لفظاً اور اہل بیت اپنے لڑکوں اور باندیوں اور خادموں اور

اہل و عیال کو یہی قرآن تعلیم فرماتے تھے۔ اور اسی قرآن کے پڑھنے کا نمازوں میں حکم فرماتے تھے
 قرآن کا حدودہ شائع ہونا خود اس میں کمی و بیشی کے خیال پر فرک پڑی لگتا ہے | معہذا قرآن مجید کا موافق نزول کے
 لوگوں کو پہنچانا اور ان کو سکھانا باجماع امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ فرض تھا اور یقیناً
 معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو کوئی مشرف باسلام ہوتا تھا، اول کلام اللہ
 سیکھتا تھا۔ بعد ازاں لوگوں کے سکھانے میں مشغول ہوتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سا
 ہی ہزاروں نے کلام اللہ سیکھ لیا تھا، چنانچہ بعضے بعضے غزوات میں ستر ستر حافظ شہید ہوئے ہیں
 بعد ازاں آج تک تمام اطراف میں یہاں تک کہ دیہات میں اہل اسلام کلام اللہ کی تلاوت کو سب
 عبادتوں میں بڑھ کر سمجھتے ہیں اور رات دن نماز میں اور نماز سے باہر کلام اللہ کے پڑھنے میں مشغول رہتے
 ہیں۔ اور ہر لڑکے کو اول جو مکتب میں بٹھلاتے ہیں تو سب سے پہلے کلام اللہ ہی یاد کرانا شروع کراتے
 ہیں۔ بالجماعہ قرآن مجید مثل کلینی و تہذیب نہیں کہ براہ یقینہ کسی کو نئے میں صندوق میں مقفل بند رہے کبھی
 تہمتی میں ڈرتے ڈرتے کہ مبادا کوئی سستی نہ آجائے ایک دو صفحہ مطالعہ کر لیا اور پسرایے کثیر الوجود کہ
 ہر شہر و دیار میں سینکڑوں ہزاروں ہیں۔ کلینی و تہذیب کو ہندوستان میں تلاش کیجئے تو کہیں کہیں نکلے
 گی علیٰ هذا القیاس ایران میں سمجھئے کیونکہ اول تو رعایا سلطانی میں اہل سنت بکثرت ہیں سنا تو یوں ہے
 کہ شیعوں سے زیادہ ہوں۔ آئندہ خدا جانے، اور شیعوں میں سے بھی کلینی و تہذیب نہ ہر کسی کے کام
 کی نہ ہر کوئی اسے سمجھے جو خواہ مخواہ بہم ہی پہنچائے، باقی سوان کے اور ممالک میں کلینی و تہذیب کا پتہ تو کیا
 ملے نام بھی کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ با اینہم اگر ایک دو نسخہ کہیں مل بھی جائے تو بیشتر غلط ملتے ہیں، صحیح تو
 قسمت ہی ملتا ہے بخلاف کلام اللہ کے ہر دیار میں بکثرت موجود۔ یہاں تک کہ کوئی کتاب کسی مذہب کی ہو
 یا کسی علم عقلی کی ایسی کثیر الوجود نہیں پھر عام و خاص کو اس کی ضرورت ایک ایک گھر میں متعدد کلام اللہ
 رکھے ہوئے ہیں حفظ و تصحیح کا یہ اہتمام کہ ہزاروں حافظ حرف حرف گنا ہوا زبردیر کی تعداد معلوم رہم
 خط میں بیسیوں کتابیں موجود، پھر با اینہم کسی عاقل کی عقل میں آسکتا ہے کہ کلینی اور تہذیب میں
 تو الحاق نہ ہونے پائے اور شیعوں کے نزدیک من کل الوجوہ معتبر اور معتد بہ ہے اور صحیح الکتاب کہلائے
 اور کلام اللہ میں الحاق ہو جائے۔ اور اس کا کچھ اعتبار نہ رہے۔

قرآن مجید کی بے پناہ بہتر عقل کے نزدیک خلیفہ ثالث کے امن کو الزام سے پاک کر دیتی ہے | جس زمانہ فرض کیجئے

کہ اس میں فلاں شخص نے کلام اللہ میں سے کم کر دیا یا اس میں کچھ بڑھا دیا۔ جیسے شیعوں کو خلیفہ ثالث کی طرف بدگمانی ہے تو ایک دو کلام اللہ میں بڑھایا گھٹایا ہو گا تمام ملک عرب ملک روم اور ملک ایران اور یمن کے مصاحف میں (کہ ان کے خلیفہ ہونے سے پہلے یہ تمام ممالک تحت تصرف اسلام آچکے تھے اور سوائے ملک عرب کے کہ وہ سارا کاسار مسلمان ہو چکا تھا اور ممالک کے باشندوں میں سے بھی لکھو کھا آدمی مسلمان ہو چکے تھے اور قرآن کو فرمان خداوندی سمجھ کر ہر کوئی حرز جان سمجھتا تھا اور مجموعہ ایمان تصور کر کے اس کی یادگاری اور تلاوت میں مشغول تھا کی و بیشی ہرگز قرین عقل نہیں، علاوہ بریں اس زمانہ میں حفاظ کی نوبت لکھو کھا کو پہنچی تھی خلیفہ ثالث نے ان کے سینوں سے کیونکر نکال دیا ہو گا۔ کہ تمام عالم میں قرآن محض ہی مخرج ہو گیا ان وجوہ کے نظر کرنے کے بعد اہل عقل کا تو یہ کام نہیں کہ قرآن مجید کی نسبت اس بات کے قائل ہوں کہ اس میں کچھ کمی یا بیشی وقوع میں آئی ہو اور جب قرآن مجید اس درجہ کو صحیح اور معتبر ہوا، کوئی کتاب اس کے ہم سنگ نہیں اور تفسیر امام حسن عسکری میں اول سے آخر تک تمام آیات بجنہا موجود ہوئیں تو اول تو آیت **الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْثَرُ** سے استدلال کرنا صحیح اور درست ہوا۔

قرآن کی حفاظت کا ثبوت خود قرآن کی زبانی | **وَدَّ كُنَّا أَنْ نَقُولَ لَكُنْ أَعْمَىٰ** اگر کلام اللہ ہی کی آیات سے کلام اللہ کے بجنہ محفوظ ہونے پر استدلال کریں تو در صورتیکہ طریقہ استدلال صحیح ہو واجب التسلیم ہو گا۔ اس لئے کلام اللہ کو جو ہم نے تجسس کیا تو آیات کثیرہ اس پر شاہد نکلیں کہ کلام اللہ تا بنور موافق نزول کے بجنہ رہا ہے کسی قسم کا تغیر یا تبدل اس میں وقوع میں نہیں آیا نہ کمی ہوئی اور بیشی ہوئی نہ کسی لفظ کے حوض میں دوسرا لفظ مشہور و معروف ہو گیا۔ سب کو لکھ کر اس مضمون کو ثابت کیجئے۔ اس کی تو گنجائش نہیں فقط ایک آیت کا لکھنا ضروری سمجھ کر ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں سورہ حجر میں ارشاد ہے **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَافِعُونَ**۔ یعنی ہم نے آپ کو وحی دی یہ نصیحت اور ہم ہی اس کے نفع دہندگان ہیں۔ اب جائے غور ہے کہ یا وجود اس پختہ وعدہ کے جو مولا محمد بن عبد اللہ علیہ السلام کے چنانچہ واقفان علم معانی واقف ہیں۔ پھر نہ جانے خلیفہ ثالث نے کیا ستم کئے ہیں کہ قرآن اصلی کا بالکل نام و نشان مٹا دیا۔ اللہ اللہ کیا کچھ قدرت و طاقت تھی کہ تو ذواللہ خدا کی بھی نہ چلنے دی۔ سورتیں کی سورتیں لگا کر الیں اور آیتیں کی آیتیں بدل دیں۔ نہ ہے نصیب اہلسنت جن کے لیے پیشوا ہوں۔

شیعوں کے غلط خیال کے شرمناک نتائج | باقی رہا یہ احتمال کہ خداوند ذوالجلال وعدہ کر کے پھر گئے ہوں۔ سو یہ خیال خود محال ہے۔ خداوند صادق القول ایسی تاکیدوں سے وعدہ مکمل فرماتے اور پھر پھر جاتے اور حفاظت نہ کرے معہذا کلام اللہ ہی میں یہ بھی آیت ہے

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْلِفُ الْمِيعَاتِ ————— یعنی۔ اللہ تعالیٰ ہرگز خلاف وعدہ نہیں کرتا

مگر شاید کسی شیعہ مذہب کو یہ احتمال پیش آئے کہ خلیفہ ثالث کے زمانے میں یا جس کو یوں کہتے کہ اس نے کلام اللہ میں کمی و بیشی کی ہے اس کے مانے میں خداوند کریم ٹول گیا ہو یا اپنے وعدہ کو بھول گیا ہو، سو اس کا جواب خداوند کریم نے اپنے آپ کلام اللہ میں فرمادیا ہے۔ آیت الکرسی تو شیعوں کو بھی یاد ہوگی اس میں یہ جملہ موجود ہے۔ لَا تَأْخُذُكَ سِنَةٌ وَلَا خَوْفٌ يَعْنِي نَهْ أَنْ تَنْكُحَ هِيَ خَدَاكُومًا دَبَاتِي هِيَ اور نہ نیند ہی ادھر سورہ مریم میں فرماتے ہیں وَمَا كُنْ رَبُّكَ نَسِيًّا۔ یعنی تیرا رب بھولنے والا نہیں۔ سورہ طہ میں یوں ارشاد ہے كَأَن يَفْضِلُ رَبِّي وَلَا يَنْسِي۔ نہ بھولتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔ اس آیت نے اس احتمال کو بھی مرتفع کر دیا کہ خداوند کریم نے نگہبانی قرآن کا قصد تو کیا ہو، پر تدبیر میں غلطی ہوئی ہو یا بوجہ غلطی قرآن کے بدلے کسی اور چیز کی حفاظت کر بیٹھے ہوں جب یہ سب قتلات مرتفع ہو چکے تو اب اس غلام خاندان نبوی کی علیہ علی آلہ الصلوٰۃ والسلام حضرت شیعہ کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ بعد اس وعدہ محکم اور عدم موانع کے جو خداوند کریم سے حفاظت نہ ہو سکی تو بجز اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے نزدیک خلیفہ ثالث میں انغوز باللہ من ہذا القول خدا سے بھی زیادہ زور اور بل تھا کہ خدا کا ارادہ پیش نہ کیا در حالیکہ تم خلیفہ ثالث کے اس قدر معتقد ہو کہ خدا کو بھی اتنا نہیں سمجھتے تو خلیفہ ثالث ہی کے ساتھ ہی کیوں نہیں ہو لیتے (انغوز باللہ نقل کفر نہ پاؤ) اگر یہی تمہارے خیال ہیں تو خدا تعالیٰ کے ساتھ جو کیا پورا پے گا مبادا قیامت کو خلیفہ ثالث تمہیں بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت سے نکال کر بھی کبھی کے بدلے لینے لگے اور خدا کو شیعیان علی سے شرنا پاڑے۔ اسی سلسلے میں کلینی کی افترا پر دازی اور مرتبہ قرآن میں خلل اندازی | یا یوں کہو کہ یہ ہمارا عقیدہ غلط ہے اور کلینی

جو تمہارے نزدیک اصح الکتاب ہے اس کی یہ روایت سراسر بہتان اور دروغ ہے۔

عن هشام بن سالم عن ابی عبد اللہ اللہ

یعنی ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ

القرآن الذی جاء بہ حبیبہ جبریل الی محمد

یہ روایت کرتا ہے کہ وہ قرآن جو حضرت جبرائیل رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم | سبعة عشر الف آیات
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ اس کی
سترہ ہزار آیتیں تھیں۔ فقط

اب دیکھئے کہ یہ کلام اللہ جواب موجود ہے اس میں کل قریب چھ ہزار آیتوں کے ہیں تو شیعوں کی
اس روایت کے موافق کوئی دوہائی کلام اللہ چوری گیا، اس سے بہتر تو یہی تھا کہ خداوند کریم
ذمہ کش حفاظت نہ ہوتے۔ اس کی حفاظت کے بھروسے امتیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے فکر
ہو بیٹھے، ورنہ بہت ہوتا تو اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا تورات و انجیل میں ہوا تھا۔ سو جو لوگ کہ
تورات و انجیل کی تحریف کے اثبات کے درپے ہوئے ہیں وہ بھی یوں نہیں کہتے کہ تورات و انجیل
میں اتنا کچھ نقصان ہوا ہے بلکہ بعد تحقیق یوں معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود و نصاریٰ نے قدر قلیل کمی بیشی
کی ہے۔ سو وہ بھی جہاں کہیں کوئی بات مسلمانوں کے مفید مطلب دیکھی ہے یا کوئی ایسا حکم ہوا
کہ اس کے مروج رہنے میں امراء کو دشواری ہوتی ہے ایسی جگہ امراء سے کچھ لے دیکر بدل دیا
واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ القصہ حسب مقولہ شیعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہتمام اور اس
انتظام کے کہ قرآن مجید کی خداوند کریم نے خود حفاظت کی۔ قرآن مجید غیر محفوظ اور غیر معتبر ہونے
میں توریت و انجیل سے بڑھ گیا۔ حالانکہ ان کا حافظہ محافظ نہ خدا تھا نہ کوئی پیغمبر، ہاں علماء دنیا پرست
کہ آیات خداوندی کا بچہ دینا، اور احکام کا بدل ڈالنا۔ اور تحریف کا کرنا ان کا کام ہی تھا، اس کے
فقط پڑھنے پڑھانے والے اور جاننے پہچاننے والے تھے حافظہ نگہبان ہونا کجا۔ شاید اس فرقہ کے
نزدیک کلام اللہ کے تورات و انجیل سے بڑھ کر ہونے کے ہی معنی ہیں۔ کہ بے اعتباری میں ان
سے بڑھا ہوا ہے۔

حفاظت قرآن کے دو لچر احتمالات اور ان کے دندان شکن جوابات | یہاں علماء شیعہ دو احتمال پیش کریں۔ تو
کریں۔ ایک تو یہ کہ کلام اللہ لوح محفوظ میں محفوظ ہے، دوسرا یہ احتمال کہ غار سرمن رائے میں
حضرت امام ہمدی حافظ قرآن موجود ہیں۔

سو اول احتمال کا پوچھنا تو ظاہر ہے اول تو یہ ہے کہ اگر بالفرض اِنَّكَ لَمُحَافِظُونَ
کا یہی مطلب ہے تو ہمیں کیا۔ ہم سے اس دھڑا کرنے کے کیا معنی، ہمارے مفید مطلب تو یہ بات ہے کہ
اس قرآن کی حفاظت کرتے جو ہمارے پاس ہے۔ تاکہ احکام خداوندی کے معلوم ہونے میں

کچھ شک و شبہ نہ رہتا۔ دوسروہاں کی حفاظت کرنے کی کیا ضرورت تھی اگر لوح محفوظ تک کسی بے دین کی دسترس ہوتی تو البتہ حفاظت کا موقع بھی تھا۔ تیسرے آیت مذکورہ اول منزل کا ذکر فرمایا بعد ازاں حفاظت کا وعدہ کیا ہے اس ترتیب سے بلاغت شناسان قرآنی کو خود معلوم ہے کہ قرآن منزل کی حفاظت مد نظر ہے نہ کہ اس قرآن کی جو لوح محفوظ میں محفوظ ہے۔ چوتھے اگر یہی مطلب ہے تو یہ فضیلت تو تورات و انجیل میں بھی موجود ہے۔ قرآن میں کیا فوقیت ہوئی یہ ہذا یہاں حفاظت کا وعدہ کیا وہاں نہ کیا۔ اس کا کیا ثمرہ نکلا۔ پانچویں یہ ہے کہ اس آیت میں اسماء قرآنی میں سے ذکر کو ذکر کیا۔ لفظ قرآن یا کتاب وغیرہ ذکر نہ فرمایا تو یہ بھی اسی عرض سے ذکر فرمایا ہے کہ قرآن میں لگاؤ کی ویشی تغیر و تبدل کا کسی کو احتمال باقی نہ رہے۔

قرآن مجید کے نام ذکر کا موقع استعمال اور اس کی مفید شرح | چونکہ بیانات تمہید طلب ہے تو ہمیں لازم ہے کہ اس کی تمہید بیان کر کے اصل مطلب کو روشن کر دکھلائیں، اس لئے یہ گزارش ہے کہ بسبب عبارات اور اوصاف مختلفہ اور حیثیات متعددہ کے ایک چیز کے متعدد نام ہو سکتے ہیں۔ اور پھر وہ نام اپنے اپنے موقع ہی میں استعمال ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنا صحیح نہیں ہوتا مثلاً ایک شخص کسی کا باپ بھی ہوتا ہے اور کسی کا بیٹا بھی، اور علیٰ ہذا القیاس کسی کا بھائی کسی کا بھتیجا کسی کا چچا کسی کا بھانجا کسی کا ماموں ہوتا ہے۔ عرض ایک شخص ہو اور اس کے القاب بہت ہیں، پر وہ سب القاب یکساں برابر نہیں بولے جاتے اپنے اپنے موقع میں مستعمل ہوتے ہیں بیٹا اپنے باپ کو بیٹا کہہ کے نہیں پکار سکتا۔ گو وہ کسی کا بیٹا ہے، اور اسی طرح باپ بیٹے کو باپ کہہ نہیں پکار سکتا اگرچہ وہ اپنے بیٹے کا باپ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک کام کلکٹر بھی ہوتا ہے، مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے، مگر چونکہ کلکٹری، مجسٹریٹ کا کام مختلف اور جدا جدا ہے تو کلکٹری کے کاغذات میں بلبق کلکٹر لکھتے ہیں اور مجسٹریٹ کے کام کاغذات میں بلبق مجسٹریٹ اور برعکس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن شریف کے بھی بہت سی القاب اور اسما ہیں اور ہر ایک لقب کا مدار ایک جدا اعتبار اور نئے نئے اوصاف پر ہے، قرآن تو لحاظ متروہون کے کہتے ہیں یعنی قرآن کو قرآن اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ اس کی قرأت کا اتفاق ہوتا ہے اور مصحف اور کتاب بایں لحاظ کہتے ہیں کہ اس میں صحف یعنی اوراق ہوتے ہیں۔ اور ان اوراق میں اس کو لکھتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس ذکر بایں وجہ کہتے ہیں کہ غافلوں اور جاہلوں کیلئے

مذکر اور گنہگاروں کے واسطے پند و لبند ہے یعنی باعث یادگاری باری ہے اور پند خداوند ہے سو اس لقب کا استعمال جب ہی صحیح ہوگا کہ مقابل میں غافل و جاہل اور گنہگار ہوں مگر سب جانتے ہیں کہ موصوف بوصف غفلت و جہل و گناہ اگر ہی تو یہ انسان ہے ملائکہ ان عیوب کے مبرا ہیں تو جب تک کلام اللہ لوح محفوظ میں تھا، اس لقب کا بولنا صحیح نہ تھا کیونکہ اس موقع میں نہ کوئی غافل تھا نہ جاہل تھا نہ گنہگار تھا وہاں تک اگر رسائی تھی تو فقط ملائکہ کو تھی۔ سو ان کو ان باتوں سے کچھ سروکار ہی نہیں ہاں جب توبت تنزیل کی پہنچی اور معاملہ حضرت انسان سے پڑا تو البتہ اس لقب کا استعمال صحیح ہوا کیونکہ غرض انزال و تنزیل سے یہی ہے کہ غافلان نوع بشر کے لئے مذکر اور واعظ ہو۔ پھر جب اِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ فرمایا، تو فیماں اسی لفظ کی طرف رجوع فرمائی اس لئے لازم پڑا کہ حفاظت بھی اسی موقع میں ظہور میں آئے کہ جہاں اس لقب کا استعمال صحیح ہو۔

دوسرے سوال کا مسکت جواب | باقی رِضاد و سراحتہاں، اس کا یہ حال ہے کہ اول تو حضرت امام ہمدی کا غافل ہر من رائے میں مخفی ہونا ہی ایک فسانہ غلط ہے جب کلام اللہ کا باوجود اس قدر تواتر کے کچھ اعتبار نہ رکھا ایسی روایات بے سرو پا کاجن کے راوی فقط دو چار منکار ہوں کیا اعتبار اور در صورتیکہ وہ بات بھی قرین قیاس نہ ہو تب تو قابل قبول عقل کسی عاقل کے نزدیک بھی نہیں اور جن روایات سے حضرت امام ہمدی کا یہ فسانہ مردی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہیں، بلکہ اس سے بھی کمتر یا اینہما یہ بات تو ہرگز متصور ہی نہیں کہ حضرت امام ہمدی کو کلام اللہ یاد ہو، یہ کام تو اہلسنت جماعت کا ہے حضرت امام ہمدی کو ان کا تشبیہ کا ہے کو گوارا ہو گا مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ ہاں ان کے پاس کلام اللہ ہو۔ اور حضرت امام اس کلام اللہ کو لیکر اسی اندیشے سے اس غار میں جا چھپے ہوں کہ مبادا ان کے پاس کلام اللہ معتقدان خلیفہ ثالث کی نظر نہ پڑ جائے تو البتہ ایک ٹھکانے کی بات ہے لیکن اہل فہم سے سوال ہے کہ یہ احتمال پہلے احتمال سے اس بات میں کیا کم ہے کہ ہمارے حساب سے ویسا ہی لوح محفوظ میں ویسا ہی غار سرمن رائے میں نقل مشہور ہے ویسا ہی کنواں ویسی ہی کھائی، بلکہ لمجاظ وجہ پنجم اس کلام اللہ کی حفاظت کا وعدہ ہی نہیں جو بزم شیعہ حضرت امام کے پاس ہو اہل فہم کے نزدیک اس کا ذکر کہنا ہی صحیح نہیں ذکر کہنا تو جب صحیح ہو کہ امتی اسے پڑھیں پڑھائیں غار سرمن رائے میں کون جائے اور کون اس سے فائدہ اٹھائے بلکہ وعدہ ہے تو اسی کلام اللہ کی حفاظت کا ہے

کیونکہ اس کا ذکر ہونا ظاہر ہے پھر حضرت امام کا کلام اللہ اگر اسی کلام اللہ کے موافق ہے تو
 فیہا ورنہ اس صورت میں حضرت امام ہی کا کلام اللہ غلط ہو گا بالجملہ ایسے لغویات کو خداوند کریم
 کی طرف نسبت کر کے مفت دین اسلام کو بٹالگاتے ہیں سبحان اللہ یہ عجب تماشا ہے
 کہ جناب باری نے وعدہ حفاظت تو اس لئے کیا تھا کہ امت محمدی کو کل کو دربارہ علم احکام کچھ
 وقت نہ پیش آئے دین محمدی میں کوئی رخنہ نہ پڑے یہ دین قیامت تک برابر روشن رہے۔
 مگر افسوس کہ تاہم وہی خرابی کی خرابی (برسرِ یہی نعوذ باللہ غارِ سرمن رائے میں محفوظ ہونے کے
 یہ معنی ہوتے کہ خداوند کریم حفاظت کے وقت اتنا بھی نہ سمجھے کوئی اجنبی آدمی سنے گا تو کیلہ کے گا۔
 شیعوں کا لغو خیال یہ تو اور نصائے کے لئے مقابلے کے لئے ایک کھوٹا ہے [ہماری صلاح یہ ہے کہ اس بات کو

شیعہ کسی یہودی نصرانی کے سامنے تو زبان پر بھی نہ لائیں ہمارے سامنے کہیں تو شاید ہم بیاسی اتحاد
 کلمہ گوئیوں سمجھ کر کہ شیعوں کی خفت فی الجملہ اپنی ہی خفت ہی سکوت بھی کر جائیں کیونکہ اول تو
 یہودیوں کو اس قسم کی خرافات کو سن کر اس بات کے کہنے کی گنجائش ملے گی کہ ہماری تورات بھی آخر
 لوح محفوظ میں محفوظ ہے سو اس کے سورہ احتفان سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے پاس تورا
 بجنہ موجود تھی اور اس میں بنی آدم کی طرح انہوں نے کچھ تغیر و تبدل نہ کی تھی ورنہ وہ یوں کہتے

إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنْزِلَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ
 مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

”یعنی بیشک ہم نے سنی ہے ایک کتاب جو نازل کی گئی ہو
 موسیٰ کے بعد تصدیق کر نیوالی ہو اس کتاب کی جو اس
 پہلے ہے۔ یعنی تورات کی تصدیق کرتی ہے۔“

سو اس بات کا یقین کہ کلام اللہ تورات کی تصدیق کرتا ہے جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو تورا
 کے بجنہ ہونے کا یقین ہو یا کلام اللہ تورات محرف کا مصدق ہو سو دوسرا احتمال تو شیعوں کے
 نزدیک بھی غلط ہے کیونکہ جنات نے جو کلام اللہ سنا تھا تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔
 حضرت عثمانؓ سے یا ایسے ہی کسی اور سے نہ سنا تھا۔ اور اگر یہودیوں کی پر خاش کا کچھ اندیشہ نہ
 ہو۔ اور یہ سمجھ کر کہ کچھ تورات بجنہ باقی ہو اور فقط اس میں تحریف نہ ہونے کا ان کو ایسا یقین ہو
 جیسے امامیہ کو الحمد اور قل ہو اللہ کے بجنہ ہونے کا یقین ہے فخر یہ یوں کہنے لگیں کہ ہمارا قرآن
 تو غارِ سرمن رائے میں محفوظ ہی ہماری توراۃ بتلا کہیں محفوظ ہی یا اتفاقات سے وہ آیات سنی ہو

جو تورات کی ان عبارات کے جواب تک صحیح و سالم ہیں۔ موافق اور مطابق ہیں اور فقط اسی توافق اور تطابق کے باعث انہوں نے کلام اللہ کو مصدق تورات سمجھا ہو تو اس صورت میں ہو سکے ہیں کہ تورات محرف بھی ہو اور کلام اللہ غار سرمن رائے میں محفوظ ہو اور اس وجہ سے کلام اللہ کو تورات پر فوقیت ہو اور یہود سے نہ شرمائیں لیکن قطع نظر اس کے کہ یہ فوقیت کس درجہ کو ناکارہ فوقیت ہو مشکل ہی رہے گی۔

اگر یہود سے پالاجیت بھی گئے تو نصاریٰ ان کی نہیں چلنے دینگے | یہودیوں سے پالاجیت بھی گئے۔ تو انگریزوں سے کس منہ سے بات کرینگے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حافظ انجیل بالفاق شیعہ و سنی آسمان چارم پر زندہ موجود ہیں۔ غار سرمن رائے میں تو حضرت امام کو اس بات کا بھی شاید اندیشہ ہو کہ مبادا کوئی معتقد خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ پھرتا پھرتا یہاں نہ آ سکے اور ان کے کلام اللہ کو چھین کر جلادے یا معاذ اللہ دشمنان امام کو شہید کر دے اور جو مصلحت کہ اخفا اور خفا سے تھی مانعہ سے نکل جائے حضرت عیسیٰ السلام تو بے کھٹکے ہیں چوتھے آسمان تک کس کے مقدور جو خاک کے بھٹکے ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے کہ ان سے یوں کہا جائے حضرت عیسیٰ کا ادل تو حافظ انجیل ہونا غیر مسلم ہو۔ مگر یہی بعینہ احتمال بہ نسبت حضرت امام موجود ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خود انجیل نازل ہوئی، ان کو یاد نہ ہونا نہایت مستبعد بخلاف حضرت امام کے کہ قرآن ان پر نازل نہیں ہوا۔ مہذا کلام اللہ کے یاد ہونے میں اہلسنت کی مشابہت لازم انجیل کے یاد ہونے میں کوئی خرابی نہیں، دوسرے ہم نے مانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہوں گے اور ان کو انجیل یاد بھی ہو لیکن چونکہ انجیل منسوخ ہو چکی ہو تو بعد نزول عیسیٰ علیہ السلام وہ یاد ہونا کچھ مفید نہ ہوگا بخلاف حضرت امام کے کہ ان کا کلام اللہ یاد رکھنا بعد ان کے خروج کے کام دے گا۔ اور شیعیان علی کو جو مدت دراز سے بنا چاری میاں عثمانی پر عمل کرتے ہیں کلام اللہ اہل ہاتھ آئے گا اور دیرینہ تمنا پوری ہوگی۔

عیسائیوں سے خبر و آزمائی کے لئے اس عقیدے سے دست برداری لازم ہے | مگر یہ تدبیر جب مفید ہے کہ شیعہ کھلت و حرمت کی تبدیلی ائمہ کے دست قدرت میں ہے | ہمارا کہنا سر و دھریں اور اس اعتقاد سے کہ اماموں کو تبدیل احکام حلت اور حرمت وغیرہ کا اختیار ہے اول اس سے دست بردار ہوں

اور نوادر کی اس روایت پر قلم پھیر دیں

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سَنَانٍ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ
قَالَ كُنْتُ عِنْدَهُ فَأَجْرَيْتُ اخْتِلَافَ
الشَّيْعَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى
لَمْ يَزَلْ مُتَقَرِّبًا إِلَى الْوَحْدِ إِنْ يَتَخَلَّقُ
مُحَمَّدًا أَوْ عَلِيًّا وَنَاطِلَهُ وَالْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ
فَمَكَثُوا الْفَدَّ هَرَفًا خَلَقَ الْأَشْيَاءَ وَ
أَشْهَدَ هُمْ خَلْقَهَا وَأَجْرَى ذَاعَتُهُمْ
عَلَيْهَا وَفَوْضَ أَمْرَهُ إِلَيْهِمْ يَحْكُمُونَ مَا
يَشَاءُونَ وَيُحَرِّمُونَ مَا يَشَاءُونَ -

حاصل اس روایت کا یہ ہے محمد بن سنان بیان کرتا ہے کہ میں حضرت
امام ابو جعفر یعنی امام محمد باقر کے پاس تھا اتفاق سے میں شیعوں
کے باہم مختلف ہونے کا ذکر چھڑا یعنی یہ پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے
کہ شیعیان علی دین میں باہم مختلف ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ محمد بن سنان
سن اللہ تعالیٰ پہلے تو ہمیشہ سے اکیلا تھا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں پھر
نبی بن کر پیدا کیا پھر ہزار دھڑ کے اور اشیاء کو پیدا کیا اور نبی بن
کے سامنے سب کو موجود کیا اور نبی بن کی اطاعت ان کے ذمہ
رکھی اور ان کے کاروبار سب نبی بن کے حوالہ فرمائے۔ سو وہ جو
چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام کر دیں۔ فقط۔

الغرض اس روایت کے سیاق سے اختلاف شیعہ کی وجہ یہ نکلی کہ نبی بن میں کسی نے ایک
بات حلال رکھی تو دوسرے اسے حرام کر دی۔ سو کوئی ان کا مقلد ہو گیا کوئی ان کا۔

دوسری روایت کلینی کی بھی اسی روایت سے ہم زبان ہے اس سے بھی دست برداری لازم ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ الْمِثْمِيِّ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ
قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ أَدَبَ رَسُولَهُ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى قَوْمَهُ عَلَى مَا أَرَادَ
ثُمَّ قَوَّضَ إِلَيْهِ دِينَهُ فَقَالَ مَا أَتَاكُمْ مِنَ الرُّسُلِ
فَخُذُوا مِنْهَا مَا نَهَى عَنْهُ فَاتَّقُوا اللَّهَ
فَمَا قَوَّضَهُ اللَّهُ تَعَالَى إِلَى رَسُولِهِ فَقَدْ
قَوَّضَهُ إِلَيْنَا -

اس کا حاصل یہ ہے کہ محمد بن حسن مٹیمی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ
سے روایت کرتا ہے کہ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خدا تعالیٰ
نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب کھایا اور سیدھا عیا اپنا
جی چاہے تھا بنایا پھر اپنا دین ان کے سپرد کیا اور کلام اللہ میں
سورۃ حشر میں سب کو حکم دیا کہ جو کچھ رسول نے یعنی کچھ فرمائے اسے
قبول کرو اور جس سے منع کرے اس سے ہٹ کر نہ ہو سو جو کچھ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا تھا وہی ہمارا بھی سپرد کیا

پہلی روایت سے فقط نبی بن ہی کا اختیار در باب تبدیل احکام معلوم ہوتا تھا اور اس روایت
سے ثابت ہوا کہ وہ اختیار اور اماموں کو بھی حاصل ہے اس لئے کہ جو تفویض اول روایت میں تھی
وہی اس روایت میں بھی ہے سو وہی معنی بلا شک مراد ہوں گے۔

بے اہل و آیات کی بے بنیاد توجیہ | مگر شاید کوئی شیعہ مذہب اس کی یہ توجیہ کرے کہ اس تفویض اور تحریم اور تحلیل کے یہ معنی ہیں کہ وہ اجتہاد کر کے لوگوں کو احکام بتلا دیں آخر اہل سنت بھی تو انبیاء اور علماء کے اجتہاد کے حجتہ ہونے کے قائل ہیں شیعہ اگر چارہ معصوم کے اجتہاد کے معتبر ہونے کے قائل ہو گئے تو کیا گناہ ہوا۔ یا یہ توجیہ گھڑیں کہ خداوند کریم نے ان کو سب کی استعدادیں اور قابلیتیں دکھلا کر چنانچہ ظاہر عبارت روایت اول یہی ہے۔ نیتیں کو حکم دیا ہو کہ ان کی استعدادوں کے موافق جو کچھ سمجھ میں آئے احکام مقرر کر دو۔ سو اگر یہ ہو تو کیا خرابی ہے لیکن اہل عقل پر پوشیدہ نہ ہو گا کہ اجتہاد کی تاویل کرنی تو بعینہ ایسی ہے جیسے کہا کرتے ہیں میں چہ میگویم و طنبور من چہ میگوید چنانچہ استعداد والے خود سمجھتے ہیں کہ اس توجیہ کو عبارت روایت اول سے کچھ علاقہ نہیں۔ نیز مخالف مذہب شیعہ ہی کہ وہ ائمہ کی نسبت اجتہاد کی تہمت لگانی موجب منقصۃ سمجھتے ہیں ان کی فرمائی ہوئی باتیں سب منجملہ وحی آسمانی سمجھتے ہیں، باقی رہا استعدادوں کو دکھلا کر کارخانہ دین کا پٹر کر دینا اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو شیعہ تو تسلیم نہ کریں گے اثنا عشریہ چھوڑ تمام امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام کو تمام احکام کی تبدیلی کا اختیار ہے۔ اگر استعداد پر ہی مدار کا رہے تو تبدیل کے اختیار کے کیا معنی! جیسی استعداد ہو ویسا ہی حکم ہونا چاہیے بدلائیموں چاہیے بہر حال کوئی توجیہ بن نہیں سکتی تفویض کے خیال کی قرآن بخ کنی کرتا ہے۔ | اگر جواب مذکور سے سرخرو ہونا مد نظر ہے تو اس روایت کو زیر قلم کریں اور ہرگز کچھ اندیشہ نہ کریں۔ کیونکہ جناب ہاری کا بھی یہ حکم اسی طرف ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کلام اللہ کی شان میں کلام اللہ ہی میں یوں فرماتے ہیں۔ "قَبِيلَانَا بِكُلِّ شَيْءٍ" مطلب یہ ہے کہ کلام اللہ میں ہر چیز کا بیان ہے ہم نہیں سمجھتے تو کیا ہوا سمجھنے والے سمجھتے ہوں گے خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر جب کلام اللہ ہی میں سب کچھ آگیا تو تفویض کہاں رہی بلکہ اس صورت میں تو لازم ہے کہ جو کچھ حضرت نے یا ائمہ نے فرمایا ہو وہ شرح قرآن مجید ہو، اپنے اختیار سے کچھ نہ فرمایا ہو۔

تفویض کا خیال قرآن کو کتب منسوخہ کی حیثیت دیتا ہے | القصہ ہماری صلاح یہ ہو کہ ان دونوں آیات پر قلم پھر کر پھر جواب مذکورہ بالا سے انگریزوں وغیرہ اعداء دین کے مقابل میں امید سرخرو ہونے کی رکھیں نہیں تو ان کے منہ میں بھی زبان ہے بنیوں کو تو بوجہ اتحاد ملت کے کچھ لحاظ بھی ہو گا۔

انہیں کیا لحاظ ہے ایسا نہ ہو کہ وہ یوں کہنے لگیں کہ ہماری انجیل اگر کلام اللہ سے منسوخ ہو گئی ہو تو سارے احکام تو منسوخ نہیں ہوئے آخر اخلاق کی باتیں اور بہت سے احکام حلت اور حرمت کے بدستور باقی ہیں اور عقائد میں تو مسلمانوں کے مقولہ کے موافق کچھ فرق پڑا ہی نہیں حضرت آدم کے وقت سے لے کر اب تک وہی عقائد چلے آتے ہیں چنانچہ کلام اللہ میں سورہ مائدہ میں خود موجود ہے

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ | یعنی نازل کی ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف
سچی کتاب کہ وہ پہلی کتابوں کی بھی تصدیق کرے ہے

سو تمہارے کلام اللہ کا بھی یہی حال ہے کہ اماموں نے مناسب وقت دیکھ کر بہت سے احکام تبدیل و تغیر کر دیئے چنانچہ پہلی روایت سے یہ خوب واضح ہوا ہے کیونکہ اختلاف شیعہ کی وجہ حضرت امام باقر علیہ السلام نے یہی بیان کی ہے پھر حضرت امام مہدی کے پاس اگر وہ کلام اللہ محفوظ بھی ہو تو کیا حاصل وہ دین تو بدل ہی گیا کوئی اور ہی کلام اللہ بنانا چاہی نہیں تو آیا یہی قصہ ہے جیسا حضرت عیسیٰ تمہارے عقیدے کے موافق آخری زمانہ میں نازل ہوں گے اور باوجودیکہ انجیل کے حافظ ہیں پھر بسبب اپنے دین کے منسوخ ہو جانے کے انجیل پر عمل نہ کریں گے بلکہ کلام اللہ پر عمل کریں گے تفویض کی شکل میں پھر حضرت امام مہدی کے وقت قرآن کی باقی رہا یہ احتمال کہ شاید حضرت امام مہدی وہی حیثیت ہوگی جو انجیل کی بوقت نزول حضرت عیسیٰ ہوگی۔ انہیں احکام پر عمل کریں جو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے مقرر کئے ہوئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن بابویہ قمی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کرے ہے

وَعَنْ أَبِي عُبَيْدٍ اللَّهِ أَنَّهُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
تَعَالَى أَخِي بَيْنَ الْأَرْوَاحِ فِي الْأَزَلِ قَبْلُ
أَنْ يَخْلُقَ الْأَجْسَامَ بِالْفِي عَالِمٍ فَإِذَا قَامَ قَائِلُهُ
أَهْلُ الْبَيْتِ وَرِثَ الْأَخَ مِنَ الَّذِينَ
أَخَا بَيْنَهُمَا فِي الْأَزَلِ وَلَمْ يُورَثِ
الْآخَ مِنَ الْوَلَادَةِ۔ | یعنی حضرت امام ابو عبد اللہ نے جو حضرت امام جعفر علیہ السلام
کا لقب ہے یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں روحوں کے پیدا
کرنے سے دو ہزار برس پہلے روحوں میں آپس میں بھائی بندی کرادی
ہے۔ سو جب امام مہدی نکلیں گے ازل کی بھائی بندی کے حساب
وراثت جاری فرمائیں گے اور جو نسل کی رو سے بھائی ہوگا اسے
وراثت نہیں دلائیں گے۔

اب دیکھئے کہ اس روایت سے صاف یوں ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام ہدی کلام اللہ کے احکام کے موافق بالکل عمل نہ کرینگے اور یہ حکم جو نبی بھائی کے وارث ہونے کا ہے، اسے موقوف کردینگے اور اس روایت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بھائیوں کی وراثت کا حکم جو سورہ نسا میں یوصیکم اللہ کے رکوع میں ہے وہ کوئی خلیفہ ثالث کی نعوذ باللہ کچھ کر توت نہیں بلکہ عین حکم الہی ہے ورنہ اس کے موقوف ہونے کی حضرت امام ہدی کے وقت پر کیا تخصیص تھی الغرض جب تک اثنا عشریہ اس مذہب سے کہ امام کو سب احکام منسوخ کر دینے کا اختیار ہی دست بردار نہ ہوں گے تب تک انگریزوں کے سامنے اپنے کلام اللہ کے محفوظ ہونے کے مقدمہ میں جو آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَکَ لَخَافِظُوْنَ سے مستفاد ہوتا ہے منہ نہ کر سکیں گے۔

تفویض سے انکار میں نصاریٰ دیہود سے گلو خلاصی اور ہماری اس صلاح کے ماننے میں فقط ان کا یہی فائدہ ملنے کے علاوہ ختم نبوت پر ایمان نچتہ ہوتا ہے۔

بلکہ لفظ خاتم النبیین جو سورہ احزاب میں ہے اس پر بھی ایمان درست ہو جائے گا نہیں تو یہودیوں کی طرح یہ عتاب ان پر بھی رہے گا اَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتُكْفُرُونَ بِبَعْضٍ یعنی کیا تم تھوڑی سی کتاب پر تو ایمان لاتے ہو اور تھوڑی پر نہیں لاتے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ بات تو انبیاء میں سے بھی کسی کسی کو میسر آتی ہے کہ نئی شریعت لائے اور پہلے احکام بدل جائیں بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک جتنے بنی ہوئے سب تورات ہی پر عمل کرتے رہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہ بات میسر نہیں آئی کہ خدا نے دین کا مقدمہ انہیں سپرد کر دیا ہو بلکہ جو کچھ انہوں نے احکام مقرر کے سب حسب فرمان خداوندی مقرر کئے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ تو درکنار کلام اللہ سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود سید المرسلین محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہ تھا کیونکہ سورہ النعام میں یہ آیت موجود ہے قُلْ لَا اَجِدُ فِيمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا اِلَیْہِ جَسَدًا کہ جس کا جسد ہے کہ جس کا جسد ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں پاتا ہوں بیچ اس چیز کے جو میری طرف وحی کی گئی ہو کوئی چیز حرام کسی کھانے والے پر فلائی اور فلائی اس آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام کرنے اور حلال کرنے کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ تھا حلت حرمت کا مدد وحی پر تھا دوسری جگہ آیا کہ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَیْہِ عَاثِلُ اسکا یہ جو کہ سو خدا کے اور

کوئی حاکم نہیں اور اگر بالفرض خدا نے امت کے احکام ان کے سپرد بھی کر دیئے ہوں۔ تب بھی ہمارے امام کچھ ان سے اس بات میں کم نہ رہے اور یہی احکام کی تبلیغ کے لئے رسول اور بنی ہوا کرتے ہیں چنانچہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ | یعنی اے رسول پہنچا دے جو کچھ میری طرف نازل کیا گیا ہے
الغرض اس طریق سے یہود اور نصاریٰ کی پرغاش سے بھی نجات ہو جائے گی اور اپنا
ایمان بھی درست ہو جائے گا

حق کے زور سے ابن بابویہ آخر سنیوں کا ہمزبان ہو گیا اور شاید کچھ یہی سوچ سمجھ کر شیخ صدوق اعنی ابن بابویہ نے کتاب الاعتقادات میں اس عقیدے ہاتھ اٹھایا اور ہمارے نزدیک اس حساب سے وہ صدوق اسم با مسعی ہو گئے۔ مگر سنیوں سے دامن چھڑانے کے لئے سب اہل تشیع کی طرف سے نیابتہ یوں کہہ اٹھے مَنْ نَسَبَ إِلَيْنَا أَنْ نَقُولَ إِنَّهُ أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ فَهُوَ كَاذِبٌ۔
یعنی جو یوں کہے کہ شیعہ یوں کہیں ہیں کہ کلام اللہ اس سے زیادہ تھا جواب لوگوں کے پاس ہے اور جس کی ایک سوچو وہ سورتیں ہیں وہ جھوٹا ہے، انہوں نے چاہا تھا کہ سنیوں کو جھوٹا بنائیں پر خدا سچوں کو سچا ہی کرتا ہے خدا ساز علامہ کلینی نے اس دروغ کا بار اپنے سر اٹھایا یا یوں کہئے علامہ صدوق کو جھوٹا بنایا چنانچہ ان کی روایت کلام اللہ کے سترہ ہزار آیت ہونے کے باب میں۔
اوپر مرقوم ہو چکی، کسی نے سچ کہا ہے حق بر زبان جاری شود۔ خیر کہاں تک حضرات شیعہ کی انصاف اس باب میں بیان کیجئے منصفوں کے لئے اس قدر بھی بہت ہے ہمیں کوئی عاقل منصف ایسا نظر نہیں آتا جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَخَافِطُونَ۔ سے بجز اس کے کچھ اور معنی سمجھے کہ اس میں ہرگز کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ خلیفہ ثالث ہو یا خلیفہ اول اور دوم،

آیت مذکورہ سے سنیوں کی فضیلت کا انکشاف | بلکہ انصاف سے دیکھیے۔ تو بشہادت صرف اس آیت میں سنیوں کی بڑی فضیلت نکلتی ہے۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جو کام کسی کے اہتمام اور انتظام اور حکم سے ہوا کرتا ہے اگرچہ حقیقت میں اسے اور ہی کوئی کرے پر عین میں وہ ہتھم ہی کی طرف اور منتظم اور حاکم ہی کی جانب منسوب ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بادشاہ کسی رسالہ یا پلٹن کو خزانہ کی حفاظت کے لئے مقرر کرے۔ سو رسالہ دار یا صوبہ دار وں پانچ سپاہیوں کو پہرہ پر

مقرر کر دیتے ہیں اور پھر نوبت نبوت اور نمبر نمبر وار اس پہرہ کو بدلتے رہتے ہیں اور آپ آرام کرتے ہیں اور سپاہی پہرہ دیا چوروں قزاقوں کو دفع کرتے رہتے ہیں اب دیکھئے کہ حقیقت میں محافظت سپاہی پہرہ دار کرتے ہیں پر چونکہ رسالہ دار اور صوبہ داروں کے حکم سے کرتے ہیں۔ تو بڑی سرکاروں میں رسالہ داروں اور صوبہ داروں ہی کا نام ہوتا ہے اور سپاہیوں کا کیا ہو اور رسالہ داروں اور صوبہ داروں ہی کا کیا سمجھا جاتا ہے۔ اس واسطے اگر کہیں ایسے موقع پر کوئی معرکہ کا کام بن پڑتا ہے تو گو سپاہیوں کو بھی قدر قلیل انعام ملے پر رسالہ داروں اور صوبہ داروں کو بیش تر انعام ملتا ہے۔ اور عہدوں کی ترقی ہوتی ہے اسی طرح سنی بھی موافق حکم الہی کے اس خزانہ بیش بہا کی محافظت کرتے ہیں اور چونکہ اوراق میں فقط خوب حفاظت نہ ہو سکتی تھی تو اس لئے اس کو اپنے سینوں میں گویا جان کے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ بے دینوں اور شیاطین کو اس کے چرانے کی دسترس نہ ہو سوائے چور کو تو ال کو ڈانڈیں شیعوہ سنیوں ہی کو چور بتانے لگے سورہ وہی مثل ہے نیکی برباد گناہ لازم اگر شیعوں سے سنی کچھ انعام و اکرام اس خدمت کا مانگتے جب ہی یہ ہمت لگائی ہوتی خدا کے دینے میں اتنا بخل کیوں ہے تیل جلے سرکار کا کلیجہ پھٹے مشعلی کا ہم جو دنیا میں دیکھتے ہیں تو کلام اللہ کی محافظت سنی ہی کرتے ہیں ایک ایک بستی میں بعضی بعضی جا پان پان سو حافظ موجود ہیں مگر چونکہ یہ ان کی حفاظت موافق ارشاد خداوندی کے ہے تو یہ ان کا کیا خدا ہی کا کیا بھنا چاہیے اور سنیوں کو طائر م خاص اور محکوم باختصاص سمجھتے اس لئے خداوند کریم نے اس محافظت کو اپنی طرف نسبت کیا اور یہ فرمایا **وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں لیکن شیعوں کو محکومان نافرمان کی مانند جانئے بلکہ بمنزلہ باغیوں کے یا چوروں کے قرار دیجئے کیونکہ یہ فرقہ محافظان کلام ربانی کے جو ایک خزانہ بے بہا ہے دشمن ہیں اور خزانوں کے محافظوں کے قزاق اور باغی اور چور ہی دشمن ہوتے ہیں غرض کہ یہ آیت **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** بھی باوازا بلند یہی کہتی ہے کہ مذہب اہل سنت حق ہے اور مذہب شیعہ باطل۔ پر سننے کے لئے کان مشرط ہیں جن کانوں پر **خَبَّئَهُمُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ** کی مہر لگی ہوئی ہو یعنی یہ مضمون ان پر صادق آتا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگائی ہے وہ کیا سینیں اور کس کی سینیں مگر ہمیں اپنی طرف سے سمجھانے میں قصور نہ کرنا چاہیے جیسے شیخ صدق

ایک بات مان اٹھے ہیں ایسے ہی شاید مولوی عمار علی صاحب یا کوئی اور عالم یا جاہل اس بات کو بھی مان جائے مگر چونکہ متعصب کو حق بات کا ماننا ہر چند کتنی ہی صاف و روشن کیوں نہ ہو بہت دشوار ہوتا ہے تو اس تقریر کو سنکر شاید کوئی شیعہ مذہب یوں کہنے لگے ہم نے مانا کہ کلام اللہ سارا کاسارا صحیح اور سنیوں کی روش کی خوبی بھی اس سے ہویدا پر یہ تو کہیں نہیں کہ ابو بکر کو بھی ماننا ہی چاہیئے۔ اس لئے یہ آیت سوم مع اپنے ماحصل کے لکھی جاتی ہے۔

چاہیئے۔ اس لئے یہ آیت سوم مع اپنے ماحصل کے لکھی جاتی ہے۔

إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ

أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيًا أَتَذْنِبْنَ إِذْ

هَمَّافِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا

تَخْزَنَنَّ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا

یعنی تم لوگ اگر ہمارے پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو کیا

ہوگا اللہ اس کی مدد کرنے والا ہے پہلے بھی اس کی

اس نے مدد کی ہے جب کہ کافروں نے اے نکال دیا تھا

جبکہ ایک دھماکا اور ایک اس کے ساتھ اور تھا جب دوزوں

غار میں تھے کب جس وقت وہ اپنے ساتھ دینے والے

سے یوں کہتا تھا کہ تو غلین مت ہو ہمارے ساتھ تو اللہ

اس آیت میں بنظر انصاف غور کیجئے۔ اور منہ زوری کو چھوڑیئے دیکھئے یہ آیت کدھر کو لئے

جاتی ہے سنیوں کی طرف کھینچتی ہے یا شیعوں کے گھر کا راستہ بتلاتی ہے ہمیں اس جگہ مرزا کاظم

علی صاحب لکھنوی کا مقولہ جو بڑے مہترک علماء شیعہ میں سے تھے اور قدوۃ الزماں مولوی دلدار علی

صاحب مجتہد بھی ان کے معتقد تھے یاد آتا ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اور کسی کو تو جس کسی کا جو

کچھ جی چاہے سو کہے پر خلیفہ اول کا برا کہنے والا تو ہمارے نزدیک بھی کافر ہے اہل محفل میں سے کسی

نے عرض کی کہ قبلہ آپ کیا فرماتے ہیں، مذہب تو اس کے خلاف ہی انہوں نے جواب دیا کہ میں

کیا کہتا ہوں خدا کہتا ہے صحابی اور صاحب کے معنی میں کچھ فرق نہیں۔ سو خدا بھی خلیفہ اول کے

صحابی ہونے کا گواہ ہے کیونکہ صاحب کے لفظ سے جو اس آیت میں موجود ہے شیعوں سنیوں کے

اتفاق سے ابو بکر صدیق ہی مراد ہیں سبحان اللہ اہل انصاف ایسے ہوتے ہیں جیسے مرزا کاظم علی

صاحب تھے اور وہ کچھ ایسے ویسے نہ تھے علم و زہد میں شیعوں کے نزدیک وہ بھی شہرہ آفاق تھے

کو نہ عالم شیعہ مذہب سے جو ان کو نہیں جانتا اور ان کو نہیں مانتا اور ان کا بھی اس بات میں

کچھ قصور نہیں اس آیت کو جس پہلو سے پلٹ کر دیکھئے کہیں گنجائش گفت و شنود کی نہیں ہر طرف

کے سنتوں ہی کا مطلب نکلتا ہے۔

آیت سوئم کی بصیرت انہیں شریح | شرح اس معما کی یہ ہے کہ اول تو لفظ صاحبہ جو لصاحبہ میں ہے وہ عربی زبان میں صحابی کے ہم معنی ہے دوسرے لفظ لاحتزن جس کا یہ مطلب ہے کہ غمگین مت ہو۔ وہ اسی پر دلالت کرتا ہے کہ ابوبکر صدیق عاشق صادق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومن با اخلاص تھے ورنہ ان کو غمگین ہونے کی کیا ضرورت تھی بلکہ محل خوشی تھا کہ ان کے دشمن موافق عقیدہ شیعہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خوب قابو میں آئے ہوئے تھے کفار جو اس وقت پاس آگئے تھے پکار کے بھی نہیں تو کسی قسم کی کھڑکی ہی تو نہیں مطلع کر دیتے تاکہ لغو ذلالت نہ ہو اپنا کام کرتے اگر کہیں انصاف کی آنکھیں مول طس تو ہم حضرات شیعہ کے لئے مول لیں اور ان کو دیں تاکہ وہ کچھ تو پاس رفاقت خلیفہ اول کریں

۵۔ جو پاس ہو و محبت یہاں کہیں ملتا تو مول لیتے ہم ایک اپنے ہر پاں کیلئے اور جو یہ بھی نہ ہو تو یہی سمجھیں کہ ان کو اس وقت اپنی جان کا خوف نہ ہوا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی کا افسوس رہا اور غم ہوا تو اس بات کا کہ دیکھئے یہ دشمن حق یعنی کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا کر بیٹھیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی اور فرمایا کہ غم کی کیا بات ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہو تو غمگین مت ہو۔

حزن کے معنی سمجھنے میں بعض غیر منصفوں کی ناش غلطی | اس جگہ بعض نا انصافیوں کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق کو اس وقت اپنی جان کا ہراس تھا کچھ پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا غور کرنے کی جگہ ہے اس بات کا یہ مطلب ہوا کہ خداوند کریم کو لغو ذلالت عربی بولنی بھی نہیں آتی فصاحت و بلاغت تو درکنار اور یہ جو کلام اللہ کے اعجاز بلاغت کا شہرہ یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوتی ہوتی تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو کچھ بھی عربی جانتے ہیں وہ بھی اتنی بات تو جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ غم کی جگہ اور فراق محبوب یا مملکت کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں اور جنہاں جان پریشانی ہے اور ڈر کا مقام ہوتا ہے خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی کتاب عربی زبان کی فصیح اور بلاغت امیز نہیں دیکھیے حضرت موسیٰ جب کوہ طور پر گئے اور خداوند کریم نے پوچھا کہ موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے انہوں نے عرض کی کہ یہ میری لاکھی ہے چلتے پھرتے اس پر

ہمارا رکھوں ہوں اور بچیوں کے لئے اس سے پتے تھاروں ہوں اور اس میں میرے اور
بھی بہت سے فائدے ہیں اور صرے حکم ہوا کہ اسے ڈالیں انہوں نے جو ڈالا تو وہ ایک اثر دھا بھی
یہ اٹھے پاؤں ایسے بھاگے مڑ کے بھی نہ دیکھا۔ اس وقت خداوند کریم نے فرمایا۔

أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ
الْمُزْزِعُونَ -

یعنی تو ادھر آ اور ڈرمت میرے پاس سول
ڈرا نہیں کرتے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو اس ارشاد ہا سے اپنی جان کا اندیشہ ہوا
تب بھاگے اسی لئے خدا نے تسلی فرمائی کہ ڈر مت یوں نہ فرمایا لَا تَحْزَنْ یعنی رنجیدہ نہ ہو اور
اسی طرح حب انہوں نے ایک قبیلے کو مار ڈالا اور فرعون کے لوگوں نے ان کے مار ڈالنے کا
ارادہ کیا تو یہ وہاں سے ڈر کے بھاگے اس موقع میں فرمایا فُخِّرْ مِنْهَا خَائِفًا یعنی بھگے۔
موسے وہاں سے ڈرتے ہوئے اور سو اس کے اور بیسیوں جگہ خوف کا لفظ کلام اللہ میں موجود
ہے جہاں کہیں یہی معنی ہیں اور جہاں غم کا مقام دیکھا وہاں ہی حزن کا لفظ استعمال کیا ہے سو
یوسف میں جس موقع میں حضرت یعقوب غم فراق یوسف میں ہائے یوسف ہائے یوسف
کہا کرتے تھے اور انہیں یاد کیا کرتے تھے اور حضرت یعقوب کے اور بیٹوں نے یوں کہا کہ تم
یوسف کو یاد ہی کرتے کرتے مر جاؤ گے حضرت یعقوب کی طرف سے یہ جواب منقول ہو۔ اَلَمْ
أَشْكُرْ نِعْمَتِي وَحُسْنِ بِنِ الْإِلَهِ یعنی میں اپنے رب سے اپنی پریشانی اور اپنا غم کہوں ہوں
بلکہ بہت سی آیات سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ حزن کے اور معنی ہیں اور خوف کے اور معنی
ہیں ایک دوسرے کی جگہ نہیں بولا جاسکتا۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أِنْ لَا تَخَافُوا
وَلَا تَحْزَنْ نُوعِنِ جِبِ پکے مسلمان مرنے لگتے ہیں تو فرشتے رحمت کے ان پر اترتے ہیں۔
اور یہ کہتے ہیں کہ نہ تم ڈرو اور نہ تم غمگیں ہو اگر خوف اور حزن کے دونوں کے ایک معنی ہو
تو مکرر کہنے کی کیا ضرورت تھی صحیح یہی ہے کہ غم اور حزن ہے اور خوف اور حزن ہے خوف اسے
کہتے ہیں کہ کچھ آگے کو اندیشہ ہو اور غم یہ ہے کہ بالفعل دل کی تمنّا ہاتھ سے نکل جائے غم خوشی
کے مقابلہ میں بولتے ہیں خوف اطمینان کے مقابلے میں خوشی اور اطمینان اور غم اور خوف کے
معنی بیان کرنے میں مجھے یہ شرم آتی ہے کہ کوئی کیا کہے گا یہ کونسی مشکل مخفی باتیں ہیں جنہیں کوئی

نہ سمجھتا ہو پر کیا کیجئے ایسے نا انصافوں سے پالا پڑا ہے کہ شاید اب بھی ان کی سمجھ میں نہ آئے
لہذا اتنا اور کہنا پڑا کہ جب کسی کا کوئی مرعاتا ہے تو اس پر جو حالت پیش آتی ہے اسے غم تو کہتے
ہیں پر خوف اور ڈر کوئی نادان بھی نہیں کہتا، ہاں مرنے سے پہلے جس موقع میں موت کا اندیشہ
ہوتا ہے اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں پر رنج کوئی نہیں کہتا اگر کسی کا لڑکا کسی دیوار پر
چڑھ جائے اور وہاں سے اندیشہ گر کر مر جائے گا ہو تو اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں لیکن
کوئی نادان بھی اسے غم نہیں کہتا۔ القصہ غم عین مصیبت کے وقت جو حالت ہوتی ہے اسے
کہتے ہیں اور خوف مصیبت کی آمد آمد کی کیفیت کا نام ہے۔ ایک کو دوسرے کو کچھ لگاؤ نہیں
جو حضرات شیعہ ہٹ و صرمی کر کے لَا تَحْزَنُ کے معنی لَا تَخَفُ گھڑ لیں۔

شیعوں کی کج فہمی کی ایک پُر مذاق توجیہ مگر ایک طرح وہ بھی سچے ہیں ان کے یہاں تو قاعدہ کلیہ ہے کہ
اللّٰہُ معنی سمجھتے ہیں مولوی عمار علی صاحب نے ناحق کے معنی حق سمجھے چنانچہ اس کا بیان گذر
چکا اور تمام شیعوں نے محافظوں کا نام چور رکھا علی القیاس یہاں بھی اگر وہ ایسا کریں تو
سینوں کو کیا شکایت ہی بلکہ خوش ہونے کی جگہ ہے کیونکہ اصل مطلب میں تو شریک ہی بکلی
لفظوں اور اصطلاح ہی کا فرق رہا سو یہ کیا بڑی بات ہے مصرع
ہر کے را اصطلاح دادہ ایم۔

حاصل تمہارے ان کے اختلاف کا یہ نکلا حق کا نام ان کی اصطلاح میں ناحق ہے
اور محافظ کا نام ان کی اصطلاح میں زور و عزن کا نام ان کے نزدیک خوف ہی مگر جیسے کوئی انگریز
تا بنیا مسلمانوں کی محفل میں کسی کو کسی کی نسبت بابا کہتے ہوئے سنا ہے تو اپنی اصطلاح کے
موافق اس وقت انگریز بیٹی کے معنی اور بنیاد ادا کے معنی سمجھتا ہے ایسے ہی حضرات شیعہ نے
اگر لَا تَحْزَنُ کے معنی لَا تَخَفُ کے سمجھ لئے تو ان کا کچھ قصور نہیں سینوں کو لازم ہے کہ ان کی اصطلاح
کے موافق ان سے باتیں کریں آخر حدیث میں تو یہ مضمون ہے کَلِمَاتُ النَّاسِ عَلَى قَدَرِ عُقُولِهِمْ
یعنی لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے موافق گفتگو کیا کرو اور اگر پیاس خاطر شیعہ لَا تَحْزَنُ کو
بھی ہم بمعنی لَا تَخَفُ ہی سمجھیں تب بھی ہمارا چنداں نقصان نہیں ہمارا ادھر بھی لیکھا ہے اس
لئے کہ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے ابو بکر مت ڈر۔ سو ظاہر ہے کہ ابو بکر جو خوفناک ہوئے

اور ان کو اپنی جان کا کھٹکا ہو گا تو اسی سبب ہو گا کہ کفار کو ان کے ساتھ دشمنی ہوگی اور وہ دشمنی بھی بوجہ اسلام اور ایمان ہوگی نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے کیا معنی اور وہ بھی پھر استقدر کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ خدا تو مسلمانوں کی طرفداری اور حمایت کرتا ہے
 اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اور اس قسم کے کلمات سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے سب کا حاصل یہی ہے کہ اللہ اچھوں کے ساتھ ہے مومنوں کے متقیوں کے اچھے کاموں کے کریموں کے ساتھ ہے کہیں اول سے آخر تک کلام اللہ میں یہ نہیں کہ اللہ کافروں کے مرتدوں کے منافقوں کے ساتھ ہے۔

اللہ کی معیت کی وضاحت | اور کوئی کہے کہ اللہ سب کے ساتھ ہے مومن ہو یا کافر کلام اللہ میں موجود ہے اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ۔ یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے۔ جب ہر چیز کو محیط ہوا تو ہر چیز کے ساتھ بھی ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ساتھ ہونا دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو یہی اکٹھے ایک مکان میں رہنا اس میں فقط تن بدن کا ساتھ ہوتا ہے اگرچہ دلوں میں فرق ہو، اس قسم کی ہمراہی تو طوطے اور زاغ کی سی ہے۔ دوسرا دلوں سے ساتھ رہنا جیسے کوئی بادشاہ کسی بیکس کو جس کے سب دشمن ہوں یوں کہے کہ تو اندیشہ نہ کر ہم تیرے ساتھ ہیں اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ ہمیں تیرا خیال ہی ہمارا دل میں تیرا دھیان ہے گا، ہم تیری حمایت پر ہیں۔ اس صورت میں کچھ لازم نہیں کہ بادشاہ اور وہ ایک مکان میں ہوں تو وہ اس کے ساتھ ہوں نہیں تو نہیں ہاں البتہ تا مقدور امداد و اعانت چاہیے۔ سو جہاں کہیں اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ یا اسی طرح اور کچھ آیا ہے تو اس سے دوسرے معنی مراد ہیں چنانچہ سب جانتے ہیں نہیں تو اس میں متقیوں ہی کی کیا تعریف کلی اور انہیں کی کیا تسلی ہوگی۔ سو خاص کر اس آیت میں تو محض تسلی ہی کے لئے یہ کہا گیا ہے اور اوپر مذکاری ہی کا بیان ہے۔

آیت معیت سے حضرت ابو بکر کی مدد کا ثبوت | باقی یہ کوئی شبہ کرے کہ اوپر سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا بیان ہے، ابو بکر صدیق کی مدد تو نہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو بازاری بلکہ جولا ہے کی لونڈیاں بھی جانتی ہیں کہ غلام کی اہانت اور اس کی رسوائی وہ میاں ہی کی رسوائی گنی جاتی ہے انگریزوں کی رعیت کو اور ملازموں کو اگر ان کے غنیمت ستاتے ہیں تو انہیں کیوں اتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ فوج کشی کرتے ہیں اور ہزاروں آدمیوں کا خون کراتے ہیں معذرا ہم نے غلہ کے

ایام میں دیکھا ہے کہ جس نے تحصیلدار یا پولیس وار کو بچالیا تھا وہ خیر خواہ سرکار گنا جاتا تھا سو ابوبکر صدیق کی مددگاری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مددگاری ہی اسی لئے ہمارے سناتے وقت تو یوں فرمایا فَقَدْ نَصَرَكَ اللَّهُ اور مدد کے وقت دونوں ہی کی مدد کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق کو جو خدا کی مدد کی اطلاع کی تو یوں کی اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا یعنی خداوند کریم خبر سانی میں اس قصہ کی تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر فرماتے ہیں اور یوں کہتے ہیں فَقَدْ نَصَرَكَ اللَّهُ یعنی اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فلانے وقت مدد کی اور جس وقت کہ مدد کی تو دونوں کی مدد کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مدد کی اطلاع کی تو یوں کی اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا یعنی اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے ساتھ ہو اور چونکہ ایک لفظ یعنی معنا سے دونوں کی مددگاری کا بیان فرمایا اور دو لفظ نہ کہے یعنی مَعِيَ وَمَعَكَ نہ فرمایا جس کے یہ معنی ہوتے کہ خدا میرے بھی ساتھ ہی اور تیرے بھی ساتھ ہے تو اس سے اور بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح سے خدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اسی طرح حضرت صدیق اکبر کے ساتھ تھا سو اس میں تو ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی بنا چاری ہمارے شریک ہوں کہ خداوند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امداد اور عنایت اور محبت اور اعانت سے تھا تو حضرت صدیق کے ساتھ بھی اسی انداز سے سمجھنا چاہیے معنٰی لفظ ثَانِي الثَّانِي جس کا یہ مطلب ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک اور بھی تھا یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ضمیر مفعول اِلَّا تَنْصُرُوْهُ سے حال واقع ہوا ہے سو اس صورت میں یہ لفظ بھی باواز بلند ہی کہتا ہے کہ حضرت صدیق بھی مددگاری خداوندی میں شریک ہیں۔

آیت معیت میں شیعوں کی طرف ایک عبارت دھوکا اور اس کا جواب اور اگر شیعہ یوں کہنے لگیں کہ یہ

لفظ اٰخَرُ حُبِّ الدِّیْنِ کے ساتھ مربوط ہے اور اس کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے اور یہ مطلب ہے کہ جس وقت کفار نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے نکالا تھا اس وقت وہ اکیلے نہ تھے ان کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور اس کو نصرت سے کچھ تعلق نہیں نصرت سے تعلق جب ہو کہ اس لفظ کو لفظ نَصَرَ اللّٰه سے علاقہ ہو تو اس تقدیر پر ہماری طرف سے یہی حجاب

شکر بدہان تو چشم مارو دشمن دل ماشاد

اگر یہ مطلب ہو تو ہماری عین تمنا ہے کیونکہ انا تو شیعوں کو معلوم ہوا کہ کفار کو جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی ویسے ہی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی عداوت تھی باقی کوئی یوں کہے کہ ابو بکر صدیق کو تو کفار نے نہیں نکالا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمراہ لے لیا تھا۔ سو اس کا جواب شیعہ دیں کیونکہ یہ معنی تو ہم نے انھیں کی طرف سے بیان کئے ہیں اور اگر ہمیں سے پوچھتے ہو تو ہمیں سے سنئے۔ جناب من بشارات کلام اللہ کفار نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس طرح سے نہیں نکالا کہ ہاتھ پیرا کر باہر کر دیا ہو یا دھکے دینے کا اتفاق ہوا ہو۔ مثلاً

دارالندۃ کے واقعہ کی اصل شکل | بلکہ صورت یہ ہوئی تھی کہ دارالندۃ میں جو ابو جہل کی بیٹھک کا نام تھا اور وہ خانہ کعبہ کے پاس تھی جہاں اب حنفی مصلے بنا ہو چکے ہیں اور اب وہ جگہ داخل حرم محترم ہو گئی ہے وہاں کفار مجتمع ہوئے اور اس بات کا مشورہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کرنا چاہیے یا مار ڈالنا مناسب ہے یا کہیں انہیں نکال دیجئے اس مشورہ کی اطلاع خداوند کریم نے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کر دی آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رفیق ولی سمجھ کر ساتھ لیا اور فارث اور میں تشریف لے گئے پھر تین دن کے بعد سواری اور راہ کا بندوبست کر کے دونوں صاحب مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے چنانچہ اس بات کی طرف بطور اختصار سورۃ انفال میں جناب خداوند کریم اشارہ فرماتے ہیں

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا
لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ
وَمِمَّا كُنْتُمْ دُونَ ذَلِكَ اللَّهُ وَاللَّهُ
خَيْرُ الْمَاكِرِينَ

یعنی وہ بھی یاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ کفار
تیرے ساتھ مکر کرنا چاہتے تھے ادا ان کا یہ ارادہ تھا
کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر دیں یا نکال دیں اور وہ یہ
مکر کر رہے تھے اور خدا ان کے ساتھ مکر کر رہا تھا یعنی
تجھے اطلاع کر دی پھر فارم میں تیری حفاظت کی یہاں تک
کہ مدینہ منورہ خیریت سے پہنچا دیا اور کیوں نہ ہو اللہ
تو سب زیادہ مکر جانتا ہے۔

اس قصہ کو غور کیجئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہاتھ پیر کے نہیں لگلا تھا اور اگر یوں کہیں کہ ایذا کے درپے ہونا لگالنا ہی ہے تو ابو بکر صدیق کے ہونے کی انہیں کو کسی راحت تھی بلکہ اس سے پہلے بھی انہیں تو نکال دیا تھا نہ ابن دغنے انھیں ہٹا کے لائے۔ اور کفار سے ان کے باب میں گفت و شنود کرے نہ وہ ہیں یہ روایت سنیں کی کتابوں میں تو موجود ہے پر عقل بھی یوں کہے ہے کہ یوں ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ خداوند کریم نے اِذْ يَقُولُ بِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا کے ضمن میں اس بات سے متنبہ کر دیا کہ ابو بکر صدیق سے بھی کفار دشمنی رکھتے تھے نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کیوں تسلی کرتے اور خدا کیوں ان کے ساتھ ہوتا اور ہمیں تو اتنا بھی بہت ہے کہ خدا ان کے ساتھ اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس تقریر کے سننے کے بعد یقین یوں ہے کہ شیعہ اس احتمال کو زبان پر بھی لائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر کو اس لئے ساتھ لیا تھا کہ وہ ہمیں کفار کو اطلاع نہ کر دے کیونکہ اس احتمال کی جڑ بنیاد تو اس آیت کے ہر ہر لفظ نے ایسی اکھاڑی ہے کہ شیعہ اپنے سر کو قیامت تک پیٹیں تو نہ جھمکی معہذا جناب سالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ کچھ ایسے کم فہم نہ تھے انکی عقل کا تو ایک عالم دیوانہ ہے کیا وہ اتنی بھی نہ سمجھے کہ اس اندیشہ کے سود فعیہ ہیں کہ ابو بکر صدیق کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی اول سے اطلاع ہی نہ کرتے کہ میں غار ثور میں جا کر چھپوں گا تو ابو بکر صدیق کچھ شیعوں کے امام تو نہ تھے کہ ان کو علم ماکان و مایکون یعنی ازل ابد کے سب قانع کی خبر تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتلاتے یا نہ بتلاتے ان کو آپ اطلاع ہو جاتی ماسوا اس کے تفتیہ تو ایسے وقت میں ضرور ہی ہو جاتا ہے چنانچہ شیعوں کے نزدیک ایک تفتیہ کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار میں چھپ جانا بھی ہے خیر یہ قصہ تو تفتیہ کی اصل جیسی سو ہے انشاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گا۔ پر شیعوں کے مذہب کے موافق تو ایسے وقت میں تفتیہ فرض ہو جاتا ہے اور جھوٹ بولنا مباح، بلکہ ضرور چنانچہ اماموں نے جو اصحاب ثلاثہ یا اور صحابہ کی تعریف کی ہے اور وہ ان کی کتابوں میں موجود ہے اس کو شیعہ یوں کہتے ہیں کہ اماموں نے بوجہ تفتیہ جھوٹ کہہ دیا تھا نعوذ باللہ منہا۔

القصد حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جھوٹ بول کر ابوبکر کے دل سے غار
 ثور کی طرف جانے کا احتمال نکال دیا ہوتا کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ان کو ساتھ لیا۔ اور
 ایک جان کا وہاں خریدنا ہوتا تو بے کھٹکے ہوتے ان کے ساتھ وہ اندیشہ جس اندیشہ کے
 لئے انہیں ساتھ لیا تھا اور وہ بالا ہو گیا اگر وہ کسی بہانہ سے وہاں سے نکل کر کفار کو اطلاع
 کر دیتے تو بظاہر کون مانع تھا یا جس وقت کفار وہاں اکھڑے ہوئے اس وقت بول اٹھتے
 تو وہی مثل ہو جاتی کہ مینہ سے بھاگے پر نلے کے نیچے جا کھڑے ہوئے دھوپ سے بچے پر آگ میں
 گر پڑے، القصد اگر ابوبکر کے ساتھ لینے میں یہی مصلحت تھی تو یہ تو مصلحت سے کوسوں دور ہے
 ملا عبد اللہ مشہدی کی بے اختیارانہ حق گوئی | اسی واسطے ملا عبد اللہ مشہدی نے اظہار الحق میں

لاچار ہو کر انصاف کی راہ سے یہی کہا کہ نفس الامر تو یوں ہے کہ یہ احتمال بہت ہی بعید ہے مگر وہ
 نقل مشہور ہے کہ ستر برس کا رام جی میں بیٹھا ہوا نکلتے ہی نکلتے ہے اتنی توفیق نہ ہونی کہ حق
 بول اٹھیں اور اپنے بیگانہ کا کچھ لحاظ نہ کریں اب ہم سے سنتے ہیں کہ ملا عبد اللہ مشہدی کا کہنا
 بجا اور درست اور اس کے حق ہونے میں کچھ شک نہیں اور اس وجہ سے اگر ان کی کتاب کو
 کو اظہار الحق کہیں تو پھبے ہے اور ہم کو بھی اس بات کی تسلیم سے انکار نہیں اگرچہ ملا مذکورہ شیعہ
 مذہب ہیں۔ ع۔ متاع نیک ہر دوکان کہ باشد

مگر ستم تو یہ ہے کہ شیعہ حتیٰ کہ علماء بھی باوجودیکہ ملا عبد اللہ مذکور کو اپنا مقتدا دین سمجھتے
 ہیں اس بات ان کی بھی نہیں سنتے ہر چند ملا مذکور آخر کو یہی کہہ اٹھے کہ عجب کیا ہے جو خلیفہ اول
 کو جناب سر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری اوچھڑی کے لئے اس لئے اختیار کیا ہو کہ انہوں
 نے اپنی بیٹی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بکاح کر دیا تھا اور اکثروں سے پہلے مسلمان
 ہوئے تھے اور اکثر ملازم خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہتے تھے لیکن کیا امکان جو حضرات
 شیعہ رو بہ راہ ہوں بلکہ عجب نہیں کہ مجتہد الزماں کے یہاں سے ان کے لئے بھی حکم تبرّاح صادر ہو
 سفرہ بکشت کی حقیقت حال | خیر کوئی مانے یا نہ مانے پر دل سب کاسنی ہوں یا شیعہ یہی گواہی
 دیتا ہے کہ ابوبکر صدیق کا ہمراہ لے جانا فقط اس وجہ سے تھا کہ ان کو کفار رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کا وزیر مشیر اور معین اور مددگار سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا محب

خاص اور ہمدم با اختصاص جانتے تھے اور کیوں نہ سمجھیں شیعہ سنی کون نہیں جانتا کہ انہوں نے
ابتدا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت سے کفار کے ہاتھ سے کیا کیا ایذا میں رہیں۔ اور
کس قدر جفا تیں اٹھائیں اور کس قدر مال لٹایا اور کیا کیا کر دکھلایا۔ بلال رضی اللہ عنہ کو بول لیا اور قید
کفار سے چھڑا کر آزاد کیا اور علیؑ اہل القیاس اللہ اور رسول کی خوشنودی کی اور سب اپنا خانماں
بر باد کیا پس در صورت ان کے مکہ میں چھوڑ جانے کے ایک تو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
کو یہ یقین کامل تھا کہ کفار ان کو اور مجھے یکساں سمجھتے ہیں جو کفار نابکار نے میرے لئے بخیر کیا ہے
ان کے لئے ہے انہوں نے بیشتر کفار سے مقابلہ کیا ہے اور ان کو بارہا یہ وعظ و پند کیا ہے کہ دین
اسلام دین حق ہے بت پرستی چھوڑو اگر سعادت مد نظر ہے اتباع نبوی اختیار کرو اگر ان کو یہاں
ہی چھوڑ گیا تو کفار ان کو ہرگز زندہ نہ چھوڑینگے۔ ہاں عمر کو اگر ساتھ نہ لوں تو کچھ مفاہقہ نہیں کہ ان سے
کفار کو چنداں پر خاش نہیں اور بایں ہمہ ان کے طرح طرح کے لحاظ پاس ہیں منجملہ ان کے یہ بھی ہے
کہ ابو جہل کے جو رئیس کفار ہو بھانجے ہیں باقی اور اصحاب کو کفار نگو نہ سار کچھ اس ورئیں دین و ایمان
نہیں سمجھتے پھر تیسرا ان کے بچاؤ کے اور بہت وجوہ ہیں پر ابو بکر کی رفاقت کفار کی آنکھوں میں غاری
ان کو دیکھ دیکھ لو کہ گھونٹ پیتے ہیں یہ اگر مارے گئے تو بڑا رکن ایمان و اسلام ڈھ جائے گا۔
اور ایسا رفیق شفیق اور ایسا مخلص کہ اس کا اخلاص و محبت دل میں اثر کرتا ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔
بایں ہمہ ایسے سفر و خطر میں بے رفیق کے نہیں گذرتی پھر رفیق بھی ایسا چاہیے کہ نہ جان سے دریغ
ہو نہ پاس آبر و ہون و فرزند کی محبت سے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل پر غالب
ہو اور تیسرا گرم و سرد زمانہ دیکھے نہ تجر کا سیر و سفر مرد ہو شیار بیکانہ روزگار بلند ہمت عالی فطرت
یار بے تکلف محب صمیم راز دار قدیم ہو جس سے دل کی بات کھلے، دل خالی ہو غم و حیرانی و حشت و
پریشانی اس کی صحبت سے دور ہو۔ سو مجموعہ ان اوصاف کا سوار جناب صدیق کے کسی اور میں نہ پایا اسی
لئے عین دوپہر کے وقت آپ ان کے گھر تشریف لائے اور عاضری پکوا کر دونوں مخدوم عالم
اور خادم ہمدم رونق افروز غار نور ہوئے اور عبداللہ بن ابی بکر کو کہ فرزند ارجمند سپر کلاں حضرت
صدیق کے تھے جاسوسی کے لئے مقرر کیا کہ مشورہ کفار سے جو کچھ وہ درباب طلب و تلاش حضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریں شب کو آگاہ کرتے رہیں

واقعہ سے شیعہ کی خام خیالی کا جواب اگر خاندانِ صدیقی کو کچھ بھی عداوت ہوتی تو یہ معاملے کہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض والتقدیر نفرض محال ایسے مشورے پیش بھی آتے تو اس سے بہتر کینہ کشی کا وقت ان کے پھر کو نساہاتھ آتا انعامِ کفار جہالتیے اور اپنا کام جدا کرتے حضراتِ شیعہ ہی اپنی کتابوں کو دیکھ کر فرمائیں کہ میں نے اس قصہ میں کیا جھوٹ ملا دیا ہے بسرِ مو اگر فرق پائیں تو جو چاہیں سو کریں۔ منصفوں کو تو بے اس کے کہے نہیں بن پڑتی کہ ایسے وقت کی ہمدی اور ہمہری اور اس اتہام اور انتظام سے ان کا ساتھ لینا ایسی بڑی فیصلت ہو کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس شب بستر پر سو رہنا بھی اس کے ہم سنگ نہیں ہو سکتا۔

غدر میں سب دیکھا ہو گا کہ تلاشی کے وقت اگر مجرم نہیں ملا تو حکام نے ان لوگوں سے کچھ پر خاش نہیں کی جو اس مقام پر ملے ہاں جس کو رفیق و مددگار مجرم دیکھا اس کو بھی مجرم ہی سمجھا جائے افسوس کہ خدا تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت حضرت صدیق کے حق میں مقبول نہ ہو، فقط اس شرم سے کہ مسلمان کہلاتے ہیں اگر خدا کے کلام کو نہ مانیں گے تو جواب کیا دیں گے۔ اس آیت کو جزا کر ہا اگر سر دھرتے ہیں تو ہزار طرح کی نامعقول تاویلیں گھڑتے ہیں پر چند منقریان سیہ باطن تیرہ دروں کی گھڑی ٹھڑی باتوں کو ایسا دل و جان سے بے جملہ و حجت قبول کرتے ہیں کہ اگر اس کے قبول کر سکیو کلام اللہ کے قبول کرنے سے موازنہ کریں تو کلام اللہ کا تسلیم کرنا اسکے پاسنگ بھی نہیں رہتا۔

آیتِ معیت کی منصفانہ ترجمانی | ہمیں اس میں شک بھی نہیں کہ حضراتِ شیعہ کے دل میں اس آیت سے اول و ہلہ ہی معنی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق کو اگر اس وقت رنج تھا تو یہی تھا کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بے بس و بکیں ہیں میں ایک تنہا کیا کر سکتا ہوں مبادا دشمنانِ دین جو پاس پاس کو پھرتے ہیں اس طش کو جھانک اٹھیں اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ہلاک کر جائیں اور ہماری حسرتیں اور تمنائیں سب دل کی دل میں رہ جائیں مگر چونکہ کمال درجہ کی بے بسی اور بے سرو سامانی کو امداد و اعانت لازم ہے چنانچہ کلام اللہ میں ہے۔

یعنی جب کہ ناامید ہو گئے رسول اور انھیں یہ وہم ہوا

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ

کہ یہ دیکھ جو دریاب نصرت اور مدد گاری کے

قَدْ كُنِيَ بَوَّاجَاءَهُمْ نَصْرُنَا

ہم سے تھے مبادا خیالِ شیطانی ہوں ہم اپنی غلط فہمی سے

اسکو مدد خداوندی سمجھتے ہوں۔ آئی ان کو ہماری مدد۔

اس مایوسی میں جو حضرت ابوبکر کو باعتبار ظاہر کے پیش آئی تھی نزول امداد ہوا اور یہ بشارت ہوئی کہ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا اے ابوبکر مایوس اور غمگین نہ ہو تسلی رکھ ہمارے ساتھ خدا ہے القصہ اس وعدہ صادق نے طہور فرمایا اور کفار نکو نسا کے شر سے ان دونوں ہند گان غاص کو بچا کر بحفظ تمام مدینہ میں پہنچایا اور پھر دین کو یہ رونق دی کہ اظہر من الشمس سود عادی نی چاہیے ابوبکر صدیق کی جان کو کہ وہ اتنے غمگین ہوتے نہ اس کا یہ ثمرہ مترتب ہوتا کہاں ان کے صدقہ سے یہ نصرت ہو کہاں ملک ایران وغیرہ قبضہ کفار سے چھوٹیں اور شیعوں کو ٹھکانہ ملے مگر اس نااہلی کو دیکھتے کہ شکرانہ کے بدلے ان کے ساتھ وہ کرتے ہیں کہ کوئی اپنے دشمن کے ساتھ نہ کرے

ع۔ ہر احمقیر تو امید نیست بدمرسان

آیت معیت میں شیعوں کی ایک اور مفسدہ خیر تاویل اور اس کا بطلان اس مقام میں بعض متعصب لاچار ہو کر بہت پیچ و تاب کھا کر شاید کہیں تو یہ کہیں کہ واقعی اس زمانہ تک تو ابوبکر ایسے ہی تھے جیسے خدا کے کلام سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بات پھر نہ رہی ہوگی، یہ شبہ اس قابل نہیں کہ کوئی اس کے جواب کی طرف متوجہ ہو بلکہ شیعوں کو لازم ہے کہ اس بات کو منھ پڑھ لائیں۔ مبادا کوئی ہند و انگریز سن کر یوں کہنے لگے کہ ایسے خدا ہی کو سلام جسے چار دن کے بعد کی خبر نہ ہو اور اگر بفرض محال حسب گفتار شیعہ نقل کفر کفر نباشد خدا کو ابوبکر صدیق کے ان اطواروں کی جو ان سے بعد میں ظہور میں آئے خبر نہیں بھی تھی اور بھولے چو کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی تب لازم تھا کہ اپنی اس بات کی پیچ کتا اور جوں توں ابوبکر صدیق کو راہ راست پر لاتا خدا تھا کچھ نا خدا تو نہ تھا کہ باد مخالف میں لاپار ہو کر بیٹھ رہے بندوں کو تو اپنی بات کی پیچ ہوتی ہو خدا تو خدا، ابوبکر صدیق کے حق میں تو یوں کہا کہ ہم اسکے ساتھ ہیں اور ادھر یوں سنا گیا کہ لَا تَبْتَئِنِ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ يَا مَعْزِرُ اَلْقَوْلِ لَدَيْهِ دُونِ آيَاتِ كَايَهِی مطلب ہے کہ خدا کی بات بدلی نہیں جاتی اور پھر تیسرا ابوبکر کا ساتھ چھوڑ دیا یہاں تک شیطان نے اسے آدیا یا، یا یوں کہیے نعوذ باللہ خدا ساتھ تو تھا پر خدا سے شیطان کے مقابلہ میں کچھ ہو سکا تَعَالَى اللَّهُ عَنْ ذَلَّتْ عَلْوًا کَثِيرًا بجز شیعوں کے اور کسی یہ لیر کا ہے کہ ایسی بات منہ پر لاسکے۔

آیت معیت کے الفاظ بھی شیعوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ اَوَّلُ تَوَاتُرِ اللَّهِ مَعَنَا یہ ایسا جملہ ہے کہ عربی کے محاورہ کے موافق اس میں سے ہمشکی کی بو آتی ہے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ فن بلاغت کے قواعد سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں بلکہ اتنی بات تو یقین یوں ہے مولوی عمار علی

صاحب بھی جانتے ہوں دوسرے ہم نے مانا اس جملہ کی کچھ ہمیشگی نہیں رکھتی پر اتنی بات تو شیعوں کو بھی تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ اس وقت خاص میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس خدا کی ہماری اور ہماری میں شریک تھے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا کبھی علیحدہ ہو گئے ہوں اور ان کی ہماری اور طرفدار کی چھوڑ دی ہو سو ان اللہ معنا۔ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تو دائمی نکلا اس صورت میں ابو بکر صدیق کا حصہ بھی دائمی ہو گا کیونکہ دونوں کے حصے ملے ہوئے ہیں بٹے ہوئے نہیں ایک مع کالفاظ دونوں کے واسطے ہے دو لفظ جدا جدا نہیں یعنی معی و معک نہیں فرمایا تیسرے ہم اس سے بھی درگزرے ہم یوں کہتے ہیں کہ شیطان کا مقولہ سورہ ق میں یوں منقول ہے

یعنی شیطان قسم کھا کے کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے

قسم ہے تیری عزت کی میں سب ہی بنی آدم کو بہکا

دل کا مگر جو تیرے چھٹے ہوئے بندے ہیں تو نے

انہیں اپنے لئے چھانٹ لیا ہے۔

فَبِعَنِّي لَهُ لَا غُورِيَهُمْ أَجْمَعِينَ

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ

کیونکہ وہ میرے دست قدرت سے باہر ہیں وہ تیری پناہ میں آگئے ہیں سو چونکہ تو ان کے ساتھ ہے اور وہ تیری پناہ میں ہیں وہاں میرا کچھ قابو نہیں چل سکتا اور سورہ حجر میں إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ کے بعد بطور تصدیق کے شیطان کے مقولہ کے جواب میں خداوند کریم کی طرف سے یوں ارشاد ہوا إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ یعنی شیطان کو کہا جاتا ہے کہ تو اس بات میں سچا ہے جو میری پناہ میں آگئے ہیں ان پر تیرا بس نہیں چل سکتا اب بعد اس کے غور فرمائیے کہ حضرت ابو بکر صدیق کا پناہ خداوندی میں آ جانا تو اس آیت ہی سے ثابت ہے یعنی إِنَّ اللہَ مَعَنَا سے صاف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ تو صدیق اکبر پناہ خداوندی میں آگئے اور خدا کے دربار میں اور حشر میں گویا داخل ہو گئے پھر بعد اس کے جو وہاں سے نکلے تو شیطان کے نکالے تو نکل ہی نہیں سکتے اور کس نکالا اور اگر یوں کہیے کہ خدا ہی نے اپنی پناہ سے نکال دیا تو خیال خود غلط ہے کیونکہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے

إِنَّ اللہَ لَا یَغِیْرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ | یعنی اللہ تعالیٰ اپنی راہ و رسم کو کسی قوم کے ساتھ

يُغَيِّرُ وَاَصَابًا لِنَفْسِهِمْ

جب تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے طور
و انداز کو نہ بدل دیں

معیت حق صدیق کی ذات کے ساتھ تھی | اور خود حضرت ابو بکر صدیق بے اغوار شیطانی اور بے استدراج

خداوندی اپنی روش بدل لیں یہ محالات میں سے ہے اس واسطے کہ یہ بدیہات میں سے بلکہ
اظہر من الشمس ہو کہ ہر قسم کے کام کے لئے ایک استعداد ہے۔ داد و ہش کے لئے سخاوت چاہیے۔ مار
مرنے کے لئے شجاعت چاہیے۔ سو ایسے ہی برے کام اور گناہ کی باتوں کے لئے بھی ایک استعداد اور
قابلیت چاہیے۔ سو وہ قابلیت اگر تھی تو خدا نے چھانٹا ہی تھا کس خوبی پر نغوز بال اللہ خود کلام
ربانی ہی میں موجود ہے۔

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ
وَالْطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ
لِلطَّيِّبَاتِ ط

یعنی بری چیزیں بروں کے لئے اور برے بری
چیزوں کے لئے۔ اور اچھی چیزیں اچھوں کے لئے
اور اچھے اچھی چیزوں کے لئے۔

بلکہ اس موقع میں جو یوں ارشاد ہوا اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے اس سے
یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ ان سے جدا نہ ہو گا۔ سو وجہ اس کی یہ ہے اگر اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ۔
یعنی اللہ مومنوں کے ساتھ ہو بعد لفظ لا تَحْزَنُ کے فرماتے تو یوں بھی گمان ہوتا کہ اللہ کی ہمہری
ایمان کے ساتھ مشروط تھی۔ جب ایمان کیا۔ ہمہری بھی ساتھ گئی اور در صورتیکہ بے کسی شرط
کے ہمہری ہو تو وہ دائمی ہوگی اس میں زوال کا احتمال نہیں۔ قرابت کی وجہ سے جو ارتباط ہوتا
وہ قابل زوال نہیں ہوتا اور آپس کی دوستی میں جو بوجہ اخلاق اور احسانات باہمہری کے ہوتے
ہیں وہ جب ہی تک رہتے ہیں کہ اخلاق اور احسان باقی رہیں اسی واسطے دوستی ٹوٹ جاتی ہے
رشتہ لہنی نہیں ٹوٹتا القصة تسب کے حقوق جان کے ساتھ ہوتے ہیں اور دوستی کے حقوق احسان
کے ساتھ سو چونکہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فرمایا ہے اور اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ وغیرہ جو کسی وصف پر
دلالت کرے نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ ابو بکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی ہمہری جان کے ساتھ ہے
کسی وصف کے ساتھ نہیں پھر اگر خدا کی ہمہری بدل جاتے تو موافق آیت مذکورہ بالا اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُغَيِّرُ الْاٰيٰتِہِ کے کسی وصف میں تغیر آنا ضروری اور جب اوصاف کے تغیر اور تبدیل پر معیت

اور ہم ہی میں بھی تغیر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ معیت اور ہم ہی ان اوصاف ہی کے سبب بھی بے وجہ نہ تھی اس صوت میں لازم آوے گا کہ خدا سے بڑی چوک ہوئی کہ اُس وصف کا نام نہ لیا یا خداوند کریم بھول گیا اور اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ کی جگہ مثلاً اِنَّ اللّٰهَ مُعَاْفِرُ مَا دَانَ لِعُوْدِ الْاِنْسَانِ سَوْءُ الْعِلْمِ خداوند کریم اور چوک جائے یا بھول جائے خدا کی توبہ شان ہے جیسے کلام اللہ میں آیا ہُوَ لَا يُضِلُّ نَبِيًّا وَلَا يَنْسِيْ عٰلِيًّا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے نہ بھولے،

آیت میں معنا کا لفظ حضرت ابوبکر صدیق کے رتبہ کا آئینہ دار ہے | انصاف اگر ہو تو اس لفظ معنا سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر صدیق کا رتبہ کچھ لگ بھگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبہ کے ہے جو ایک قسم کی معیت ان دونوں کے واسطے خداوند کریم نے بیان فرمائی۔ سو یہ بات بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ صدیق اکبر ان کو کہا جائے اور تمام اُمت محمدی اور سوائس کے اور امتہائے ماضیہ و ان کو افضل سمجھا جاتے جب کہیں ان کے رتبہ اور مقام کی حصر اعلیٰ مقام نبوت کی سرحد اسفل سے متصل ہو اور یہ لیاقت بہم پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بات میں شریک ہوں سو یہ بات شیعہ سنی سب جانتے ہیں کہ ایسا مقام جو مقام نبوت سے متصل ہو بجز صدیقیت اور کوئی نہیں کیونکہ کلام اللہ میں بعد انبیاء کے صدیقین ہی کو ذکر کرتے ہیں سوائس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کی امت کے صدیق اکبر کا رتبہ اس نبی کے رتبے سے متصل ہی نیچے ہوتا ہے سو چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو اور نبیوں کی نبوت سے بالاتر ہے تو اس امت کے صدیق اکبر کا رتبہ اپنی امت کے صدیقوں کے مرتبہ سے تو بڑھ کر ہی ہو اور امتوں کے صدیقوں کے مرتبہ سے بھی بالاتر ہو گا۔ اب پس کیجئے کہ منصفوں کے لئے یہ بھی بہت ہی اور متعصبوں کو خداوند کریم اگر سمجھائے تو شاید مانیں ہم حبیبوں کی کاہے کو مانیں گے مگر ہمیں بطور نصیحت اس قدر کہنا لازم ہے کہ خداوند کریم جس کے ساتھ ہوتا ہے اس کے دشمنوں کی خیر نہیں ہوتی۔

شیعوں کی ایک اندازہ گیر اور اس کی روک تھام | اس کے بعد کوئی کہے گا تو یہی کہے گا کہ لا تحزن ان اللّٰهَ مُعَاْفِرُ مَا دَانَ لِعُوْدِ الْاِنْسَانِ سَوْءُ الْعِلْمِ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقولہ یہ خداوند کریم فقط ناقل اور راوی ہے کچھ اپنی طرف سے نہیں فرماتے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس وقت صادر ہوا اسے بعینہ نقل کر دیا جیسے فرعون کا اَنَّا رَبُّكُمَا اَعْلٰیٰ کہنا یعنی میں تمہارا بڑا

ہوں۔ یا ابلیس کا انا خیر منہ کہنا یعنی میں آدم سے بہتر ہوں بعینہ نقل کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چند رسول ہیں لیکن پھر بھی انسان ہیں اور یہ مثل مشہور ہے الا انسان کتب من الخطاء والذنیان سو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ غلطی ہو گئی ہو تو کیا بعید ہے جواب اس کا یہ ہے کہ واقعی شیعوں کیلئے یہ بڑی مایہ افتخار ہے لازم تو یوں ہے کہ عید بابا شجاع سے اس کی خوشی کم نہ ہو اگرچہ کسی سنی ہی کی تہلانی ہی مطلب کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنالیا کرتے ہیں۔ سنی تو ان کے قدیمی استاد ہیں اور استاد بھی کو نے جن سے کلام اللہ سیکھا جس کا رتبہ حقیقی باپ سے بھی بڑھ کر یہ بات بھی اگر ان سے سیکھ لی تو کیا مضائقہ ہے مگر اتنا کہنا میرا بھی ماننا چاہیے کہ سورہ نجم کو ساری کی ساری نہیں تو اتنے ہی کلمہ کو ساقط کر دو۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ
یعنی ہمارا پیغمبر جو کچھ ہمارے حوالہ سے کہے ہے وہ کچھ اپنے جی سے نہیں تراش لیتا بلکہ وہ نری وحی ہے

اس میں کسی طرح کار لاؤ نہیں نہ کچھ دخل فصل ہو نہ وہم کا یا عقل کا کچھ دخل ہو خلیفہ ثالث نے امیر المومنین علی مرتضیٰ وصی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے کلمات اور آیات کیا سورتیں کی سورتیں جو خلافت پر دلالت کرتی تھیں کلام اللہ سے نکال دیں تم اس کی پاداش میں ایک آیت جو فی الجملہ اثبات فضیلت خلیفہ اول میں کار آمد ہو اگر نکال دالو تو از قبیل جزاء و سببہ سببہ مثلاً کے ہوگی بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ اس آیت کے معنی تو فقط اتنے ہی ہیں کہ بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے سو یہاں برابر کیا۔ آدھوں آدھ کی بھی نسبت نہیں تقریباً گیارہ ہزار آیت کے بدلے میں ایک آیت کو کون برابر کر دے گا اور پھر وہ بھی ایسی کہ اس کے جاتے رہنے سے کوئی حق تلف نہیں ہوتا خلیفہ ثالث نے تو یہ کمال کیا کہ اتنی آیتیں بھی نکال دیں اور آیتوں کو نکال کر عوام کی آنکھوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق بھی نہ رکھا۔ خیر یہ بات تو دور جا پڑی حاصل یہ ہو کہ آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا خدا ہی کا کہا ہے فاصلہ ایسی بات کہ جو منجملہ اخبار غیب ہے کیونکہ خدا کی معیت تو کچھ آنکھوں سے نظر نہیں آتی بلکہ اخبار غیب میں سے بھی اول قسم۔ اس لئے آیت اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ہمنگ آیات متشابہات ہے ان میں عقل کو کسی طرح دخل نہیں ہو سکتا جو کوئی یونہی کہے کہ عقل کے وسیلے سے بہت سے وقائع آئندہ کی اطلاع ہو جاتی ہو

خسوف کسوف اکثر واقفان علم ہدایت کو معلوم ہو جاتے ہیں سو اگر ایک واقعہ بالفعل کی کچھ اطلاع عقل کے وسیلے سے ہو گئی ہو تو کیا عجب ہاں اگر کوئی حکم حلت حرمت کا ہوتا تو البتہ اس میں اجتہاد کی گنجائش تھی احتمال ہو سکتا تھا کہ جیسے پچھلے اماموں نے اجتہاد کئے ہیں اگر کسی بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہو تو کیا عجب، چنانچہ سنی اجتہاد نبی کے قائل ہیں مضمون ان اللہ صغنا میں کوئی احتمال بجز اس کے نہیں کہ جو کچھ آپ کی زبان پر جاری ہوا وہ سب القائل ربانی تھا کوئی احتمال مفید مطلب شیعہ اس آیت کے پاس گویا نہیں بچھکتا چسپیدگی تو چیز دیگر حق یہی ہے کہ اگر ابو بکر حسب اعتقاد شیعہ مقبولان بارگاہ الہی میں سے نہ ہوتے اور انجام ان کا ارتداد اور کفر پر ہوتا تو اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تسلی ہی نہ فرماتے کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر جھوٹ بولتے۔

تقیہ کا قدر لگ اور تقیہ کو کوئی کہے تو اول تو تقیہ ہاں ہوتا ہے جہاں اندیشہ کسی قسم کا ہو۔ ابو بکر صدیق کچھ پہلوان نہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کمزور نہ تھے ان میں تو ایک پہلوان کیا بہت سے پہلوانوں کا زور تھا تنہائی میں ابو بکر کے مار ڈالنے کا بہت عمدہ موقع ہاتھ آگیا تھا وہاں کون پوچھتا تھا مار کر کہیں چل دیتے۔ دوسرے تقیہ کرنا تھا تو تلافی اور اخلاق زبانی کفایت کرتے تھے سو وہ کچھ تسلی اور تشفی ہی الفاظ میں منحصر نہیں ہم جیسے محض گفتگو کا سلیقہ نہیں بہت سے تلافی کے الفاظ تراش سکتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو افسح العرب لعجم تھے اور اگر تسلی ہی کے الفاظ کی ضرورت تھی تو اور بہت سی صورتیں تھیں اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی اور نعوذ باللہ مہنا ہم سے تو نہیں کہا جاتا۔ اگر شیعوں کے کہے موافق جھوٹ ہی بولنا تھا تو کچھ تو یہ کر لینا تھا۔ اگر ان اللہ معنا کی جگہ ان اللہ مع المؤمنین فرمادیتے تو تسلی کی تسلی ہو جاتی بات کی بات بن جاتی ان کی تسلی ہو جاتی آپ جھوٹ کچھ حاتم، ابو بکر نعوذ باللہ اگر منافق تھے تو یوں سمجھ جاتے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومن اور اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور اگر مومن تھے اور پھر مرتد ہو گئے تو اپنے کلام میں سچے رہتے خدا کی طرف بھول چوک کا احتمال نہ ہوتا کیونکہ جب تک وہ مومن رہے جب تک اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ ہے جب ان کے دل سے ایمان نکل گیا۔ خدا نے بھی ان کی ہمراہی چھوڑ دی۔

لصاحبہ سے متعلق لطیف و دقیق تشریح اور صحابی و صاحب کا مفہوم | اس تقریر کے بعد ایک تہنیت پر خامتہ کرتا ہوں۔ اتنا یاد رہے کہ شاید بعض عقل کے دشمنوں کو یہاں یہ خلجان پیش آئے۔ کہ کلام اللہ میں یوں ارشاد ہے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا

یعنی نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس کی زبان وہی تھی

بِلِسَانٍ قَوْمِهِ۔

جو اس کی قوم کی زبان تھی

سو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی موافق اس قاعدہ کے عرب کے محاورہ میں گفتگو کرتے ہوں گے اور چونکہ اس بات کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تفہیم مطالب میں فرق نہ ہو تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کلام اللہ بھی عرب کے محاورے میں ہوا اور یہ ظاہر ہے کہ صاحب عربی زبان میں فقط بمعنی ہمراہی ہے اس کو صحابی کے ہم معنی سمجھنا ایک طرح کی نا انصافی ہے کیونکہ صحابی تو اصطلاح شرع میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ ایمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھوڑی دیر یا بہت دیر رہا ہو اور بعض علماء کا یہ مذہب ہے کہ طول صحبت بھی شرط ہے بہر حال ایمان داخل مفہوم صحابی ہی ہو لفظ صاحب اول تو اصطلاح میں معروف نہیں۔ بلکہ اصطلاح شرع میں لفظ صحابی مستعمل ہوتا ہے دوسرے مسئلہ کہ صاحب بھی مستعمل ہو لیکن کلام اللہ تو عرب کے محاورہ موافق آتا ہی اصطلاح کے موافق نہیں آتا تیسرے ہم نے مانا کلام اللہ سے ابو بکر صدیق کا صحابی ہونا بھی ثابت ہوا اور اس وجہ سے بد لالت التزامی ان کے ایمان کا بھی پتہ لگا مگر کوئی یہ تو بتلائے کہ اس آیت سے تادم مرگ ان کا ایمان پر قائم رہنا کہاں سے نکلا۔ سو جو شخص ان کے ارتداد کا قائل ہو اس آیت سے اس کا التزام معلوم۔

صاحب بمعنی صحابی نہ ہو تو بھی کچھ قدح نہیں | جواب اس وہم کا یہ ہے ان کا ایمان اور پھر ایمان پر قائم رہنا تو بایا کلمات طیباتِ الْإِعْبَادَةِ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ اور إِنَّ عِبَادِي لَشَرٌّ لِّكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اور ہر قوم ہو چکا۔ حاجت تکرار نہیں پھر جب ایمان تو یوں ثابت ہوا اور ہمدی اور مصاحبت لفظ صاحبہ کی ثابت ہوئی تو صحابیت میں کیا کسر باقی رہ گئی جس کا انتظام ہی اس صورت میں اگر صاحب مراد صحابی بھی نہیں تو نہ ہو مگر لفظ صاحب کا مشہور ہونا اور صحابی کا اصطلاح شرع میں مشہور ہونا تو باعتبار اس زمانہ کے ہے

اور اگر اس زمانہ میں بھی یوں ہی تھا تو یہ کیا قصہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام محمد مشہور تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو آپ کی بشارت دی تو احمد کے نام سے بشارت دی چنانچہ سورہ صفت میں مذکور ہے القصہ جب دو لفظ مرادف اور ہم معنی ہو کرتے ہیں گو ایک مشہور ہو مگر کہہ دے گا اس کی جگہ دوسرا لفظ بھی بول دیا کرتے ہیں، باقی یہ کہنا کہ کلام اللہ عربی محاورہ میں ہے اس کا کسے انکار ہی پر اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ کلام اللہ میں ہے اس کے وہی معنی مراد میں جو عرب کی زبان میں اس کے معنی تھے۔ صلوات زکوٰۃ۔ صوم۔ حج یہ جتنے اس قسم کے الفاظ ہیں سب کے سب اپنے معانی اس سے منقول ہیں اور اصطلاح شرعی مراد ہے سو ایسے ہی لفظ صاحبہ کو سمجھنا چاہیے۔

نقل معنی کی حقیقی صورت اور قاعدہ کلیہ اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رسول آتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ نئے احکام لاتا ہے اور ایک کارخانہ ہی نیا ہو جاتا ہے اور اکثر ایسے نئے نئے مضمون پیش آتے ہیں کہ اس کو اور اس کے توالیع کو ان کی تفہیم کی اکثر ضرورت پڑتی ہے مگر چونکہ وہ احکام اور وہ مضمون پہلے سے معلوم نہیں ہوتے تو ان کے مقابلہ میں کوئی لفظ موضوع اس زبان میں نہیں کرنا چاہیے آپ وضع کرنا پڑتا ہے لیکن ہر زبان کا دستور ہے کہ جب اس زبان کے مشاقوں کو کسی نئی وضع کی ضرورت ہوتی ہے تو پہلے ہی الفاظ مستعملہ میں سے کسی ایسے لفظ کو مقرر کر لیتے ہیں کہ اس کے معنی اول سے نئے معنی کو کچھ مناسبت ہو۔ چنانچہ واقفان فن عربیت کو لفظ صوم صلوات کے دونوں معنوں قدیم اور جدید کے تصور سے یہ عقدہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ سو ایسا ہی لفظ صاحب اور لفظ صحابی کو سمجھے مگر چونکہ لفظ صاحب کے اصلی معنی کی تفہیم کی بھی اکثر ضرورت پڑتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس لفظ کے معنی شرعی کی بھی اہل زبان کو اکثر ضرورت ہوتی ہے تو بایں لحاظ فرق کے لئے صاحب کو اکثر پہلے معنوں میں بولتے ہیں اور صحابی کو اکثر دوسرے معنوں میں مگر باہمہ صاحب دوسرے معنوں میں بھی اطلاق کیا جاتا ہے لیکن اضافت کے وقت چونکہ توہم التباس نہیں رہتا تو لفظ صاحب ہی کو اصطلاح شرعی میں استعمال کرتے ہیں چنانچہ جو لوگ احادیث پر اور خطب ائمہ پر عبور رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں۔ القصہ اصطلاحات شرعی سے کلام اللہ خال نہیں بلکہ جو لفظ کہ شرعی میں کسی معنی کے لئے مقرر ہے جب کلام اللہ

یا حدیث میں پایا جائے گا تو معنی شرعی ہی مراد ہوں گے احتمال معنی اصلی کا کرنا محض سفاہت ہوگی صوم صلوات زکوٰۃ سے کلام اللہ میں معنی شرعی کے مقابل میں مستعمل ہوا ہے اور اس سے معنی لغوی مراد لینے درایت سے بہت دور میں اور سلیمان کہ لفظ صاحب سے جو صاحبہ میں ہے معنی شرعی مراد نہ ہوں تب عربی معنی اس لفظ کے وقتیکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف ہو۔ معنی شرعی کے مطابق ہوں گے کیونکہ کفار زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو اہل زبان تھے جب اس لفظ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کرتے تھے اور اس سے کسی کی طرف اشارہ کرنا مد نظر ہوتا تھا تو یہی معنی مراد لیتے تھے کہ فلانا شخص ہمارے ساتھ سے نکل گیا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لیا۔ اور ان کے زمرہ میں داخل ہو گیا ہمارے دین سے نکل بھاگا محمدی دین اختیار کر لیا۔ اس مضمون کا ما حصل علماء شیعہ فرماتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ پھر جائے حیف یہ کہ کفار تک اس لفظ سے وقت اضافہ ہی معنی سمجھتے ہوں حالانکہ ان کی اصطلاح نہیں۔ نہ سمجھیں تو حضرات شیعہ نہ سمجھیں مگر ہم جانیں بزعم خود اچھا کرتے ہیں۔ کفار سے مطابقت اور موافقت تو آخر ممنوعات شرعی میں ہے اور یہ کیا ابھی تو شروع ہے رفتہ رفتہ کفار سے یہ خلاف پیدا کریں گے کہ برخلاف ان کے صوم و صلوات وغیرہ الفاظ سے بلکہ سارے کلام اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ اور ہی معنی سمجھا کریں گے اور ہم اس سے بھی درگزرے صاحب کے لغوی ہی معنی ہیں اور کسی طرح معنی شرعی کے مراد لینے کی گنجائش نہیں تب لفظ لا تحزن اور ان اللہ معنا کو کہاں کھوینگے صاحب کے لفظ سے نہیں ان دونوں سے ایمان ثابت ہو گیا چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا بہر حال ان کا صحابی ہونا بطور اصطلاح شرع کے اس آیت سے ثابت ہو گیا

لفظ صاحبہ میں بہ نسبت لفظ صحابی زیادہ فضیلت ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک اس صورت میں اور دینی فضیلت ہو جائے گی۔ لفظ صاحب اصطلاح شرعی مراد ہوتی تو وہ بات ہرگز نہ ہوتی بشرح اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب کے لفظ سے جو ہماری مراد ہوگی تو ابھی ہماری طرف اشارہ ہوگا جو اِذْ هَمَّ اَنِي الْغَاثِ سے ثابت ہوتی ہے چنانچہ لفظ اِذْ جو اِذْ يَقُولُ میں ہے وہ پہلے اِذْ کا جو اِذْ هَمَّ اِنِي ہے بدل ہے مطلب ہوا کہ یہ ہماری نصرت اس وقت ہوتی جب دونوں غار میں تھے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہی سے یوں کہہ رہے تھے اور یہ تو ظاہر ہے۔ کہ

ایسے وقت کی ہمراہی اسی کا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی مخلص نہ ہو اور سچ بھی تو ہے۔
 ابوبکر صدیق کی جانبازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خاص کر اس وقت دشواری
 ہمراہی اور رفاقت ایسی نہیں کہ اس کا انکار کیا جائے۔ اگر خداوند کریم اس کی طرف اشارہ نہ
 فرماتے تب کچھ حاجت نہ تھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ رفاقت اور ان کا اخلاص ایسا شہرہ
 آفاق ہے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں شیعہ زبان سے انکار کریں تو کیا ہوا اول میں ان کے بھی یہی
 ہے کہ ابوبکر صدیق کے برابر دنیا میں کوئی کسی کا رفیق نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے
 رفیقوں میں کچھ ان کا رتبہ بڑھ کر نہیں دیکھتے نہیں بلکہ جس کی رفاقت اور اخلاص نہایت کو
 پیش جاتے ہیں تو عرف میں اسے شیعہ سنی ہندو مسلمان سب یار غار کہتے ہیں رفاقت میں ایسا
 رتبہ کہ ضرب المثل اور مشبہ بہ ہو جائے بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ اوروں کی رفاقت کو ان کی رفاقت
 کے ساتھ ایسی نسبت ہو جیسے نور چہرہ کو نور قمر یا نور خورشید کے ساتھ نسبت ہو کون نہیں
 جانتا کہ کجا آفتاب کجا آدمی کا چہرہ۔ آدمی کیسا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو آفتاب کے نور سے لاکھوں
 درجہ کم اس کا نور رہتا ہے اس کے شرف کے لئے یہی بہت ہو کہ اس کے ساتھ تشبیہ دیتے
 ہیں۔ ایسا ہی اوروں کی رفاقت اور دوستی کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور
 دوستی سے بھدا راج کم سمجھنا چاہیے ان کو یہی شرف بہت ہے کہ ان کے ساتھ اوروں کو
 تشبیہ دیتے ہیں اور جس کی رفاقت اور دوستی کی تعریف کرتے ہیں تو اس کو یار غار کہتے
 ہیں القصہ اس تقدیر پر وہ صحابہ میں بھی فرد اکمل ہوں گے اور کیوں نہ ہوں۔ زبان خلق نقارہ
 خدا، ان کا یار غار ہونا اور صدیق ہونا سب عام و خاص پر روشن ہے دوست و دشمن سب
 ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں اب یہاں بس کیجئے۔

شیعوں کی رائے سے خلافت صدیقی پر نہایت چنی مگر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اگر فضل بھی
 ہوئے تو کیا ہو خلافت تو بظاہر علی رضی اللہ عنہ ہی کا حق تھا کیونکہ وہ چچا کے بیٹے اور داماد تھے
 اور مشہور ہے کہ داماد بہتر ہے از زندہ ہوتا ہے تو اس صورت میں خلافت بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے اگر پہنچتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچتی ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کون ہوتے
 تھے جو خلافت دبا بیٹھے اور اس سے بھی قطع نظر کیجئے اپنے بعد ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ

کر دینا تھا وہ بھی نہ ہوا وصیت کی تو خلیفہ ثانی کے لئے کی۔

جواب | سو اس تو ہم کا جواب اول تو یہی ہے کہ خلافت کو سلطنت پر قیاس کیجئے تو البتہ یہی تو ہم پیدا ہو تا ہے لیکن اہل فہم پر پوشیدہ نہ ہو گا کہ خلافت نبوت ارکان دین میں سے بھی رکن عظیم اور سلطنت دنیا کے امور میں بھی نہایت درجہ قبیح پھر جب حقیقت دنیا اور دین ہی میں اتنا تفاوت ہو کہ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا تو اس کے اعلیٰ درجہ اور اس کے اعلیٰ درجہ میں کچھ لگاؤ ہی نہ ہو گا جو ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے

ع۔ بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ہاں خلفائے انبیاء کو اگر خلفاء علماء اور خلفاء فقہاء پر قیاس کیا جائے تو البتہ قیاس کا موقع بھی ہے علم و فقر بھی امور دینی میں سے ہیں مگر یہ بھی سب جانتے ہیں کہ خلافت علم اور خلافت فقر میں بیکارگی اور قرابت کی وجہ سے ترجیح نہیں ہوتی فضیلت اور کمالات کے باعث ترجیح ہوتی ہے چنانچہ لفظ خلافت ہی خود اس بات پر دلالت کرتا ہے خلافت بمعنی نیابت ہے اور نیابت کا استحقاق اس کے لئے ہوتا ہے جو کہ منیب کا کام دے سکے اور اگر چند آدمی موصوف بایں صفت ہوں تو وہ ان میں مقدم ہو گا جس میں کمالات اور فضائل منیب اوروں سے زیادہ تر ہوں گے بموجب حضرت صدیق اکبر کی فضیلت مابعد انبیاء کے سب پر ثابت ہو گئی تو پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق کے ہونے کے کیا معنی ہاں یہ مسلم کہ خلافت کی لیاقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی رکھتے تھے لیکن افضل پھر افضل ہے باقی رہا دبا بیٹھنا ہم پوچھتے ہیں کہ جب سب میں زیادہ استحقاق خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں ہوا تو خلافت کو اگر دبا ہی لیا تو کیا بیجا کیا اپنا حق تھا دوسروں کا حق چھیننے تو جائے گرفت بھی تھی معہذا و آفغان فن سیر جنکو حضرت ابو بکر صدیق کے خلیفہ ہونے کے قصے کی خبر بے خود جلتے ہیں کہ انہوں نے خلافت خود دبا لی تھی یا بجز واکراہ ان کو سر دھرنی پڑی۔

باقی رہا حضرت عمر کا خلیفہ کر دینا اس کا جواب بھی ہے کہ خلافت میں قرابت کو مداخلت نہیں ورنہ حضرت فاطمہ زہرا اور حسنین رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مقدم تھے۔

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا عورت ہونا اور علی رضی اللہ عنہ اس حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کا لڑکا ہونا موافق آئین سلطنت کچھ مانع جانشینی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا سلطنت

میں بوقت ضرورت اکثر عورتوں اور لڑکوں کو قائم مقام کر دیتے ہیں گو اور ہی کوئی نگران حال رہے
 القصہ اگر حال نبوت مثل حال سلطنت دنیا ہے اور قرابت باعث ترجیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ
 عنہ پھر بھی مستحق نہ تھے نہ وقت وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا حق تھا نہ اپنی خلافت
 کے وقت اس وقت حق تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہما کا تھا اور اگر حال نبوت مثل حال سلطنت
 نہیں اور قرابت کو اس میں کچھ دخل نہیں بلکہ افضلیت باعث تقدیم ہونی چاہیے تو پھر حضرت
 ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کو خلیفہ کر دیا تو کیا بھی کیا کسی اپنے کو کر دیتے یا حضرت عمر ان کے
 نزدیک اوروں سے افضل نہ ہوتے تو البتہ جائے اعتراض تھی۔

باب

وعدہ خلافت و استخلاف

مہند اکلام اللہ سے بھی یہی حکم ہے کہ جو کچھ ہوا بجا ہوا اور یہی عین صواب تھا اگر یقین

نہ ہو تو یہ آیت چہارم موجود ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ
 وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيُخْلِفَنَّهُمْ
 فِي الْأَرْضِ كَمَا خَلَفَ الَّذِينَ
 مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ
 الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
 مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي
 لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ
 بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ

یعنی وعدہ کیا ہے اللہ نے بعضے ان لوگوں سے
 جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور اچھے اچھے عمل کئے
 اس بات کا کہ ان کو زمین کا خلیفہ اور بادشاہ
 بنادے گا جیسا ان سے پہلوں کو اور ان کے لئے
 اس دین کو جو ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے چھانٹ
 رکھا ہے اور پسند کر رکھا ہے خوب جہاد کیا اور ان کو
 بعد اسکے کہ اندیشہ اور خوف رہا کرتا تھا امن دے گا
 کہ وہ پھر میری ہی عبادت کیا کریں گے اور کسی کو ذرہ
 برابر عبادت میں میرا شریک نہ کریں گے اور جو لوگ
 بعد اس نعمت کے کفران نعمت کریں اور ناشکری
 کریں وہی ہیں اسی فاسق طاعت سے نکلے ہوئے

اس آیت کا حاصل یہ ہوا جو کلام اللہ کو سمجھتے ہیں وہ تو سمجھتے ہی ہیں۔ اور جو نہیں سمجھتے۔ وہ ترجموں سے مطابق کر دیکھیں آج کل سینکڑوں ترجمہ کے کلام اللہ ملتے ہیں کچھ کمی نہیں۔

آیت ممکن معتقدات شیعہ کے کسی طرح مطابق نہیں | اب میری سنئے یہ وعدہ ہر کسی سے نہیں ہوا اس زمانہ کے مومنوں سے ہوا ہے یعنی صحابہ سے ہوا ہے کیونکہ الَّذِينَ آمَنُوا کے بعد مِنْكُمْ بھی بڑھایا ہے۔ اس کا حاصل یہی ہوا کہ یہ وعدہ انہیں سے ہے کہ جو تمہارے زمانے میں مومن ہیں پچھلوں کو اس لفظ کے ذکر کرنے سے اس وعدہ سے علیحدہ کر دیا ہے تو اب حضرت امام مہدی کا تسلط روئے زمین پر اس وعدہ سے علیحدہ ہے اور پھر تیسری وعدہ بھی اس زمانہ کے تمام مومنوں سے نہیں ہوا بلکہ بعضے نے چنانچہ لفظ من جو مِنْكُمْ میں ہے اس کا حاصل یہی ہے بلکہ جب لفظ من ضمیر کے اوپر داخل ہوگا۔ اس کا یہی مطلب ہوگا یا ابتداء کے معنی ہوں گے۔ جو اس جگہ ابتداء کے معنی کسی کے نزدیک بن ہی نہیں سکتے۔ تو بیشک بعض ہی کے معنی ہوں گے کیونکہ بیان کیلئے تو فصحاء کے کلام میں ضمیر پر آتا ہی نہیں اور اگر بالفرض بفرض محال یوں ہی کہیں کہ من یہاں بیان کے لئے ہے اور اس کا ہم ہرگز خیال نہ کریں کہ کلام اللہ خدا کا کلام ہے اور وہ بھی معجز نظام کسی ایسے گنوار ہندوستانی کا نہیں کہ ہدایت النخود وغیرہ رسالے عربی زبان کے پڑھ کر عربی کی ٹانگ توڑنے لگے تب بھی شیعوں کی مشکل ہی رہے گی اس صورت میں تمام صحابہ مراد ہونگے حتیٰ کہ خلفاء ثلاثہ بھی اس لئے کہ جب تک تو وہ بھی مسلمان ہی تھے مرتد نہ ہوئے تھے اور اگر وہ منافقین میں سے تھے اور کبھی مسلمان ہوئے ہی نہ تھے تب بھی وہ تو داخل ہی رہیں گے جو ان کے عقیدہ کے موافق بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد ہوئے ہیں اور جو آیات مرتدین کے بیان میں آتی ہیں شیعوں کے نزدیک ان کے حق میں وارد ہوتی ہیں اس صورت میں اول تو یہ لازم آئے گا کہ جو مرتد ہو گئے ان سے اس بات کا وعدہ تھا کہ ان کے لئے دین پسندیدہ کو جہاد نیکے وعدہ کر کے خدا نے خلافت وعدہ کیا کیونکہ اگر خدا دین کو جہاد بتا تو پھر نفس اور شیطان سے کہیں اکٹھا کر سکتا جو وہ مرتد ہو گئے۔ معذرا ان کے حال میں یوں بھی بیان فرماتے ہیں کہ جب ان سے یہ وعدہ پورا ہوگا اس وقت وہ میری ہی عبادت کریں گے یہاں تک ذرہ برابر کسی کو میری طاعت میں شریک نہ کریں گے یا یوں کہتے کہ یہ بھی ایک وعدہ ہے اخبار نہیں بہر حال اس صورت میں لازم آئے گا کہ تا دم

باز پسین وہ اسی حال پر تھے جس کے انعام میں یہ وعدہ ہوا تھا یعنی ایمان اور عمل صالح چنانچہ
 اہل فہم وعدۃ اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات سے یہی معنی سمجھتے ہیں کہ
 باعث اس وعدہ کا ایمان اور عمل صالح ہیں پھر نہ معلوم کہ باوجود ان سب باتوں کے وہ کیونکر
 مرتد ہو گئے دو حال سے خالی نہیں یا یوں کہو کہ خدا نے خلافت وعدہ کیا یا خدا سے آئندہ
 کی خبر میں غلطی ہوئی۔

جن سے وعدہ تھا ان کو تمکین ہی حاصل نہ ہوگی لہذا وعدہ پھر بھی غلط نکلا اور یہ سب ہی الذین آمنوا
 منکم سے وہ چار پانچ صاحب ہی مراد ہیں جو بزعم شیعہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 مسلمان رہے اور مثل دیگر صحابہ مرتد نہ ہوئے اس صورت میں من اگر منکم میں بیان کے لئے
 ہو گا تو بیشک ان سب کے ساتھ اس وعدہ کا پورا ہونا چاہیے کیونکہ وہ سب صاحب اس آیت کے
 تازل ہونے سے پہلے مسلمان ہوئے تھے حالانکہ ان میں سے یہ سب وعدے سے حضرت امیر المومنین
 علی رضی اللہ عنہ کے لئے پورے نہیں ہوئے حضرت ابوذر غفاری اور سلمان فارسی
 اور حضرت بلال بلکہ حسن بن رضی اللہ عنہم تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی حضرت امام حسین
 رضی اللہ عنہ کا حال تو ظاہر ہی ہے اور حضرت امام ہمام سبط اکبر کا حال یہ ہے کہ چھ ہینہ کے لئے وہ
 خلیفہ تو ہو گئے پر چاہیے ان کو کسی طرح کی تمکین دین حاصل ہوئی ہو ہرگز ظہور میں نہیں آئی۔
 خاص کر شیعوں کے نزدیک کیونکہ امیر معاویہ جو ان کے نزدیک بالاتفاق کفار اور منکرین امت
 ائمہ میں سے ہیں تمام خلافت پر غالب اور متولی تھے اور پھر امن کو ہرگز مستری نہیں آیا انہیں
 تو خلافت ہی کیوں ان کے حوالہ کرتے اور کیوں ساری عمر تقیہ میں گزارتے اور حضرت علی مرتضیٰ
 رضی اللہ عنہ کو بھی سنیوں کے نزدیک خلافت اور تمکین کچھ حاصل تھی شیعوں کے نزدیک تو ہرگز حاصل
 نہیں کیونکہ دین شیعہ اس زمانہ میں بھی مخفی ہی رہا اور حضرت کو تقیہ ہی کہنے بنی شیخین کی
 تعریف ہی کیا کہ یہ کبھی نہ ہوا کہ کھل کھیلے اور بے کھٹکے ہو کر جلوت جلوت میں برابر یکساں
 گزاریں چنانچہ اس کی سند آگے انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہو جائیگی اور علی القیاس امن موعود
 یعنی کفار کے شر سے حضرت امیر کو بھی بطور شیعہ حاصل نہیں ہوا وہی امیر معاویہ ہمیشہ
 تنگ کرتے رہے اور آپ کے ہاتھ سے اکثر ملک نکال لیا۔ بہر حال سب کے اگر وعدہ ہو تو کلام

بالکل لغو ہو جائے گا۔

استخلاف بمعنی توطن کسی طرح موزوں نہیں | اور اگر من کے بیانہ ہونے کے ساتھ استخلاف کو بھی بمعنی توطن لیجئے جیسا کہ بعض علماء شیعہ نے تاویل کی ہو اور بمعنی تسلط نہ لیجئے تو قطع نظر اس کے کہ من کا ضمیر یہ بیانہ ہونا خلاف استعمال عرب ہے اول تو یہ مشکل ہے کہ استخلاف کے ساتھ جب لفظ فی الارض ہوتا ہے تو تسلط ہی کے معنی مراد ہوتے ہیں دوسرے اس صورت میں قید و غملاً الصالحات محض بے معنی ہو جائے گی زمین میں توطن تو صالح اور فاسق کو برابر حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ فاسق کو بوجہ احسن بلکہ آمنوا کی قید بھی بیکار ہی نظر آتی ہے کیونکہ کفار کے توطن میں کیا کمی ہے القصہ ان لغویات کے کلام اللہ کی تفسیر کی جاتی ہے یہ نہیں جانتے کہ لغو کلام کا کلام اللہ میں ہونا منجملہ محالات ہے۔

استخلاف بمعنی تسلط ہے بدلات فی الارض | اور بعض علماء شیعہ بہت کوشش کر کے یہ بات نکال کر لاتے ہیں کہ الذین آمنوا و عملوا الصالحات سے حضرت امیر مراد ہیں اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ہے یا حضرت امیر اور ان کی اولاد مراد ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ قطع نظر اس بات کے کہ جمع سے واحد مراد لینا بے ضرورت بیجا ہے اور باوجودیکہ جمع کے معنی بن سکیں واحد کے معنی مراد لینے اہل سخن کے نزدیک بالقطع ممنوع شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ مکین دین اور زوال خوف تو کسی کو بھی میسر نہیں آیا اس لئے ضرور ہوا کہ منکم کے من کو بتعصیہ قرار دیجئے اور استخلاف سے تسلط مراد لیجئے مگر چونکہ الذین آمنوا جمع ہے تو کم سے کم تین تو ہونے ضرور ہوئے اور زیادہ ہوں تو فیہا۔

القصہ ابتدا سے اس آیت کے اتنی بات نکلی کہ صحابہ سے خداوند کریم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم میں سے کم سے کم ایسے تین شخصوں کو کہ وہ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہوں گے ضرور ہم خلیفہ بنا کر رئے زمین کو ان کے تسلط میں کر دیں گے اور اس دین کو جو علم الہی میں اس سے بہتر کوئی دین نہیں اور خدا نے ازل سے انہیں کے لئے چھانٹ کر رکھا، ان کے واسطے جمادیں گے کہ ان کے جیتے جی اس میں رخنہ نہ پڑے گا اور ان کے خوف و ہراس کو کہ جو کفار سے رکھتے تھے بالکل امن اور اطمینان سے بدل دیں گے پھر بعد اس کے یا تو وعدہ میں دخل ہے یا فقط بطور اخبار بالغیب کے

بیان کرتے ہیں کہ وہ باوجود ان خرخشوں کے جو ایسی خلافتوں کو لازم ہیں ہرگز عبادات میں سستی نہ کریں گے اور پھر وہ عبادت بھی ایسی اخلاص کی ہوگی کہ ہرگز اس میں بوئے شرک اور ملاؤریا کا نہ ہوگا

آیت استخلاف کی صحیح تفسیر اب اس کمترین کی اتنا اس حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ وعدہ الہی میں تو تخلف ہو ہی نہیں سکتا۔ سو جن کے ساتھ اس وعدہ کا ایفا ہو رہا ہے وہی مصداق ان اوصاف مذکورہ کے ہوں گے اور وہ بیشک لشہادت خداوندی ایمان کامل اور اعمال صالح رکھتے ہوں گے بلکہ سب قرآن و امثال میں ان دو باتوں میں بڑھے ہوئے ہوں گے کیونکہ جب ایمان اور عمل صالح کے انعام میں یہ نعمتیں ملی ہیں تو انہیں کو ملی ہوں گی جن کا ان دو کمالوں میں نمبر اول ہو گا ورنہ لغو ذبا اللہ خدا کے یہاں بھی بڑا اندھیر ہے کہ استحقاق کسی کلمہ اور انعام کسی کو مل جائے۔ سینوں کے طور پر تو خدا کو اختیار بھی ہے کہ کسی کا حق کسی کو دیدے لیکن اسکی حکمت کی شان یہی ہے کہ جس چیز کو کسی کے لائق دیکھے اسے ہی دے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا اور اس آیت کے معنی بھی محققین کے نزدیک ہی ہو سکتے ہیں۔

اعطی کل شیء خلقہ ثم ھل یعنی ہر چیز کو اسی کے مناسب طور پر پیدا کیا پھر آئندہ مناسب ہی مناسب کاموں کی انہیں سوجھانی لیکن شیعوں کے نزدیک خدا کو اختیار نہیں کہ کسی کا حق کسی کو دیدے اس لئے کہ ان کے نزدیک خدا پر عدل واجب ہے اس صورت میں ممکن ہی نہیں کہ جن کو خدا نے خلیفہ بنایا وہ اوروں سے خلافت کے استحقاق میں کم ہوں بلکہ ان کا لائق ہونا استحقاق خلافت میں ضرور پڑا۔

نہ صرف استحقاق خلافت بلکہ ترتیب خلافت کا پتہ بھی اس آیت چلا اور نیز اسی تقریر سے یہ بھی نکل آیا کہ ان میں سے جو ایمان میں اور عمل صالح میں دوسروں سے بڑھ کر ہو گا وہ اس انعام میں مقدم رکھا جائے گا کیونکہ تقسیم انعام کی خوبی یہ ہے کہ اول نمبر والے کو اول دیں مگر چونکہ یہ انعام خلفائے راشدین پر ہوا اور یہ وعدہ خلفائے اربعہ کے ساتھ بتدریب معلوم و قایم آیا تو لشہادت خداوندی معلوم ہوا کہ یہ اصحاب اربعہ ایمان اور عمل صالح میں اوروں سے بڑھ کر تھے اور وہ بھی استقدر کہ ان کے ہوتے قابلیت اس انعام خاص کی ان کے سوا کسی میں نہ تھی اور باہم ترتیب

خلافت ایک دوسرے سے ایمان اور عمل صالح میں مقدم تھا۔ اول اول اور دوم دوم اور سوم سوم اور چہارم چہارم

آیت استخلاف کا مصداق صرف خلفاء اربعہ ہیں | اور بعد اس کے ہر چہ حضرت سبط اکبر امام بام امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلفاء راشدین میں معدود ہیں مگر ان کو جو خلافت پہنچی تو اس وعدہ کے تحت نہیں پہنچی کیونکہ انکو قبل نزول اس آیت کے کہ سدن خوف ہوا تھا وہ زمانہ انکے لڑکپن کا تھا دشمنوں سے اندیشہ بڑھ کر ہوتا ہے لڑکوں کو نہیں ہوتا بلکہ وصول اس نعمت کا ان تلک زمانہ از قدر وعدہ تھا اسی لئے ان کی خلافت کے لئے تمکین اور جماؤ لازم نہ ہوا باقی رہے امیر معاویہ ہر خیدان کو بظاہر تمکین میں آئی لیکن حقیقت میں وہ تمکین دین نہ تھی تمکین ملک و سلطنت تھی چنانچہ واقفان فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفاء اربعہ کے اطوار اور انداز اور امیر معاویہ کے اطوار اور انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا ان کی گزران فقراء اور زراہدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملک کا ساتھ اس لئے اہل سنت ان کو باوجودیکہ صحابی سمجھتے ہیں خلفاء میں نہیں گنتے ملک میں شمار کرتے ہیں لیکن ملک ملک بھی فرق ہی ایک نوشیرواں تھا ایک چنگیز خاں۔ سو یہ ہر خید ملک میں سے تھے لیکن اس کے یہ معنی ہیں کہ خلفاء راشدین کے مقابلے میں دنیا دار معلوم ہوتے تھے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور انبیا کے مقابلے میں مالدار معلوم ہوتے ہیں نہ یہ کہ ظلم و ستم کے روادار تھے غریب کے حق میں ستمگارتھے ان کا حکم اور رعایا پروری اور دلجوئی خلأق شہرہ آفاق ہو مہندریان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کو قرار واقعی کفار سے کبھی خوف ہوا ہو، یہ بات فقط مہاجرین اولین کے حق میں صادق آتی ہے نہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو یہ بات پیش آئی کہ امیر معاویہ کو اور مہاجرین اولین میں سے بھی جیسا خوف خلفاء اربعہ کا ترتیب ہوا ہے اور کسی کو پیش نہیں آیا چنانچہ کتب تاریخ سے خوب واضح ہے یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل علم مذکور خاص انہیں کو ملا اور یہ وعدہ انہیں کے ساتھ ملو کر آیا کیونکہ یہ خوف اصل سے بوجہ ایمان اور عمل صالح تھا کفار کی دشمنی کی بناء پر دیکھئے وہ انہیں دو باتوں پر تھی پھر جس میں ایمان اور عمل صالح زیادہ ہو گا دشمنی کفار بھی اسی کے ساتھ زیادہ ہو گی خوف کفار بھی اسی کو زیادہ ہو گا دوسرے محبت اور اخلاص جو ایمان اور عمل صالح کا خلاصہ ہیں خوف ہی کے وقت معلوم ہوتے ہیں اور خوف ہی سے پرکھے جاتے ہیں تو جس کو اس قسم کا خوف زیادہ ہو گا اسی

میں ایمان اور عمل صالح بھی زیادہ ہوگا القصہ خوف کفار ہاجرین اولین کو ہوا ہے حضرت امام
ہمام امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کفار سے کیا اندیشہ تھا حضرت
امام ہمام رضی اللہ عنہ اس زمانہ تک لڑ کے تھے امیر معاویہ جب تک مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔

آیت استخلاف کی بنیاد ہاجرین کی قربانیاں ہیں | اس آیت کے مضامین میں غور کیجئے تو یوں معلوم ہوتا ہے
کہ باعث اس وعدہ کا فقط یہ ہوا ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصاً ہاجرین اولین
نے باوجود بے سرو سامانی اور ذلت اور خواری کے جو ابتداء اسلام میں تھی ایک جم غفیر اور گروہ اعظم
کفار کی مخالفت محض خدا کی رضا مندی اور دین کی ترویج کے لئے اختیار کر کے اپنی جانیں جلائیں
اور ان کو اپنا دشمن بنا کر طرح طرح کی ایذاؤں ان کے ہاتھ سے اٹھائیں سا ہا سال خوف و خطر میں
گزارے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ نوبت اس کی آئی کہ گھر سے بے گھر ہوئے زن و فرزند سب کو چھوڑ کر
جلا وطن ہوئے پھر اس پر بھی چین نہ ملا نوبت قتل قتال کی پہنچی مدہائے دراز تک کفار گونگار
فوج کشی کرتے رہے اور جو چڑھ کر نہیں آئے تو مسلمانوں کے فکر سے تو خالی بھی نہیں رہے اس میں
بہت سے ہاجرین میں سے اور نیز ان کی ہمراہی میں بہت سے انصار شہید ہوئے جب خداوند
کریم عالم الغیب و الشہادت کو ان کا کامل امتحان ہو گیا تو رحمت الہی کو ان کی اس جان کا ہی
اور جان گدازی پر جوش آیا لازم پڑا کہ ان کی اس جان نشاری اور جان بازی کی مکافات اس دار
دنیا میں بھی کی جائے اس لئے جس جس قسم کی کفایتیں انہیں پیش آنی تھیں اس کے مقابل کی
نعمتیں ان کو ملیں اور اس کے مکافات کی رحمتیں ان کو عطا ہوئیں تسلط کفار جو ان کے حق میں
باعث تمام آزار اور سبب ہمہ ممکنات تھا استخلاف ہی مبدل ہوا کفار کے تسلط کے باعث جو
نماز روزہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور ذکر خداوندی سے ممنوع تھے اور اس سبب سے حسرت ہمار گوناگوں
دل میں رکھتے تھے بلکہ باعث جلا وطنی کا بھی حقیقت میں ہی تھا اس کے عوض میں تسکین دین ملی
اور خوف کے عوض میں امن عطا ہوا اس تقریب سے واضح ہو گیا کہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
آلہ وسلم ہر چند شرف گوناگوں رکھتے ہیں لیکن فقط اس شرف کو استحقاق خلافت میں دخل نہیں
یہ اس جان کا ہی اور جان گدازی کا ثمرہ ہی جس کا مذکور ہوا۔

آیت مذکورہ سے مشت خلافت قریش کا راز بھی کھل گیا | اور خلافت کے مخصوص ہونے کی وجہ بھی نسبت

قریش کے معلوم ہو گئی۔ یعنی یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ خلافت حق قریش ہے انصار کو اس میں کچھ دخل نہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ خلافت حقیقت میں انعام اور مکافات میں ہما جریں کی جائز تانیوں کے ملی ہے چونکہ ہما جریں قریش میں سے ہیں اس لئے انہیں میں منحصر رہتی چاہیے ہاں جو کہ انصار اور اعراب خلفاء ہو کرتے ہیں جیسے قاضی وغیرہ وہ البتہ نصرت کے صلہ میں انصار میں سے ہونے چاہئیں اور یہ بھی مکرر روشن ہو گیا کہ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کو جو خلافت ملی ہے۔ تو وہ خلافت نہیں جو وعدہ کے سبب ملی ہے اور نیز یہ بھی اہل فہم والصفاء پر صاف روشن ہو گیا کہ ان کے زمانے میں ان کے ہاتھوں سے جو کچھ دین کے مقدمہ میں ظہور میں آیا اور اس نے رواج پایا جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک کا نہ دینا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا متعہ کا منع کرنا اور تراویح کی تاکید اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جمعہ میں ایک اذان کا بڑھا دینا وہ سب منجملہ دین پسندیدہ اور مصداق مضمون اس آیت تھے لَہُمْ عَلٰی ہٰذَا الْقِیَاسِ جس مسئلہ پر ان کے زمانے میں ان کی وجہ سے اجماع اور اتفاق ہو گیا وہاں یہ حق و صواب ہے اس سے جو منصف ہو وہ دین پسندیدہ خداوندی ہی منصف ہو اور جو اس کا منکر ہو وہ حق کا منکر ہے۔

آیت مرقومہ حضرت فاروق کی نزاہت کی دلیل ہے اور نیز قطع نظر اس کے کہ جملہ وَعَدَ اللّٰہُ الذِّیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ حقیقت خلافت خلفاء ثلاثہ پر بوجہ حسن دلالت کرتا ہے اور شیعوں کے اس توہم کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایام مرض وفات میں کاغذ قلم دوات منگایا تھا اور حضرت عمرؓ نے نہ آنے دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے فرمان ہی کے لکھنے کو منگایا تھا بیخ و بنیاد سے اکھاڑتا ہے جملہ وَکَیْفَ کُنَّ لَہُمْ دِیْنُہُمْ الذِّیْنِ اِسْرَافُ لَہُمْ سے بھی اہل فہم کے نزدیک یہ توہم زائل ہو گیا کیونکہ خلافت خلفاء ثلاثہ جب خلافت موعودہ ہوئی تو ان کی خلافت کی تکمیل بھی منجملہ تکمیل دین پسندیدہ ہو گئی، ہاں اگر خلافت امور دینی میں سے نہ ہوتی تو البتہ اس استدلال کی گنجائش نہ تھی۔ سو شیعہ اس کا انکار نہیں کر سکتے ورنہ حضرت امیر اور ان کی اولاد رضوان اللہ علیہم اجمعین کو طالب دنیا کہنا پڑے گا بخیر و باللہ مہنا غرض یہ طعن اور نیز اور بہت سے مطاعن جو شیعہ اور خارجی

بسیب اپنی تیرہ درونی کے حضرات خلفاء راشدین پر کرتے ہیں مندرج ہو گئے اگرچہ طبع
اور سوا اس کے اور مطاعن بنظر غور اہل بصیرت کے نزدیک اعترافوں کی تیرہ درونی سے پیدا
ہوتے ہیں چنانچہ دربارہ فدک تو اوراق مابعد سے انشا اللہ تعالیٰ حال واضح ہو جائے گا تفصیل
اس اجمال کی بہ نسبت جملہ مطاعن کے اس جہاد پر اگر بے موقع اور بے جا نہ ہوتی تو بہت
گنجائش وقت درج اوراق کرنا نہ چونکہ کاغذات قلم کے نہ آنے دینے کا طعن بھی بزرگ
کلائرین مطاعن خلفاء راشدین ہے تو نظر سکین خاطر بعض بنی نوع اگرچہ اس بحث پر بے موقع
ہے مختصر مختصر عرض کرتا ہوں تاکہ اس بڑے طعن کا اندفاع موجب اندفاع دیگر مطاعن
صغیرہ ہو جائے۔

فرمان نبوی کی تعمیل نہ ہو سکنے کے اسباب | حضرت من اول تو کسی روایت میں یہ نہیں کہ کاغذ
قلم دوات کے آئینے مانع اول حضرت عمر ہی تھے البتہ جب سرور کائنات علیہ علی الصلوٰۃ و
التسلیمات نے کاغذ دوات قلم منگانی کو فرمایا تو حضرت عمر بھی اس محفل میں موجود تھے حاضرین
مجلس کی رائے اس وقت مختلف ہوئی کسی نے کہا کہ امتثال امر ہی کیجئے۔ کوئی بولا کہ اس شدت
مرض میں یہ تکلیف نہ دیجئے۔ اس رد و کد میں ایک شور برپا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے
میں یہ آیا کہ یہ ارشاد مریدانہ اور مشفقانہ ہے بطور ایجاب ہمیں جس کی تعمیل واجب ہو کیونکہ
خداوند کریم اس سے پہلے فرما چکا ہے۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ

أَتَمَّمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي

یعنی حجۃ الوداع کے دن خداوند کریم کی طرف

سے یہ بشارت آئی کہ آج کے دن میں نے اپنے

دین کو تمہارے لئے پورا کر دیا اور تمام کردی میں

نے تم پر اپنی نعمت

پھر جب خداوند کریم دین کو کامل کر چکا ہو تو اب یہ امر کسی سے امر دینی کے لکھوانے کے
لئے تو نہیں ہی ہو نہ اسی کی تفصیل ہوگی سو یہ بات چنداں ضروری نہیں جو اس امر کی تعمیل
واجب ہو بلکہ بوجہ شفقت کاملہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ سو جب باوجود شدت مرض کے اپنے
ہمارے لئے یہ تکلیف گوارا فرمائی تو کیا اس کی مکافات یہی ہو کہ ہم بھی آپ کے لئے اس تکلیف کو

گواہیں بلکہ مقتضی ادب یہی ہے کہ آپ کے فرمانے کا کچھ خیال نہ کیجئے اور اس قصہ کو جانے دیجئے اور سچ بھی تو ہے اگر کسی کا باپ بھوک کی شدت میں آپ کو نہ کھاتے اور بیٹے کو بوجہ شفقت اپنے حصہ کے کھانے کو فرمانے تو کیا مناسب ہے کہ فرزند عاقل دیدہ دانتہ پدر مہربان کو بھوکا چھوڑ کر سب نکل جائے بلکہ ایسے وقت میں مقتضی ادب یہی ہے کہ والد مہربان کا کہنا نہ مانے اور اس نافرمانی ہی کو اپنی سعادت جانے غرض حضرت عمرؓ نے بوجہ مذکور اور سیزبایں غرض کہ کسی طرح یہ شور موقوف ہو جائے حسب کتاب اللہ کہا یعنی کافی ہے ہم کو قرآن شریف پھر اس تکلیف کے دینے کی کیا ضرورت؟ اور اگر کسی کتاب نادر الوجود کی کوئی ایسی روایت جو حضرت عمرؓ کے مائع اول ہونے پر اس طرح دلالت کرے کہ اس میں گفت و شنید کی گنجائش باقی نہ رہے کوئی شیعہ پیش بھی کرے تو قطع نظر اس کے کہ وہ روایت واقعی صحیح ہے۔ کوئی جھلسا زری نہیں تب بوجہ مذکور کوئی گرفت کی بات نہیں بہر حال منشاء اس اعتراض کا قلت فہم و فراست اور نقصان عقل و درایت ہے اور انجام کو دیکھا تو حضرت عمرؓ کی رائے ٹھیک تھی۔ آخر جب یہ شور ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمام مجمع کی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ یہاں سے کھڑے ہو جاؤ اگر کاغذ و داتِ فلم کے منگائے کا ارشاد پیام خداوندی ہوتا اور ضروری اور واجب ہی ہوتا تو مکرر آپ بتا کید فرماتے اور علیؓ ہذا القیاس اگر یہ شور جیسا حضرت عمرؓ نے سمجھا موجب آزار خاطر حضرت سیدالابرار صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتا تو کھڑے ہو جانے کو نہ فرماتے۔

حضرت عمرؓ کی رائے کا ذرا بلکہ یوں کہیے کہ جیسے اور بہت مواقع میں باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے حضرت عمرؓ کی رائے خدا کی مرضی کے موافق نکلی ہے اور اسی وجہ سے ان مواقع میں ان کی رائے کے موافق وحی آئی اگر وحی نہ آتی تو بوجہ مخالفت رائے نبوی اہل اسلام کے نزدیک حضرت عمرؓ سے برا کوئی نہ تھا یہاں بھی حضرت عمرؓ کی رائے خداوند کریم حکیم کی مرضی کے موافق تھی ورنہ جیسے کفار کی تکذیب کے وقت وحی آسمانی شاہد صدق رسول ربانی صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی تھی یہاں بھی وحی آئی اور آپ کی رائے کی تصدیق ہو جاتی، ہاں آنی کمی رہ گئی کہ بعد اس واقعہ کے حضرت عمرؓ کی تصدیق کے لئے وحی نازل نہ ہوئی غالباً پندرہ سولہ واقعہ کی تصدیق کو کافی سمجھ کر ایک اس واقعہ میں بغرض تصدیق عمری وحی نازل نہ فرمائی اور نیز یہ واقعہ بد دلالت آیت

مذکورہ اکملت لکم دینکم چنداں ضروریات دینی میں سے نہ تھا چنانچہ مذکور ہوا۔ اور بانی
ہمہ آخر زمانہ حیات نبوی میں جو وقت کمال توجہ الی اللہ اور استغراق تمام کا ہے کیا مناسب تھا
کہ ایسے امور غیر ضروریہ کی طرف اپنے نبی کو مصروف کیا جائے بایں وجہ غالباً اس واقعہ میں وحی ربانی جو
مصدق عمر اور شاہد حقیقت قول خلیفہ دوم ہو جائے نہ آتی ورنہ یہ وہ بات خود مندرج ہو جاتے
بالجملہ یہ حضرت عمر کا بولنا تو عقل سلیم کے نزدیک قابل توفیر ہے اور اس پر بھی بوجہ تیرہ درونی اور
لغض ذاتی کے اگر کوئی برا کہے جائے تو اس کا جواب بجز اس شعر کے اور کچھ نہیں

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

کاغذ قلم دوات نہ لانے میں سمجھی شریک تھے صرف فاروق کیوں اور اگر ارشاد نبوی کو دربارہ طلب کاغذ و

قلم و دوات شفقت پر محمول کرنا کسی تعصب کو حکم الٰہی و یقین علیٰ نفسہ کے تعصب نظر آئے
اور باوجود اس توضیح کے اس ارشاد کو ارشاد و وجوب ہی کہے جائے تو یہ اعتراف فقط حضرت عمر

ہی پر نہ ہو گا بلکہ اس کے یہ معنی ہونے کہ تمام اہل بیت اور تمام صحابہ اس جرم میں حضرت عمر کے
شریک نکلے اور وہ قصہ ہو گیا مرگ انبوہ جشنے دارد بلکہ اہل بیت اس تقصیر میں اول درجہ کے

تقصیر دار ہوئے کیونکہ اول تو مریف کی امر وہی کے مخاطب اس کے گھروالے ہی ہوا کرتے ہیں

دوسرے حضرت عمر تو غیر تھے عیادت کے لئے ساعت دو ساعت کے لئے آگئے تھے اگر ان کی شست

کے وقت کچھ اندیشہ تھا تو جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر کون مانع تھا آخر اس قصے کے بعد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کئی روز زندہ رہے بلکہ غور سے دیکھے تو در صورتیکہ اس ارشاد کو ارشاد ایجابی

اور امر و جوبی کہتے جیسے شیعوں کا جی چاہتا ہے تو پھر جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تعوذ

باللہ اس جرم کے شریک ہو کیونکہ جس قدر ہم پر اطاعت خدا و رسول واجب ہے اس سے زیادہ نبی

پر تبلیغ احکام واجب ہے چنانچہ آیت

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ

مِنْ رَبِّكَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَأَنْزِلْ

مِنْ سَأَلْتَهُ

اس پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ حاصل اس آیت

مذکور کا یہ ہے کہ رسول پہنچا ہے جو کچھ تیری طرف

نازل کیا گیا ہے اور اگر یہ کام نہ کرو گے تو پھر تم نے کوئی

پیغام بھی خدا کا نہ پہنچایا۔ انتہی

اور ادھر سب سے سنا ہو گا کہ نزدیکانِ رابیش بود حیرانی چنانچہ اشارت کلام اللہ و حدیث بھی اس پر
 شاہد ہیں تو اب لاجرم یہی کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام اس سے زیادہ
 واجب ہے کہ ہم تم پر تعمیل احکام اور ادھر یہ بھی ظاہر ہے کہ تبلیغ جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ احکام کا
 بیان بھی کیا جاتے اتنی بات کو کہ کاغذ و ادوات فلم لاؤ میں ہمیں وہ باتیں لکھ دوں کہ اگر ان پر عمل کرو
 تو گمراہ نہ ہو تبلیغ حکم کہنا اسی کا کام ہے جو برائے نام ہی انسان ہے اور عقل سے محروم اور دانش
 سے ناکام ہے الغرض اس صورت میں حضرت عمرؓ سے اگر تفصیل بھی ہوئی تو اتباع بنوی پھر بھی ہاتھ سے
 نہیں گیا اگر حضرات شیعہ جناب سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوات و التسلیمات اور اہل بیت کرام
 رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نسبت اس تفصیل کو غرض باللہ منہ بخیر کر سکیں تو ہمیں بھی حضرت عمرؓ کے
 اس قدر گناہ گاری کا چنداں رنج نہیں اول تو مرگ ابنوہ جسنے دار و دہ دوسرے

سہ شام کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے گوشت خاک ماہم بر یاد رفتہ باشد

شیعوں کو یہ جواب کہاں سے آگیا کہ منشا بنوی تحریر مسئلہ خلافت حضرت علیؓ تھا | معجزہ ادوات فلم کاغذ کے منگائے
 سے یہ کہاں لازم آگیا کہ فرمان خلافت حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ہی تحریر فرماتے ظاہر عبارت
 سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو تقاضا کرتا ہے کہ دین اسلام کی باتوں کا خلاصہ جو تمام ارکان کی جڑ
 ہو تحریر فرماتے یا احکام دین میں سے وہ احکام کہ ان کی تعمیل کو تمام احکام کی تعمیل لازم ہو لکھواتے
 چنانچہ آپ کا یہ فرمانا کہ ان پر عمل کرو گے تو گمراہ نہ ہو گے اس بات پر گواہ ہے سو کسی ایک خلافت
 معین کرنے میں یہ بات ظاہر ہے کہ حاصل نہیں ہوتی یوں تاویلیں اٹھانے کو ہر کسی کے ہنڈ میں
 زبان ہے اور اگر تکلف اس مضمون کو حضرت علیؓ کی خلافت کو لازم بھی سمجھتے تو پھر کب تک حضرت
 علیؓ کے بعد پھر کچھ نہیں حالانکہ روایت کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پھر کبھی گمراہی
 پیش ہی نہ آئے گی اور یہ بھی نہ ہی بیاس خاطر شیعہ ہم نے اس پر خاک ڈالی اور اسی کو
 تسلیم کیا کہ فرمان خلافت کی تحریر ہی مد نظر تھی لیکن پھر بھی یہ کہاں سے نکل آیا کہ حضرت علیؓ ہی کی
 خلافت کی تصریح کے لئے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اضطراب تھا کہ ہدیل نقلی و
 عقلی فرمان خلافت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مرگوز خاطر حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھا نقل
 کی بات پوچھتے تو صحاح اہل سنت میں کچھ ایسا موجود ہے کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ ارشاد فرمایا کہ میری جی میں تھی کہ ابوبکر کے لئے لکھ دوں تاکہ کسی تمنا و اسے کو
پھر تمنا باقی نہ رہے مگر نہ خدا کو سوا ابوبکر کے کسی کی خوشی ہے نہ مومنین اُن کے سوا
کسی اور کے روادار انتہی۔

نصران بنی سے خلافت صدیقی کی طرف اشارہ | عرض اس روایت کا حاصل اسی پر دلالت
سمجھا جائے تو عین ترین قیاس ہے | کرتا ہے۔ کہ اگر لکھنے کا ارادہ تھا۔

تو ابوبکر صدیق کے لئے تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے نہ تھا اور عقل سے پوچھتے ہو
تو سنئے کہ دستور کے موافق آپ کو غالباً یہ اندیشہ ہو گا کہ حضرت علی کو بوجہ قرابت شاید
خیال جانشینی ہو۔ اور اُن کے احباب و اقارب اس باب میں ساعی ہوں تو اس صورت
میں حق حقدار یعنی ابوبکر کو نہ پہنچے گا اور اس قسم کا خیال بہ نسبت ابوبکر اہل عقل کے
نزدیک متصور نہیں نہ قرینہ ہے نہ احتمال اور اِثبات ہی ہو تو حضرت علی ہی کی نسبت ہو
بالجملہ اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تیج ماب تھا اور اس قدر اسکی مفت
میں اضطراب تھا سو بحمد اللہ بزم شیعہ آپ کا یہ خیال بھی راست ہو حضرت علی رضی اللہ عنہ
خواستگار خلافت رہے پھر اُس پر آپ کی پسین لونی بھی صحیح ہوئی خدا تعالیٰ کو اور مومنوں کو
کو سوا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اور کوئی پسند ہی نہ آیا القصہ اگر لکھنے کا ارادہ تھا تو حضرت
ابوبکر کے لئے تھا حضرت عمر کی شکایت کریں تو صدیقی کریں شیعان حضرت علی کو کیا
کام ہنگر وہ نقل ہے کہ بھوکے دو اور دو چار روٹیاں ہی سمجھ میں آتی ہیں اور بلی کو خواب
میں چھیڑے ہی نظر پڑتے ہیں کوئی بات کیوں نہ ہو حضرت شیعہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ
کی خلافت اور اماموں کی امامت ہی نظر آتی ہے۔ خیر اس جگہ یہ بات اتفاق تھی مطلب
اصلی یہ تھا کہ جملہ و کیمکن سے بالا جمال تمام مطاعن خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا جواب
نکلتا ہے اب یہاں بس کیجئے کہ خلافت خلفاء ثلاثہ بوجہ احسن اس آیت سے ثابت ہو گئی
اور ان کا فضل و کمال اور اُن کی بزرگی کما یبغی اس آیت سے ظاہر ہو گئی اور سنیوں کے
مذہب کی حقیقت اور اُن کی حقانیت اور شیعوں کے خیال و گمان کا بطلان اور اُن کے
طریقہ کی مذمت بخوبی روشن ہو گئی۔

خلفاء نعمت خلافت سے اصالتہً لو اسے گے دوسرا ان کے طفیلی تھے | مگر تنبیہ کے لئے اس قدر اور گزارش ہے کہ اس آیت میں اول کلمہ لَھُمْ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں دین پسندیدہ انہیں اشخاص کے لئے جمایا جائے گا جو خلیفہ بنائے جائیں گے اور یہ نعمت عظمیٰ اولاً بالذات انہیں کو عطا ہوگی جو خلیفہ ہوں گے مقصود اصلی وہی محبوب ہوں گے اور وہ دولت اگر ملیگی تو انہیں کے تصدق ملیگی مگر استخلاف اور تبدیل خوف میں ان کا اصل الاصول ہونا عام فہم سمجھ کر الفاظ موجودہ پر اکتفا فرمایا پر دین کا ایک کے لئے اصلی ہونا اور باقیوں کیلئے اُس کا تصدق ہونا چونکہ ایسا عام فہم نہ تھا کہ شیعہ بھی مان جائیں تو لَئِیْمَلَّتْ کے بعد لفظ لَھُمْ بھی بڑھایا غرض اُس عہد میں او بھی اگر اُس دین پر ہونگے تو وہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہوگا اس سے یہ ثابت ہوا کہ تسلط اہل اسلام اور تمکین دین پسندیدہ اور ازالہ خوف اور تبدیل امن جو کچھ تھا سب کا سب اصل میں انہیں چار یار کے لئے تھا لیکن جیسے کسی امیر کی کوئی دعوت کرتا ہے تو اُس امیر کے اقربا اور اُس کے حشم خدم کی دعوت بھی اُس امیر کے طفیل میں کر دیتا ہے پھر جو امیر مذکور کو کھلاتے پلاتے ہیں اُس کے اقربا و حشم خدم کو بھی وہی کھلاتے ہیں فرق ہوتا ہے تو اصالت اور تبعیت کا اور اعزاز و اکرام کا ہوتا ہے ایسے ہی یہ نعمت عظیمہ اور دولت جلیلہ خلافت وغیرہ بھی ہر چند اصل میں انہیں چار یار کے لئے ہیں لیکن ان کے طفیل میں اس نعمت عظمیٰ سے تمام اصحاب بہرہ ور ہوئے جو صحابہ کہ کبھی عرب اور فقرہ صحابہ میں معدود تھے وہ بھی مناصب حکومت پر مامور ہوتے تھے اور کفار پر حکم اور حکمرانی تو ہر کسی کو حاصل تھی اور انیٰ صحابی کا ناز امرا اہل کتاب کو اٹھانا پڑا القصہ نعمت خلافت ہر چند بالاصالت چار یار ہی کے لئے تھی مگر سب ہی اُس میں شریک اور ساری نعمتوں سے جو اس آیت میں مندرج ہیں صحابہ اور غیر صحابہ بطویل خلفاء اربعہ حسب لیاقت بہرہ ور ہوئے اس میں صحابہ کو بمنزلہ اقربا سمجھئے اور ان میں بھی ان کو جو وقت نزول اس آیت کے مشرف باسلام و ایمان ہوئے تھے زیادہ تر قریب سمجھئے پھر مہاجرین اولین

کو سب سے اقرب بلکہ بمنزلہ حقیقی بھائیوں کے مقرر رکھئے اور تابعین کو بجائے اتباع اور
خدام کے تصور کیجئے اس صورت میں یہ نعمت گو سب میں مشترک ہوگی لیکن اعزاز
واکرام میں درجہ بدرجہ فرق ہوگا۔

وَمَنْ كَفَرَ سِیَعِہ کے کفران نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اعجاز قرآنی ہے | اور یہ بھی ظاہر ہے
کہ خویش واقارب اگر بطفیل امیر کے نعمت سے کامیاب ہوتے ہیں تو امیر کچھان سے خواستگار
شکر گزاری یا طالب خدمت گاری نہیں ہوتا ہاں غلام اور خدام اور زلہ برداروں کی
طرف البتہ جو یہ نظر رہتی ہے سوائے میں سے قدر شناس اور عاقل اور سلیم الطبع
ہوتے ہیں وہ خدمت گزاری اور شکر گزاری سے پیش آتے ہیں اور مجاہد اصل اور ناقدر
ہوتے ہیں وہ شکر گزاری تو درکنار اپنے آقا نعمت اور وسیلہ راحت کی جزو کائنات
کے درپے ہوتے ہیں۔

سوائے نعمت عظمیٰ خلافت کا حال بھی یہی ہوا کہ ہر چند خلفاء اربعہ کے صدقہ
میں اس زمانہ تک کے اہل اسلام کامیاب ہیں جس قدر دین کو وسعت اور شوکت ہوئی
یا اب ہے حقیقت میں سب انہیں کی خلافت کا پھول پھل ہے لیکن صحابہ کے زمانہ
سے لیکر آج تک جیسے اس نعمت کے شکر گزار ہیں ویسے ہی اس زمانہ سے لیکر آج تک کافر
نعمت بھی برابر چلے آتے ہیں مگر چونکہ ظلم الہی تو وقائع گذشتہ اور وقائع آئندہ کو برابر محیط
تو بطور اخبار بالغیب کے ان کافران نعمت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضرور پڑتا کہ خلفاء
اربعہ کی بزرگی اور ان کے اعداء کی برائی قرار واقعی ثابت ہو جائے اور ان کا اور ان کے
اعداء کے مرتبہ کا حال سب کو بخوبی واضح ہو جائے اسی واسطے بعد اتمام وعدہ اور
بیان حال خلفاء اور صحابہ کے جو آگے ہونے والا تھا اتنا اور ارشاد فرمایا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ
ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ یعنی جو کہ طفلی اور تابع خلفاء کے اس نعمت میں ہوں اور پھر
حق نعمت نہ پہنچائیں اور خدمت گاری اور اطاعت فرمان تو درکنار زبان سے شکر گزار
تک نہ ہوں بلکہ الٹے بدی سے پیش آئیں تو وہ اصل فاسق ہیں کہ کوئی فاسق ان کے برابر
نہیں اور یہ تو خود ظاہر ہے کہ اس آخر آیت کے مصداق بجز شیعہ اور نو اصیب اور خوارج

اور قاتل خلیفہ ثانی اور قاتلان خلیفہ ثالث اور قاتل حضرات امیر رضی اللہ عنہم کے اول کوئی معلوم نہیں ہوتا مگر چونکہ شیعہ ان کے دشمن ہیں جو اس نعمت کے حق میں اصل اصول ہیں تو اس فسق میں جو اس ناشکری کا ثمر ہے سب میں پیشرو ہوں گے اگرچہ کسی اور وجہ سے وہ دو فریقے اور دوں سے بڑھ جائیں۔

اور امیر معاویہ اور یحییٰ اور صحابہ گو مخالف حضرت امیر رضی اللہ عنہ رہے لیکن ان کا بگڑنا ایسا تھا جیسا بھائیوں کا بگڑنا کیونکہ وہ اور چار یا اس نعمت غلات میں بمنزلہ امیر اور غریب بھائیوں کے ہیں کہ باوجودیکہ سب اپنے امیر بھائی کے طفلی ہوتے ہیں پھر اس سے بگڑتے رہتے ہیں عرض شکر رنجی برادرانہ کو ہر چند ایک دوسرے کا طفیلی ہو کفر نعمت نہیں سمجھا جاتا اس کو عرف میں ناز کہتے ہیں اسی واسطے اگر ایک بھائی کو دنیا میں ثروت ہو جاتی ہے اور اس کے اور بھائیوں کو اس کے طفیل سے ہمیشہوں میں عزت اور گونہ ثروت حاصل ہو جائے تو خوبی اُسی کی سمجھتے ہیں کہ وہ بھائی جس کے سب طفیلی ہوتے ہیں اپنے اور بھائیوں سے منت اور سماجت پیش آیا کرے نہ کہ غرور اور تکبر کیا کرے بلکہ اُس کے بھائی اگر اُلٹے ٹھکم کریں تو سب سبے اور مدارات سے پیش آئے اور مکافات کے درپے نہ ہو اور نہ ان سے انتقام لے بلکہ اگر کوئی شخص اس کے متوسلوں میں سے ان سے کسی قسم کی پر خاش کرے تو یہ سمجھا دے کہ میرے بھائی ہر چند مجھ سے منحرف ہیں پھر بھائی ہیں اور تم ہر چند دوست ہو پھر غیر ہو۔

القصد حق شناسوں کا دستور یہی ہے کہ باہم کی شکر رنجیوں کی وجہ سے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ غیر (خاص کر اپنے نوکر غلام) اُنکو ایذا پہنچائیں بلکہ خدا اگر کچھ لیاقت دین یا دنیا کی دیتا ہے تو اسکی جفا اٹھاتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے بلکہ اُلٹے احسان کیا کرتے ہیں ہاں اگر اپنا نوکر یا غلام اُن کی اہانت یا ایذا کے درپے ہوتا ہے تو اسکو البتہ سزا دیا کرتے ہیں۔

شیعوں کا شیوہ قبرا بازی امیر کی اتباع سے نکال کر ان کا قدم امیر معاویہ کی تقلید پر جما ہے

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا کہ اصحاب
امیر معاویہ ہم پر لعن طعن کرتے ہیں تو آپ نے اپنے لشکریوں کو انکی لعن کرنے سے منع
فرمایا چنانچہ شیعوں کی معتبر کتابوں میں موجود ہے افسوس کہ شیعوں نے امیر معاویہ
کی تقلید اختیار کر لی اور تبرّا اپنا شیوہ بنایا حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا اتباع نہ کیا کہ
کسی کو برا نہ کہیں مگر ان کے کہاں نصیب جو حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ
کا اتباع اختیار کریں، اس نعمت کے لائق سنی ہی تھے۔

شہر زاع وزغن زیباے صید و قیدیت : ایں کرامت ہمرہ شہباز و شاہین کردہ اند
سبحان اللہ کیا کلام معجز نظام ہے کہ کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ صحابہ سے وعدہ کیا
اور ان کے فضائل اشارت اور نیز صراحت سے بیان کر کے مگر ان صحابہ کی جدا خبر لی پھر
وہ بھی کچھ ایسی طرح کہ دشمنان صحابہ پر سر سے لے کر پاؤں تک برابر مطابق آئے۔

الفاظ آیت تحفظ فضیلت صحابہ کے لئے سنگین حصار کھینچتے ہیں | ہاں اگر یَعْبُدُ وَنَفِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ
بِیْ شَیْءٍ نہ ہو مایا وَمَنْ کَفَرَ کے پیچھے لفظ بَعْدَ ذَٰلِکَ نہ ہوتا تو بظاہر تاویل کی گنجائش
رہتی کہ صحابہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمارے عقیدہ کے
موافق مرتد ہو گئے تھے وَمَنْ کَفَرَ سے وہی مراد میں اور کفر سے کفر حقیقی مقصود ہے کفران نعمت
مراد نہیں مگر خدا سے کہیں کوئی بات رہ سکے ہے اہل فہم تو پہلے ہی سمجھتے تھے کہ ایسا ایمان اور
عمل صالح جو خداوند کریم کو بھی پسند آئے اور اس کے امتحان میں عمدہ نکلے یہاں تک
کہ اس پر انعام دے مبدل بکفر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسا ایمان اور عمل صالح بجز ان
لوگوں کے میسر نہیں آتا جن کے حق میں شیطان تو یوں کہے اِذَا عِبَادُکَ مِنْهُمْ
اَلْمُخْلِصِیْنَ یعنی اے خدا میں سب کو گمراہ کر دوں گا۔ سوا تیرے چھٹے ہوئے بندوں کے
اور خداوند کریم کا یوں ارشاد ہوا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ یعنی
اے ابلیس میرے جو کامل اور چھٹے بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہیں بلکہ کلام اللہ سے تو یوں
ثابت ہوتا ہے کہ مخلصین یعنی چھٹے ہوئے مومنوں کا گناہوں سے محفوظ ہونا یا معصوم ہونا لازم
ہے کیونکہ آیہ لَنْضِیْ فَعَنَّهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءُ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِیْنَ میں حضرت

یوسف علیہ السلام کے گناہوں سے بچا دینے اور بچے رہنے کی وجہ یہی فرمائی کہ وہ مخلصین میں سے تھے پھر جب خلفاء اربعہ جن کا مخلصین میں سے ہونا ابھی مرقوم ہوا محفوظ یا معصوم ہوئے تو مصداق **وَمَنْ كَفَرَ** کیونکر ہو سکیں گے۔

اس کے بعد جو لوگ کچھ قلیل مایہ فہم رکھتے ہیں ان کے لئے **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي اسْتَفَضُّوا لَهُمْ** بڑھایا۔ تاکہ صحابہ کی نسبت اپنی زبان و دل کو آلودہ گستاخی نہ کریں اور اس طرح اپنے دین و ایمان کو برباد نہ کریں اور ان کی لعنت کی سزا میں ہماری لعنت کے مستحق نہ ہوں لیکن انبیاء اور جہال کے سمجھانے کے لئے بھی کوئی بات ضرور چاہیے تھی اس لئے جملہ **يَتَّبِعُونَ** لائش کون جی شیئا زیادہ فرمایا تاکہ احتمال ارتداد بھی باقی نہ رہے اور بسبب اپنی تیرہ درونی اور کم فہمی کے اپنی ہجو کو جو **وَمَنْ كَفَرَ** سے شروع ہے صحابہ کے اوپر مطابق نہ کرنے لگیں واقعی **يَتَّبِعُونَ** لائش کون جی شیئا نے احتمال ارتداد کو جو بطور فرض محال پیش آتا تھا یخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا کیونکہ اس میں ان کے آخر حال تک کی خبر دیدی، سو جو کچھ خداوند کریم نے ارشاد فرمایا وہ سب خلفاء اربعہ میں بوجہ اتم ظہور میں آیا۔ یہاں تک کہ شیعہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خلفاء ثلاثہ خصوصاً حضرت عمر ظاہر شریعت کی پاس داری اور ترویج دین اور زبرد و تقویٰ کی رعایت بہت کرتے تھے چنانچہ شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء دالائمہ میں بلکہ اور علمائے بھی اس بات کو واضح لکھا ہے اگرچہ اپنی بدی سے باز نہیں آئے اور موافق مثل مشہور المرافقیں علی نفسہ کے وجہ اس کی یہ تراشی ہے کہ یہ سب لوگوں کے دکھانے کو تھا لیکن جملہ **يَتَّبِعُونَ** اور نیز اس جملہ کا ماقبل جب ان کے اخلاص پر دلالت کرے تو پھر موافق مثل مشہور المرافقی نواریہ لعنت از دمی خیر و بدی ریزہ یہ سرائی اور بدگوئی انہیں کے سر رہے گی۔

خلفائے ثلاثہ پر ارتداد کی تہمت خدا تعالیٰ پر دروغ گوئی کی تہمت ہے | **مَعْبُودُ الْقَطْعِ بَعْدَ ذَلِكَ** نے امامیہ کے مؤنہ کو یا نکل سیاہ ہی کر دیا ہے کیونکہ اگر بالفرض بغرض محال خلفاء ثلاثہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد بھی ہوئے تو نعوذ باللہ خدا نے اتنا بھی نہ سمجھا جتنے شیعہ سمجھے چاہیے تھا **وَمَنْ كَفَرَ** بعد وفات البنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا اور کہنا **وَمَنْ كَفَرَ**

کَعْدَ ذَٰلِكَ جَسَّ دُرُوعٌ غَوِيٌّ كِي تَهْمَتِ اِنپے ذمہ لگی اور اگر وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ بجائے خود ہے تو شیعوں کے مفید مطلب نہیں بلکہ مضر ہے کیونکہ اگر وَمَنْ كَفَرَ سے صحابہ ثلاثہ ہی مثلاً مراد ہیں تو ان کا کفر بعد اتمام نعمت موعودہ ہونا چاہیئے تو اس صورت میں انکار امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو شیعوں کے نزدیک بجز وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ خصوصاً خلفاء ثلاثہ سے ظہور میں آیا کفر لازم نہ آوے سوا اول تو یہ شیخ حلی کا گھربنا بنایا ڈھ جائیگا کہ انکار امامت اور انکار رسالت دونوں سے آدمی کافر ہو جاتا ہے دوسرے خلفاء ثلاثہ کے استحقاق خلافت کے انکار سے جو اس آیت سے ثابت ہوتا ہے خود کافر بننا پڑیگا خیر اس صورت میں ہمیں بھی شکایت نہیں ہے

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتے بگوشت خاک ہم برباد رفت باشد وَمَنْ كَفَرَ کے اصلی مصداق بالجملہ صحیح یہی ہے اور صحیح کیوں نہیں، سیاق یہی کہتا ہے کہ مصداق وَمَنْ كَفَرَ اعداء خلفاء ہیں خلفاء نہیں ہو سکتے اور کفر سے کفران نعمت مراد ہے کفر حقیقی نہیں گو تبکلف بن سکے کیونکہ اس وقت مطلب یہ ہو جائے گا کہ جو شخص ایسی ایسی امدادیں خطا کی طرف سے بنسبت دین محمدی کے دیکھے اور پھر بھی کفر ہی اختیار کرے تو وہ اصلی فاسق ہے لیکن نعمت کے مقابلہ میں کفران نعمت ہی ہوا کرتا ہے کفر حقیقی کا موقع نہیں ہوتا عرض صحیح یہی ہے کہ وَمَنْ كَفَرَ کے مصداق اعداء خلفاء ہیں لیکن ہم نے رعایت کی تھی کہ کفران نعمت مراد رکھا وہ اس کمی سے ناخوش ہیں تو اس گھائے کو پورا کر لیں اور اپنے آپ کو کافر حقیقی ہی سمجھیں ع رضا و ماہمہ آنست کان رضا شامت

بَابُ

مناقب صحابہ بدیل تفسیرات آیہ محمد رسول اللہ

یہاں پہونچکر شاید بعض شیعہ مذہب یوں حجت کریں کہ ہم نے مانا صحابہ ثلاثہ خلیفہ برحق اور اپنے زمانہ میں افضل الناس تھے لیکن بعد ان کے جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا وقت آیا تو اس وقت موافق اشارات آیہ وعد اللہ الخ کے و افضل الناس اور خلیفہ برحق ہو چنانچہ اس بات کے سنی بھی معتقد ہیں تو اس صورت میں

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے مخالفین کیوں کر مقبولان پارگاہ الہی ہوں حالانکہ اہل سنت سب صحابہ کے خواہ انہوں نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی یا نہ کی مستقد ہیں خصوصاً طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ کو تو بشر بالجنتہ بھی جاتے ہیں اس لئے لازم پڑا کہ کلام اللہ کی شہادت ان بزرگواروں کے لئے ادا کی جائے اور منشاء غلطی حضرات شیعہ کا بیان کیا جائے سورۃ فتح میں خداوند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے باب میں یوں ارشاد فرماتا ہے

حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول ہیں ساحر کا ہن نہیں اور ان کے ہمراہی کافروں پر تو بڑے تیز و تند اور ایک دوسرے کے ساتھ نرم اور ایک دوسرے کے دوست تو انہیں دیکھے تو رکوع میں جھکے ہوئے بعدے میں پڑے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی سے غرض ہے ان کے چہروں میں علامتیں موجود ہیں سجدہ کے اثر سے۔

حَمْدُ الرَّسُولِ وَاللَّهِ وَالَّذِينَ
مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ
رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ
رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ
فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا
سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ
مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ۔

اس امت میں حضور کے بعد صحابہ کا درجہ ہے اور رسالت کے بعد بغض فی اللہ کا۔ یہاں تک آیت کے معنوں کا بیان تھا اب اس ہیچمدان کی سنئے کہ اول جناب باری تعالیٰ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف فرمائی بعد میں اصحاب کی تو قرینہ عقلیہ سے معلوم ہوا کہ بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس امت میں اصحاب کا رتبہ ہے علیٰ ہذا القیاس جو وصف کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں ہو گا اس کے بعد اس وصف کا رتبہ ہو گا جو صحابہ کی مدح میں بیان ہوا ہو گا مگر ہم نے جو دیکھا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں رسول اللہ کا لفظ ہے اور اصحاب کی مدح میں اشداء علی الکفار ورحماء بینہم تو اس لف و نشر سے معلوم ہوا کہ بعد رسالت کے رتبہ بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کا ہے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے سبب کسی سے

عداوت کر فی یہ بعینہ وہی شدت علی الکفار ہے اور حب فی اللہ بعینہ رحما رہیم کا ترجمہ ہے اس اشارہ سے زیادہ تر تصدیق اس حدیث کی ہو گئی جو سنیوں کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور اس کا ما حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے خدا واسطے دیا اور خدا واسطے کسی سے ہاتھ کو کھینچ لیا اور خدا واسطے کسی سے محبت اور خدا واسطے کسی سے بغض رکھا تو بیشک اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا واقعی سنیوں کی حدیثیں سب کلام اللہ پر مطلق آتی ہیں پر شیعوں کی حدیثوں کا حال یہ ہے کہ کلام اللہ کچھ کہتا ہے اور ان کی حدیثیں کچھ ایک دو حدیثیں جو بیان کی گئیں انکا حال ناظرین رسالہ ہذا پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

صحابہ کی غفلت میں اشدر علی الکفار کو باقی اوصاف پر مقدم کر چکی حکمت پر یہاں ایک لطیفہ قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں جہاں کہیں حب فی اللہ بغض فی اللہ کا بیان آیا ہے تو حب فی اللہ کو مقدم کیا ہے اور کلام اللہ میں بغض فی اللہ پر جو لفظ دلالت کرتا ہے یعنی اشدر علی الکفار اسے مقدم بیان کیا حکمت اس میں کیا ہے؟ اس کم فہم کے فہم میں یوں آتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ دونوں آثار کمال محبت خداوندی میں سے ہیں یعنی حب کسی کو خداوند کریم سے محبت کمال درجہ کی ہوگی تو وہ محبت چاروں طرف کو پھیلے گی جہاں جہاں خدا کے ساتھ کسی چیز کو کچھ خصوصیت ہوگی تو اس خصوصیت ہی کے موافق اس چیز سے بھی محبت ہوگی۔

محبوب کے متعلقین کی محبت محبوب ہی کی محبت ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کو نبی اکرام میں سے خدا کے ساتھ زیادہ علاقہ اور اختصاص ہے تو جس شخص کو خدا کے ساتھ محبت کامل ہوگی اور اس علاقہ کو سن لے گا تو بیشک اس کو بعد خدا کے رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم ہی سے محبت ہوگی علیٰ ہذا القیاس جس کو بعد رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کے خدا سے زیادہ اختصاص ہوگا تو محب خداوندی کو بھی اس سے اسی قدر محبت ہوگی علیٰ ہذا القیاس مکانات میں مثلاً خانہ کعبہ کو زیادہ تر اختصاص ہے تو محب خداوندی کو بیشک سب مکانات سے زیادہ خانہ کعبہ سے محبت ہوگی پھر اس کے بعد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد کا رتبہ ہے اسکے بعد بیت المقدس کا تو اس شخص کو بھی علی حسب المراتب محبت ہوگی اسطرح اعمال اور اخلاق اور عادات میں خیال کر لو انقصہ جتنا کسی چیز کو جناب باری سے قرب ہوگا اتنا ہی محبوبان خداوندی کو اس چیز سے علاقت ہوگا۔

متعلقین محبوب کی محبت محبوب کی محبت کا جزو ہے | مثلاً ظاہر کی محبت میں ظاہر ہے جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے اقربا اور خیر خواہوں بلکہ کوچہ کے رہنے والوں کے ساتھ بھی محبت ہو جاتی ہے سو جیسے روشندانوں میں گودھوپ بمقدار روشندان کے آتی ہے ایسے ہی محبت بھی بمقدار علاقہ محبوب متعلقان محبوب سے پیدا ہو جاتی ہے مگر جیسے گودھوپ باہر ہوتی ہے اسی کا ٹکڑا اندر ہوتا ہے اور جو نور خارج از دیوار ہے اسی نور کا شعبہ اندر ہے ایسے ہی متعلقوں کی محبت بھی محبوب ہی کی محبت کا شعبہ ہوتا ہے اور اسی کا ٹکڑا اسکو سمجھنا چاہیے۔

بدخواہان محبوب کی دشمنی محبت کا جزو نہیں اسکا لازم ہے | بخلاف بدخواہان محبوب کی عداوت کے کہ وہ محبوب کی محبت کو لازم ہوتی ہے اس کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ نہیں ہوتی یعنی جو لوگ کہ محبوب کے بدخواہ ہوتے ہیں ان سے بتقاضا محبت محبوب عداوت ہونی لازم ہے مگر یہ عداوت محبوب کی محبت کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ بلکہ بچس تک نہیں ہاں اسکو لازم ہے جیسے دھوپ کو بشرطیکہ دیوار وغیرہ کوئی شے نور کے روکنے والی حائل ہو سایہ لازم ہے حالانکہ اس کے بچس تک نہیں اس قیاس پر جو لوگ اعداء خدا ہوں گے محبوبان خداوندی کو ان سے عداوت لازم ہوگی لیکن بہر حال یہ عداوت غیر محبت ہے اگرچہ اسکو لازم ہے ہاں اولیاء خدا اور مقربان الہی کی محبت وہ حقیقت میں خدای کی محبت کا ٹکڑا ہے کوئی غیر شے نہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی مدح اور ثنا بیان فرمائی وہاں تو مقدم کو مقدم رکھا موخر کو موخر اور خداوند کریم حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی تعریف نہیں فرماتے بلکہ ان لوگوں کی تعریف کرتے ہیں جن میں یہ وصف پائے جاتے ہیں

کسی کی مدح میں پہلے ہلکی پھر بڑھیا پھر اور بڑھیا خوبی بیان کرنا صحیح ترتیب ہے | اور دستور یوں ہے کہ کسی صاحب کمال یا موصوف باوصاف مختلفہ کی اگر تعریف کیا کرتے ہیں تو اس کے کمالات میں سے کمتر کو پہلے لیا کرتے ہیں بعد میں اس سے زیادہ کو پھر بعد میں اس سے زیادہ کوتاہ و وصف کی قدر اور عزت ہو ورنہ اگر ترتیب کو بالعکس کر دیجے تو بعد عمدہ اوصاف کے سن لینے کے کمتر اوصاف کیا قدر رہ جائے گی جو محل تعریف میں بیان کیا جائے غرض یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اوصاف کی خوبی اور برائی تو اصلی ہے اور اوصاف والوں کی بھلائی بُرائی اوصاف کے سبب سے ہے در صورتیکہ اوصاف کی بھلائی بُرائی بیان کی جائے تو اول کو اول بیان کیا جائے اور دوم کو دوم اور در صورتیکہ اوصاف والے کی بھلائی بُرائی مد نظر ہو اور اس شخص کے اوصاف بہ ترتیب ذکر کئے جائیں تو ترتیب مذکور کو منکس کر دینا چاہئے ہاں جہاں دو چیز کا فرق مراتب باعتبار مجموعہ اوصاف کے دریافت کیا جائے یعنی کس میں زیادہ اوصاف ہیں اور کس میں کم؟ اور کس میں عمدہ تر ہیں اور کس میں نہیں؟ تو یہ حقیقت میں اوصاف ہی کی تعریف ہے اس لئے انکی ترتیب وہی ہوگی جو اوصاف کی ترتیب ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اول ذکر کیا بعد میں صحابہ کا مذکور شروع کیا قصہ صحابہ کی تعریف میں ادنیٰ وصف جو بیان کیا گیا ہے تو اشداء علی الکفار ہے یعنی وہ کافروں پر بڑے ہی تیز و تند ہیں۔

محبت کرنا آسان ہے اور دشمنی دشوار خصوصاً اقربا سے | اور چونکہ محبت کرنا آسان ہے کیونکہ طبعی بات انسان کی یہ ہے کہ جب کوئی اس سے محبت کرے تو یہ بھی اسکی طرف مائل ہو تو اس صورت میں خدا واسطے کی محبت سے ایمان خوب نہیں پرکھا جاتا ہاں عداوت کرنی البتہ دشوار ہے کہ عداوت کے ثمرہ میں دوسرا بھی عداوت ہی سے پیش آئے گا محبت تو کم معلوم تو اگر کسی کو خدا واسطے کسی سے بغض ہو تو یہ نشان کمال ایمان ہی سمجھا جائے گا خاص کر خدا واسطے کی عداوت بھی اقربا سے کہ یہ دشوار اور دشوار ہے سو درنہ تو تیکہ مطلق عداوت نشان کمال ہو تو اقربا کی عداوت تو نشان اکلیت

سمجھنا چاہئے۔

اور ہم جو قرینہ مقام کو لحاظ کرتے ہیں تو محل اقرباہی کی عداوت کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ماسبق کی آیت یعنی لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْوُثَّاءُ صحابہ کرام کی تسلی اور تسکین خاطر کے لئے نازل ہوئی ہے سو جس غم کے سبب تسلی کی جاتی ہے وہ غم یہی تھا کہ غزوہ حدیبیہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ معظمہ سے صلح کر کے مراجعت فرمائی اور صحابہ کی آرزوئیں خاص کر مہاجرین کی جو درباب جہاد کفارینہ میں لبریز تھیں دلوں کی دلوں میں رہ گئیں اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ابتدا میں اس سفر کے یہ خواب دیکھا تھا کہ ہم جمیع جماعت امن چین سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور اس خواب کے باعث باین خیال کہ اسی سال میں ہم مکہ میں داخل ہوں گے صحابہ کے دل میں یہ سرور بھرے ہوئے تھے کہ کچھ کہا نہیں جاتا وہ سب سب حسرت و غم سے بدل گیا اس وقت صحابہ کا یہ حال تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہوتی تو آب تیغ صحابہ کفار مکہ کو غرقاب فنا کر دیتی پاس قرابت کس کا اور شفقت نسبی کجا وہی مہاجرین جو مکہ والوں میں سے کسی کے بھتیجے تھے فقط جوش محبت خداوندی اور نیاز مندی رسول میں انہیں اپنے اقربا کے خون کے پیانے نظر آتے تھے اور آیت ماسبق اور آیت محمد رسول اللہ الخ سب باہم چسپیدگی میں دست و گریباں ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو یوں تو ہر کافر دشمن خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غیظ و غضب آتا تھا لیکن اس آیت میں زیادہ تر اسی غیظ و غضب کی طرف اشارہ ہے جو انکو کفار مکہ پر اس قصہ میں پیش آیا سو ان میں سے مہاجرین انہیں کفار کے اقربا میں سے تھے تو ان کے حق میں لفظ اشداء علی الکفار نشان اکملت ایمان کا سمجھنا چاہئے اور در صورتیکہ ادنیٰ وصف ان کا اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ انکا ایمان کامل تو کیا اکل ہے تو اعلیٰ اوصاف تو اعلیٰ ہیں اور چونکہ مومنان کامل الایمان گئے چنے ہوئے ہوتے ہیں کچھ ایسی سہل بات نہیں کہ دخل در معقولات کی طرح ہر کوئی کمال ایمان حاصل کرے۔

صحابہ بہادرت کتاب اللہ نفس و شیطان پر بھی اشد تھے۔ | معہذا قرینہ اس بات کا کہ اول رسول اللہ
 ہنذا ان کی گمراہی کا خیال بھی گمراہی ہے۔ | صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر فرمایا پھر
 صحابہ کا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس
 امت میں اول نمبر ہے اور صحابہ کا دوم تو ہم بالیقین سمجھتے ہیں کہ صحابہ کرام اول قسم
 کے مخلصین میں سے تھے کہ شیطان بھی اُنکے اغواء سے کانوں پر ہاتھ دہرتا تھا بلکہ یوں
 نظر کہ شیطان اس ورئیں کفار ہے اور صحابہ اشد اعداء علی الکفار ہیں تو شیطان پر
 اور بھی اشد ہونگے علی ہذا القیاس نفس اعداؤ دین میں سے بلکہ سب میں بڑھ کر ہے۔
 شیطان بھی اُسی کے سرہانے اپنا کام کرے ہے وہ اگر نہ مانے تو شیطان کیا کرے
 بہر حال نفس و شیطان سے اُنکی عداوت اور بھی زیادہ ہوگی اور ان دونوں پر وہ اور
 بھی اشد ہونگے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے دشمنوں سے عداوت بقدر دشمنی
 ہوتی ہے جتنی دشمنوں کی دشمنی زیادہ اتنا ہی بغض فی اللہ زیادہ ہو اور مخلصین پر شیطان
 کا فقط بس نہ چلتا تھا مگر کچھ اندیشہ بھی نہ تھا صحابہ سے اسکی کو رہی دیتی تھی عجب
 نہیں کہ اُن سے بھاگتا پھرتا ہو۔

سو یہی وجہ ہوگی کہ حضرت عمر کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا تھا۔ کیوں کہ وہ سب صحابہ
 میں کافروں کے باب میں زہر قاتل تھے ان کے حق میں اشد اعداء علی الکفار ہونا سب میں زیادہ
 صادق آتا تھا بھلا شیطان جن سے خود بھاگے انہیں کیا گمراہ کرے گا شیطان کو
 ایسی جگہ اپنی ہی پڑ جاتی ہے اور نفس جن سے دبدبہ کس سے دہیں گے آدمی۔۔
 ادروں سے جو دبتا ہے تو اس نفس ہی کے پتے دیتا ہے اسی واسطے یہ لازم پڑا کہ ایسے لوگوں
 کی عبادات میں کچھ فرق نہ پڑے اور ان میں کسی قسم کا رلاؤریا وغیرہ کا نہ ہو کیونکہ ان سب
 بیماریوں کی جڑ یہی دو آسیب تھے جب یہی قابو میں آگے پھر کیا کسر باقی رہ گئی۔

نفس و شیطان کی آمیزش بغیر غلط فہمی سے | ایسے وقت اگر ہر اکام ہوتا ہے تو فقط بسبب
 کوئی غلطی ہو تو امید ثواب ہے۔ | غلط فہمی کے ہوتا ہے اس لئے اس میں ہی ثواب
 ملنا چاہئے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے جوہر کے

بال غصے میں پکڑ کر کھینچنے حالانکہ حضرت ہارون کی کچھ تقصیر نہ تھی ہرگز عقل سلیم کے نزدیک داخل جہانم نہیں یہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا مواخذہ ہو بلکہ امیدِ ثواب ہے کیونکہ باعث اس کا فقط خدا کی محبت اور بغض فی اللہ ہوا اور چونکہ یہ دونوں اوصاف محمودہ میں سے ہیں بلکہ اعلیٰ مقام میں سے اور ادھر اعمال کا مدار سے پر فقط صورت پر نہیں درنہ سب کی نمازوں کا برابر ہی ثواب ہوتا تو ہم کو یقین کا مل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس پر ثواب ملے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعد اطلاق غلطی کی بوجہ غلطی ندامت ہونی ضرور ہے سو اس ندامت سے یہ نہیں لازم کہ وہ کام ایسا بُرا ہو کہ انکو اس پر عذاب ہو بلکہ وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ کام تو حقیقت میں برا ہوتا ہے پر نیت کے غلبہ سے اچھا ہو جاتا ہے جیسے وصول دھبہ اصل سے برا ہوتا ہے لیکن یارانِ غمگسار کا دھول دھبہ بھی بسبب اس کے کہ ازراہ محبت ہوتا ہے موجب نشاط خاطر مخردن ہوتا ہے۔

مشاجرات صحابہ کا باعث نفس و شیطان نہیں بلکہ بغض فی اللہ تھا | الغرض صحابہ کرام کے سامنے جب نفس و شیطان مغلوب ہوئے تو اس وقت اگر کوئی کارِ بیوقوفانہ سے صادر ہوا ہو تو بوجہ غلط فہمی صادر ہوا ہوگا اس صورت میں گو وہ کام برا تھا لیکن چونکہ بری طرح سے نہیں ہوا اور شیطان و نفس کو جو برے کاموں کی اصل اور بنیاد باندھنے والے ہیں اس میں دخل نہیں ملا بلکہ قوت ایمانی ہی باعث اس کا ہوئی ہے تو اب بوجہ غلبہ نیت اور قوت ایمانی ان کاموں کی برائی ایسی مغلوب ہو گئی ہے جیسے ماشہ دو ماشہ برابر میٹھے یا نمک کا اثر کنوئیں یا دریا میں۔

سو جیسے حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون پر غصہ ہونے اور انکے بال پکڑ کر کھینچنے کا باعث فقط بغض فی اللہ تھا ایسے ہی مشاجرات صحابہ بھی بغض فی اللہ پر مبنی ہوں لیکن جیسے حضرت موسیٰ سے یہ غلطی ہوئی کہ اس بغض فی اللہ کو بیوقوفانہ صرف کر دیا ایسے ہی صحابہ سے بھی یہ غلطی ہوئی ہو کہ جوش بغض فی اللہ میں مثلاً چوک گئے اور بگاڑ بیٹھے اور حقیقت الامر کہ سمجھے تو اس صورت میں ان پر مواخذہ نہ ہوگا بلکہ ماجرہ ہوں گے ہاں اگر بغض فی اللہ یا کوئی اور صنف محمود باعث اس کا فعل کا نہیں ہو کہ بلکہ کوئی ایسا

امر ہے کہ اس پر ثواب نہیں ہو سکتا فقط اس قسم کے افعال مباح ہوتے ہیں تو البتہ ثواب تو مترتب نہ ہو گا لیکن بسبب غلط فہمی کے مانوڑ بھی نہ ہوں گے۔

نفس دب سکتا ہے لیکن اسکا مزاج نہیں بدل سکتا اور احتمال یہ بھی ہے کہ گہرہ و بیگاہ اقل قلیل بہ مقتضائے مشریت کوئی حرکت نامنزا صادر ہوئے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چند شیطان کو مخلصین پر قابو نہیں رہتا اور نفس بھی مغلوب اور مقہور ہو کر ان کا اس طرح مطیع فرمان ہو لیتا ہے جیسے ہاتھی باوجود اس عداوت کے کہ اسکو آدمیوں سے ہے مغلوب و مقہور ہو کر آدمیوں کی طرح سے اطاعت کرتا ہے لیکن جیسے ہاتھی پھر ہاتھی ہے آدمیوں کے غلبہ سے آدمی نہیں بن گیا کبھی نہ کبھی اپنی عادات اصلی پر آجاتا ہے ایسے ہی نفس کو غلبہ ایمان اور صولت محبت الہی کے باعث مقہور اور مغلوب ہو گیا ہے لیکن پھر نفس ہے وہ طبع زائد برائی اور گناہوں کی رغبت کہاں جائے۔

نیکی کی اصل روح اور بدی کی اصل نفس ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے بدن میں چاروں قسم کی کیفیات یعنی حرارت برودت یوست رطوبت کے پائے جانے سے یہ دریافت ہوا ہے کہ بیشک بدن ان چاروں کیفیات کی اصلوں سے یعنی آگ ہوا پانی خاک سے مرکب ہے ایسے ہی ملحوظ اس بات کے کہ آدمی کے دل میں کبھی نیکی کی طرف رغبت ہوتی ہے کبھی بدی کی جانب یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقت ان دونوں کی اصلوں سے مرکب ہے لیکن جیسے اربع عناصر میں سے ہر ایک میں ایک کیفیت خاص ہے کہ اس کے مخالف اس میں نہیں پائی جاتی اور اگر پائی بھی جائے تو عارضی ہوتی ہے جیسے پانی کا گرم ہو جانا ایسے ہی نیکی اور بدی کی اصل میں بھی ان دونوں میں سے ایک ایک ہوتی چاہئے اور دوسری آجائے تو وہ عارضی ہے جب یہ بات مسلم ہو چکی تو ہم کہتے ہیں کہ نیکی کی اصل کا نام ہم روح کہتے ہیں اور بدی کی اصل کا نام نفس اور روح میں کیفیت اصلی نیکی ہوگی مغلوب ہو کر اگر بدی اس سے صادر ہو تو وہ عارضی ہے اور نفس کی اصلی خاصیت بدی ہوگی اور مغلوب ہو کر نیکی کرنے لگے تو وہ عارضی سمجھی جائے گی۔

روح عالم ملائکہ کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین میں سے ہے | اس جگہ سے ہم یوں قیاس کرتے ہیں کہ جیسے حرارت غریزی کے وسیلے سے ہم یوں دریافت کرتے ہیں کہ آدمی کے بدن میں ایک جزو ناری بھی ہے اور پھر اس کو یوں کہتے ہیں کہ اس کی اصل کمرہ ناری ہے خدا نے اپنے زور قدرت سے اسے یہاں لاکر قید کر دیا ہے ایسے ہی نیکی کے ارادہ کے وسیلے سے اول تو ہم یہ دیتا کرتے ہیں کہ آدمی میں کوئی چیز ایسی بھی ہے کہ اس کی اصلی خاصیت نیکی ہے اور دوبارہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل طبقہ ملائکہ ہے جن کی شان میں خداوند کریم یوں ارشاد فرماتا ہے لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ یعنی خدا کی نافرمانی کرتے ہی نہیں جو حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں سو اس کا حاصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت نیکی ہی ایسے ہی انسان کے دل میں ہدی کے ارادہ اور خواہش کے وسیلے سے اول تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی جز ایسا ہے کہ اس کی اصلی خاصیت بدی ہے اور پھر یوں خیال میں آتا ہے کہ اس کی اصل طبقہ شیاطین ہے جن کے حق میں جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلرَّبِّ كَفُورًا حاصل یہ کہ شیاطین اپنے رب کے قیدی نافرمان ہیں سو اس کا حاصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت بدی اور نافرمانی ہے۔ القصہ روح عالم الملكوت کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین سے ہے۔ خداوند کریم نے اپنے زور قدرت سے ان کو ایک جگہ ایسا جمع کر دیا ہے۔ جیسا طوطی اور زرافہ کو ایک قفس میں بند کر دیں۔

انسان میں نیکی و بدی کے مختلف دور ملائکہ اور شیاطین کی تقویت و تاثیر سے ہوتے ہیں | پھر جیسے بدن کے اربع عناصر میں ہر ایک کو اس کے محسوس سے تقویت ہوتی ہے۔ ایسے ہی روح اور نفس کو بھی اپنے اپنے محسوس سے یعنی ملائکہ اور شیاطین سے تقویت ہوتی ہے چنانچہ بعض احادیث بھی اس پر شاہد ہیں اور زور عقل بھی ہم یوں ہی یقین کرتے ہیں کہ اوقات مختلفہ میں نیکی اور بدی کے خیال کا غلبہ بوجہ ملائکہ یا بوجہ شیاطین ہو تو ہو ورنہ جو انداز طبع زاد تھا وہی رہتا غرض طبعی کیفیت اگر جاتی ہے تو کسی خارجی شے کے غلبے سے جاتی ہے سو نیکی کے خیال کا غلبہ لفظ ہر سامان بجز اعانت ملائکہ متصور نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس مسی کی جانب کجی کی زیادتی بجز تاثیر شیاطین معقول نہیں۔

نفس دب جائے تو اشد اعلیٰ الکفاس کا مقام ہاتھ آتا ہے | سو اگر کسی وقت نیکی کا خیال غالب ہو اور اس

وجہ سے اعمال صالحہ صادر ہوں اور اس ترکیب سے روح کی تاثیر نفس پر ایسی طہرح عارض ہو جائے جیسے برتن کے نیچے آگ جلانے کی ترکیب سے آگ کی تاثیر پانی پر عارض ہو جاتی ہے اور اس کی تاثیر اصل کو جو ٹھنڈک ہے، دبا لیتی ہے تو اس صورت میں نفس بھی روح کے کام ایسے ہی دینے لگے گا جیسے بہت گرم پانی آگ کا کام دے یعنی بدن کو جلادے | لہذا القیاس اگر نفس روح پر غالب آجائے گا تو روح نفس کی تبعیت میں نفس کے کام دینے لگے گی کیونکہ ترکیب میں ہی ہوتا ہے کہ یا یہ غالب ہو یا ہنوخنا پنچ اجسام میں ہی حال ہوتا ہے کبھی کسی خلط کا غلبہ کبھی کسی خلط کا غلبہ ہر حال اگر روح غالب ہوگی تو ایسے وقت میں روح کو نسبتہ نفس کے اشد اعلیٰ الکفاس میں سے سمجھنا چاہیے۔ اور اس وقت میں شیطان کا بالکل اختیار اٹھ جاتا ہے اور وہ تسلط اور حکومت جو پہلے تھی۔ باقی نہیں رہتی۔

نفس دب جائے تو بھی قابل اعتبار نہیں | لیکن جیسے کسی شخص پر ہمیں ایسا اختیار تو ہوتا ہے جیسے نوکر یا غلام پر ہوتا ہے مگر تاہم اپنی طرف سے اپنے جی کی بات سوچایا کرتے ہیں وہ ماننے یا نہ ماننے ایسے شیطان بھی اپنی حسب مرضی کہنے سے یعنی دوسو سو ڈالنے سے باز نہیں آتا، بہر حال جن کا نفس مقہور اور مغلوب ہو جاتا ہے وہ روح کی تبعیت میں اچھے کام کرنے لگتا ہے لیکن پھر نفس نفس ہی ہے۔ جیسے پانی کتنا ہی گرم کیوں نہ ہو آخر پھر پانی ہے۔ اول تو آگ کے بجھانے کی سیاحت ہے جیسا ٹھنڈا پانی دوسرے یہ حرارت عارضی ہے اور عارضی چیز کا کیا اعتبار ابھی آگ جلانی چھوڑ دیا چوٹھے پر سے آتا کر ذرا رکھ دو پھر وہی ٹھنڈا کا ٹھنڈا ہے اسی طرح جہاں نفس کی خبر داری سے ذرا غفلت ہوتی۔ پھر وہی اپنیوں پر آجاتا ہے

انسان ہمیشہ ایک ہی حال میں نہیں رہ سکتا | اور ہر وقت ایک سا حال رہنا محالات عادی میں سے ہے۔ خصوصاً انسان سے جس کی شان میں جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں وَكَلَّمَ نَحْنُكَ عَنْ مَا يَعْنِي حَضْرَتِ آدَمَ كِي شَان مِيں یوں ارشاد ہے کہ آدم بھول گئے اور ہم نے ان میں بختگی پائی۔ کیونکہ جو اوصاف حضرت آدم علیہ السلام میں تھے۔ تھوڑے بہت سب بتی آدم میں ہونے چاہئیں وجہ اس کی یہ ہے کہ تو والد و تناسل میں نوعیت باقی رہتی ہے اسی واسطے آدمی کے

آدمی اور گھوڑی کے گھوڑا اور گدھی کے گدھا پیدا ہوتا ہے اور جب نوعیت باقی رہے تو جو وجہ نوعیت کے باقی رہنے میں نظر آتی ہے یعنی توالد تناسل وہی بعینہ اور اوصاف کے حق میں بھی سمجھنی چاہیے بالجملہ سب اوصاف آدم علیہ السلام نسلاً بعد نسل اکم و بیش سب آدمیوں میں ہوتے ہیں چنانچہ مشہور بھی ہے **أَلَوَكُنْ سِرّاً لَّيْتَهُ** اور جب بے ثباتی بھی سب آدمیوں میں ہوتی تو پھر ایک حال پر رہنا کجا اس صورت میں لازم پڑا کہ ہمیشہ نفس کی محافظت یکساں نہ ہو بلکہ کبھی کبھی اس کی نگاہداشت میں فرق پڑے اور نفس اپنی خاصیت کی طرف مائل ہو، اور کوئی نہ کوئی قصور سرزد ہو، باقی رہی یہ بات کہ کوئی نفس کی حقیقت کو بدل کر روح بنالے یہ خود محالات میں سے ہے خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے **لَا تَبْدِلْ خَلْقَ اللَّهِ** یعنی خدا کے پیدا کئے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

غلبہ نفس اور مغلوبیت نفس سے سرزد ہونے والی خطاؤں میں بے حد فرق ہے | الغرض کوئی صورت ایسی نہیں کہ انسان خطا اور قصور سے بے اندیشہ ہو جائے۔ لیکن اس حال کا قصور اس قصور کے برابر نہیں کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر ہو اور اس پر روح کا ذرہ برابر اثر نہ ہو بلکہ الٹا اس کا روح پر اثر ہو کیونکہ پہلی صورت میں آدمی کا کچھ قصور نہیں اس کا کام اتنا ہے کہ روح کو غالب کر دے اور نفس کو مغلوب، روح کی خاصیت نفس کی خاصیت کو دبا بیٹھے یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ نفس کو بدل کر روح بنا دے یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ مدام یکساں حال رہے پھر جب اس کے اختیار میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں اور جس قدر اس کا اختیار تھا اس قدر کر گذرا، تو پھر لائق اس کے ہے کہ معاف کیا جائے چنانچہ خداوند کریم خود فرماتا ہے **لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسْعَهَا** یعنی اللہ کسی کو اس کی طاقت اور وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس لئے ہمیں یقین کامل ہے کہ اس وقت کی خطائیں ہر حین خطائیں ہیں لیکن بسبب عموم رحمت اور وعدہ مذکور کے معاف کی جائیں۔

اب سنئے کہ انبیاء سے جو لغزشیں ہوتی ہیں تو شاید اس قسم کی ہوں جن پر عتاب ہو اور احتمال ہے کہ بسبب ان کے علو رتبہ کے موافق مثل مشہور انبیاء کا بیش بود حیرانی انکی زلات سب از قسم غلط فہمی ہوں اور اوروں کو گو اس پر ثواب ملے پر ان کو اس پر عتاب ہو۔ لیکن

صحیح اول ہی بات معلوم ہوتی ہے پھر حال ہر چہ بادا بادا نبیسا کے اسرار کو خدا جانے
یا انبیاء۔

الشہداء علی الکفار سے خطا ممکن ہے لیکن شیطان کا تسلط ممکن نہیں ہے یہاں تو فقط اتنی بات سے غرض ہے
کہ یہ وصف کہ جو اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رَحْمَةً بَيْنَهُمْ کا خدا نے معرفت میں بیان کیا اور پھر
تعریف بھی ایسے وصف کے ساتھ کہ بعد رسالت اسی کا رتبہ ٹھہرا یہ وصف ایسا نہیں کہ صد در گناہ
یا صد ور خطا اس کے ساتھ محال ہو، حال البتہ جب ہو تا کہ اس وصف والوں کو حقیقت نفسی کے تبدیل
کا اختیار ہوتا۔ سورہ تو معلوم یہ بھی اس وصف والوں کو مسیر نہیں آسکتا کہ ایک حال پر برقرار رہیں
اور کیونکر رہ سکیں دو چیزیں مخالف ایک دوسرے کی دشمن سے ان کو بالاطرا ایک شے ہو تو ایک
حال پر رہے۔ ان کے واسطے یہی بہت ہے کہ شیطان کا ان پر تسلط نہیں ہو سکتا خداوند کریم
ان سے برائیوں کو ہٹاتا رہتا ہے، چنانچہ حضرت یوسف سے برائی اور فحش کے ہٹانے کی وجہی
بیان فرمائی ہے کہ وہ چنے ہوؤں میں سے ہیں۔ فرمایا ہے

كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ
وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ

یعنی یوں ہی ہوا۔ اس واسطے کہ ہٹادیں اس

سے برائی اور بے حیائی البتہ وہ ہے ہمارے

چنے ہوئے بندوں میں سے۔

القصر یہ لازم نہیں کہ جو اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رَحْمَةً بَيْنَهُمْ ہوا کریں ان سے لغزش کا

ہونا محالات میں سے ہو۔

اَشِدَّاءُ اور رَحْمَاءُ کے لئے اخلاص لازم اور ایمان ممکن ہے ہاں البتہ یہ لازم ہے کہ عبادات میں

فتور نہ ہو۔ ان کے کام میں ریا کو دخل نہ ہو۔ طالب اگر ہوں تو رضا، خداوندی کے ہوں نظر

ہو تو اس کے ایک افضال پر ہو۔ سو اسی لئے بعد ان دونوں وصفوں کے بطور علامات کے اور دلائل

کے یوں بیان فرمایا تو رَحْمَةً بَيْنَهُمْ دیکھا الخ

غلط فہمی کے سبب بڑوں بڑوں سے خطا ہو جاتی ہے جب یہ بات متاثر ہو چکی تو اب ہماری عرض علماء شیعہ کی

خدمت میں یہ ہے کہ اول تو بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کسی غلطی کے سبب سے بھلی بات کو

بری سمجھ جاتے ہیں خضر کی کشتی توڑنے کو حضرت موسیٰ سے چاہیے نبی اور العزم نے برا سمجھا اور خلافت

شرعیات سمجھ کر لوں فرمایا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اَهِسًا حاصل یہ ہے کہ تو نے برا کام کیا حالانکہ انہوں نے کچھ برا نہیں کیا تھا بلکہ بھلا کیا تھا اگر نہ توڑتے تو وہ کشتی پکڑی جاتی سو اسی طرح حضرات شیعہ بلکہ حضرات ائمہ بعض اصحاب کے افعال کو مثلاً فدک کے نہ دینے کو اور سو اس کے اور افعال کو برتر اگر برا سمجھ گئے ہوں۔ اور حقیقت میں وہ برے نہ ہوں تو شیعہ حضرات ہی نقل کی رو سے فرمائیں کیا محال ہے۔

اور یہ بھی نہ سہی شاید کسی کو یہ گمان ہو کہ حضرت خضر اہل مکاشفہ میں سے تھے ان کی بات اگر سمجھ میں نہ آئی تو بجا ہے ابو بکر کو ہم اہل مکاشفہ میں سے نہیں سمجھتے اس لئے یہ التماس ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی باہم جو شکر ربی ہو گئی اور منشا اس کا یہ ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حقیقت الامر کو نہ سمجھے اور اس سبب دست و گریباں ہو گئے اور ایسے ہی حضرت زہرارضی اللہ عنہا حقیقت الامر کو سر دست نہ سمجھی ہوں تو کیا ہرج ہے حالانکہ یہاں کوئی مکاشفہ کی بات بھی نہ تھی اس لئے کہ حضرت ہارون نے تو کچھ خطا کی ہی نہ تھی اگر معصوم ہونے کی وجہ سے اس بات کو مستبعد سمجھتے ہو تو حضرت زہرارضی اللہ عنہا تو فقط شیعوں ہی کے نزدیک معصوم تھیں حضرت موسیٰ تو بالاتفاق معصوم ہیں۔

اور مستلماً یہ بھی نہیں تو یہ ناکارہ ابھی عرض کر کے آیا ہے کہ ادیر لیا اور مخلصین سے چوک نہ ہی جاتی ہے اور خطا کا ہونا کچھ ان سے محال نہیں جو اس وجہ سے ان کی بزرگی کے منکر ہو جائے۔ بزرگی اور چیز اور صدور گناہ اور چیز۔ وہ گناہ جو مخالف ولایت ہے وہ یہ ہے کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر باقی ہو اور روح اس کے مغلوب ہو جائے، نہ یہ کہ بمقتضای بشریت بھی نہ ہو۔ ورنہ ہم تو نہیں کہہ سکتے حضرت آدم کی شان میں جو یہ آیا ہے وَعَفَا اَدَمُ رَبَّهُ فغوی یا حضرت یونس کی طرف تعریف ہے۔ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْخُوْتِ یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے مَا كَانَ لِنَبِيِّ اَنْ يَكُوْلَ لَهٗ اَسْرًا مَعَهُ يَتَخَنُ فِي الْاَرْضِ اِنَّ كَيْدَ السَّاسِ كَمَا مَعْنَى ہونگے، حالانکہ یہ سب قانع کلام اللہ میں مذکور ہیں گنجائش انکار بھی نہیں اور صحابہ کے زلات اگر زلات بھی ہوں اور از قبیل غلط فہمی ہوں تب وہ کچھ کلام اللہ میں مذکور نہیں کسی حدیث متواتر میں نہیں ممکن ہے کہ غلط ہوں اور نہ سہی ہم کہتے ہیں کہ غلط نہیں لیکن جو ہم جواب انبیاء کی طرف سے دو گے وہی صحابہ کی طرف سے سمجھ لو بلکہ ان کی

طرف سے یہی غدر بہت ہے کہ وہ معصوم نہیں بنی نہیں، اگر خطا ہو گئی تو بلا سے جب بائیمہ خدا
نے ان کی تعریف کر دی۔ تو پھر کیا حاجت جواب اور کیا عذر کی ضرورت۔

مصرع۔ ہر عیب کہ سلطان بہ پسند و ہنر ست

امکان خطا کے باوجود اتنی تعریف دلیل غفران و رضا ہے۔ | القصۃ اس قسم کے قصور
قابل گرفت نہیں۔ اور عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ ان پر محاسبہ اور
امواحد ہو بلکہ ان اوصاف کے بیان ہی میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا اس لئے کہ اشدّ اذ
عَلَى الْكَفَّارِ رَحْمَةً بَيْنَهُمْ ہونا کچھ اس بات کو نہیں چاہتا کہ ان سے کوئی خطا نہ ہوئی ہو اور جب
اس بات کا التزام نہ ہو اور خداوند کریم نے باوجود امکان صدور خطا ان کی تعریف فرمائی تو یہ معنی
ہوئے کہ یہ وصف ایسے نہیں کہ ان کے سامنے اس قسم کی باتوں کا حساب کیا جائے بلکہ یہ خوبی فقط اتنا
ہے کہ سب کو محو کئے دیتی ہے تو گویا ضمناً اشارہ ان کی مغفرت کی طرف ہوا اور جواب بھی وہ معذب ہو سکیں
تو پھر کیا تعریف جہنمی سے تو سوز بلکہ پاخانہ پیشاب بھی اچھے ہیں چنانچہ ظاہر ہے۔

القصۃ نظر انصاف چاہئے خدا کی تعریف کے بعد پھر کہیں ہو سکتا ہے کہ صحابہ جہنم میں جائیں پھر
اس صورت میں ایک کیا لاکھ گناہ ان کے ذمہ لگا دو جو کرے گا وہ اپنی عاقبت خراب کرے گا اور
سمجھنے والے اسی کو تعریف سمجھیں گے۔

امکان خطا کے باوجود اتنی تعریف اعدائے صحابہ کے مفہم بظاہر ہے | اور حق بھی تو ہے جب کوئی بادشاہ دانشمند
انتظام مملکت کا خیال ہو اور وہ ملازموں کے حال کا نگران ہوا اپنے چند ملازموں کو باوجود خطاؤں کے
کچھ نہ کہے تو ظاہر میں ہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی بہت پیارے ہیں کہ اس حال پر بھی ان سے مواخذہ
نہیں اور جو الٹی تعریف کرے اور ان کے غمازوں اور دشمنوں سے جو ان سے کینہ رکھتے ہوں۔ بری
طرح پیش آئے اور ان کے ان کمالات کو جو اپنے نزدیک اور ان کے دشمنوں کے نزدیک ان کی خوبی
مسلم البشوت ہو ان کے دشمنوں کو سنا کر کہے کہ ان میں سے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں ہم نے اس
کی سب خطائیں معاف کیں بلکہ اس کے لئے اور انعام قرار واقعی تیار کیا ہے تو اس صورت میں مجرم
کے اور کوئی احتمال نہیں ہو سکتا کہ بادشاہ کو ان ملازموں سے محبت ہے اور اس کو ان کی طرح ہے جو ان کا
دشمن ہو وہ اس کا دشمن جو ان کا دوست، وہ اس کا دوست ہے

تو پھر صحابہ کا ایک مقصد انہو لے دشمنوں کا چڑانا اور جلانا بھی ہے | سو بفضلہ تعالیٰ یہ سارا قصہ بعینہ ان آیات کے ملاحظہ سے سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اول تو صحابہ کی تعریف ایسی بڑھ کر کرے کہ اس سے زیادہ کوئی تعریف کی صورت اقیوں کے حق میں سمجھ میں نہیں آتی، پھر بعد ازاں فرمایا لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ۔ یعنی یہ جو کچھ صحابہ کے حق میں کہا گیا تو کفار یعنی ان کے دشمنوں کے جلانے اور چڑانے کے لئے کہا گیا، سبحان اللہ کیا علم محیط خداوندی ہے کہ بعد کے تمام احوال کی طرف اشارہ فرما دیا، خدا کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ شیعہ اور نواصب اور خوارج صحابہ کے حق میں عمارتیں کرینگے اور ان کی قدر و منزلت کا جو خدا کی درگاہ میں ہے کچھ خیال نہ کرینگے۔

باقی یہ بات کہ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ کا لفظ ہونا چاہیے تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کو ہی ان سے دشمنی ہو تو ہو مسلمانوں کا کام تو یہ نہیں کہ خدا ان کی تعریف کرے اور انکی سب خطائیں معاف کرے اور پھر بھی ان سے حسد کئے جائیں جن کی خدا تعالیٰ کرے اور خدا کی بات بات سے ان کی محبت ٹپکے پھر کمبختی ہے یا نہیں کہ ان کی بدی کرے اور برائیوں گائے۔ اور خدا کو اپنا دشمن بنائے

صحابہ کرام شیعوں کے بھی محسن ہیں یا یوں کہیے کہ منکران صحابہ کو جو نوبت کھڑے گوئی کی آئی اور بزم خود مسلمان ہوئے تو یہ صحابہ ہی کی جویوں کا صدقہ ہے نہ وہ جہاد کرتے نہ اس طرح اسلام پھیلتا اور نہ یہ کلام اللہ کا رواج ہوتا کہ شیعہ تک باوجودیکہ کلام اللہ کو ان سے کیا نسبت، کلام اللہ کی تلاوت سے مستفید ہوتے ہیں۔ پھر بائیں ہمہ اگر ان کے شکر گزار نہ ہوں تو پھر کس کے ہوں گے اور ان کے حق میں گستاخی کریں گے تو پھر کس کا ادب کرینگے ان سے زیادہ بڑھ کر اور کون کافر نعمت ہو گا اس لئے جناب باری تعالیٰ نے دشمنان صحابہ کو کافر فرمایا۔

صحابہ کی تعریف قرآن کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ صحابہ کے دشمن پیدا ہونگے | پھر چونکہ علم غیبی صحابہ کی نسبت بدگوئی اور گستاخی کا ہونا متحقق تھا، تو جیسے مثال مذکور میں غمازوں کے لئے بیان کیا گیا تھا ایسے ہی غمازان صحابہ کو بھی سنا سنا کر یہ ارشاد فرماتے ہیں وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَوْ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَخْفَرَكَ وَاجْزِ آعْظِمًا یعنی حاصل اس کا اس صورت میں یہ ہوا کہ اے منکران صحابہ یہ جماعت صحابہ جن کی ہم تو تعریف کرتے ہیں اور تم پھر بھی ان کی بدگوئی سے باز نہیں آتے اور سپر بھی نہیں سمجھتے

اگر بالفرض ایسے ہی ہیں جیسے تم کہتے ہو اور واقعی ان سے یہ خطائیں ہوئی ہیں جن کو تم گاتے پھرتے ہو تب کیا ہوگا ہم نے تو یہ وعدہ کر لیا ہے کہ ان میں سے جو ایمان رکھتا ہوگا اور اس نے اچھے اچھے عمل کئے ہونگے ہم اس کی خطائیں بھی معاف کر دیں گے۔ اور ان کو اجر عظیم بھی دیں گے پھر جب وہ سب کے سب کافروں کے ساتھ تیز و تند ہوں اور آپس میں محبت رکھتے ہوں نمازیں ہمیشہ مشغول رہیں سواء خدا کی رضا مندی اور اس کے افضال کے اور کہیں طلبگار نہ ہوں تو ہم ان کے گناہ کیونکر معاف نہ کریں اور انہیں کسی عذر سے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا اجر کیوں نہ دیں اس سے زیادہ ایمان اور اعمال صالحہ کی اور کیا صورت ہے۔

صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ غیر شرط ہے | اگر یہ شرط ہوتی کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ گناہ بھی کسی قسم کا نہ کریں تب بھی ایک بات تھی۔ اس وعدہ میں تو یہ شرط نہ تھی اہل ہم اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ منہم جو بعد عملوا الصلوات کے بڑھایا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ وعدہ حقیقت میں منکروں کے جواب کے لئے بیان کیا گیا ہے اور اس کی یہ صورت ہے جیسے مرقوم ہوئی۔ ورنہ یہ معنی اگر ہوں کہ کوئی ان میں سے ایمان لایا۔ اور عمل صالح کئے اور کوئی کافر ہی رہا بغور ذالہ تو اس کو ہم جانتے ہیں۔ شیعہ بھی باور نہ کریں گے۔ اس لئے کہ خدا کے اتنے تو یہ بھی معتقد ہیں کہ خدا جسے مومن تہلادے وہ مومن ہی ہے کافر نہیں۔ سو خدا نے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی پہلے ہی گواہی دے دی بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ میں سے بھی اول قسم کے ایمان اور اول قسم کے اعمال صالحہ کی گواہی دی کیونکہ ایمان میں تو اس سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں کہ خدا سے محبت اس درجہ کو پہنچے کہ اس کے دشمنوں سے کسے باشد اپنا ہو یا سگناہ عداوت ہو جائے اور اس کے دوستوں سے کسے باشد محبت ہو جائے کیونکہ سب کے نزدیک بالاتفاق محبت اعلیٰ مقامات ایمان میں سے ہے اور پھر وہ بھی اس قدر۔

ایمان کے معنی اور مراتب یقین | اور وجہ اس کی ظاہر ہے اس لئے کہ ایمان کہتے ہیں کسی چیز کے یقین کر کے تسلیم کر لینے کو۔ سو اصطلاح شرع میں خاص خدا کے کمالات پر یقین کر لینا اور پھر ان کو تسلیم کر لینا یعنی مثلاً خدا احکم الحاکمین ہے تو اس کے ایمان کے معنی ہوئے کہ اول تو خدا میں اس کو یقینی سمجھے پھر تسلیم بھی کر لے سو حاکم کی حکومت کے تسلیم کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اس سے منفرد

نہ ہو جائے علیٰ ہذا القیاس سب کمالات کو سمجھو۔

علم الیقین مگر یقین کے چند مرتبے ہیں۔ ایک تو علم الیقین یہ تو ادنیٰ مرتبہ ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی معتبر آدمی سے ہم سنیں کہ فلانی جگہ فلانی چیز ہے۔ ایسا یقین تو ہر ادنیٰ مسلمان کو حاصل ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بالافتاق پہچے ہیں۔ ان کی خبر سے معلوم ہوا کہ خدا میں کمالات ہیں اگر اتنا یقین بھی نہ ہو تو ایمان ہی نہیں۔

عین الیقین دوسرا مرتبہ عین الیقین یعنی جو کانوں سے سنا تھا وہ آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سو اس مرتبہ میں یقین پہلی مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ سن کر گو کسی چیز کا یقین ہو جائے لیکن وہ بات نہیں ہوتی جو آنکھوں سے دیکھنے میں ہوتی ہے اسی واسطے خوبصورتوں کے قصے اکثر کانوں سے سنتے ہیں اور محبت نہیں ہوتی اور آنکھوں سے دیکھنے میں جو کچھ ہوتا ہے سب جانتے ہیں لیسے اور شیریں اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے مرنے کے بعد کسی کو محبت نہ ہوئی حالانکہ شہرہ انکے حسن و جمال کا قناب ہے، جب نہ ہو گا۔ بلکہ اس سے صاف یوں معلوم ہو گیا کہ سننے سے کسی کو محبت ہوتی ہی نہیں ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کسی کو تو محبت ہوتی اپنے زمانہ کے خوبصورتوں سے تو محبت ہو جائے اور ان سے نہ ہو، وجہ اس کی اور کچھ نہیں کہ سننے سے بوجہ صورت محبت پیدا نہیں ہوتی ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام تو حضرت یوسف ہی تھے۔

اور جو کہیں سننے سے ہو بھی ہے تو وہ بھی دیکھنے ہی کا طفیل ہے یعنی آنکھوں سے جو خوبصورت نظر آتے ہیں اور ان کے دیکھنے سے ایک کیفیت ہوتی ہے تو پھر اگر سنتے ہیں کہ فلانا خوبصورت ہے تو اسے اپنے تجربہ سابق پر قیاس کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے گو نہ اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے ورنہ فقط سننے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے مادرزاد اندھے کو جسے شکل و صورت کا تصور ہی نہیں ہوتا اور خوبصورت اور بدصورت کو ہرگز نہیں سمجھتا اس کو بوجہ صورت کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں بالجملہ عین الیقین کے درجہ میں اگر کوئی چیز جمیل و مجموعہ کامل ہوتی ہے تو اس سے بشرط مناسبت طبیعت محبت ہو جاتی ہے

حق الیقین پھر ایک مرتبہ یقین کا حق الیقین ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے استعمال اور برتنے کا بھی اتفاق ہو جیسے پانی کا ایک تو دیکھنا پھر دیکھ کر اسے پی بھی

لینا، اب پینے کے بعد یہ احتمال ہے کہ شاید سیراب ہو یا دیکھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو باقی نہیں رہتا غرض یہ مرتبہ یقین ہونے میں عین الیقین سے بڑھ کر ہے اس مرتبہ میں وہ محبت جو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

محبت حق الیقین کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے | بلکہ حقیقت میں دیکھئے تو محبت اسی درجہ میں پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ پانی سے جو محبت ہے تو اسی وجہ سے ہے کہ وہ پیاس کو کھجاتا ہے جو یہ بات تو پیٹنے ہی سے معلوم ہوئی۔ اگر کوئی شخص ایسا فرض کر دے کہ اس نے نہ کبھی پانی دیکھا ہو نہ سنا ہو نہ اس کی تاثیر معلوم ہو اور نہ اسے کبھی پانی کی ضرورت ہوئی ہو۔ پھر اسے ایک دفعہ ہی پیاس لگے اس وقت اس کے سامنے اگر پانی آجائے تو وہ کیا جانے کہ اس میں یہ تاثیر ہے اور اس سے میری پیاس بجھ جائے گی بجز اس کے کہ یا تو خدا اس کے جی میں ڈال دے کہ اسے استعمال کیجئے یا کوئی اسے بتلا دے اسے ہرگز پانی کی طرف تڑپ نہ ہوگا۔ لیکن خوبصورتوں کو دیکھنا اس وجہ سے برتنا ہی ہے کہ جیسے گلزار کے دیکھنے سے جی کو راحت ہوتی ہے ویسے ہی ان کے دیکھنے سے جان و دل کو آرام ہوتا ہے۔ بالجملہ عقل سلیم یوں کہتی ہے کہ محبت حق الیقین کے مرتبہ میں ہوتی ہے چنانچہ واضح ہو گیا۔ اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس بحث کو پورا بیان کرتا مگر ناچار ہوا فرصت کم پھر اپنا حصرج اوقات، ادھر جواب خط کی جلدی۔ لہذا ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

صحابہ حق الیقین کے مراتب پر فالز تھے اور حب | بالجملہ محبت مرتبہ حق الیقین میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اعلیٰ قسم فی اللہ اور بغض فی اللہ میں بھی راسخ ہے | یقین کی ہے اور پھر محبت میں اعلیٰ قسم یہ ہے کہ محبوب کے لواحق و توابع تک محبت پہنچ جائے اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے دشمنوں سے عداوت ہو جائے سو جب جناب باری تعالیٰ نے سب صحابہ کے حق میں اس بات پر گواہی دی کہ ان کے دل میں ہمارے دشمنوں کی دشمنی اور ہمارے دوستوں کی دوستی ہے تو صاف واضح ہو گیا کہ ان کے دل میں خدا کی محبت پہلے ہے۔

باقی کوئی یوں کہے کہ مسلمانوں سے محبت ہونے کو کیا لازم ہے کہ خدا ہی کے سبب سے ہو، محبت کے بہت اسباب ہیں، نسب کی وجہ سے ہوتی ہے احسان اور سلوک اور دوستی

کے سبب سے ہوتی ہے، علاوہ اس کے اور بہت صورتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دشمنی کی بہت وجوہ ہیں۔ جب تک یہ متحقق نہ ہو کہ وہ محبت اور دشمنی خدا کے سبب سے، تب تک مطلب ثابت نہیں ہوتا۔

جواب اس کا اول تو یہ ہے کہ جب کسی وصف کے ساتھ محبت اور دشمنی کو متعلق کرتے ہیں تو عرف میں وہ محبت اور دشمنی اس وصف ہی کی وجہ سے سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ مجھے خوبصورتوں سے محبت ہے یا عالموں سے محبت ہے، علیٰ ہذا القیاس کوئی یوں کہے کہ مجھے متکبروں سے عداوت ہے یا کافروں سے عداوت ہے تو کوئی ناانصاف بھی اس کے سمجھنے میں تامل نہیں کرتا کہ یہ محبت اور یہ عداوت ان اوصاف ہی کی وجہ سے ہے اور یوں کسی کو احتمال بھی نہیں ہوتا کہ شاید کسی اور وجہ سے ہو سو خدا نے بھی اس لئے اکتفا کر کہا ہے یعنی کافروں پر بڑے تیز و تند ہیں اور کافر کے یہی معنی ہیں کہ خدا کا دشمن ہو تو معلوم ہوا کہ ان کی عداوت بوجہ کفر ہے۔ کسی اور وجہ سے نہیں اور جب بوجہ کفر ہوئی تو خدا ہی کی محبت کے سبب ہوئی ایسے ہی رَحِمًا بَيْنَهُمْ کو سمجھے۔ یعنی ایک دوسرے کو جو آپس میں محبت ہے تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کے زمرہ میں داخل ہو جانے کے باعث ہے اور اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ خدا کے متعلقوں میں سے ہیں اور جب یہ سمجھ کر ہوئی تو وہی خدا واسطے کی محبت ہوئی۔

صحابہ کا مقصود صرف رضائے الہی تھا مَعْنَا يَتَّبِعُونَ فُضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا لے اس بات کو خوب ثابت کر دیا کہ ان کے ہر کام میں خدا کی رضامندی مد نظر ہے، سو کفار سے سختی کی باتیں اور آپس کی عنایاتیں سب خدا کی رضامندی کے لئے کرتے ہیں اور خدا کی رضامندی کی طلبگاری عین نشان محبت ہے۔ سوا محبت کے اور کوئی وجہ رضا کی طلبگاری کی ممکن ہی نہیں اور بہشت کی تمنا میں جو لوگ خدا کی مرضی کے کام کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں مرضی کی طلب نہیں ہوتی جنت کی طلب ہوتی ہے جیسے فقیر روٹی کی وجہ سے مالداروں کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں ان کی رضا کے طالب نہیں۔ مقصود اصلی ان کا روٹی ہی ہوتا ہے بالجملہ رضا جوئی محب ہی کا کام ہے۔

الغرض صحابہ کرام کو جو کفار سے عداوت اور اپنے لوگوں سے محبت تھی تو وہ فقط خدا ہی کی محبت کا کمرہ تھا۔

صحابہ کی محبت اور تسلیم سے اوپر کسی اور چنانچہ محبت مرتبہ حق الیقین میں ہوتی ہے اور وہ اعلیٰ درجہ یقین کا ہے تو لازم آیا کہ سب صحابہ کو خدا کی عظمت اور جلال

اور کمال اور جمال کا اتنا یقین تھا کہ اس سے اوپر کوئی یقین کا مرتبہ ہی نہیں اور تسلیم اس درجہ کو تھی کہ اس کے آثار خود موجود تھے چنانچہ باری تعالیٰ نے خود اس کی خبر دی اور کہا تَدْرَأُھُمْ رُکْعًا سُبْحَدًا لِّیْ اَلْحِ اَلْمُکْرِ سَلِمَ نہ ہوتی تو یہ اعمال کیوں کرتے اور یہی الفاظ بمعیت جملہ نَبِیُّنَ الْاَلْحِ اَلْمُکْرِ کے اعمال صالحہ کی بھی خبر دیتے ہیں تو اب بوجہ اکل ان کا ایمان کامل اور اعمال صالحہ جن پر وعدہ مغفرت اور اجر عظیم تھا ثابت ہو گیا تو پھر یہ حتمال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہیوں میں سے کوئی مسلمان تھا اور کوئی نہ تھا اور اس وجہ سے مِنْھُمْ فرمایا تو یہ شیعوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اگر ہر بیہات کا انکار اور محال کی تسلیم ممنوع ہوتی تو سنتوں کے مذہب سے روگرداں ہو کر مذہب شیعہ پر کیوں مستقیم ہوتے اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو اس دعوے کی دو چارہ بلیس بیان کرتا مگر سمجھنے والے اسی رسالہ میں سے اس مطلب کو سمجھ جائیں گے ان کے لئے یہی دلیل بہت ہے

حق الیقین کے مراتب میں تفاوت ہے باقی کوئی یوں کہے کہ صحابہ کو اگر مرتبہ حق الیقین تھا اور وہ اعلیٰ مراتب یقین ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انہوں نے کوئی مرتبہ ہی نہ چھوڑا صحابہ کیوں کہتے ہو رسول کہو تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الیقین میں سو آدمیوں سے اگر ایک خبر سنیں اور اس پر یقین ہو جائے تو وہ بھی علم الیقین ہے اور ہزار سے سنیں تب بھی علم الیقین ہے لیکن با اینہمہ دوسرا یقین قوی ہے علیٰ ہذا القیاس کو سبھر سے ایک شے دیکھے وہ بھی عین الیقین ہے اور ایک ہاتھ کے فاصلے سے دیکھے وہ بھی عین الیقین ہے لیکن دوسری صورت میں جو وضاحت ہے وہ پہلی صورت میں نہیں، اسی طرح ایک دفعہ پانی پچھے یا تھوڑا سا پیچھے وہ بھی حق الیقین ہے اور کئی بار پیچھے یا بہت سا پیچھے وہ بھی حق الیقین ہے مجہذا دوسری صورت میں جو بات ہے وہ پہلی صورت میں نہیں ایک دفعہ میں بسا اوقات چنداں حال معلوم نہیں ہوتا ہاں کئی بار میں البتہ خوب معلوم ہو جاتا ہے۔

الغرض حق الیقین میں شریک ہونے سے مساوات لازم نہیں آتی۔ با اینہمہ ارفضانیت

کا محبت پر ہے معلوم ہونے پر نہیں بسا اوقات ایک خوبصورت کو دو آدمی برابر دیکھتے ہیں ایک کو محبت ہوتی ہے ایک کو نہیں اور جو ہوتی بھی ہے تو برابر نہیں ہوتی سو صحابہ کو خدا تعالیٰ سے اتنی محبت نہ تھی جتنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے تھی۔

باہمی مناقشات میں حمائم بینہم کے منافی نہیں ہیں اب ایک بات قابل بیان کے اور باقی ہے وہ یہ کہ شاید حضرات شیعہ کو موافق مثل مشہور ہوئے۔ خوئے بدر را بہانہ بسیار صحابہ کی بزرگی کے تسلیم کرنے میں یہ حیلہ اور باقی ہو کہ صحابہ میں باہم اکثر مناقشات ہوئے اور ان کے باہم اکثر رنج ہے اور نزاع ظہور میں آئے۔ چنانچہ طرفین کی کتابوں میں موجود ہے پھر ان کو رَحْمًا بَيْنَهُمْ کیونکر ہم کہیں اور جب یہ نہیں تو پھر کس وجہ سے یوں کہا جائے کہ وہ کامل الایمان تھے بلکہ یوں احتمال ہوتا ہے کہ جن سے حضرت امیر کو رنج پہنچا یا وہ ان سے لڑے نہ وہ رَحْمًا بَيْنَهُمْ کے مصداق تھے نہ ان پر اُصْلُوْا وَاَعْمَلُوا الصَّالٰتِ صَادِقَاتَا تھا اور لَفْظ مِنْهُمْ جو بعد عملوا الصلحت ہایا ہے تو انہی کے اخراج کے لئے بڑھایا ہے اس شبہ کا جواب ہر چند فقط ہمارے ہی ذمہ نہیں کیونکہ بعینہ ہی احتمال خوارج او لو اصعب بھی پیش کر سکتے ہیں شیعوں کو بھی اس اعتراض کا فکر جواب لازم ہے

صحابہ کی رنجش کی بنیاد بھی محبت تھی اگر بغرض لیکن خاطر شیعہ و سنی یہ معروض ہے کہ رنج دو وجہ سے ہوتا ہے ایک بوجہ عداوت ایک بوجہ محبت بوجہ عداوت کی تو صورت اظہری۔ دشمنوں کو جو دشمنوں سے رنج ہوتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں باقی بوجہ محبت کے یہ صورت ہے کہ کسی کا دوست اس کے خلاف مرضی اور خلاف توقع کرے تو یہ رنج بوجہ محبت ہے اس لئے کہ اگر جنبی ایسی باتیں کرتے ہیں تو ان سے کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اس سے خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنج فقط محبت کا ثمر ہے اگر محبت نہ ہوتی تو یہ رنج نہ ہوتا۔ ایسے ہی اگر صحابہ کو بھی سمجھ لو تو بہت ہو گا تو یہی ہو گا کہ خدا کے کلام کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

سو نعوذ باللہ مثل زرارہ بن اعین اور احوال طلق وغیرہ مقتدایان شیعہ جو بہت بات اُٹھ اور کتب جھوٹے اور کذاب ہیں چنانچہ انشاء اللہ مذکور ہو گا کچھ خداوند کریم تو جھوٹا اور کذاب نہیں جو اتنا دشوار معلوم ہو مگر جن کو جھوٹی باتوں کے تسلیم کرنے کی خو ہو وہ سچے کلام

کو اگرچہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو کیونکہ تسلیم کر لیں۔

جن روایات پر شیعہ کی بنیاد ہے ان کے معنی ہذا ہم یوں پوچھتے ہیں کہ سنی تو حسب اعتقاد شیعہ اس راویوں کی ثقاہت کا حال، قابل ہی نہیں کہ ان کی کتابوں کی روایات کو تسلیم کیا جائے باقی رہی شیعوں کی روایتیں ان کا حال یہ ہے کہ جن راویوں سے شیعہ اپنے دین ایمان کی باتیں لیتے ہیں اور ماہین شیعہ اور حضرات ائمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ واسطے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب طلق یعنی احوال طلق وغیرہم جو ان کے مقتداء اور پیشوا اور احادیث معمول بہا کے راوی ہیں ان کی جو کچھ خوبیاں اور زبرگیاں ہیں اور حضرات ائمہ نے ان کے فضائل بیان کئے ہیں وہ سب تو اس رسالہ میں نہیں آسکتے پر بطور نمونہ کچھ معروف ہے کلینی جو صرح الکتاب شیعہ اس میں یہ حدیث ہے۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابراہیم بن محمد خزار اور محمد بن حسین بیان کرتے ہیں کہ ہم امام ابو الحسن رضا علیہ السلام کے پاس گئے ہم نے کہا کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب الطلق یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بنا ایک تو کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس ہے آپ سنتے ہی سجدے میں جا پڑے اور یہ فرمایا کہ الہی تو پاک ہے ان عیوب کے ان لوگوں نے تجھے پہچانا اور نہ انہوں نے تجھے وعدہ لائے کہ لے جائے اس سبب سے جو کچھ ان کے منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔

عن ابراهيم محمد بن الحسن اور محمد بن الحسين
قَالَ ادْخُلْنَا عَلَى ابْنِ الْحُسَيْنِ الرضا عليه السلام
فَقُلْنَا اِنَّ هِشَامَ بْنَ سَالِمٍ وَالمِثْمِ وَصاحب الطلق
يَقُولُونَ اِنَّ اللهَ تَعَالَى اَجْوَدُ اِلَى الشَّرِّ تَوَّ
وَالْبَاقِي صَمَدٌ فَخَرَّ لِلَّهِ سَاجِدًا ثُمَّ قَالَ
سُبْحَانَكَ مَا عَرَفْتُكَ وَلَا وَحَدُّكَ
فَمِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ وَصَفُوكَ

دوسری روایت بھی کلینی ہی کی ہے۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابن حمزہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ ہشام بن حکم تم سے روایت کرے کہ خدا جسم ہے ٹھوس، سو اس کے جواب میں حضرت امام ہمام رضی اللہ عنہ

عن علي بن حمزة قَالَ قُلْتُ لَابْنِ عَبْدِ اللهِ
عَلَيْهِ السَّلَامُ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ الْحَكَمِ يَرْوِي
عَنْكَ اِنَّ اللهَ جِسْمٌ صَمَدٌ يُّنَوَّرُ مَعْرِفَتُهُ فَضْرٌ وَبَشَرٌ
يُخَمَّرُ بِهَا عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَقَالَ سُبْحَانَ مَنْ

لَا يَعْلَمُ أَحَدٌ كَيْفَ هُوَ إِلَّا هُوَ كَيْسَ كَيْثَلِهِ شَيْءٌ
وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ لَا يُحَدُّ وَلَا يُحْشَى وَلَا
يُحِيطُ بِهِ شَيْءٌ وَلَا جِسْمٌ وَلَا صُورَةٌ وَلَا نُحْدٌ

نے کچھ یلیا ہی فرمایا جیسا امام ابو الحسن رضائے
فرمایا تھا مطلب قریب قریب

ابن روایتوں کو دیکھئے کہ مقتدایان امامیہ نے کیا کیا معرفتیں تراشی ہیں پھر تیسرا ماموں
کا جواب دیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعضے ان کے مقتدا اور پیشوا خدا کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے تھے،
کہ خدا ازل میں جاہل تھا جیسے زرارہ بن اعین اور بکر بن اعین اور سلیمان جعفری اور محمد بن مسلم
وغیرہم اور کہاں تک بیان کروں۔ ایسے ایسے بزرگواروں سے دین کی باتیں روایت کرتے ہیں اور
پھر ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان کا نام صحیح رکھتے ہیں اور یہ افسانے انہی کی معتبر کتابوں
سے معلوم ہوتے ہیں یقین ہے کہ علماء سب سلیم کرینگے

اور اگر موافق عادت بزرگان (دفع پسندگی) سینوں کے سامنے جھوٹ بول جائیں۔ اور
الکار کر جائیں تو اپنے دل میں تو ضروری منفعیل ہونگے۔ سبحان اللہ اس بات کی رعایت تو سینوں میں ہے
کہ جن کتابوں کا صحیح نام رکھتے اور انہیں معتبر سمجھتے ہیں ان میں بجز پارساؤں اور متقیوں اور دینداروں
کے اور کسی سے روایت نہیں لاتے۔ اور حولاتے بھی ہیں تو اس غرض سے کہ کوئی اس روایت کی وجہ
سے دھوکا نہ کھا جائے اسی لئے بتلا جاتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع یعنی بنائی ہوئی جھوٹی
روایت ہے الغرض شیعوں کے دین کی روایتوں کا جب یہ حال ہے تو کتب تواریخ تو نور علی نور ہی ہو
گی اور سنیوں کی روایت خود قابل اعتبار نہیں تو اس صورت میں جو روایتیں کہ نزاع صحابہ اور باہم کی
چپقلش پر دلالت کرتی ہیں۔ کلام اللہ کے مقابلہ میں کیونکہ قابل اعتبار ہونگی بہر حال کلام اللہ متواتر
تو ہے جس صورت میں کلام اللہ میں رَحْمَةً بَيْنَهُمْ ہو اور اس کے تمہارے نزدیک ہی معنی ہوں
کہ ان میں ہرگز کبھی رنج ہوتا ہی نہیں تو موافق قاعدہ اصول کے ان روایات کا اعتبار نہ ہو گا جو کلام اللہ
کے مخالف ہیں اب بفضلہ تعالیٰ جمیع امور متعلقہ آیت مرقومہ بالا سے فراغت پائی لازم یوں ہے کہ
ایسی آیت بھی جو صحابہ کی بزرگی پر ایسے دلالت کرے کہ اظہر من الشمس ہو اور بسہولت فہم میں آجائے
اور اس روایت سے ان کا حسن خاتمہ بھی معلوم ہو جائے بیان کی جلے شاید کوئی راہ پر آجائے
لہذا آیت ششم معروفہ خدمت ہے۔

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ
وَالْأَنْصَارُ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِلُحْزَانٍ
سَرَفِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَفُوهُ وَعَدَّ
لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

حاصل اس کے معنوں کا یہ ہے کہ جو لوگ قدیم
میں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے
اور حمان کے پیچھے آئے مکی و اللہ رضی ان سے اور وہ
رہی اس سے اور تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے
لئے باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، رہا کریں وہ ان
میں ہمیشہ ہمیشہ یہی ہے بڑی مراد ملتی۔

اس آیت کے بعد ہم جانتے ہیں کہ اگر حق پرستی مد نظر ہوگی تو مولوی عمار علی صاحب تو
کس گنتی میں ہیں شیعہ صد سالہ بھی جس کی رگ و پے میں تشیع سما گیا، مو حق بول اٹھے اور کیونکر
حق نہ بولے جناب باری تعالیٰ نے اس آیت میں مسکرا کر اکابر صحابہ کے لئے حیلہ و حجت کی
گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

آیت ہجرت میں رضائے الہی کا مدار صرف ہجرت پر ہے اگر ایمان کا ذکر ہو تا یا اعمال صالحہ کا ذکر ہو تا تو شیعہ
لہذا الزام کا الزام بھی مفید مقصد نہ ہو گا ! اور خوارج اور نو اصب آنکھیں بند کر کے یوں بھی کہہ
سکتے کہ صاحب اس میں مومنوں اور اچھے عمل والوں کے لئے خدا کا وعدہ ہے۔ سو ہم کہتے ہیں کہ
وہ دائرہ ایمان ہی سے خارج تھے سبقت ہجرت خلفائے ثلاثہ اور حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وغیرہم
ہاجرین اولین کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں جو انکار کر سکیں اور کہہ دیں کہ صاحب کسی نے تہمت لگا دی
ہوگی خصوصاً خلیفہ اول کی ہجرت کہ وہ حضرت علی کی ہجرت سے بھی سابق ہے اور ہاجرین اولین تو
انہیں لوگوں کی نسبت اول گنے جائیں گے جو بعد جنگ بدر کے آئے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
تو ہاجرین اولین میں سے بھی ہاجر اول نکلے، اس صورت میں تو اسی آیت سے ان کی افضلیت
نکل آئی۔ کیونکہ در صورتیکہ اس آیت میں جتنے وعدے ہیں وہ سب سبقت ہجرت پر (مثلاً)
موقوف ہوئے۔ تو جو کوئی سبقت میں بھی سابق ہو گا وہ استحقاق و نفاذ وعدہ میں بھی اول نمبر
ہو گا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو البتہ ابو بکر صدیق سے اتنے پہلے گھر چھوڑ
کر آئے کہ ابو بکر صدیق کے گھر تک پہنچے بانی سب ان سے پیچھے ہی نکلے۔

ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ منورہ کے درمیان عجیب غریب فرق اور ہجرت حبشہ اگرچہ ہجرت مدینہ منورہ

سے سابق ہے لیکن اس کی وجہ سے سابق ہونا چنداں موجب افضلیت نہیں اس ہجرت کی اباحت کا باعث تھا تو فقط قلت صبر تھا مکہ معظمہ میں رہ کر پکا رہنا اور احکام خداوندی کا بجالانا بہت دشوار تھا ثبات ایمان اور حفظ جان کے لئے ضعف کو رخصت ہو گئی تھی اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہجرت حبشہ نہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حکم نہ ہونے کی اگر کوئی وجہ تبکلف نکال بھی لیجئے تو اس کا کچھ جواب ہی نہیں کہ جس نے حبشہ کی جانب ہجرت نہ کی اس پر کچھ عتاب نہ ہوا اور مدینہ منورہ کی ہجرت بغرض امداد دین تھی اس کو رخصت نہیں کہہ سکتے۔ عزیمت ہی کیسے تو اول درجہ کی عزیمت کہنے اسی لئے اس کے تارکین مورد عتاب رہے ہر چند ہجرت حبشہ کا رخصت ہونا اور ہجرت مدینہ منورہ کا عزیمت ہونا قطع نظر ظاہر ہونے کے اس تقریر سے اور بھی واضح ہو گیا مگر مزید توضیح کے لئے استقدر اور بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہجرت مدینہ میں جان پر کھیلنا تھا اور ہجرت حبشہ میں جان کا بچانا، اس میں دین کا بڑھانا تھا۔ اس میں اپنی نماز روزہ کا بجالانا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت تھی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا چھوڑ جانا۔ اس میں مازنا مازنا۔ اقربا سے رؤسا سے جہاں دکرنا۔ اس میں اعدا کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سلامت گزرنا۔ بیس تفاوت رہ از کجاست تا بجایہ غرض ہجرت حبشہ کوئی فضیلت قابل تعریف نہیں خصوصاً تعریف خداوندی۔

آیت السابقون میں ہجرت سے مراد اسی لئے فریقین میں سے کسی نے اس ہجرت کو مصداق آیات صریح ہجرت مدینہ منورہ ہے۔ تاکیدی ہجرت یا آیات فضائل ہجرت نہیں سمجھا اور یہی وجہ معلوم

ہوتی ہے کہ یہ آیت اور نیز آیات ہجرت مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد نازل فرمائی ہیں اور پھر اس آیت میں اور نیز آیات میں ہاجرین کے فضائل میں انصار کو پھر ذکر فرمایا اور سورہ حشر میں ہاجرین کے حال میں لفظ ینصرون اللہ بڑھایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ فضیلت ہی ہجرت کے لئے ہے جو انصار کی نصرت کے ہمدوش اور ان کے کام سے ہم آغوش ہے سو ایسی ہجرت اگر ہے۔ تو مدینہ منورہ کی ہجرت ہے۔ حبشہ کی ہجرت میں نہ انصار تھے نہ نصرت تھی بہر حال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہم کی سبقت ہجرت میں کچھ کلام نہیں۔

آیت ہجرت سے صرف رضائے الہی ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا ایمان | پھر اس سبقتہ ہجرت ہی کے سبب اور اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔ خداوند کریم یوں فرماتا ہے کہ اللہ ان سے

راضی ہوا، سوا اول تو یہی کفایت کرتا تھا کیونکہ رضا سے آگے کوئی مقام ارفع نہیں جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان میں کمال ایمان بھی اس درجہ کو ہو گا کہ کہا نہیں جاتا، اور اعمال صالحہ بھی ان کے قرار واقعی صالح ہوں گے، سوا اول تو موافق آیت وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا مرقومہ بالا کے ان کی مغفرت میں کلام کی گنجائش نہ رہی کیونکہ بزرگان مذکور سب کے سب غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے ساتھ تھے۔

دوام جنت کی خوشخبری سے بڑھ کر حسن | معجزہ پھریوں بھی ارشاد فرمایا کہ ان کے لئے جنتیں تیار خاتمہ کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے | کر رکھی ہیں پھر وہ بھی ہمیشہ کے لئے، اس پر بھی کوئی ان کی بزرگی میں شک کرے تو بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ بزرگی کے معنی اس کے نزدیک یہ ہوں کہ خدا اس سے ناخوش ہو اور اس کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہو، سو حضرات شیعہ جو ان بزرگواروں کی بزرگی میں کلام کرتے ہیں اور ان کے دشمنوں کو اکثر بزرگ سمجھتے ہیں تو شاید اسی اصطلاح کے موافق سمجھتے ہیں لیکن صورت میں لازم آئے گا کہ حضرت امیر سے بھی دست بردار ہوں کیونکہ وہ بھی بشارت میں داخل ہیں۔ بہر حال ان اولیاء اللہ کے برا کہنے والے ان کو کیا کہتے ہیں۔ خدا کو جھٹلاتے ہیں۔ سو ان کا کفر یا فاسق کہنا، اپنا کفر یا فاسق کہنا ہے۔ آفتاب کو کوئی بے نور بتلائے تو وہ آفتاب کو کیا اپنی آنکھوں کو بے نور بتلاتا ہے۔

آیات فضائل صحابہ میں جو شبہات شیعہ پیش کرینگے۔ | اس کے بعد اتنی اور گذارش ہے کہ بعضے ہٹ دھرم وہی بعینہ فوجی بھی حضرت علی کے بارے میں پیش کر سکتے ہیں شاید یوں تکرار کریں کہ خدا پہلے راضی ہو گیا ہو اور پھر جب حضرت امیر سے مخالفت کی ہو تو ناراض ہو گیا ہو اور ان کیلئے جو جنتیں تیار کر رکھی ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو عذاب نہیں ہونے کا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اول عذاب ہو لے اور پھر وہ جنتوں میں چلے جائیں تو اس کا جواب ہر چند قابل جواب نہیں خصوصاً شیعہ کے مقابلہ میں کیونکہ خوارج بھی نسبت حضرت امیر کے اس قسم کی آیات میں بعینہ یہ احتمال پیدا کر سکتے ہیں

یہاں تک کہ جن آیات میں مغفرت کا ذکر آیا ہے اسے بھی یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مغفرت ہے جو بعد عذاب کے ہوگی۔ لیکن نقل مشہور ہے کہ "جیلہ جو راتا پدروازہ پاید رسائند"

صحابہ کے لئے قیامت میں رسوائی نہیں اور کفار اس لئے کہا جاتا ہے کہ اول تو سورہ تحریم میں یوں ارشاد اور فساق کے لئے رضائے الہی نہیں ہے یَوْمَ لَا يُخْرِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ لَعْنِ

جس روز کہ نہ رسوا کریگا اللہ بنی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔

سوان کے ایمان میں تو شبہ بھی کلام نہیں کر سکتے اس لئے کہ کلام اللہ موجود ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا

یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ یعنی اللہ راضی نہیں ہوتا کافروں سے بلکہ یوں بھی آیا ہے اِنَّ

اللّٰهَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ یعنی اللہ راضی نہیں ہوتا فاسقوں سے سو جب خدا ان سے

راضی ہوا تو ان کے رسول اللہ کے ساتھ ایمان لانے میں تو کچھ شک نہ ہوا بلکہ اس بات میں بھی

تردد نہ رہا کہ وہ ایک زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زمانہ حیات میں سے صالحین میں

سے تھے فاسق تک نہ تھے تو بیشک موافق وعدہ الہی کے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ قیامت کو معزز اور محترم رہیں گے۔ پھر عذاب آخرت کے کہ اس سے بڑھ کر کوئی رسوائی

نہیں کیا معنی۔ مگر شاید ان التوں سمجھ کے مارون کے نزدیک یہی معنی عذاب کے ہوں دوسرے

یہ کہ سورہ انبیاء میں یوں ارشاد ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ

عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْنَهَا

وَلَهُمْ فِیْ مَا اَشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خَالِدُوْنَ

لَا یُخْرِیْهُمْ اَلْفَسْخُ اَکْکَبَرُ وَتَتَلَقَّہُمْ

مَلَائِکَۃٌ ہٰذَا یَوْمُکُمْ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوعَدُوْنَ

حاصل اس کا یہ ہے۔ جس کے لئے ہمارے یہاں عمدہ

مرتبہ مقرر ہوا ہے وہ اس دوزخ سے دور رہیں

گے نہیں سننے کے اس کی آہٹ تک اور وہ اپنی جی

چاہتی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے، نہ غم ہوگا ان کو اس

بڑی گھبراہٹ میں، اور اپنے آدنیگے انکو فرشتے یوں کہتے

ہوئے یہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ تھا۔

اب خیال کیجئے کہ جن سے خداوند کریم وعدہ فوز عظیم فرمائے اور تسلی آمیز کلام سے انکو طمّینان

دلائے۔ ایسوں کو مستحق عذاب جاننا اہلوں کا کام ہے اور وعدہ کا پہلے سے مقرر ہونا آپ ظاہر ہے

کہ ابھی سے وعدہ ہو لیا اور وہ وعدہ کے موافق تسلیاں ہو لیں پھر ان کے لئے عذاب کا ہونا بے

اس کے نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ خدا اپنے وعدے سے ہٹ جائے؟ سو خدا تعالیٰ الشیعان علی کی طرح سے تو ہے ہی نہیں۔ نعوذ باللہ منہا کہ آج لقیہ کر کے سب کچھ کہہ لیا پھر وقت پر آنکھیں بدل لیں۔

صحابہ کے مشاجرات نہ کفر تھے نہ فسق کیونکہ دونوں رضائے کے منافی ہیں | اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محاربہ یا شکر رنجی نہ موجب کفر ہے جیسے اکثر شیعہ کہتے ہیں نہ موجب فسق نہیں تو خدا لوگوں سے کیوں راضی ہوتا اس لئے کہ وہ خود فرما رہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰ عَنِ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ بلکہ انکار امامت حضرت امیر بھی موجب کفر و فسق نہیں کیونکہ تمام جماعت مہاجرین و انصار سوا دو چار آدمیوں کے سب ان کی امامت کے شیعوں کے نزدیک منکر تھے اور اسی کی موید نبیج البلاغت میں جو اصح الکتاب شیعہ ہے حضرت امیر سے د بارہ محاربہ امیر معاویہ یوں مروی ہے اَجْعَلْنَا قَاتِلَ اَحْوَا نِنَا فِي الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِيْهِ مِنْ اَلْزَنَجِ وَالْاَوْغُو جَا حِ یعنی ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے اس سبب سے لڑتے ہیں کہ اسلام میں کچھ کجی کی باتیں داخل ہو گئی ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ منکر امامت حضرت امیر اور ان سے لڑنے والے کافر نہیں اور امیر معاویہ باوجود اس مخالفت اور انکار امامت کے چنانچہ سب کو معلوم ہے حضرت امیر کے نزدیک مسلمان ہی تھے اب اگر شیعہ مذہب کو تھامنا چاہیں تو ان روایات کی تغلیط اور تکذیب کریں جبکہ محاربات صحابہ اور مشاجرات ان کے حضرت امیر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں۔ نہیں تو یہی کریں کہ کلام اللہ میں سے ان آیات کو بن پڑے تو اڑا دیں۔ آخر حضرت عثمان نے حضرت امیر کے استحقاق امامت کے مخفی کرنے کے لئے گیارہ ہزار آیتوں کے قریب اڑا دیں حالانکہ واجبات کا مخفی کرنا سخت گناہ ہے شیعہ تو بزعم خود نیک ہی کام کرینگے اور جب حضرت امیر سے لڑنا اور ان کی امامت کا انکار تک موجب کفر و فسق نہ ہوا حالانکہ امامیہ کے نزدیک مثل شہادتین اقرار امامت حضرت امیر بھی جز ثالث ایمان ہے تو اور گناہ جو اس سے کمتر ہیں وہ کاہے کو موجب کفر و فسق ہوں گے اس صورت میں حضرت امیر معاویہ اور ان کے اصحاب بھی اس طعن سے شیعوں کے عقائد کے موافق بری ہو ملے چاہئیں۔

بہر حال آیت السابقون نے شیعوں کو جواب دندان شکن سنایا نہ یہ بن پڑے ہے

کہ اصحابِ ثلاثہ و غیر ہم مذکورین کی نسبت یوں کہیں کہ وہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے کیونکہ یہ آیت سورہ توبہ میں ہے اور سورہ توبہ کل ایک دو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نازل ہوئی ہے یہ سب صاحبانِ مکہ میں مسلمان ہو لئے تھے یہ اس کی گنجائش کہ لفظ باحسان ہی کو ملے یا نہ ملے ہو حینک دھینگے سے مہاجرین اور انصار کے ساتھ ملا کر کچھ باب گفتگو کا وہ کریں، کیونکہ اتباع احمد کے متعلق ہے اور پھر وہ جملہ ہے اور جملہ بھی موصولہ ماقبل تک کیونکر لے جائیں؟

عقیدہ تفضیل ائمہ پر آیت اعظم درجۃ کی ضرب کاری | معہذا طرفہ تماشایہ ہو گیا کہ اس آیت اور دوسری آیتوں کے وسیلے سے جو اس آیت کے ذیل مذکور ہوئیں سنی اصحابِ ثلاثہ کیا بلکہ تمام مہاجرین اور انصار کا ایمان ثابت کر کے امامیہ کے ایک اور عقیدہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرات ائمہ سب کے سب امتیوں سے تو کیا انبیاء سے افضل ہیں اور وجہ اس عقیدہ کی پامالی کی یہ ہے کہ سورہ توبہ ہی میں (ان صحابہ کے حق میں جو ایمان بھی لائے اور سچتر بھی کی اور جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد بھی کیا) یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کا مرتبہ اور امتیوں سے اعلیٰ ہے پھر اس میں کچھ تخصیص امام اور غیر امام کی نہیں تو معلوم ہوا کہ سوائے حضرت علی کے اور ائمہ اہل ہمار اس رتبہ کو بھی نہ پہنچے تھے جو ان صحابہ کا ہے۔ بنی کا رتبہ تو درکنار کسیں خاطر کے لئے وہ آیت مرقوم ہے۔

یعنی جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا وہ سب میں بڑے درجہ والے ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں بشارت دیتا ہے انکو رب ان کا، اپنی رحمت اور اپنی رضا مندی اور باغوں کی جن میں ان کے لئے دوام کی نعمت ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے کیوں نہ ہو اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
أَعْظَمَ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ
هُمْ الْغَايُزُونَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ
بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ
لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ
فِيهَا أَبَدًا إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ
أَجْرٌ عَظِيمٌ

باب عقیدہ بدّی کی تفصیل میں !

بدّی پر خاوندی اور علمائے شیعہ کا اضطراب اب حضرات شیعہ سے بجز اس کے کچھ نہیں پڑتی۔ کہ یا تو حق بول اٹھیں یا یہ موافق مثل مشہور الضورۃ فی بیح المحظورات بحکم ضرورت پھر مذہب قدیم کی طفر رجوع کریں اور یوں کہیں کہ ہمیں کلام اللہ کو ہی ثابت ہوتا ہے جو سنیوں کا مطلب ہے لیکن خدا کا کیا اعتبار؟ جیسے اور بہت سے امور میں۔ (ہمارے عقیدہ کے موافق آج کوئی مانے یا نہ مانے) خدا کو بدّی واقع ہوا ہے صحابہ کی شان میں اور سنیوں کے حق میں اور کلام اللہ کی حفاظت میں بھی بدّی واقع ہوا، پہلے یوں ہی ارادہ ہو جیسا کلام اللہ میں فرمایا بعد میں رائے بدل گئی ہو اور یہی معنی بدّی کے ہیں۔

بدّی کے ایک معنی چنانچہ نظام الدین جیلانی نے جن کو آج کل کے شیعہ شاید منافق بتلاتے ہیں رسالہ علم الہدای فی تحقیق البدّی میں لکھا ہے یُقَالُ بَدَّ إِلَهُ إِذَا ظَهَرَ لَهُ دَائِمٌ مُخَالَفٌ لِلرَّائِي الْأَوَّلِ یعنی کہا کرتے ہیں کہ فلانے کو بدّی واقع ہوا جب اس کو پہلی رائے کے مخالف کوئی دوسری رائے سوچھے، ملا نظام الدین جیلانی مذکور اسی سالہ میں لکھتا ہے کہ شیخ ابو جعفر طوسی اور شیخ ابو الفتح کراچی کا بھی بدّی کے معنوں میں یہی مذہب ہے اس لئے کہ شیخ طوسی نے عدۃ میں اور شیخ کراچی نے کنز الفوائد میں یہی تحقیق کی ہے۔

بدّی کے دوسرے معنی مگر شریف مرتضیٰ نے ذریعہ میں جو کچھ تحقیق کر کے لکھا ہے۔ (اور طبری کے کلام میں سے بھی کچھ اسی کی بول آتی ہے) وہ اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں معنی قولنا بَدَّ إِلَهُ تَعَالَى أَنَّهُ ظَهَرَ لَهُ مِنَ الْأَمْرِ مَا لَمْ يَكُنْ ظَاهِرًا یعنی ہم جو کہتے ہیں کہ خدا کو بدّی ہوا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کو کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو پہلے نہ تھی۔ پھر اس کے بعد ملا نظام الدین لکھتے لکھتے یوں لکھتا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ خدا کو اشیاء نوید کا علم ان کے وجود کے بعد حاصل ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد اپنی تحقیق لکھتا ہے۔ اور وہ تحقیق دوسرے معنوں پر منطبق آتی ہے وہ یہ ہے کہ خبر میں بھی بدّی ہوتا ہے یعنی یوں بھی کبھی ہوتا ہے کہ آئندہ بات کی خبر دی کہ یوں ہوگی اور وہ اس طرح نہ ہو۔

بدّی کے تیسرے معنی اب سنئے کہ متاخرین امامیہ کو کچھ بدّی کے باب میں بھی ہوش آئی ہے

اور سنیوں کے اعتراضوں کو سن سنا کر کچھ فکر آبرو ہوا ہے۔ اس لئے بات بدل کر اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ بات فقط خاص اس علم میں ہوتی ہے جس کی کسی کو خبر نہیں کرتے، اور جو علوم کہ انبیاء کو بھیجے جاتے ہیں۔ اس میں خدا جھوٹ نہیں بولتا سو اگر اس بات پر امامیہ جم جائیں تو سنیوں کی طرف سے ان کو مرحبا اور آفرین۔ اس صورت میں کلام اللہ کی بات تو باون تولے پاؤرتی کی ہوگی۔ پھر ہمیں کیا ضرورت کہ بیدار کے عذر کی وجہ سے کسی اور طرح سے اثبات مدعا کریں۔

مگر مانتے ہیں ملا نظام الدین کو کہ سنیوں کے طعن اٹھانے اور مذہب کے بٹا لگجانے سے گھبرائے مذہب کو سنبھالا، اور متاخرین کی نہ مانی اس تخصیص میں جو متاخرین نسبت علم مخصوص کے کرتے تھے ان کی تکذیب کی اور بہت سی روایات احادیث مذہب شیعہ نقل کر کے متاخرین کی بات کو خاک میں رلا دیا اور کیوں رلاتے آخر شیعوں میں بڑے محقق ہیں، یہی وجہ ہوئی کہ اس باب خاص میں سالہ لکھا معہذا اس کا کہنا بھی سچ ہے۔ جھوٹ بولنا واجب ہو جب خدا جان بوجھ کر کچھ کا کچھ کہدے اور جب لغو ذی اللہ خدا ہی کو غلط معلوم ہو تو پھر خدا کا کیا قصور؟ جو متاخرین کہتے ہیں کہ خدا اپنے دوستوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

بیدار کی تین قسمیں | بالجملة ان سب روایات سے جو محقق مذکور نے اثبات مدعا کے لئے نقل کیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیدار کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو بدانی العلم یعنی خدا نے پہلے سے کچھ جان رکھا تھا مگر بعد میں حقیقت الامر کچھ اور معلوم ہوئی دوسرے بدانی الارادہ یعنی پہلے سے کچھ ارادہ تھا پھر یوں معلوم ہوا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں، تیسرے بدانی الامر یعنی پہلے کچھ حکم دیا۔ پھر بعد ازاں یوں معلوم ہوا کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی۔ اس حکم کو بدل کر دوسرا ایسا حکم جس میں وہ نقصان نہ ہو بلکہ مصلحت وقت معلوم ہوتی ہو۔ صادر فرمائیں۔

بدا اور نسخ میں ایک اشتباہ کا ازالہ | یہ معنی آخر خوب ذہن نشین رکھنے چاہئیں ایسا نہ ہو کہ نسخ سے مشتبہ ہو جائیں کیونکہ نسخ حقیقت میں اسے کہتے ہیں کہ ایک حکم کا

زمانہ آخر ہو جائے اور دوسرے حکم کا زمانہ آجائے۔ مثلاً رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے جب عید ہوئی وہ زمانہ آخر ہوا اور افطار کا زمانہ آگیا، اسے یوں نہیں کہتے کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی اس لئے موقوف کیا گیا، بلکہ وہ حکم اسی زمانہ تک تھا، اس کے بعد دوسرے حکم کا زمانہ آگیا۔ تنازعہ یہ ہے کہ کہیں پہلے سے زمانہ کی مقدار کی اطلاع ہوتی ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اطلاع ہے اور کہیں نہیں ہوتی وقت ہی پر ہوتی ہے مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تھی یہ بات سوائے خداوند کریم کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور جو کوئی جانتا بھی تھا۔ تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمانہ کس وقت آئے گا۔ القصہ بدائی الامر جسے شیعہ بدائی التکلیف کہتے ہیں اور ہے اور نسخ اور ہے بدائی کی یہ صورت ہے کہ رمضان کے مثلاً روزے رکھنے کا حکم دیا اور جب تک کوئی نقصان اس میں معلوم ہوتا تھا اور اسی لئے جب تک اس نے ٹھہرایا تھا کہ یہ حکم فلاں وقت تک رہے گا۔ پھر یکایک یہ سو جھی کہ مصلحت وقت اس کے خلاف میں ہے اس لئے اس کو بدل دیا

بدائی کی تینوں قسمیں ایک دوسرے کو لازم ہیں جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اس بچہ دان کی گزارش بھی سنئے کہ در صورت بدائی التکلیف کے واقع ہونے کے بدائی الارادہ بھی جسے بدائی التکوین بھی کہتے ہیں لازم ہوگا کیونکہ بدائی الارادہ تو اسے ہی کہتے ہیں کہ بسبب کسی مصلحت تازہ کے پہلے ارادہ سے پلٹ جائیں تو جب مصلحت ہی کے لحاظ سے حکم بدلا گیا۔ تو پہلا ارادہ جو اس حکم کی ہمیشگی کا تھا وہ آپ بدلا گیا اور اسی طرح بدائی الارادہ کو بدائی العلم جسے بدائی الاخبار بھی کہتے ہیں لازم ہے اس لئے کہ ارادہ تو نئی مصلحت کے معلوم ہونے پر بدلتا ہے پھر جب مصلحت تازہ معلوم ہوتی تو لاجرم یہ بات صحیح ہوتی کہ جو علم اب حاصل ہوا وہ پہلے نہ تھا اور جو پہلے تھا وہ اب غلط معلوم ہوا۔ اسی کو بدائی العلم کہتے ہیں۔

سوا اگر شیعوں میں سے کوئی بدائی الامر اور بدائی الارادہ کا تو قائل ہو اور سنتوں کے سامنے بدائی الاخبار سے مکر جائے تو یہ مکر جانا پیش نہ جائے گا حاصل کلام یہ ہے کہ شیعوں کے

نزدیک مسئلہ بدائع جمع علیہا ہے اگر وہ آیات مذکورہ کے دباؤ سے سینوں سے دامن چھڑانے کو یوں کہنے لگیں کہ اگر تم اپنے پیشواؤں کی بزرگی کلام اللہ سے ثابت کرتے ہو تو ہم نے مانا کلام اللہ میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو لیکن کلام اللہ کا نعوذ باللہ کیا اعتبار؟ خدا کی رائے گھڑی گھڑی بدلتی رہتی ہے اور نعوذ باللہ غلط صحیح رطب یا بسبب اس کے کلام میں ہوتا ہے ہمارے ائمہ کو البتہ علم ماکان مایکون تھا ان کے اقوال سے اگر ان کی بزرگی ثابت ہو۔ تو بیشک ہم تسلیم کر لیں۔

عقیدہ بدائع کے نتائج (۱) چارہ معصوم کی مغفرت مشکوک اس صورت میں ہمیں بھی یوں لازم ہے کہ شیعوں کی اس حجت کو بھی ختم کر دیں اس لئے سامعہ خراش اہل انصاف ہوں کہ اگر یہی بدائع تو اول تو ہمیں چارہ معصوم کی مغفرت میں کلام ہے نعوذ باللہ اور شیعوں کا تو کیا ذکر؟ جیسے اصحاب کرام سے وعدہ ہائے مغفرت کر کے بعد بدائع پھر گئے اگر حضرات ائمہ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہو تو فرمائیے اماموں کا خدا پر کیا دباؤ ہے؟ خاص کر یہ بہانہ بھی موجود ہو کہ ان کے لقیہ اور نامردہ پن نے تمام دین کا ستیاناس کر دیا۔

امام آخر الزماں کی طویل روپوشی اندیشناک ہے پھر سپر امام آخر الزماں نے تو نعوذ باللہ یہ ستم ڈھائے ہیں کہ باوجودیکہ دوست دشمن کی خبر ہے یہ بالیقین معلوم ہے کہ تمام ملک ایران میں مخلصان شیعہ ساہا سال سے منتظر زیارت اور مشتاق ملازمت بیٹھے ہیں۔ جان و مال فدا کرنے کو تیار ہیں ادھر ہندوستان میں روز بروز ترقی تشیع ہے امام کے انتظار میں مرے جاتے ہیں۔ اگر حسب حال ان کے یہ شعر کہا جائے تو بجا ہے۔

اے اشتیاق رویت دہا گیب کردہ ❖ سیلاب اشتیاق جا نہا خراب کردہ
مہذا اپنی موت اپنے اختیار میں ہے اور سپر یہ معلوم کہ میں فلانے وقت سے پہلے نہ مرنے گا باوجود اس فراہمی اسباب اور انتظار احباب کے خدا جانے کیا نامردانہ پن ہے کہ روز بروز زیادہ ہی پچھتے جاتے ہیں اور باہر نہیں آتے اگر خدا نخواستہ کچھ اندیشہ ہوتا تو کیا ہوتا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کل تین سو تیرہ ہی آدمی مجتمع ہونے پائے تھے جو جہاد شروع کر دیا پھر وہ بھی بزم علم شیعہ اکثر منافق اور منافق بھی نہیں تو ایسے مخلص بھی نہ تھے جیسے امامین

نمائندہ امام زماں سے اخلاص و محبت رکھتے ہیں اور مخلص نہ تھے جیسی تو شہادت امامت حضرت پسر چمپالی بلکہ خلافت اور سوا اس کے اور حقوق اہل بیت دبا بیٹھے بہر حال جائے حیرت ہے کہ بایں ہمہ سامان و امن و اطمینان غیبت امام کا انتہائی نہیں کہیں اماموں کا بنسبت ماکان مایکون کے عالم ہونا غلط ہے یا شیعوں کی دوستی غلط ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہی صحیح ہے ایک دوستی کی آڑ میں ہزار عیب اماموں کے ذمے لگاتے ہیں چنانچہ کچھ کچھ تو اس سال کے دیکھنے والوں کو بھی واضح ہو جائے گا۔

پسر امام کو امام بننے میں بھی شاید خدا سے بدو واقع ہو گیا ہو الحاصل امام زماں بایں ہمہ انتظار اجباب اور فراہمی اسباب ادھر پھر ہر طرح سے بے اندیشہ غار سرمن رائے سے باہر تشریف نہیں لاتے اور دین محمدی اور امت احمدی کی خبر نہیں لیتے کہ کس گمراہی میں پھنسی ہوئی ہے دین ابو بکر بچائے دین محمدی اور بیاض عثمانی بجائے کلام ربانی دوازہ امام کے بدلے ابو حنیفہ شافعی اور اس گمراہی سے زیادہ اور کیا گمراہی ہوگی جس کا انتظار ہوگا الغرض اماموں کو تو یہی غدر تھا کہ ہم بے بس و بیکس ہیں امام زماں جو باہر تشریف نہیں لاتے تو ان کو کیا غدر ہے در صورتیکہ بدو کو ہم تسلیم کر لیں تو توجیہ اس بے انتظامی دین کی امامیہ کے عقائد کے موافق بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا سے دوازہ امام کے مقرر کرنے میں بڑی چوک ہوئی ابو بکر عثمان کو مقرر کرنا تھا جو دین کو رونق دیتے اور بے انتظامی نہ ہونے دیتے۔ القصہ امامیہ سے بجز اس کے اور کچھ توجیہ بن نہیں پڑتی ہاں اگر اس کے قائل ہو جائیں کہ خدا کے ذمہ یہ واجب نہیں کہ جو بندہ کے حق میں اصلاح ہو اسے کیا کرے تو البتہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کَمَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ یعنی خدا سے کوئی یوں نہیں پوچھ سکتا کہ یوں کیوں کیا اور خدا سب سے پوچھ سکے ہے کہ تم نے یوں کیوں کیا۔

امام زماں کو شاید بدلا کی وجہ سے خدا معزول کر چکا ہو بہر حال عجب نہیں جو بدو واقع ہوا ہو اور امام زماں کی معزولی کا حکم صادر ہو چکا ہو اور شاید یہی وجہ ہے کہ تخمین سے زیادہ امام کو غیبت میں گذری اور یہ جو امامیہ کے ذہن نشین ہے کہ ابو بکر عمرو وغیرہم آخر زمانہ میں پیدا کئے جائیں گے یہ بالکل غلط نہ ہو بلکہ امام زماں کو معزول کر کے شاید ان کو پھر نئے سرے سے پیدا کر کے

مامور کریں۔ پر امامیہ نے بابتناح خداوندی اس بات میں غلطی کھائی ہو کہ وہ سزا دینے کے لئے پیدا کئے جائیں گے خیر یہ بات تو شاید شیعوں کو ناگوار ہو۔

عقیدہ بڑا کا استیصال قرآن مجید سے | سو بیاس خاطر شیعہ اس بات سے اعراض کر کے یوں ملتس ہو گئے کہ اگر خداے چوک ہوتی ہے تو انبیاء سے تو نہ ہوتی ہوگی اور اتنا ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی کہیں گے کہ خدا اخبار گزشتہ میں بھی غلطی کھاتا ہے کیونکہ یہ تو صاف جھوٹ ہے جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ خداوند کریم سوہ طہ میں حضرت موسیٰ کے قصے میں جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلا قصہ ہے حضرت موسیٰ کا مقولہ فرعون کے سوال کے جواب میں یوں نقل فرماتا ہے لَا يَصِلُ رَبِّي وَلَا يَنْسِي یعنی حضرت موسیٰ فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے ہے نہ بھولے ہے اس آیت کو غور کیجئے کیا ارشاد کرتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو ہم جانتے ہیں شیعہ بھی یوں نہ کہیں گے کہ وہ چوک جاتے تھے یہ برائی تو اس فرقہ کے پیشواؤں نے خدا ہی کے لئے رکھ چھوڑی ہے ورنہ لازم آوے گا کہ معصوم بھی خطا کرے پھر یہ طعن جو سنیوں پر کرتے ہیں کہ ان کے امام اور خلیفہ معصوم نہ تھے حالانکہ امام اور خلیفہ کو چاہیے کہ معصوم ہو خطا نہ کرے ورنہ حق اور باطل کی تمیز محال ہو جائیگی۔ اور جو غرض کہ ان کے مقرر کردہ سے ہوتی ہے یعنی احکام شریعت معلوم ہونا اور ان کا عمل درآمد ہونا وہ حاصل نہ ہوگی سواب یہ طعن کس منہ سے کر نیچے۔

قواعد عقائد شیعہ کی رو سے خدا سے خطا ممکن معصوم سے ناممکن | الغرض قواعد عقائد شیعہ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ خدا سے کو خطا ہو جائے پر معصوم سے خطا نہ ہو۔ سو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو بالائفاق معصوم تھے انہوں نے جو یہ فرمایا کہ میرا رب نہ بہکتا اور چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے تو اس میں تو برگزناں غلط نہیں اور خدا نے جو یہ قصہ نقل فرمایا تو ایک قصہ گزشتہ ہے کچھ آئندہ کی بات نہیں جو بدآئی الاخبار کی گنجائش ہو پھر کیا معنی کہ خدا بہک جائے کچھ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ عقل و حواس میں اختلال آگیا ابو بکرؓ عمرؓ و عطاءؓ صاحب رعب اور مرد باہمیت تھے مگر نہ اتنے کہ خداوند کریم کے بھی عقل و حواس میں فرق آجائے یا سو اس کے اور کچھ سبب ہے نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات تعالیٰ اللہ عن ذالک علو اکبر ایک سنیوں کے الزام کے لئے

خدا کی عظمت بھی تو ہاتھ سے دے بیٹھے۔ فدک چھینا تھا تو ابو بکر نے چھینا تھا۔ او
قرطاس و دوات کو نہ لانے دیا تو عمر نے نہ لانے دیا۔ ان پر تبر کیا تو کیا خداوند کریم کو جو ان۔۔
برائیوں میں سان لیا تو کیا اسی سبب سے کہ باوجودیکہ نصر المظلوم حق (یعنی مظلوم کی مددگاری
حق) ہے اور پھر مظلوموں کی مددگاری نہ کی خیر خداوند کریم ان بیباکوں کا منہ میاہ کرے ک سخت
بے ادب ہیں اور جس لائق یہ ہیں انہیں وہاں ہی پہنچائے، بالجملہ کلام اللہ میں بد کو بیخ و بنیاد
سے اکھاڑ دیا ہے۔

بدن کا عقیدہ رکھنے والوں کے لئے حضرت جعفر کی بددعا اور اگر شیعہ خدا کا اتنا بھی اعتبار نہ کریں
اور اخبار گزشتہ میں بھی غلطی فہم کے احتمال سے لغو ذبالہ اس بات کے طالب ہوں کہ
ہم کلام اللہ کی گواہی پر بد سے انکار نہیں کرتے جب تک کہ کلینی کی کوئی حدیث اس باب میں نہ
ہو تو کلینی کی حدیث بھی لیجئے

کلینی کافی میں منصور بن حازم سے روایت کرتا ہے کہ میں
نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے پوچھا
کوئی چیز ایسی بھی ہوئی کہ کل خدا کو معلوم نہ تھی اور آج
ہو گئی ہو؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی نہیں، جو یہ کہے خدا اسے
رسوا کرے پھر میں نے پوچھا کہ تو بتائیے جو ہو لیا اور جو
ہو نہ لیا ہے قیامت تک، کیا خدا کو معلوم نہ تھا؟
انہوں نے فرمایا کیوں نہیں خلق کے پیدا کرنے سے
پہلے معلوم تھا؟

فی کافی عن منصور بن حازم عن ابي
عبد الله قال منصور سألتُهُ هَلْ يَكُونُ
شَيْءٌ لَمْ يَكُنْ فِي عِلْمِ اللَّهِ قَالَ لَا مَنْ
قَالَ هَذَا فَافْخِزْ أَلَا اللَّهُ قُلْتُ أَرَأَيْتَ مَا كَانَ قَبْلَ
مَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَيْسَ فِي عِلْمِ
اللَّهِ قَالَ بَلَى قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ.

اس روایت سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ ہر ایک عقیدہ غلط ہے،
کیوں کہ بدائی آفتوں میں جو تحقیق گزر چکی اس سے صاف ثابت ہے کہ بدائے اس کے ہو ہی نہیں
سکتا کہ کوئی نیا علم پیدا ہو، دوسرا یہ کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بدائے قائلوں
کے لئے بددعا فرمائی، سو حضرات شیعہ کو ہماری طرف سے بھی مبارک باد یہ ساری خرابیاں کلام اللہ
کے نہ سمجھنے کی ہیں اور ان کا بھی کیا قصور؟ اپنی روایتوں کے معنوں کو نہیں سمجھتے اگر سمجھ ہوتی

تو پہلے انہیں ہی سمجھتے۔ کلام اللہ تو سنیں گے۔

حق واضح ہونے کے بعد مانتا ضروری ہے پھر کسی اور بات کا انتظار صاقت ہے اس وقت لازم یوں ہے کہ منشأ اس غلطی کا بیان کیا جائے تاکہ مزید اطمینان ہو جائے اور ناظرین کو یہ خلیجان باقی نہ رہے کہ "تہناروی پیش قاضی آئی راضی" محرر رسالہ کے طمطراق کی باتیں فقط سنکر ہم یوں کیونکر بد اسے دست بردار ہوں ہمارے علماء شیعہ بھی تو آخر کسی وجہ سے کہتے ہوں گے جب تک ان کی نہ سن لیں تسلی نہیں ہوتی ہر چند یہ عذر اس قبیل کا ہے کہ شہسور ہے "عذر گناہ بدتر از گناہ کیونکہ جب کسی آدمی کو کسی وجہ سے حق واضح ہو جائے تو پھر اسے اس کا کیا انتظار کہ دوسروں کی بھی سن لوں اگر کوئی شخص قریب شام کے درو دیوار پر دھوپ دیکھے یا خود آفتاب کو چشم خود دیکھے اور دوسرا پردہ میں بیٹھا ہو گھڑی گھنٹے کے وسیلے سے یوں کہے کہ دن چھپ گیا تو آفتاب کا یا دھوپ کا دیکھنے والا کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو اور گھڑی سے وقت کا بتلانیوالا کتنا ہی علامہ روزگار اور حساب میں پرکار کیوں نہ ہو لیکن تیسرے بھی آفتاب یا دھوپ کے دیکھنے والے کو دن کے یقین ہونے میں اس کا انتظار نہ ہو گا۔ کہ میں اس کی تو سن لوں کہ جو گھڑی کے وسیلے سے رات بتلاتا ہے۔

اسی طرح جب یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ بروئے کلام اور نیز بروئے احادیث شیعہ بدغلط ہے پھر اس کا کیا انتظار ہے کہ بد کے قائلوں کی بات بھی سن لینی چاہیے بلکہ ایسے وقت میں مناسب یوں ہے کہ جیسے آفتاب کا چشم خود دیکھنے والا باوجود جاہل ہونے کے بے تامل یوں سمجھ جاتا ہے کہ گھڑی والا ہر چند محاسب اور بڑا ہوشیار ہے اس کے علم میں کچھ شک نہیں لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کی گھڑی بگڑی ہوئی ہے یا اس وقت اتفاق سے بمقتضا بشریت کچھ غلطی ہو گئی ہے ایسے ہی بد کی غلطی کا سمجھنے والا بھی بے تامل مان اٹھے کہ ہر چند قائلین بد بڑے بڑے عالم اور فاضل تھے لیکن تاہم آدمی تھے۔ غلطی کھا گئے نہ اس آیت پر انہیں دھیان ہوا کَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا یعنی اللہ ہمیشہ سے علیم ہے اس کا علم کچھ اب پیدا نہیں ہوتا اور نہ آیت مذکورہ لَا يَضِلُّ رَجُلٌ وَلَا يَنسِي ان کے خیال میں گزری اور نہ حدیث کلینی کا کچھ خیال کیا بلکہ ادب کی بات آویں۔ ہے کہ یہ کہیں

ان لوگوں کو کلام اللہ تو یاد نہ تھا۔ کیونکہ یہ تو سنیں گے کہ کام ہے۔ کلینی بعد میں تصنیف ہوئی۔ معہذا ان کا کیا قصور؟ سب جانتے ہیں ”دروغ گورا حافظہ نباشد“ القصد یہ عذر کہ شیعوں کی دلیلیں معلوم ہوتی چاہیں وہ عذر بعد کلام اللہ اور حدیث مذکور کے جن کے معنوں میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی اور خدا کے علم کے قریبی ہونے پر مثل آفتاب روشن کے گواہی دیتی ہیں) عقلا کے نزدیک قابل سماعت نہیں۔

بدلاً جیسے گواہی عقیدے کی غلط بنیادیں | مگر با اینہم بیاس خاطر مولوی عمار علی صاحب یہ معروف ہے کہ منشاء غلطی شیعہ اس قسم کی آیتیں ہیں لَبِئْسَ لَكُمْ اٰخِصْنَ عَمَلًا حاصل یہ کہ خدا نے موت حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ تمہیں آزمائے کہ گونسا تم میں اچھے عمل والا ہے سو اس آیت سے اور ایسی ہی مضمون کی اور آیتوں سے علماء شیعہ کو یوں دھوکہ پڑا کہ امتحان اور آزمائش تو وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت امر پہلے سے معلوم نہیں ہوتی پھر تفسیر یہ تسمیہ ہوا کہ ایک جگہ خداوند کریم یوں بھی ارشاد فرماتے ہیں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰتُوا زَكٰتَہُمْ حَتّٰى تَكُوْنُوْا فِیۡ سَبِيْلٍ سَوِيٍّ یَّعْنٰی اللّٰہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس آیت کے مضمون کو جو پہلی آیت کے مضمون سے ملا کر دیکھا تو علماء شیعہ کو بجائے خود اس بات کا یقین ہو گیا کہ خدا کو پہلے سے تو حقیقت الامر خوب معلوم تھی ہی نہیں یونہی شکل اور رائے سے ایک بات مقرر کر رکھی تھی سو اس میں جہاں کہیں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے اسے بدل دیتے ہیں اور یہی معنی بدلا کے ہیں۔ الحاصل اس وجہ سے شیعوں کے نزدیک عقیدہ بدستحکم ہو گیا اور یہ غلطی جو اول کسی کو بوجہ گواہی عقل کے پڑی تھی خوب مضبوط ہو گئی اور کیوں نہ ہو۔

بے استاد کی ٹھوکریں | بے استاد ہمیشہ خراب رہتا ہے اگر ہر ان کلام اللہ کی کنش برداری اختیار کرتے تو اس آیت کے معنوں میں ایسے کیوں بہکتے مگر یہ فرقہ تو ایسا کم نصیب ہے کہ کلام اللہ کے جاننے والوں کے دلی دشمن ہیں جناب من ”ہر کارے ہر مردے“ صحابہ کرام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے۔ کلام وہ سمجھتے تھے۔ پھر جو ان سے مستند ہو گا وہ کلام اللہ کو سمجھ گیا یا شیعہ سمجھیں گے؟

ابتلاؤ امتحان سے مقصود خداوندی فیض حجت ہے نہ کہ تحصیل علم | اگر آیت لَبِئْسَ لَكُمْ اٰخِصْنَ عَمَلًا سے یہ بات نکالی ہے کہ

خدا کو پہلے کسی چیز کے پیدا ہونے کے علم اس کا نہیں ہوتا ہے تو اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اس وقت تو ضرور ہی ہو جاتا ہے چنانچہ اول تو شیعوں اس کے قائل ہی ہیں معہذا کلام اللہ میں بیلوں جگہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ موجود ہے۔ یعنی خداوند کریم جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے پہلے پیدا ہونے سے تو ہم نے مانا، نہیں دیکھتا تھا لیکن یہ تو فرمایا ہے کہ بعد پیدا ہونے کے بھی کیا کچھ اس میں متامل باقی ہے؟ نور آفتاب خدا کا محتاج نہیں شمع چراغ کی اس کو ضرورت نہیں آگے پیچھے ہونا اس کے نزدیک سب یکساں ہے کیوں کہ وہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّخِيْطٌ یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے القصہ بعد وجود اشیاء کے ان کے پیش نظر ہونے میں کچھ شک نہیں اور پھر یا نہمہ بھول جانے کا اندیشہ نہیں کیونکہ سورہ طہ میں لَا يَنْسِيْ مَوْجُوْدٌ هِيَ اللّٰهُ بَعْدَ اَنْ يَّخْلُقَ اَمْثَلُ الَّذِيْنَ اَخْلَقَ یعنی خدا بھولتا نہیں پھر کیا ضرورت ہوئی کہ کرام کا تبیین مقرر کئے گئے؟ اور حساب کتاب قیامت کو ہونا ضرور پڑا اور نامہ اعمال و صحیفہ ہا کر دار بنی آدم لکھے گئے جو علماء شیعہ اس کا جواب دینگے وہی ہماری طرف سے نوازش فرما کر قبول فرمائیں۔

اگر یوں جواب دیں کہ ہر حنیف خداوند عالم الغیب کو ہر لکی چھپی بڑی چھوٹی چیز کی خبر ہے لیکن شوکت اور عظمت اور حکمت خداوندی کے مناسب یہی ہے کہ یہ سارا کارخانہ برہما ہو تو ہمیں تسلیم پڑے یہی جواب ہمارا ہے اور اگر شیعہوں کو نسبت ناہمائے اعمال اور حساب کتاب اور ہاتھ پاؤں کی گواہی کے جو قیامت میں ہوگی یہ عذر ہے کہ یہ سب تعلیم بنی آدم کے لئے ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ امتحان خداوندی بھی تعلیم بنی آدم کے لئے ہے۔

باقی کسی کو ہاتھ پاؤں کی گواہی اور حساب کتاب اور وزن اعمال میں شک ہو تو یہ کلام اللہ کی آیتیں موجود ہیں آیت یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ جس کا یہ حاصل ہے کہ فلاں نے لوگوں کو اس روز عذاب ہو گا۔ جس روز ان کی زبان ہاتھ پاؤں ان پر گواہی دینگے اور آیت قَالُوا الْجُلُودُ دِهْمٌ لِّمَن شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَأَلْطَقْنَا اللَّهَ يَلْعَنُ قِيَامَتِ كُوجِب كُفَارِ كَ كَان أَنكُم مِّن كُھَالِیْس ان کے کرتوت کیا گواہی دینگے تو وہ ان کو طاعت کرینگے سو اس کا بیان ہے کہ کہیں گے کفار اپنی کھالوں کو کہ تم نے کیوں ہمارے حق میں بری گواہی دی؟ تو وہ کہیں گے کہ جس خدا

نے سب کو بلایا تھا اور بولنا سکھا یا تھا اسی نے ہمیں بھی بلایا۔

اور سوا اس کے اور بہت سی آیتیں وزن اعمال پر اسی طرح دلالت کرتی ہیں۔

وَالْوِزَنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ يَعْنِي تَوَلَّ اس دن ٹھیک ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ

حاصل اس کا یہ ہے کہ رکھیں گے ہم ترازو میں انصاف کی قیامت کے دن فَاثَا

مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ حَاصِل یہ ہے کہ جس کے اعمال

تول میں بھاری ہوں گے ان کی اچھی گزران ہوگی، ایسی ہی حساب کے مقدمہ میں کثرت سے

آیتیں وارد ہیں منجملہ ایک دو لکھے دیتا ہوں اِنْ تَبَدُّوْا فَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخْفَوْا

يُحَاسِبُكُمْ بِهِنَّ اللّٰهُ خَوَاه ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے یا چھپاؤ خدا حساب ضرور لے

كَافٍ مِّنْ يَّكْفُرْ بِالْآيَاتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ یعنی جو کوئی منکر ہو گا اللہ کے حکموں

سے تو اللہ حساب کتاب لینے والا ہے الغرض ان باتوں سے انکار نہیں ہو سکتا اور ہمیں کسی

سے کیا کام اما میرہ اور اثنا عشریہ سے غرض ہے سو وہ منکر ہی نہیں اہل سنت اور وہ دونوں

ان باتوں کے ایمان میں متفق ہیں زیدیہ اسمعیلیہ ہوتے تو یوں بھی رہی۔

الحاصل جو کچھ شیعہ تجویز فرمائیں ہمیں کچھ دریغ نہیں اگر وہ یوں کہیں کہ بنی آدم

کی حجت ختم کرنے کے لئے حساب کتاب وغیرہ ہے ورنہ کچھ حاجت نہ تھی تو ہماری طرف سے

بھی یہی جواب معروض خدمت رہی بلکہ اس کے ساتھ میں الٹا شکرانہ ہم سے لیں کہ ہمیں ان آیات

کے معنی کی تحقیق میں تحفیف پاتا تھا آئی غرض بہر حال چشم مارو شن دل ماشاد،، صلاح ماہمہ ان

کان صلاح شما است،،

امتحان بغرض قطع حجت کی ایک قرآنی مثال | اور کسی مثال سے سمجھنا مد نظر ہے تو ایسی مثال لیجئے جسے

مولوی عمار علی صاحب بھی مان جائیں آئم کا پہلا سپارہ تو شیعوں کو غالباً یاد ہو؟ نہیں تو

قریب یاد کے ہو گا کیونکہ اکثر دستمال اطفال رہتا ہے چہ جائیکہ بڑے بوڑھے عالم فاضل، سو

پہلے سپارہ میں رکوع خَرَاذُ قَالَ سَرَّابٌ مِّنْ اَيُّكُمْ يَبْيَانُ بِيَّ اَنَّ جَنَابَ بَارِي تَعَالٰی لَے

فرشتوں سے حضرت آدم کے زمین میں خلیفہ بنانے کی خبر دی تو فرشتوں نے یہ اعتراض

کیا کہ آپ آدم اور آدم کی اولاد کو زمین میں خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد کریں اور خونریزیا

مچائیں حالانکہ ہم اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آپ کی تسبیح ہم کرتے ہیں آپ کی تقدیس میں ہم مشغول رہتے ہیں تو اس کے جواب میں سر دست تو جناب باری تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے مگر ان کی حجت قطع کرنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام یا حقیقت لعلیم فرما کر پھر فرشتوں سے ان چیزوں کے نام یا حقیقت دریافت کئے۔ اور فرمایا کہ اگر تم دعوائے استحقاق میں سچے ہو تو ہمارے سوال کا جواب دو چونکہ فرشتوں کو معلوم نہ تھے تو انہیں بجزیوں کہنے بن پڑی کہ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ حاصل اس کا یہ کہ الہی تو پاک ہے ہمیں تو جتنا تو نے بتلادیا اسکے سوا اور کچھ معلوم نہیں تو ہی اسرار کا جاننے والا اور حکمتوں والا ہے۔

جب ان سے نہ بتلایا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تو انہیں ان چیزوں کے نام بتلا دے، جب حضرت آدم علیہ السلام نے ان کے نام بتلا دیئے تو خداوند کریم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمان زمین کی لکی چھپی باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرو اور جو چھپاتے ہو وہ سب مجھے معلوم ہیں۔ برائے خدا علماء شیعہ اس قصہ میں غور فرمائیں یہ امتحان فرشتوں اور حضرت آدم کا جو لیا۔ تو کیا اس لئے لیا تھا کہ اپنے آپ کو حقیقت الامر معلوم ہو جائے یا فرشتوں ہی کی حجت قطع کرنے کے لئے؟ در صورتیکہ حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے اپنے سوال کا جواب بتلا چکے ہوں اور فرشتوں کو نہ بتلایا ہو، تو کسی نادان کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جناب باری تعالیٰ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کون استحقاق رکھتا ہے کون نہیں ہو جیسے یہ امتحان فقط فرشتوں کی حجت قطع کرنے کے لئے اور ان کے اعتراض کو اپنے ذمہ سے اٹھا دینے کے لئے تھا ایسے ہی یہ امتحان جو لَبِيبُكُمْ یا اور اسی مضمون کی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے تو فقط اسی لئے ہے کہ بنی آدم کو جو حد ایک دوسرے کے درجہ بڑھانے پر خدا کے ذمہ انصافی کی تہمت نہ لگانے لگیں اور ان کو گنجائش گفت و شنود اور جائے اعتراض و انکار جو ان کی جبلت میں رکھی ہوئی، باقی نہ رہے۔

بعثت انبیاء اور کالیف شرعیہ کی | اور واقعی اس حکم احکام کے قصہ اور رسولوں اور
وجہ بھی قطع حجت بنی آدم ہے | انبیاءوں کے بھجنے کے سلسلہ کی وجہ اور حکمت یہی معلوم

ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ملائکہ باہم عصمت اور فرمانبرداری کے جو آیت لَا یُعْصُونَ
لِلّٰہِ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ سے جس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتے خدا کی
نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ انہیں حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں (ثابت ہوتی ہے خدا کی
بات میں دخل دے بیٹھے اور بوجہ حدی بنی آدم اعتراض کر گزے۔ بنی آدم تو بنی آدم ہیں پھر
باوجودیکہ گناہوں سے ان کا خمیر ہے ان کی شان میں یہ تعریف بھی آئی ہے وَکَانَ
الْاِنْسَانُ اَکْثَرُ شَیْءٍ جَدًّا۔ یعنی انسان سب میں زیادہ جھگڑا لو ہے پھر اگر خداوند کریم موافق
اپنے علم ازلی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جنت میں
اور ابوجہل اور فرعون کو دوزخ میں داخل کر دیتا تو ابوجہل اور فرعون کا ہے کوٹھنڈے
جوٹھے بیٹھتے اعتراض پر اعتراض کئے جاتے اور اپنے استحقاق جنت کے دعوے میں کیا
کیا کچھ نہ کرتے اسی لئے خداوند کریم علیم حکیم نے کلام اللہ میں اکثر مواقع میں وجہ اس سلسلہ
ہدایت کی بھی بیان فرمائی ہے لیسکین خاطر ناظرین کے لئے ایک آیت گذارش کرتا ہوں۔

وَاتَّبِعُوا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ
مِنْ رَبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاتِیَکُمْ
الْعَذَابُ اَبْکَثَہُ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ
اَنْ تَقُولَ نَفْسٌ یَّأَحْسَرُنِیْ عَلٰی مَا
فَرَطْتُ مِنْ حِجْبِ اللّٰہِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ
السَّاجِدِیْنَ اَوْ تَقُولَ لَوْ اَنَّ اللّٰہَ هَدٰی
لَکُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ اَوْ تَقُولَ حِیْنَ
تَرٰی الْعَذَابَ اَبْ لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّةً فَاَکُوْنَ
مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ بَلٰی قَدْ جَاءَتْکَ
اٰیَاتِیْ فَکَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَکْبَرْتَ

حاصل اس کا یہ ہے کہ چلو بہتر بات پر جو
تم پر نازل کی گئی تمہارے رب کی طرف سے پہلے
اس سے کہ پہنچے تم پر عذاب اچانک اور تم کو خبر
نہ ہو کہیں کہنے لگے کوئی جان ہائے افسوس میں نے
قصور کیا اللہ کے مقدمہ میں۔ اور میں ہنستا ہی ہا
کوئی کہنے لگے اگر اللہ مجھ کو بتایا تو میں متقی ہوتا۔
یا کوئی کہنے لگے جب دیکھے عذاب کسی طرح مجھ کو
پھر جانا طے تو میں نیکی والوں میں سے ہر جاؤں
کیوں نہیں پہنچ چکے تھے مجھ کو میرے حکم۔
پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور فرود کرنا۔ اور تو کافروں

وَكُنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ۔ ۱ میں سے تھا۔

دوزخی اور جنتی پہلے ہی سے طے ہیں۔ یہاں تک ترجمہ تھا اب اس آیت کے مطالعہ کر نیوالے فرمائیں کہ یہ جو حکم ہوا کہ خدا نے جو تمہاری طرف سے عہدہ بات نازل کی ہے اس کا اتباع کرو اور اس پر چلو خدا نے اس کی کیا وجہ فرمائی ہے بجز اس کے اور بھی کچھ ہے کہ یہ اندیشہ تھا کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ خدا اگر مجھے راہ بتلاتا تو میں متقی رہتا اور یہ اندیشہ جب ہو سکتا ہے کہ اپنی طرف سے پہلے تجویز کر رکھا ہو کہ اس کو دوزخ میں پہنچائیں گے اس کو جنت میں ہو اسی تجویز کے موافق اگر کار بند ہوتے اور جس کو برا بھلا جیسا سمجھ رکھا تھا اس کے مناسب اسے جگہ دیتے تو بیشک دوزخی بھی اپنا استحقاق جتاتے اور دعوائے اپنی بھلائی کا کر کے کہتے کہ ہمارا امتحان کیوں نہ لیا۔ ہم کو راہ دکھائی ہوتی ہم بے شک متقی اور پرہیزگار نکلتے مَعْنَا كُنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ فرمایا اور کفرت نہ فرمایا عرتبت میں جو ہمارے کَمَا يَنْبَغِي رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کفرت فرماتے تو یہ معنی ہوتے کہ جب آیات آئیں اور ان کا انکار کیا تب کافر ہو گیا۔ پہلے سے نہ تھا اور اب یہ معنی ہیں کہ انزل سے تیرا چہرہ کافروں میں اور مک حراموں میں لکھا ہوا تھا سو تو موافق اس لکھے ہوئے ہی کے نکلا باوجودیکہ ہماری آیات تیرے پاس آئیں پھر تو نے انہیں نہ مانا۔ اور اَلْاَعْرَابُ غرور کیا۔

ایسے ہی سورہ اعراف میں ہے اَنْ تَقُولُوْا لِمَ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْقُرْآنُ لَعَلَّآ اَنَّا كُنَّا مِنْ غَافِلِيْنَ یعنی عہد الست جو لیا گیا۔ تو فقط اسی لئے کہ تم عذاب کے وقت یوں نہ کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ القصہ چونکہ صورت حال نبی آدم سے چنانچہ مذکور ہوا اعتراض اور جھگڑا ٹپکتا تھا جناب باری تعالیٰ نے یہ امتحان اعمال مقرر کر دیا۔ تاکہ ان کی حجت منقطع ہو جائے اور کل کو غل نہ پچائیں اور نا انصافی کی تہمت نہ لگائیں اسی لئے ان کے سنائے کو فرماتے ہیں لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَلِيُنَبِّئَكُمْ حَقَّتْ الْعِلْمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَتُنَبِّئُوا اَخْبَارَكُمْ حَاصِلُ يَنْبَلَاكُمْ اگر تم کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اور یوں سمجھتے ہو کہ خدا کو کیا معلوم کون اچھا ہے کون برا ہے اُنہما کے دیکھا

تو ہوتا جو اچھے برے کا فرق معلوم ہوتا، ورنہ فقط اٹکل سے کسی کو برا بھلا سمجھ لینا۔
اور پھر اس کے موافق دوزخ و جنت میں داخل کر دینا کا انصاف نہیں تو اب ہم بھی امتحان ہی
لیں گے تاکہ معلوم ہو کہ کون بھلا ہے کون برا ہے کون مجاہد ہے کون صابر ہے غرض یہ امتحان
قطع حجت بنی آدم کے لئے ہے خداوند علیم کو تحصیل علم مد نظر نہیں۔

اٰخْبَارُكُمْ کے تفسیری فوائد اپنا پنچہ دوسری آیت میں جو لفظ اٰخْبَارُكُمْ ہے وہ بھی باوازا
بلند اس بات پر شاہد ہے کہ خداوند علیم پہلے سے بخبر نہیں اچھے برے نیک و بد سب کے
حال سے خبردار ہے کیونکہ اس صورت میں حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ ہم کو جو تمہاری حقیقتوں
کی خبر ہے اور ہم کو اس میں شک ہے ہم بھی اسے جانچیں گے اس سے صاف معلوم ہو گیا
کہ خدا کو پہلے سے ہر چیز کی خبر ہے بھلے اور برے کو جانتا ہے ایسا نہیں جیسا امامیہ کہتے ہیں کہ
جب کوئی چیز پیدا ہوتی ہے خدا کو جب ہی خبر ہوتی ہے چنانچہ ملا نظام الدین جیلانی کے حوالے سے
اوپر گزر چکا لیکن بنی آدم کی حجت قطع کرنے کے لئے یہ سارا بکھڑا کیا جیسے فرشتوں کے ساکت
کرنے کے لئے سوال جواب مذکور کی نوبت پہنچانی ورنہ جیسے خداوند کریم پہلے سے جانتا تھا
کہ حضرت آدم خلافت کے لائق ہیں اور فرشتوں میں وہ بات نہیں جو حضرت آدم علیہ السلام
میں ہے ایسے ہی ازل سے جنتیوں کا جنت کے لائق ہونا اور دوزخیوں کا دوزخ کے لائق
ہونا خداوند کریم اس طرح جانتا تھا جس طرح ہم تم لکڑیوں کا چوٹھے کے لائق ہونا اور روٹی کا
کھانے کے قابل ہونا سمجھتے ہیں سو اگر خداوند کریم علم ازل کے موافق جنتیوں کو جنت میں اور
دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچا دیتا تو کچھ ظلم تھا۔ لیکن بنی آدم کا جھگڑا پلے بندھتا تھا فرشتوں
نے تو کیا تکرار کیا تھا جو یہ کرتے؟ اس لئے یہ سارے کارخانے اور امتحان مقرر کئے۔

جیسے بعض جگہ بالاتفاق ماضی سے مجازاً مستقبل مراد | اب بفضلہ تعالیٰ وہ دھوکہ جو بوجہ آیات امتحان
ہے اسی طرح بعض جگہ مستقبل سے بھی ماضی مراد ہے | علماء شیعہ کو واقع ہوا تھا مرتفع ہو گیا اور معلوم ہو
گیا کہ کلام اللہ یوں سمجھا کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک آیت کو چیل گئے اور جو کچھ فی الفور سمجھ میں آگیا
اس پر جم گئے اور یہ نہ دیکھا کہ اور آیات سے مل کر اس آیت کے کیا معنی ہوتے ہیں اگر یہی تفسیر
دانی ہے تو ہم جانتے ہیں کہ علماء شیعہ کل کو وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَانُوا يُعَذِّبُونَ النَّاسَ فِي الْأَدْنَىٰ

أَصْحَابُ الْآخِرَةِ اور وَنَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ وغیرہ اس قسم کی آیات کے معنوں میں فرمانے لگیں گے کہ یہ سب قصے ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ قطع نظر ان آیات اور احادیث کے جن سے قیامت کا آئندہ کو ہونا ثابت ہوتا ہے سر دست ان آیات کے ہی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ یہ باتیں سب ایام گزشتہ کے افسانے ہیں کیونکہ نادى ماضی کا صیغہ ہے جب ملک یوں نہ کھیں کہ جو چیز ہونے والی ہے اور اس کے ہونے میں کچھ شک نہیں ہوتا اسے عرف میں یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ کہ ہو ہی چکی چنانچہ جو شخص لب مرگ ہوتا ہے اسے کہا کرتے ہیں اس میں کیا رہا ہے مر ہی چکا۔

جب ملک ان آیات کے معنی اور آیات کے موافق نہ ہوں گے ادنیٰ سے ادنیٰ عربی خوان بھی یوں جانتا ہے کہ باعتبار لغت کے وَنَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ کے یہ معنی ہیں کہ ندا کی خبیثوں نے دوزخیوں کو اب ملک دوزخ اور جنت میں گیا ہی کون ہے جو یہ سوال اور جواب ہونے لگے البتہ یہ سب سرگزشتیں بروز قیامت ظہور میں آئیں گی، چنانچہ سیاق اور سباق سے ظاہر ہے اور نیز امامیہ اور اثنا عشریہ بھی یہی فرماتے ہیں سو جیسے ان الفاظ کو بقرینہ دیگر آیات اپنے معنی حقیقی یعنی زمانہ ماضی سے پھیر کر معنی مجازی یعنی زمانہ مستقبل مراد لیتے ہیں ایسے ہی اگر کُنْ بَلَوْ تَكُنْ وغیرہ کلمات کو جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتے ہیں ان آیات کے قرینے سے جن سے خداوند علیم کے علم کا قدیم ہونا ثابت ہوتا ہے اپنے معنی اصلی یعنی زمانہ مستقبل سے پھیر کر زمانہ ماضی مراد لیں تو کیا گناہ ہے۔؟

حوادثِ آئندہ یقینیہ کو ماضی اور وقائعِ ماضیہ اور تصحیح مجاز کی وجہ درکار ہوتو سنئے جیسے امور مخفیہ کو مجازاً مستقبل سے تعبیر کرنا صحیح ہے اسکی مثال آئندہ میں سے ان امور کو جن کا آئندہ کو واقع ہونا یقینی ہوتا ہے بایں وجہ کہ ان کا تحقق ضروری اور یقینی ہے الفاظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں ایسے ہی امور گزشتہ میں سے ان امور کو جن کا تحقق اور وقوع اور ان کا وجود ایک نوع سے مخفی ہو اور باینہم ان کا اثر بھی ہنوز ظاہر نہ ہوا ہو تو بایں لحاظ کہ ایسے امور کا ہونا نہ ہونا اکثر اثر کے ہونے نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے الفاظ مستقبل سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں مثال کی ضرورت ہو تو سنئے کہ اگر کوئی بیمار بوجہ امتداد مرض اور شدت بیماری صاحب

فرست ہو جائے یعنی چار پائی کا سوار بن جائے اور پھر شافی مطلق اس بیمار کو ایک دفعہ ہی شفا عطا فرمائے تو ظاہر ہے کہ وہ طاقت رفتہ مرض کے جاتے ہی نہ آجائے گی، بلکہ آئیگی تو رفتہ رفتہ آئے گی سو اگر مجرّد زوال مرض عطا وغیرہ قرض خواہ اگر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں تو وہ مرد ضعیف و نقیہ اگر مفلس ہوتا ہے تو باوجود اطلاع اس امر کے کہ میرا مرض زائل ہو گیا اور میں اچھا ہو گیا اکثر یہی جواب دیتا ہے کہ میں اچھا ہو جاؤں تو کہیں سے فکر کر کے آپ کا حق پہنچاؤں۔

یا فرض کرو بیمار کو تو زوال مرض کی اطلاع نہ ہو، چنانچہ اکثر ہوتا ہے پر طبیب کامل آثار و دلائل سے اس کی صحت سے مطلع ہو کر خواستگارِ العام ہو اور بیمار بسبب بقائے آثار مرض مثل نقاہت وغیرہ کے اعطائے العام میں مترّد ہو، تو طبیب اکثر کہا کرتے ہیں کہ اچھا جب تم اچھے ہو جاؤ گے جیسی دینا، سو جیسے طبیب یا مریض مذکور بایں لحاظ کہ اب تک ظہور اثر صحت کچھ نہیں ہوا یعنی طاقت نہیں آئی صحت کو جو واقع ہو چکی بمنزلہ غیر واقع سمجھ کر صیغہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے۔

ایسے ہی جناب باری بھی اپنے اس علم قدیم کو رکھنا بہ حجاب و صابر ہیں اور اعداء صحابہ فاسق و فاجر، اصحاب کرام بوجہ سعادت ازلی اور شرافت لم یزلی اور خوبی ذاتی اوکمال صفاتی اس لائق ہیں کہ ان سے اچھے کام لئے جائیں۔ اور اس کے ثمرہ میں کمالات کسی دیئے جائیں اور اعداء صحابہ بسبب شقاوت ازلی اور زوالت لم یزلی اور ربوبی ذاتی اور نقصان صفاتی اس قابل ہیں کہ ان سے برے کام لئے جائیں اور اس کی پاداش میں ان کے قلوب سیاہ کئے جائیں بایں نظر کہ قبل تکلیف اعمال اس علم پر کوئی ثمرہ متفرع نہیں ہوا اور اس کا اثر یعنی اچھے برے کاموں کا ان سے لینا ہنوز ظاہر نہیں ہوا یا بایں خیال کہ بہت سے نابکاروں کو خدا کے اس علم کے صحیح ہونے میں ایسا تردد ہے جیسا بیمار مذکور کو قول طبیب میں، اگر بصیغہ استقبال بیان فرمائے تو شیعوں کو اس قدر حیرت کیوں ہے؟

ازلی سعادت و شقاوت کی عام فہم مثال ایسی بات کہ یہ فرق نیک و بد ازلی اور خلقی ہے کسی اور عارضی نہیں سو یہ ہر چند ایک دقیق ہے۔ لیکن اہل فہم کے نزدیک یہ فرق بعینہ ایسا ہی جیسا

ذکی و غبی اور حلیم و خوتخوار اور بخیل و سخی اور شجاع و نامرد، عالم و جاہل کا فرق ہے جیسے بادشاہان عاقل عالم سے کارِ علم اور جاہل سے کارِ جہل لیتے ہیں ایسے ہی جناب باری بھی ہر کسی سے اُسی کے لائق کام لیتا ہے۔

تینوں زمانے مجتمعتہً موجود ہیں فنا نہیں ہوئے | بلکہ تحقیق تو یوں ہے کہ زمانہ بتماہہ ازل سے لے کر اب تک ایک شے موجود ہے نہ زمانہ ماضی فنا ہوا اور نہ زمانہ آئندہ معدوم ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی یوں کہے اِنَّ زَيْدًا قَاتِلٌ يَعْنِي زَيْدٌ قَاتِمٌ ہے تو مجرد اس کلام کے سننے کے ہر کوئی یہ سمجھ جاتا ہے کہ زید موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے اور ظاہر بھی تو ہے کہ کوئی حال تو جب ہو کہ جب وہ خود پہلے ہو لے جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو گذارش یہ ہے کہ قیامت کے باب میں جو قائل آئندہ میں سے ہے خداوند کریم یوں فرماتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدا سچا ہے اِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ يَعْنِي بِيَشَك قِيَامَتِ اَنْهٖ وَالِي هٖ يٰۤاٰدُوسُ رِي حَبْكُہٗ یوں فرماتا ہے اِنَّ زَلْزَلَةً السَّاعَةِ شَیْ عَظِيْمٌ يَعْنِي بِيَشَك قِيَامَتِ کَا زَلْزَلَةٍ بَرِي حَبْكُہٗ ہے، سو موافق قاعدہ مذکورہ کے ہم بھی یوں ہی سمجھتے ہیں کہ قیامت بالفعل موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ ہماری طرف سے آنے والی ہے۔ اور وہ بہت بڑی چیز ہے اور ہم اس پر بے تکرار ایمان لاتے ہیں اور چون و چرا نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی نیم ملا یوں چون و چرا بھی کرے کہ بہت اوصاف ایسے ہیں کہ ان سے اس چیز کا وجود معلوم نہیں ہوتا جس کا وہ وصف ہوتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلانا مر گیا یا فلانا معدوم ہو گیا۔ تو ہر چند یہ شبہ قابل جواب نہیں اور اس کا جواب بھی یہ ہے کہ یہ باتیں اوصاف نہیں بلکہ اوصاف کا نہ ہونا ہے۔ لیکن سلیمان یوں کہنا کہ فلانی چیز آنے والی ہے یا فلانی چیز بڑی ہے یہ تو ایسی باتیں ہیں جن سے ہونا معلوم نہ ہو بلکہ یہ باتیں تو کوئی نوں کے نزدیک بھی وجود ہی پر دلالت کرتی ہیں سو در صورتیکہ یہ اوصاف وجود پر دلالت کرتے ہوں ہم قیامت کے بجائے خود موجود ہونے میں کیوں تا مل کریں اور یوں جب مقرر ہو چکا تو ہم ایک اور بھی التماس کرتے ہیں کہ جیسے قیامت آنے والی ٹھہری اور وہ اس وصف کے قرینے سے موجود معلوم ہوئی تو زمانہ گذشتہ بشہادت تمام عالم گزرنے والا ہے اسی واسطے اس کا نام گذشتہ رکھا گیا۔ مہذا جب قیامت وغیرہ

اجزائے زمانہ متحرک ٹھہرے تو ایک روز ہم تک پہنچ کر گذر بھی جائے گی اور یوں کہنا کہ
فلانا شخص جاتا ہے وجود پر دلالت کرنے میں کچھ اس سے کم نہیں کہ یوں کہیے کہ فلانا شخص
آتا ہے اور جب دونوں طرفیں زمانے کی گزشتہ اور آئندہ برابر بجائے خود موجود نکلیں۔
سب زمانے احاطہ خداوندی میں ہیں۔ تو موافق فرمودہ باری تعالیٰ اِیَّیْہِ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ
شَیْءٍ حَیْطٌ سار ازمانہ اول سے لے کر آخر تک احاطہ خداوندی میں داخل ہوا سوا احاطہ
خداوندی کے جو کچھ کوئی معنے لے سہیں کچھ انکار نہیں کم سے کم یہ معنے تو ضرور ہوں گے کہ
اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے جیسا کہ دوسری آیت، بعینہ اسی معنے پر دلالت کرتی ہے۔ وہ
آیت یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا یعنی اللہ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے
اس صورت میں کیفیت سارے زمانہ کے وجود کی باوجود اس روانگی کے کہ ایک جزا آتا ہے
اور ایک جاتا ہے ایسی ہوگی جیسے اجزاء آب و اال کہ سب کے سب بجائے خود موجود ہیں۔
لیکن جب اگلے اجزاء گذر جاتے ہیں تب پچھلے آتے ہیں۔

اور خدا کے پیش نظر اور معلوم ہونے کے ایسی مثال سمجھئے جیسے کوئی اب دریا جا کر
کھڑا ہو تو ادھر سے ادھر تک تمام دریا کا پانی اور جو جو اس پانی کے اندر ہوتا ہے جاب یا خش
و خاشاک اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور اس کو سب ایک شے واحد نظر آتا ہے گو اجزاء آب
اور جو کچھ ان میں ہے باہم مقدم اور موخر ہیں

ماضی و مستقبل بھی خدا کے لئے حال کا حکم | الغرض اجزاء زمانہ اور جو کچھ زمانے میں واقع ہوتا ہے
رکھتے ہیں مگر باہم مقدم موخر ہیں | سب کا سب بہا ہا خداوند کریم کے پیش نظر ہے اور سارا

مجموعہ اس کو بمنزلہ شے واحد معلوم ہوتا ہے اور معاً سب کے سب اس کو یکساں نظر آتے ہیں
اس کے حساب سے سب زمانہ حال کا حکم رکھتے ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت
مقدم اور موخر گنے جاتے ہیں اور فرق حال اور استقبال اور ماضی کا نسبت ایک دوسرے کے
ہے۔ سو جیسے کوئی کسی مکان میں ہوتا ہے تو اس کے سوا جو مکان کہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے
اس کو آگے کہتے ہیں اور جو اس کے پیچھے ہوتا ہے اسے پیچھا کہتے ہیں، ایسے ہی جس زمانہ میں
کوئی چیز ہوتی ہے اس کے پہلے زمانہ کو بہ نسبت اس کے ماضی کہتے ہیں اور اس کے اگلے

زمانہ کو بہ نسبت اس کے مستقبل اور خاص اس زمانہ کو جس میں وہ چیز ہوتی ہے اس کی نسبت زمانہ حال کہتے ہیں سو ہر چند خداوند کریم کے پیش نظر ہونے میں اور اس کے سامنے موجود ہونے میں یکساں ہیں لیکن باہم مقدم اور موخر ہیں اور ایک دوسرے کی نسبت ماضی اور مستقبل اور حال ہے

کلام الہی میں ماضی و حال و استقبال کے استعمال کی ترتیب سو خداوند کریم کبھی تو موقع دیکھ کر لجا تا اپنے معلوم ہونے اور اپنے پیش نظر ہونے کے کلام کرتا ہے اور کبھی مناسب وقت ان وقائع کے تقدم اور تاخر کا لحاظ ہوتا ہے پہلی صورت میں تو ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے اور دوسری صورت میں ماضی کے موقع میں ماضی اور حال کے موقع میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال اور باوجود سب کے یکساں پیش نظر ہونے کے ماضی کا صیغہ جو استعمال کرتے ہیں اور حال کا لفظ نہیں بولتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کسی فعل کے صدور اور حدوث سے خبر دینی مد نظر ہوتی ہے اور کبھی اس فعل کے استمرار وجود کی خبر۔ سو جن افعال کی خبر دیتے ہیں وقت خبر جو وہ حاضر ہوتے ہیں تو باعتبار استمرار وجود کے حاضر اور پیش نظر متکلم ہوتے ہیں ورنہ باعتبار صدور اور حدوث کے وقت خبر حاضر نہیں رہتے بلکہ غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ صدور اور حدوث آتی ہے زمانی نہیں اور قبل وجود کسی فعل کے جو اس فعل کی خبر دی جاتی ہے تو وہ لاجرم بصیغہ استقبال ہونی چاہیے غرض حدوث کے لئے صیغہ حال ممکن نہیں یا لفظ ماضی ہو گا یا لفظ استقبال اگر قبل حدوث کسی وجہ سے مطلع ہو کر خبر دینگے تو بصیغہ استقبال خبر دینگے اور بعد حدوث معائنہ کر کے خبر دینگے تو بصیغہ ماضی خبر دینگے حال جب سے کہتا تھا کہ حدث بھی مثل استمرار یعنی حاصل مصدر زمانی ہوتا ہوا ہوتا ہوا بہر حال نسبت علم خداوندی کے سب بمنزلہ حال کے ہے۔ سو جہاں کہیں وقائع آئندہ کو ماضی کے الفاظ سے بیان کیا ہے جیسا و نادى اصحاب الجنة یا اور سو اس کے تو وہاں عا۔ اس کی ہے کہ خدا کو سب حاضر اور پیش نظر ہے اور جہاں امور گزشتہ میں صیغہ استقبال کا مذکور ہے۔ جیسا حتى نعلمکم المجاہدین یا و لنبلونکم وغیرہ تو وہاں یہ مد نظر ہے کہ نسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے۔

وقائع عالم قدیم نہیں ہو سکتے کیونکہ مستمر نہیں | اس بحث کو اہل انصاف انصاف سے ملاحظہ فرمائیں
 اور پھر فرمائیں کہ یہ سچاں ہر چند دیوانہ ہے لیکن کس قدر بھکانے کی بات کہتا ہے مگر برائے
 خدا ذرا سوچ سمجھ کر دیکھیں مبادا اپنی جلدی میں میرے ذمے یہ تہمت نہ لگا دیں کہ فلا نے
 رسالے والا وقائع عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہے تنبیہ کے لئے میں ابھی سے کہے دیتا
 ہوں کہ کسی واقعہ کے قدیم ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ اس کا استمرار وجود اعمیٰ حاصل
 بالمصدر بقدر تمام زمانہ من اولئالیٰ آخرہ ہو۔ یعنی ازل سے لے کر اب تک اس کا استمرار وجود
 موجود ہو۔ اس سے قدم ثابت نہیں ہوتا کہ ایک زمانہ محدود الطرفین پر منطبق ہو اگرچہ وہ
 زمانہ قطع نظر حرکت لازمہ کے بذات خود ایک شے مستقر ہو۔ یعنی مثل حرکات ایسا نہ ہو کہ
 ایک جز حادث ہو تو ایک فانی ہو گیا اللہم انت الہادی لا ہادی الا انت
 حصول علم کے دو طریقے بالواسطہ و بلاواسطہ | اور اگر کوئی عقل کا پورا اس تقریر میں کچھ الجھنے لگے
 اور اس طریق سے مطلب تک پہنچنا اس کو دشوار معلوم ہو تو ایک دوسرا طریق جس سے یہ وضاحت
 خدا کے علم کا قدیم ہونا اور ان آیات کا بھی بلا تکلف اس پر مطابق آجانا ثابت ہو جائے۔ جو
 درج اوراق ہیں پر توجہ خاطر ناظرین ضروری ہے۔ اپنے علوم کے تجسس کرنے سے یوں معلوم
 ہوتا ہے کہ ہم کو علم اشیا دو طریق سے حاصل ہوتا ہے ایک تو بے واسطہ دوسرا بواسطہ لازم
 یا بواسطہ ملزومات، مثلاً آفتاب کا یاد دھوپ کا علم کبھی تو بے واسطہ ہوتا ہے آنکھ سے دیکھا معلوم
 ہو گیا اور کبھی بواسطہ ہوتا ہے آفتاب کا علم دھوپ کے وسیلہ سے یاد دھوپ کا علم آفتاب کے
 وسیلہ سے، اگر آدمی گھر میں ایسی جگہ بیٹھا ہو، جہاں سے آفتاب نظر نہ آتا ہو پر دھوپ نظر
 آتی ہو تو دھوپ کے وسیلہ سے معلوم ہو جائیگا کہ آفتاب آسمان پر نکلا ہوا ہے۔ سو یہ علم جو
 آفتاب کا حاصل ہوا تو بواسطہ لازم حاصل ہوا اور اگر آفتاب کو صحن میں بیٹھے ہوئے دیکھیں
 اور یوں سمجھیں کہ چھت پر دھوپ ہوگی تو یہ دھوپ کا علم بواسطہ ملزوم حاصل ہوا اعلیٰ
 ہذا القیاس آگ اور دھوئیں کے علم کو سمجھئے کہ کبھی بے واسطہ حاصل ہوتے ہیں جیسے آگ کو
 یاد دھوئیں کو خود آنکھ سے دیکھ لیا کبھی بواسطہ یک دیگر ہوتا ہے مثلاً دھوئیں کو دیوار کے
 پیچھے سے دیکھ کر آگ کو سمجھ جانا یا دور سے جہاں چراغ کا دھواں نظر نہ آتا، ہو چراغ کے

شعلہ کو دیکھ کر دھوئیں کو جان لینا۔

اکثر ایک چیز کا علم بواسطہ اور بیواسطہ دونوں ساتھ آتے ہیں | لیکن ایک شے کے علم بے واسطہ کو اس کا علم بواسطہ بھی بیشتر لازم ہوتا ہے اور دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور کسی طرح کا تقدم اور تاخر نہیں ہوتا مثلاً آگ کو قریب سے دیکھنے تو دھواں بھی اس کے ساتھ ہی نظر آئے گا سو اس صورت میں آگ کا علم دو طرح حاصل ہو سکتا ہے ایک تو بے واسطہ کیونکہ آنکھ سے خود نظر آتی ہے دوسرا دھوئیں کے واسطے سے کیونکہ اگر آگ نظر نہ آتی۔ اور دھواں ہی نظر آتا تو بیشک آگ کا علم حاصل ہوتا سو در صورتیکہ آگ بھی نظر آئی تو بطریق اولیٰ آگ کا علم دھوئیں کے واسطے سے ہونا چاہیے اور ظاہر بھی تو ہے اب دھوئیں میں کیا کمی آگ کی ہے جو دلالت نہ کرے۔

کبھی علم بواسطہ علم بے واسطہ میں محو ہو جاتا | بلکہ غور سے دیکھنے تو لازم جس سے علم بالواسطہ حاصل ہے کہ اس کا خیال بھی نہیں رہتا | ہوتا ہے اسی صورت سے معلوم ہوتا ہے مگر آگ کا علم جو بواسطہ دھوئیں کے اس صورت میں حاصل ہوتا ہے ہر خند علم بے واسطہ ہی کے ساتھ حاصل ہوتا ہے لیکن علم بے واسطہ میں ایسا مستعمل اور محو ہے کہ اس کی خبر بھی نہیں ہوتی اور کسی کو اس طرف دھیان بھی نہیں گذرتا اس کی ایسی مثال ہے کہ دن کو ستاروں کا نور بھی ہوتا ہے مگر آفتاب کے نور میں ایسا محو ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا۔

کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ یا ایک کا بواسطہ | جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی کہ ایک شے کا علم دوسری کا بیواسطہ بھی اکٹھے ہی حاصل ہو جاتے ہیں | بیواسطہ اور بواسطہ بسا اوقات دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں ایسا ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ بھی ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے مثلاً آگ کو اور دھوئیں کو ایک ساتھ دیکھنے علیٰ ہذا القیاس ایک شے کا علم بے واسطہ اور دوسری شے کا علم بواسطہ پہلی شے کے واسطے سے بھی اکٹھے ساتھ ہی حاصل ہوتے ہیں مثلاً دھوئیں کا علم بے واسطہ اور آگ کا علم بواسطہ دھوئیں کے واسطے سے اور ایسے ہی آگ کا علم بے واسطہ اور دھوئیں کا علم بواسطہ آگ کے واسطے سے دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور اکثر کچھ تفاوت نہیں ہوتا جو ایک کو یوں کہیں کہ یہ علم تو فلانی ساعت میں حاصل ہوا

اور یہ علم اس سے پہلی ساعت یا اس کے بعد کی ساعت میں حاصل ہوا۔

بے واسطہ اور بواسطہ حاصل ہونے والے علم الہی میں کوئی تقدم تاخر نہیں | لیکن تاہم عقل کے نزدیک ایک ترتیب ہے کہ اس کی رو سے مقدم موخر کہہ سکتے ہیں یعنی ایک شے کے علم بے واسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے جو بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوتا ہے عقل ایک طرح سے مقدم سمجھتی ہے یعنی ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ دوسری شے کا علم اس صورت میں پہلی شے کے علم پر موقوف ہے سو جیسا ہاتھ میں کسی چیز کو لے کر بلائے تو گو وہ چیز ہاتھ کے ساتھ ہی ہوتی ہے لیکن پھر یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ اول ہلتا ہے ایسا ہی اس صورت میں گو دونوں چیزوں کا علم برابر ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس کا علم بے واسطہ ہے بہ نسبت اس کے علم کے جس کا علم اسی کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے مقدم گنا جاتا ہے اور جیسا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھ کو اس لئے ہلایا تاکہ وہ چیز ملے جو ہاتھ میں ہے۔ ایسا ہی یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دھوپ کو اس لئے دیکھا تاکہ آفتاب بھی معلوم ہو جائے۔ کلام الہی میں ماضی و حال علم بے واسطہ سے تعبیر جب یہ تمام مقدمات ذہن نشین ہو چکے۔ تو اب ہے اور استقبال علم بالواسطہ سے | اتماں یہ ہے کہ خداوند کریم کے علم کو اگر قدیم کہیے تو حتیٰ لعدم وغیرہ کے استقبال میں کچھ فرق نہیں آتا اور حتیٰ لعدم وغیرہ کے استقبال سے اس کے علم کے قدیم ہونے میں کچھ تفاوت نہیں پڑتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خداوند علیم کو ہر چیز کا علم دو طرح سے حاصل ہے بے واسطہ اور بواسطہ یکدگر کیونکہ تمام موجودات کے ساتھ لوازم لگے ہوئے ہیں سو جیسا لوازم اور ملزومات دونوں کا علم بے واسطہ اسے حاصل ہے ایسا ہی لوازم کا علم ملزومات کے واسطہ سے، ملزومات کا علم لوازم کے واسطہ سے بھی اسے حاصل ہے اور دونوں ازل سے برابر ساتھ ہیں گو علم بالواسطہ کسی چیز کا اسکے علم بے واسطہ میں محو اور مضمحل ہو، اور ایسا ہی کسی چیز کا علم دوسری چیز کے علم کے واسطہ سے اور اس دوسری چیز کا علم برابر ساتھ ہی ازل سے خداوند ملزوم نہی کو حاصل ہیں اور دونوں قدیم ہیں مگر کسی چیز کے علم بالواسطہ کو بہ نسبت اس چیز کے علم کے جسکے واسطہ یہ علم حاصل ہوا ہے۔ موخر گنیں گے اور یہ علم بہ نسبت اس علم کے مقدم سمجھا جائے گا۔ سو جہاں کہیں علم خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا یا معنی استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ با اعتبار علم بالواسطہ کے ہے ورنہ با اعتبار زمانہ کے کچھ تفاوت نہیں اور جہاں کہیں ماضی یا حال متعل ہے وہاں

علم بے واسطہ مراد ہے۔

بنی آدم کے علوم چونکہ بواسطہ ہیں اس لئے بصیغہ استقبال (بواسطہ تکلم فرمایا) اور باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کرنے کی وجہ یہ پیش آئی ہو کہ کلام اللہ کے مخاطب آدمی ہیں اور تمام آدمی بلکہ تمام ذوی العقول کو اکثر چیزوں کا علم بالواسطہ ہی ہے بے واسطہ نہیں۔ روح بنی آدم یا بنی آدم کے کمالات انسانی جیسے سخاوت، شجاعت، خلق، مروت، اگر ہیں تو دل میں ہیں آنکھوں سے یا کانوں سے یا سوا اس کے اور جو اس خبر سے معلوم نہیں ہوتے ان کو اگر کوئی دوسرا معلوم کرتا ہے تو ان کے آثار اور لوازم سے معلوم کرتا ہے۔ سخاوت دینے والا ہے جو ہاتھ کا کام ہے شجاعت مارنے مرنے سے جو ہاتھ پاؤں سے تعلق رکھتا ہے خلق شیریں زبان سے جو زبان سے متعلق ہے معلوم ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس روح کا ہونا نہ ہونا دوسروں کو حرکات سکناات سے جو بدن سے متعلق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔

اگر علم بے واسطہ سے تکلم فرماتے تو وہ بنی آدم پر اور جہاں کہیں جناب باری تعالیٰ نے اپنے علم حجت نہ ہوتے کیونکہ ان کے بس میں نہیں میں صیغہ استقبال استعمال کیا ہے وہ ایسے ہی ہو

ہیں جو بنی آدم کو بے واسطہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ سو ان سے باعتبار علم بے واسطہ کے اگر کلام کرتے۔ تو ان پر کچھ حجت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ان کو الزام دے سکتے تھے۔ اس لئے الزام دینے کے موقع میں باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کی ہے اور جہاں یہ غرض نہیں وہاں باعتبار علم بے واسطہ کے کلام کی ہے اور وہاں صیغہ ماضی کا یا حال کا مستعمل ہے مگر بنی آدم کو چونکہ ان اشیاء کا علم بے واسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور لیسراں واسطوں کا علم قبل ان کے وجود کے بنی آدم کے حق میں ممکن ہی نہیں اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغہ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ کلام اللہ میں ایک جاتو یوں مذکور ہے کہ خداوند علیم کو تمام اشیاء کے علوم ازل سے حاصل ہیں جیسا کہ كَانَ اللَّهُ بِخَلْقِ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ اور ایک سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض علوم حادث ہیں جیسے الفاظ حتیٰ نَعْلَمَ وَغَيْرِہ مگر جو لوگ نہیں دیکھتے ہیں اور نکتہ مذکورہ سے متنبہ ہو گئے ہیں دونوں کو مطابق یکدیگر سمجھتے ہیں۔

محو اثبات کی بحث اور علم الہی کے دو دفتر | اب مناسب یوں ہے یَحْوَالِہُ مَا یَشَاءُ وَ
یُثَبِّتُہُ مَا یَشَاءُ کے معنی بھی بیان کئے جائیں کہ منصفان علماء شیعہ کو شاید انتظار ہو محذوم من
اول ساری آیت گوش گزار ہے بعد اس کے اپنا ما فی الضمیر بھی معروض خدمت ہو گا ساری
آیت یوں ہے وَمَا کَانَ لِرَسُولٍ اَنْ یَّاتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِجَلِّ اَجَلِ کِتَابِ
یَحْوَالِہُ مَا یَشَاءُ وَیُثَبِّتُہُ مَا یَشَاءُ اَمْ اَلْکِتَابُ حَاصِلِ اس کا یہ ہے کہ کسی رسول سے
یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی معجزہ جو اس کی نبوت کی نشانی ہو خدا کی بے اجازت لے آئے اللہ کے
یہاں ہر مدت کی ایک جدا کتاب ہے اس میں سے جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی
رکھتا ہے اور اس کے پاس ایک اور بڑی کتاب ہے جو سب کی اصل ہے۔ یہ تو اس آیت کا
حاصل ہوا۔ اب اہل فہم سے یہ امید ہے کہ بعد ملاحظہ ان دونوں لفظوں کے ایک تو لکل اجل
کتاب، اور دوسرا عندہ ام الكتاب، اور نیز بعد لحاظ اس امر کے کہ جملہ کحوالہ اللہ الخ اول
کے بعد واقع ہے بے تنبیہ کے آپ سمجھ جائیں گے کہ خداوند کریم کے یہاں دو دفتر ہیں ایک
بڑا جس کی طرف ام الكتاب کا لفظ اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا چھوٹا دفتر جس کی طرف جملہ لکل اجل
کتاب ہدایت کرتا ہے اور محو اور اثبات یعنی مٹانا یا چھوٹے دفتر میں ہوتا ہے بڑے میں
نہیں ہوتا۔ سو بعینہ یہی اہل سنت کا مذہب ہے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ بڑا دفتر جو علم خداوندی کے
موافق ہے یا خود علم خداوندی ہے اس میں گھٹاؤ بڑھاؤ نہیں ہوتا۔

عقیدہ بد اقرآن سے اس طرح ثابت ہے جیسے | پھر شیعہ کس خوبی پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ بد ا
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سَے نماز کی ممانعت | کلام اللہ سے ثابت ہوتا ہے اگر اسی آیت کے بھروسہ
کو دتے ہیں تو یہ بعینہ ایسا ہی استدلال ہے جیسا کسی بانوانے کہا تھا کہ کلام اللہ میں خدا نے
نماز سے منع فرمایا ہے اس لئے ہم نہیں پڑھتے۔ کسی نے پوچھا کہ صاحب ہمیں بھی بتلاؤ ہم نے تو
آج ملک یہ بات نہیں سنی اگر یہ حکم ہے تو کلام اللہ کے قربان جائیے بڑے آرام کی بات نکل آئی
بانوانے کہا صاحب سورہ نساء میں نہیں کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ یعنی نماز کے پاس نہ پھٹکو اس نے
کہا صاحب اس کے بعد وَ اَنْتُمْ سَکَارٰی بھی تو ہے یعنی نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو۔
ساری آیت کے معنی پر عمل کرنا چاہیے بانوانے کہا بابا سارے کلام پر کس سے عمل ہوا ہے یہ بھی

عنیمت ہے جو اتنا بھی عمل ہو جائے سو شاید علماء شیعہ نے بھی اسی قاعدہ پر عمل کیا ہے۔

اور میرے نزدیک ایک اور عذر شیعوں کے لئے اس موقع میں خفت اتارنے کے

لئے بہت عمدہ ہے وہ یہ ہے کہ سارے کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں تو شیعہ معذور ہی ہیں۔

اتفاق سے لیکل اجل کتاب بحوالہ اللہ مایشاء و یتثبت، تک فقط ان کو یاد ہو گیا تھا۔ بسبب کم سال

عبودیت اور سراپا بندہ ہونے کے اسی پر اعتقاد جما بیٹھے۔ سو یہ بات تو قابل تعریف ہے اگر وعندہ

ام الكتاب بھی ان کو معلوم ہوتا اور پھر سنیوں کے موافق ان کا اعتقاد نہ ہوتا۔ تب البتہ جائے

گرفت تھی سبحان اللہ اس تفسیر دانی اور کلام اللہ کے محفوظ ہونے پر سنیوں سے مقابلے کا دعویٰ

مگر ”موشے بخواب اندر بیرون ز شہر شد“ جناب من شیعوں کے اکثر استدلال تو بالواحد کور کے

سے استدلال ہیں اور کلام اللہ کی یادداشت ایسی ہے جیسے مرزا نوشہ شاعر بقاضائے تاثیر

مذہب اپنی ہرگز ثبوت لکھتے ہیں۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ زَنہِیْمَ بَخَاطِرِ اسْتِ ۝ وَ زَا مَرِیَادَ مَانِدْ کَلَوَا وَا شَرُّ لَوَا مَرَا

علم الہی قدیم غیر متغیر محیط ہے | حق یوں ہے کہ علم الہی میں کچھ تغیر نہیں آتا اور کیونکر تغیر ہو سکے۔

خداوند کریم جا بجا ایسے ہی توہمات کے دفعیہ کے لئے فرماتا ہے۔

ماصل سب کا یہ ہے، کہ خداوند کریم ازل سے

ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کی حقیقت پہچانتا ہے،

اور ہر چیز ازل سے اس کے احاطہ علمی اور احاطہ

وجود میں ہے

كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا كَاَنَّ اللّٰهُ بِحُلِّ

شَیْءٍ عَلِیْمًا وَ كُنَّا بِحُلِّ شَیْءٍ عَاِلِمِیْنَ

اِنَّ اللّٰهَ اَخَاطَ بِحُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا كَاَنَّ

اللّٰهُ بِحُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا۔

چنانچہ تصویر اس مضمون کی کچھ مذکور بھی ہوئی پھر جب ازل سے ہر چیز کو محیط ہے۔ تو

بعد اس کے غلطی کا باعث اگر ہو سکے ہے تو یہ ہو سکے ہے کہ کوئی چیز بیچ میں خدا کے اور خدا کے

معلومات کے حامل ہو جائے۔ سو اگر یہ احتمال ہے تو اس کا جواب تو کلام اللہ ہی میں بہت جگہ موجود

ہے بحن اقرب یعنی ہم سب زیادہ نزدیک ہیں یا شیعہ یوں تجویز فرمائیں کہ لغوز باللہ خداوند

کریم کے حوالے میں فتور ہے سوائی جرات شیعوں ہی کو ہے معہذا لا یخفے علی اللہ صر

شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَاءِ یعنی اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ

آسمان میں یہ بھی کلام اللہ ہی میں ہے کسی پنڈت کی پوکھٹی کی آیت نہیں
 عقیدہ خدا کے لئے جہل مرکب تجویز کرتا ہے [تیسرے یہ ہے کہ اکثر علماء شیعہ معقولات میں دخل
 در معقولات رکھتے ہیں مگر تیسرا اتنا نہیں سمجھتے کہ علم غلط حقیقت میں علم نہیں وہ اقسام جہل
 میں سے ہے اسی واسطے اس کو جہل مرکب کہتے ہیں اس اصطلاح کو منطق کے پھوٹے رسالہ
 پڑھنے والے تو درکنار ان پڑھے بھی سمجھتے ہیں۔ بلکہ زبان زد عام و خاص ہے کہ جہل مرکب تو جہل
 بسیط ہی بھلا! بانیہم جو یہ حضرات ذات والامفات جناب کبریائی کو جہل مرکب کا بیٹہ لگاتے ہیں۔ تو
 اول تو ان آیات مرقومہ پر خط نسخ کھینچنا پڑا سبحان اللہ خدا کے کلام کو بندے نسخ کریں
 اور وہ بھی اعتقادات میں کہ بالفاق شیعہ سنی بلکہ بالفاق عالم قابل نسخ ہی نہیں دوسرے خدا
 کجا جہل مرکب کجا خود باللہ من ہذہ الخرافات۔

عقیدہ بدستام موجودات کو ایک طرح خدا پر فیلیت دیتا ہے [تیسرے جمادات وغیرہ جن کو بالکل علم
 نہیں۔ بلکہ تمام موجودات ایک وجہ سے خدا سے افضل ٹھہرے کیونکہ کوئی ہو سوائے خدا
 کے سب میں کچھ نہ کچھ جہل بسیط ہے اور خدا میں جہل بسیط نہیں کیونکہ کلام اللہ کی آیات
 خود واضح ہو چکا کہ خدا کو سب چیز کی خبر ہے۔ سو وہ خبر اور وہ علم اگر غلط ہووے تو جہل مرکب ہوگا
 اور جہل مرکب سے جہل بسیط آخر افضل ہی ہے۔ تو سب مخلوقات ایک درجہ سے خدا سے افضل کج
 واہ سبحان کیا خدا کی قدر شناسی ہے۔

تمام عالم علم الہی کے محو اثبات کا دفتر ہی باقی کوئی ہم سے یوں پوچھے کہ وہ دفتر کونسا ہے جس میں محو
 اور اثبات ہوتا ہے تو گو ہمیں بعد اس کے کہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دفتر علم الہی کے علاوہ ہے
 کچھ اس کے جواب کی حاجت نہیں لیکن تسکین خاطر گردینی بھی اچھی ہوتی ہے اس لئے معروض
 خدمت ہے کہ ان امور کی حقیقت تو خدا ہی جانے یا جن کو وہ اطلاع کر دے مگر بطور امکان
 احتمال اس مقام میں ہمیں بیان کرنا لازم پڑا اس کم فہم کے فہم نارسا میں جو بمجہولت تقاریر بعض
 بزرگان آتا ہے تو یہ ہے کہ تمام عالم دفتر خداوندی ہے مگر اس میں سے بعض اشیاء کو بمنزلہ اوراق
 کے اور بعض کو بمنزلہ نقوش اور حروف کے سمجھئے۔

محو اثبات کی ایک تفہیمی تمثیل تفہیم کے لئے اول ایک مثال گوش گزار ہے موم یا گارے یا کسی اور

نرم چیز کو ہم کئی کئی شکل میں لا سکتے ہیں چاہیں اس کو گول بنالیں چاہیں چٹا ہلکا اس موم پر
ان اشکال میں سے ایک وقت میں ایک شکل آسکتی ہے دو مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ جب
دوسری شکل آئے گی پہلی مٹ جائے گی لیکن چونکہ اشکال تو ایک قسم کے نقش و نگار ہیں
تو ان کو تو بمنزلہ حروف اور نقوش سمجھے اور اس موم کو بمنزلہ اوراق سمجھئے۔ جب یہ مثال
ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ تمام اجسام میں تبدل اشکال اور کیفیات نظر آتا ہے زمین
سے جو کھیتی نکلتی ہے تو وہی اجزائے خالی ہوتے ہیں پر خدا کی نیرنگی سے ان کی شکل اول بدل
جاتی ہے پھر اس کھیتی کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے آخر رفتہ رفتہ وہی غذا جو حقیقت میں
اجزاء خالی ہیں شکل بدل کر غذا بن گئے ہیں۔ معدہ میں جا کر کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں اور پھر
لطفہ بن کے کچھ اور رنگ روپ پیدا کر لیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور اجسام میں دیکھ لیجئے گرمی
سردی وغیرہ جتنے تغیرات ہیں وہ سب اسی قسم کے ہیں۔

ایسے ہی ارواح میں طرح طرح کی کیفیات کا تبدل رہتا ہے ربخ خوشی خوف و امن
وغیرہ سو جو چیزیں کہ بدلتی رہتی ہیں ان کو تو اس دفتر خداوندی کے حروف اور نقوش سمجھئے
اور اجسام اور ارواح وغیرہ کو جو ان سب احوال میں بمنزلہ موم بجائے خود موجود رہتے ہیں اس
دفتر کے اوراق سمجھئے بعد اس کے یہ ذہن نشین لیجئے کہ جو جو اشکال معدوم ہو گئے وہ تو محو ہو گئے
اور جو ان کی جگہ قائم کئے گئے وہ اثبات اور مثبت ہو گئے۔ چنانچہ محاورہ دان فارسی اور عربی جانتے
ہیں کہ اثبات اور مثبت لکھنے کے موقع میں بولا کرتے ہیں۔

دیکھو آجل کتاب کی عجیب ترین مگر چونکہ ہر شکل کے لئے کچھ نہ کچھ زمانہ چاہیئے اور اس کی بقا کے
لئے زمانہ میں سے کچھ مقدار معین ہوتی ہے تو خداوند کریم نے ارشاد فرمایا دیکھو آجل کتاب
یعنی ہر زمانہ کے لئے جدا جدا نقوش ہیں جب ایک زمانہ ہو لیتا ہے اور دوسرے نقوش اور گھائے
اشکال اور کیفیات کی بہا آتی ہے اور ان کے زمانہ کی آمد ہوتی ہے تب پہلے نقوش کو مٹا دیتے
ہیں اور دوسرے زمانے کے مناسب نقوش ان اوراق میں لکھے جاتے ہیں مگر یہ وہ اوراق نہیں
کہ پہلے نقوش کے مٹانے سے بکڑ جائیں یا آلودہ ہو جائیں بلکہ جیسے دفتر میں یا سلیٹ کی تختی یا
لکڑی کی تختی پر جو چاہا لکھ دیا۔ پھر جب چاہا مٹا دیا اور اس کی جگہ اور لکھ دیا، ایسے ہی ان اوراق

میں جو چاہا لکھ دیا اور جب چاہا مٹا دیا۔

ام الکتاب کی توضیحی مثال | لیکن پہلے پچھلے سب نقوش کی نقل بلکہ اصل ایک بڑے دفتر اور بڑی کتاب میں ہے جیسے تحریر پڑھنے والے جس شکل کو پڑھتے جاتے ہیں سلیٹ پر کھینچ کھینچ سمجھتے جاتے ہیں، اور جب سمجھ لیتے ہیں اور دوسری شکل کے سمجھنے کی نوبت آتی ہے، پہلی کو مٹا دیتے ہیں اور دوسری کھینچ لیتے ہیں اور بائیں ہمہ ان سب کی نقل بلکہ اصل تحریر اقلیدس میں موجود ہے۔ باقی ربط اس آیت کا اپنے مقابل سے اس صورت میں یہ ہو گا کہ کسی نبی سے کیونکر ہو سکے کہ اپنے آپ کوئی آیت لے آئے، ہمارے یہاں تو ہر زمانے کے لئے نقوش مقرر ہیں گئے چنے ہوئے رکھے ہیں۔ اس میں کمی بیشی کب ہو سکتی ہے جو کوئی اپنی طرف سے اس میں اپنی خواہش کیونکر اس آیت کا نقش بھی رلا دے؟

محو اثبات علم الہی میں نہیں لہذا بدیہ کی گنجائش بھی نہیں | اب اس تقریر کو اہل انصاف غور فرمائیں کہ کسی برجستہ ہے اور پھر بائیں ہمہ اس میں کہیں اس کی گنجائش نہیں کہ قائلین بدیہ انگشت رکھ سکیں یا تمسک کر سکیں پھر کوئی کیونکر کہہ دے کہ آیت میں محو اثبات کا ذکر ہے تو علم الہی میں محو اثبات ہوتا ہو گا مگر جو بات اپنے ذہن میں جمی ہوئی ہوتی ہے اسی کی طرف ذہن دوڑا کر لے بھوکے کے نزدیک دو اور دو چار روٹیاں ہی ہوتی ہیں اور اگر اس تقریر کو سن کر کسی کے یوں کان کھڑے ہوں کہ مشہور تو یوں سنا تھا کہ لِكُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ سے جو لکھنا نکلتا ہے تو یہی لکھنا ہے جسے عرف میں لکھنا کہتے ہیں سو وہ تو کسی کلام اور الفاظ کے مقابلہ میں جو حروف اور نقوش ہوتے ہیں ان کے لئے ہوتا ہے تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ حق بات چاہے مشہور ہو کہ نہ ہو ہاں اگر یہ معنی چسپاں نہ ہوں تو جب ہی کہو۔

ام الکتاب اور محو اثبات کی ایک اور مثال | معجزاً جیسے اور صاحبوں کی مرضی ہم بھی اسی راہ چلتے ہیں دو کا نڈاروں کے یہاں اکثروں نے دیکھا ہو گا کہ روزمرہ کی برداشت کو سختی پر لکھتے جاتے ہیں بعد ازاں یہی نقل کر کے سختی کو دھو لیتے ہیں اور پھر دوسرے دن کی برداشت اسی سختی پر لکھنی شروع کر دیتے ہیں سو روزیہ لکھنا اور مٹانا رہتا ہے اور تیسرا ایک ہی وہ ایسی ہے کہ اس میں تمام ایام کی برداشت کی تفصیل تاریخ وار درج ہے کہ اس میں بجز لکھنے کے مٹانے کا اتفاق نہیں ہوتا سو ایسا ہی جناب باری تعالیٰ کے کارخانہ قدرت میں سمجھ لیجئے جیسے یہاں روزمرہ کی برداشت

تختی پر لکھتے ہیں۔ وہاں قرن وار کسی لوح پر ایک تحریر ہوتی تھی اور پھر اس کو اس لوح سے مٹا کر بڑی کتاب میں کہ اس کو اُم الکتاب کہتے ہوں رچ کر دیتے ہوں بعد ازاں پھر دوسرے قرن کا حساب کتاب لکھنا شروع کر دیتے ہوں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن کا حساب کتاب ایک لوح پر لکھ کے اس کو کسی بڑی لوح میں نقل کر دیا ہو پھر اس لوح سے اس تحریر کو مٹا کر صحابہ کے قرن کا حساب کتاب لکھ کر اسی طرح لوح کلاں میں درج کر دیا ہو اسی طرح یہ محو اثبات ہمیشہ ہوتا ہو مگر سب جانتے ہیں کہ یہ محو اثبات بوجہ غلطی تحریر نہیں کہ جس کے اثبات ہو جائے۔

محو اثبات بالفرض احکام میں بھی ہو تو خداقت ہے بدائیں | اور سلنا کہ یہ بھی نہ سہی بلکہ حکم احکام کے تبدیل و تغیر کے باعث یہ محو اثبات ہوتا ہو تب بھی تو مقتدایان شیعہ کا دعوائے ثابت نہیں ہو سکتا تصویر اگر مطلوب ہے تو اس کی یہ صورت ہے کہ بیمار اگر طبیب کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کے لئے موافق قواعد طب کے مثلاً منصفیج تجویز کرتا ہے جب اس کی میعاد پوری ہو لیتی ہے تو انہی دواؤں میں سے بعض دواؤں کو کاٹ دیتا ہے اور سنا وغیرہ بڑھاتا ہے اور بعد اس کے تبرید کا نسخہ لکھتا ہے اور پھر مقویات تجویز کرتا ہے تو اس صورت میں جو کچھ طبیب تجویز کرتا ہے وہ سب کتب طب کے موافق ہوتا ہے۔ اور منصفیج اور مسہل اور تبرید اور مقویات کی جو تبدیلی کرتا ہے تو وہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ پہلی تجویز میں کچھ غلطی ہو گئی تھی بلکہ عین فہم و خوبی طبابت یہی ہے کہ اپنے اپنے وقت پر منصفیج اور مسہل اور تبرید کا استعمال ہوا کرے۔

سو جیسے یہ قصہ ہے ایسا ہی کارخانہ قدرت کا کارخانہ سمجھئے۔ جناب باری تعالیٰ کو جو حکم مطلق ہے بجائے طبیب حاذق خیال فرمائیے اور ام الکتاب کو بجائے کتب طب قرار دیجئے اور اس کتاب کو جو لکھل آجل کتاب میں ہے یعنی ہر مدت کی جدا جدا کتاب کو بمنزلہ نسخہ منصفیج اور مسہل رکھئے اور فرشتوں کو تمہارا دار اور مجموعہ عالم کو جو اصطلاح محققین میں مسمیٰ بہ شخص اکبر ہے بیمار فرض کیجئے اور محو اثبات کو ایسا سمجھئے جیسا منصفیج کی جگہ مسہل بدلتے ہیں اور مسہل کی جگہ تبرید ہو اس تبدیلی کو بد مصطلح شیعہ سمجھنا کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے ہاں اگر یہ تبدیلی اس قسم کی ہوتی۔ جیسے تشخیص کی غلطی سے اول کچھ تجویز کیا تھا پھر کچھ سمجھ میں آیا البتہ ایک موقع تھا لیکن لکھل آجل کتاب اس بات کو چاہتا ہے کہ مدت وار جدا جدا تحریریں ہوتی ہیں اور وہ تبدیلی

بوجہ تبدیلی مدت ہے بوجہ غلطی بخونہ نہیں۔

القصد یہ تینوں تقریریں جو مذکور ہوئیں ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہے اور بعد ملاحظہ آن
تقریرات کے مدعیان بدعا کا حوصلہ معلوم نہیں ہوتا کہ پھر اس آیت کی طرف منہ کر کے بھی سوویں
یا اس آیت سے تمسک کا نام بھی لیں مگر جس کے دل میں انصاف نہ ہو اس کے آگے حق بات کا بیان
کرنا بھی لا حاصل خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے جو اس پر بھی نہ سمجھے اسے خدا سمجھے۔

عقیدہ بدعت پر تیسرا استدلال | اور بعض علماء شیعہ کو بدعت کی حقیقت پر ایک اور نئی دلیل سوجھی ہے
آیت وَرَاعِدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَمْنَا هَا بَعْثْنَا الْخَلْقَ سے بدعت کی حقیقت پر استدلال
لاتے ہیں تفصیل اس اجمال کی سنئے، ہم سناتے ہیں حاصل اس آیت کرمیہ کا اول معروض ہے
وہ یہ ہے کہ ”وعدہ ٹہرایا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا، اور پورا کیا ہم نے اس مدت کو ایک عشرہ
اور بڑھا کر سو پورا ہو گیا وقت اس کے رب کا چالیس راتیں انتہے۔“

اب تقریر استدلال سنئے اول تو جناب باری نے تیس شب کی محنت پر تو رات کا
وعدہ کیا پھر تیس رات کے مجاہدہ پر تو رات عطا نہ ہوئی بلکہ فرماتے ہیں کہ تیس رات کے بعد دس
روز اور بڑھا دیئے۔ سبب اس زیادتی کا بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس رات کی
خلوت پر تو رات کا عطا ہونا خلاف مصلحت معلوم ہو یا یہ کثیر اجرت اس قلیل مدت پر مانا یا نظر الی
تعظیم اجرت کے لئے مدت اور بڑھائی۔ سو اگر خدا ہی کو یہ بات پہلے سے سوجھی نہ تھی تب تو بدعا کا
ثبوت موافق اصطلاح متقدمین ظاہر ہے ورنہ اس سے تو کم بھی نہیں کہ خداوند علیم تو جاننا
تھا پر حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو کچھ کا کچھ بتلا دیا۔ سو اس بات میں اور اس بات میں گو
زمین و آسمان کا تفاوت ہے پر ہمارے حق میں جیسا بدعت حسب اصطلاح متقدمین ویسا ہی
تو رب العالمین، نہ اس صورت میں خدا کے کلام پر اعتماد نہ اس صورت میں کلام ربانی قابل
استناد، پھر اگر فضائل صحابہ وغیرہ معتقدات اہل سنت پر کلام ربانی شاید بھی ہو تو کیا ہونا ایک
ربانی بات ہے قابل التفات نہیں۔

جواب | مگر کوئی سمجھا رہا ہو تو ہم بھی اسے چھی میں اس کا جواب لئے بیٹھے ہیں غلطی یا غلط گوئی
متکلم اور ہے اور غلط نہیں مخاطب اور، حضرات شیعہ اپنی غلطی نہی سے اپنی غلطی کو غلطی یا غلط

گوئی خداوندی سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ غلط فہمی اپنی سمجھ کا قصور ہے خداوند علیم کا اس میں کیا قصور؟ یہ سب جانتے ہیں کہ جناب باری نے اس قصہ کو مختصر بیان فرمایا ہے۔ روزوں کا اس میں ذکر نہیں مسواک کا اس جگہ مذکور نہیں سو جیسا روزوں کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ حدیث و تفسیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فقط تیس دن رات مقصود نہ تھے بلکہ اتنے دنوں صائم رہنا مطلوب تھا۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ بعض اور شرائط بھی ہوں کہ ان کا ذکر نہیں فرمایا منجملہ ان کے مسواک کا کرنا بھی ہو اور اگر فرض کیجئے روایات سے ثابت ہو جائے کہ تو رات کی اجرت میں فقط تیس دن کے روزے ہی ٹھہرے تھے اور سو اس کے اور کوئی بات مشروط نہ ہوئی تھی تو قطع نظر اس کے کہ اس امر کا ثبوت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے فقط عدم ثبوت نکلے تو نکلے ثبوت عدم محال نظر آتا ہے۔

جواب کی ایک توضیحی مثال | ہم کہتے ہیں کہ بہت سے ایسے شرائط ہوتے ہیں کہ وقت تقریر اجرت ان کا ذکر نہیں آتا ان کا معروف ہونا کافی ہو جاتا ہے۔ کچھری یا فوج کے ملازموں کو دیکھئے۔ کہ لباس خاص اور اکرام حکام اور تقدیم تسلیم کا وقت تقریر ان سے کوئی مذکور نہیں کرتا بایں ہمہ ان امور کے ترک پر ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے جرمانہ لیا جاتا ہے تاوان لیتے ہیں سزا دیتے ہیں اور اگر ملازمان بادشاہی کی بات بایں وجہ قابل قیاس نہ ہو کہ ان سے تو اصل کار اور اجرت کی مقدار کا بھی ذکر نہیں آتا۔ ایک بات معین ہوتی ہے جس سے ہر عام و خاص جانتا ہے، علیٰ ہذا القیاس اور امور بالائی مثل لباس وغیرہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس حساب سے ان کا حال مثل اصل امر رہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو ہمارے اور بھی مفید مطلب ہے۔ کیوں کہ جب شہرت کے سامنے تمام امور کے ذکر کی حاجت نہیں تو بعض امور کے مذکور ہونے کی تو بشرط شہرت لاجرم حاجت نہ ہوگی۔

دوسری توضیحی مثال | معہذا یہ مثال نا پسند ہے تو اور مثال لیجئے گھوڑے کو کہیں جانے کے لئے کرایہ کرتے ہیں تو چار جامہ پوری لکام رکاب وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا بایں ہمہ اگر گھوڑے والا گھوڑے کے ساتھ یہ چیزیں حوالہ نہیں کرتا تو کرایہ لے جانے والا کیسا کچھ لڑتا جھگڑتا ہے اور بن پڑتا ہے تو کرایہ میں سے بھی کچھ نہ کچھ کتر لیتا ہے۔ ایسے ہی اگر مابین بندگان خاص خداوندی

خصوصاً انبیاء اور جناب باری کچھ قوانین ادب مقرر ہوں اور بندگان خاص کے نزدیک مشہور معروف ہوں اور اس کے ترک پر اگرچہ ذکر نہ آئے مواخذہ ہو تو عین حق اور عین صواب ہے مگر اس کو بد نہ کہہ سکتے، بد کہنا جب مناسب ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو ہرگز اس کی اطلاع نہ ہو اور در صورتیکہ اس کی اطلاع ہو اور فقط بمقتضا بشریت ان سے خطا ہو جائے تو پھر بد کہنا۔

دوسرا جواب اور یہ بھی نفسی کلام اللہ سے فقط اتنا اثبات ہوتا ہے کہ تیس دن کے مجاہدہ پر تورات کا عطا ہونا ٹھیک تھا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک ماہ کا کسی کا کچھ مشاہرہ مقرر کر دیں جو جیسے ایک ماہ کی تنخواہ کے یہ معنی ہیں کہ ایک مہینے کی یہ مزدوری ہوئی۔ خواہ تیسویں دن ملے خواہ دس دن بعد ایسے ہی تیس رات دن کے مجاہدہ پر تورات کے عطا ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تیس دن کے مجاہدہ کا یہ ثمرہ اور یہ پھل ہے خواہ تیسویں دن ملی ہو یا دس دن بعد باقی رہی دس روز زیادہ کی محنت کی وجہ اس کا بیان ہمارے ذمہ ضرور نہیں۔

دفعہ توہم اور اگر کوئی نادان لفظ اتمنا سے دس رات کا بہ نسبت تیس رات کے تتمہ ہونا سمجھ کر الجھنے کو تیار ہو تو اس کا جواب بھی لیجئے سنن و اوافل کا بہ نسبت فرائض کے متمم ہونا اور علیٰ ہذا التیاس صدقۃ الفطر کا بہ نسبت صیام رمضان کے متمم ہونا احادیث صحیحہ سے ظاہر و باہر ہے مگر کسی کے نزدیک اس کے یہ معنی نہیں کہ فرائض پنجگانہ کی مقدار بہ نسبت زمانہ سابق کے زیادہ کی گئی بلکہ یہ معنی ہیں کہ بمقتضا بشریت ہر عمل میں کچھ نہ کچھ قصور رہا جاتا ہے کتنا ہی اہتمام کیوں نہ کرو۔ اس صورت میں مقدار اصلی خدا کے نزدیک بھی اور بندوں کے علم میں بھی وہی رہی اور یہ سب اوپر کا بکھڑا از قبیل قضا و مافات اور جبر نقصان اور مکافات تقصیرات ہے سو ایسے ہی ان دس دن کو سمجھئے بلکہ لفظ اتمنا ہی خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دس دن کی محنت از قبیل جبر نقصان ہے ورنہ میعاد اصلی وہی تیس دن تھے اگر ان تیس رات کا مجاہدہ بہم وجوہ قابل پسند ہوتا۔ اور بمقتضائے بشریت جس سے سب ناچار ہیں بنی ہو یا ولی ہو۔ چنانچہ واقف کار واقف ہیں کوئی قصور تصور عارض حال موسمی نہ ہوتا۔ تو جناب باری تعالیٰ کی طرف سے اور دس دن کا مطالبہ نہ ہوتا۔

لفظ میقات کی تفسیر باقی رہا لفظ میقات ربہ کا اس بات پر دلالت کرنا کہ میعاد اصلی چالیس تین

تھیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ بازار خداوندی میں ہر عمل کی ایک اجر تہ ہے اور ہر اجرت کے لئے ایک محنت معین ہے کلام اللہ حدیث اس کے گواہ ہیں فضائل عظیمہ مثل حصول تورات وغیرہ کا نرخ چالیس رات کی محنت اصل سے مقرر ہو مگر کمال جود اور عموم رحمت کے باعث حضرت موسیٰ علیہ وعلی نبینا السلام کے لئے دس دن یعنی تہائی محنت کی تخفیف کی گئی ہو جیسے اس امت کے عوام کے لئے نوح صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت کی تخفیف کی گئی مجاور نہ ہو تو اس آیت کو دیکھئے

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا یعنی جو ایک نیکی لائے گا دس گنا ثواب پائیگا سو دس گنا تو جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک نیکی کے عوض دس نیکیوں کا ثواب ملے پھر جب ایک ہی نیکی پر دس نیکیوں کا ثواب ملا تو نوح صلی اللہ علیہ وسلم کی تخفیف آپ کل انی آیات اور احادیث میں اس مضمون کے اور بھی بہت شواہد ہیں پھر بعض آیات و احادیث لکھی ہیں جن سے اس سے زیادہ تخفیف بھی بعض بعض افراد کے لئے ثابت ہوتی ہے، باندیشہ تطویل تفصیل سے معذور ہوں۔

غرض یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے لئے بحکم عنایت قدیمانہ دس دن کی تخفیف ہوئی ہو پر بمقتضائے بشریت حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام سے یہ عمل ایسا کامل بن پڑا جیسا تورات کے معاوضہ کے لئے بکار تھا بلکہ کچھ نقصان نکلا جس کی مکافات ورتلانی دس دن کی خلوت و مجاہدہ سے ہو سکی، اس لئے بنظر رحمت خاصہ حضرت موسیٰ کی تیس دن کی محنت کو رد تو نہ کیا۔ اگرچہ رد کرنے کا موقع تھا ہاں دس دن کی اور ہدایت فرمائی تاکہ کامیاب جائیں اور غیروں کے سامنے ندامت نہ اٹھائیں۔ جب اس طریقہ سے وہی چالیس دن آپڑے تو جناب باری نے بھی یہ ارشاد فرمایا فَتَمَّ مِثْقَاتُ رَبِّهِ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً یعنی پس تمام ہو گئی وہی چالیس راتیں جو اس کے رب کا میقات تھا، یعنی وہ وقت جو ایسی نعمتوں کے لئے اس نے مقرر کر رکھا تھا۔ سو انجام کار وہی پورا ہوا۔

تیسرا جواب یا یوں کہیے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بذات خود قابل اہتمام اور شایان تاکید ملک علام نہیں ہوتیں، پر کسی بندہ خاص سے جو ایک وقت خاص اور ساعت اخلاص میں بضرورت کسی امر عارضی کے ظاہر ہوتی ہیں تو جناب باری بروئے کمال بندہ پروری اور غلام

نوازی اس عمل کو ایسا قبول کرتا ہے کہ اس کو داخل عبادات خاصہ گردیتا ہے اور پھر ہر خاص و عام سے اس کے کرنے نہ کرنے کا حساب لیتا ہے تاکہ خدا کی قدر شناسی اور اس بندہ کی رفعت و قدر معلوم ہو جائے مثال اس کی اگر مطلوب ہے تو حضرت ہاجرہ کا صفامروہ کے بیچ دوڑنا اور اس سبب سے اس سعی کا داخل سنن یا واجبات حج ہو جانا حالانکہ عقل سلیم کو اس فعل میں کوئی مضمون بعد کا نظر نہیں آتا سبک سنا ہوا قصہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر چالیس رات کی مقدار اول سے خداوند علیم کے نزدیک قابل اہتمام نہ ہو بلکہ اس وقت تک وہی تیس رات کی مقدار مہتمم بالشان ہو مگر چونکہ بندہ خاص سر پر اختصاص حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ بنینا الصلوٰۃ والسلام سے ایک وقت خاص میں جس کا مذکور ہے چالیس رات کا مجاہدہ بضرورت معلوم ظہور میں آیا تو بوجہ کمال اخلاص حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب باری نے اس عمل کو ایسا قبول فرمایا کہ آئندہ سے فضائل جلیلہ کی تحصیل کے لئے عدد اربعین ہی مقرر ہو گیا اور جب اس وجہ سے یہ عدد مہتمم بالشان ٹھہرا تو جناب باری عز اسمہ کے اس قول کے فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ یہ معنی ہوئے کہ ہر چند ایسی نعمتوں کے لئے اصل میں وہی تیس راتیں تھیں لیکن چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بضرورت معلوم حالت اخلاص میں چالیس رات کا مجاہدہ ظہور میں آیا تو خداوند کریم نے اس عمل کو ان کے اخلاص کے باعث ایسا قبول فرمایا کہ اب سے تقرب بارگاہ خداوندی کے لئے پوری چالیس شب و روز کی خلوت مقرر ہو گئی چونکہ پہلی تقریر اور اس تقریر میں فرق ظاہر ہے ان دونوں کے بیان فرق سے معذور ہوں۔

براکیلیے کذب لازم ہوا نتیجہ اس طول بیانی کا عرض کرنا پڑا اس لئے سامع خراش اہل انصاف ہوں کہ ہذا کا ثبوت اس آیت سے جب ہو سکتا ہے کہ یا تو جناب علام الغیوب ہی نے پہلے سے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ بعد مرور تیس شب کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کریں گے اور جب تک ہرگز چالیس رات کی تاخیر کا دھیان نہ تھا اتفاق سے کسی مصلحت تازہ کے باعث ارادہ سابق سے پلٹ گئے اور تیس رات کے بدلے چالیس رات کے بعد عطا فرمائی یا جناب باری عالم الغیب والشہادۃ کے علم و ارادہ میں تو یہی تھا کہ بعد انقضاء مدت چہل شب عطا

تورات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مشرف ہوں۔ مگر عہدِ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب کے بعد تورات کے عطا ہونے کی خبر دی حضرت موسیٰ علیہ السلام باعتماد صدق خبر خداوندی یہی سمجھتے رہے کہ لاجرم بعد مورتیس شب کے تورات عطا ہوگی مگر چونکہ مد نظر خداوندی کچھ اور تھا تورات کی بات چالیس رات پر جا پڑی۔

اس صورت میں گو صفت علم خداوندی اور صفت ارادہ عیب و نقصان سے منزہ رہے پر کلام خداوندی میں دروغ کا بٹہ لگا یہ اس واسطے جتلا یا کہ بعض محققان شیعہ بیاس عصمت صفت علم و ارادہ بے ادراکی تقریر کچھ ایسی ہی کرتے ہیں جس سے نقصان و عیب جو کچھ ہو اخبار تک رہے علم و ارادہ تک نہ پہنچے، پر جو لوگ خدا کی عظمت و جلال کو کسی قدر سمجھتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ خداوند عظیم الشان کی کوئی صفت کیوں نہ ہو عیب و نقصان سے مبتلا ہے۔ محقق مذکور نے بزعم خود اچھی روش اختیار کی تھی اور صفت علم و ارادہ کو نقصان سے بچا کر یوں خوش تھے کہ اہل سنت سے دامن چھڑا لیا پر یہ نہ سمجھے کہ یہ صفتیں اگر منزہ رہیں تو کیا ہوا ایک اور صفت میں نقصان لازم آیا۔

آرے دروغ گو را حافظہ نباشد

مخاطب کی غلط فہمی سے علم خداوندی میں بدائیات نہیں ہو سکتا بہر حال یہ دو صورتیں بے ثبوت کی تھیں اور در صورتیکہ یہ دونوں صورتیں نہوں بلکہ شکل عقد اجارہ اور تعلیق شرط و جزا ہو تو اگر بوجہ عدم وقوع شرط جزا ظہور میں نہ آئی اور بہ سبب ناپسندی عمل اجرت نہ ملی تو اس میں خدا کی جانب کو نسا قصور عائد ہوتا ہے جو بے ثبوت کی گنجائش ملے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام غلطی فہم کے باعث جس سے انبیاء معصومین بھی معصوم نہیں اگر کچھ کا کچھ سمجھ جائیں تو ہم تو نہیں کہہ سکتے یہ ان کا قصور ہے مگر اس کو بے ثبوت سے کیا علاقہ، ایسے بے ثبوت کے تو خود اہل سنت جو بے ثبوت کے بغایت منکر ہیں بکثرت قائل ہیں اختلاف آئمہ جو لاجرم ایک نہ ایک کی غلط فہمی کو مستلزم ہے ان کے نزدیک رحمت عظمیٰ ہے بالجملہ بے ثبوت کی حقیقت یہ ہے کہ متکلم یعنی جنابِ ربی خود غلط سمجھے جیسے متقدمین شیعہ کی رائے معلوم ہوتی ہے یا عہدِ غلط کہدی جیسے بعض محققین زمانہ تاویل کرتے ہیں نہ یہ کہ مخاطب یعنی انبیاء یا علماء وغیرہم اپنے قصور فہم سے

کچھ کا کچھ سمجھ جائیں اس کو غلطی اجتہاد اور غلطی فہم اور قصور فہم کہتے ہیں بد کو اس سے کچھ
علاقہ نہیں ہاں کوئی قاصر الفہم اگر اس کو بد سمجھ جائے تو تا دم وضوح حق گو نہ معذور ہے گو
ایسی باتوں میں عذر حیل مقبول نہیں اور بعد وضوح حق اور اتمام حجت پھر یہ قصور اعلیٰ
درجہ کا قصور ہے نعوذ باللہ من سوء الفہم۔

مگر ناظرین تقریر لہذا کو اس قدر یاد رہے کہ غلطی اجتہاد کی گنجائش اگر ہے تو ماسوا،
محکم اور عبارت النص میں عجمت النص اور محکم میں اہل فہم نہیں بہکتے جو اس میں بھی خطا کرے
وہ جاہل ہے عالم نہیں سو تلاوت کرنے والے کلام اللہ کے خود جانتے ہیں کہ آیات فضائل صحابہ
در باب فضیلت صحابہ محکم اور عبارت النص میں کہ نہیں ؟۔

آیہ میقات کی دو دیگر تفسیریں اور بد کا استیصال اگر کوئی اب بھی نہ سمجھے تو اس کو خدا سمجھے پر نقل
مشہور ہے جیسے کو تیسرا ایسے نادانوں کا یہ علاج ہے کہ یوں کہا جائے ثلثین لیلۃ یا مفعول بہ
چنانچہ ظاہر ہے یا مفعول فیہ اگر مفعول بہ ہے تو قدر موعود تو وہی تیس راتیں تھیں اور مطلب
تھا کہ تم طور پر آنا۔ اپنا ایک خاص کام یعنی تیس رات کی عبادت جو اہل عقل کے نزدیک اس سے
بڑھ کر کوئی نعمت نہیں تم سے لیں گے سو اس وعدہ کو پورا فرمایا اور پھر مقتضائے کرم خداوندی
دس دن کا اور اضافہ فرمایا سورہ از قبیل لَدُنَّیْنِیْد ہے اور اس نعمت اول کی اس کو روکن
سمجھنا چاہیے۔ جب عوام امت محمدی کو نو لو گنی اصل سے روکن ملتی ہو اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام
کو ایک تہائی روکن مل گئی تو شیعوں کو آٹنا برا کیوں معلوم ہوتا ہے اس صورت میں تورات کو
اس وعدہ سے کچھ علاقہ نہیں یا تو وہ از قسم وعدہ و عید ہی نہ ہو بلکہ از قبیل لَدُنَّیْنِیْد
ہو یا موعود تو ہو پر بالا استقلال موعود ہو تیس رات کی محنت کا بطور تعلیق و شرط موعود نہ ہو،

بالجملہ آیت سے اس صورت میں اگر ثابت ہوگا۔ تو تیس رات کی عبادت کا موعود ہونا
ثابت ہوگا تورات کا موعود ہونا جس پر مدار کا اثبات بدلتا تھا ہرگز ثابت نہ ہوگا اور اگر مفعول
فیہ ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ تیس راتوں تک وعدہ ہوتا رہا، باقی رہا موعود کیا ہے اس کے بیان
سے یہ آیت ساکت ہے اگر امر موعود عطاء تورات تھا تب کچھ نقصان نہیں اور اگر امر دیگر تھا تب
کچھ خلجان نہیں اول تیس رات تک یہ بشارت آتی رہی جب بایں لحاظ کہ ایک مہینے کی مقدار

بنی آدم میں ایک مقدار کثیر ہے اسی سبب اکثر معاملات، اجرت اس پر منعقد ہوتے ہیں اس قدر بشارت سے تسلی ہو گئی تب مزید اطمینان کے لئے چلہ پورا کیا اور اسی واسطے ایک بار ہی واعدا ناموسی اربعین لیلۃ ہکمر خاتمہ نہ کر دیا بلکہ ثلاثین لیلۃ ہکمر واثمناہ العشر فرمایا ہر حال مطلب ہو کہ دونوں صورتوں میں یہ نہیں کہ کسی امر کے لئے اول کچھ ایک مدت مقرر فرمائی۔ پھر وقت پر اور مدت کام میں آئی جو بدل کے لئے دست آورند مہرب حق سے جائے گمیر ہو چنانچہ ظاہر ہے مگر دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ یہ تقریر اخیر موافق مثل مشہور جواب ترکی بہ ترکی اہل جہل کے مقابلہ میں بطور مجادلہ لکھی گئی ہے ورنہ طالبان حق کے لئے یہی حق و باطل خود ظاہر ہے۔

خاتمہ مباحث بدلا اب اس قدر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ شیعہ بدل کے وقوع کے مدعی تھے اور یہ آیت برعم خود انہوں نے دلیل دعوائے سمجھ رکھی تھی اور یہ سب اہل فہم جانتے ہیں کہ مدعی کے لئے دلیل ایسی چاہیے جس میں خلاف دعوائے اور کوئی احتمال نہ ہو اور جو کوئی احتمال خلاف دعوائے اس دلیل سے سمجھ میں آتا ہو اور پھر وہ احتمال بھی ایسا کہ بہ نسبت دعوائے مدعی کے زیادہ چسپاں بلکہ عین مفہوم مطابق ہو اور باس ہمہ اور دلائل اس کے مثبت ہوں اور دعوائے مدعی کو رد کرتے ہوں۔ تو اہل عقل پھر یہ گز اس دعوائے کو قبول نہ کریں گے اور حق نہ سمجھیں گے، بلکہ حق اس دوسرے ہی احتمال کو سمجھیں گے، سو یہاں بعینہ یہی صورت ہے۔ چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گی۔

جب بدل کے ابطال سے بفضلہ تعالیٰ فراغت پائی تو ہم اپنی طرف سے ان لوگوں کے غدر کا جواب دے چکے جو خلفاء ثلاثہ اور باقی مہاجرین اور انصار کی بزرگی کے باوجود یکہ کلام اللہ میں ان کی بزرگیاں مذکور ہیں اور ان کے لئے بڑے بڑے وعدہ کئے ہیں اس غدر سے قائل نہیں ہوتے تھے کہ شاید خدا کو یہ واقعہ ہوا ہو اور یہ سارے وعدے اور سب ان کی تعریفیں غلطی سے اول ظہور میں آئی ہوں اور پھر بعد میں حقیقت الامر صحابہ کی جناب باری تعالیٰ کو معلوم ہو گئی ہو اور بروئے انصاف اب ہمارے ذمے یہ واجب نہیں کہ الممۃ کے اقوال سے ان کو تسلی کر دیں۔

بد کے ضمن میں ائمہ کے علم غیب پر بحث اور اگر ہم اس پر بھی خاک ڈالیں تو یہ بات کیونکر سنی جائے کہ ائمہ کو ماکان و مایکون کا علم تھا اس لئے اگر ان کے اقوال سے خلفاء یا اصحاب کی بزرگی ثابت ہو جائے تو پھر کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ سبحان اللہ خدا کے کہے سے تو تسلی نہ ہو اور اماموں کے فرمانے پر قرار آجائے اول تو صدہا آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سوا جناب باری تعالیٰ کسی کو علم غیب نہیں برائے تسکین دو تین آیتیں لکھنی ضرور پڑیں۔

مَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّا ذَا تَأْتِي بِهَا خَبْرٌ - یعنی نہیں جانتا کوئی کہ کل کو کیا کرے گا۔ اس آیت میں کسی کا استثناء نہیں سب کو امام ہو یا غیر امام برابر فرماتے ہیں کہ کل کی خبر نہیں رکھتے۔

فَلَا يَخْلَعُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ غِيبًا إِلَّا اللَّهُ - کہدے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں جانتے زمین و آسمان والے غیب کو مگر اللہ جانتا ہے۔

ماکان ویکون تسلیم کرنے میں مساوات لازم ہے اور اگر اس صورت میں خدا کے علم میں اور ائمہ کے علم میں مساوات لازم آئے گی حالانکہ جناب باری تعالیٰ سورہ یوسف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ یعنی ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے اور اگر کوئی یو کہے کہ اگر اس آیت سے استدلال کرتے ہو تو اس آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی علم والا ہے کیونکہ اس آیت میں کلیتہً فرمادیا ہے کہ خدا اور غیر خدا کی تخصیص نہیں کی تو یہ بات اول تو اہل فہم کے نزدیک قابل جواب نہیں اور جواب کے قابل بھی ہے تو اس جواب کے کہ یوں کہا جائے۔ ع

برین فہم و دانش ببايد گريست

کون نہیں جانتا کہ ایسے مقامات میں جناب باری تعالیٰ باستثناء عقلی مستثنیٰ ہو کرتا ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ سے کسی نادان کو بھی آج تک یہ شبہ نہیں پڑا کہ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہو تو اپنے معدوم کر دینے یا اپنے شریک کے پیدا کر دینے پر بھی قادر ہوگا۔ اتنا ہر کوئی سمجھ لیتا ہے کہ انبیاء اور اماموں کے پیدا کرنے اور معدوم کر دینے پر دونوں پر قادر ہے ایسے ہی فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ سے جاہل سا جاہل بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی عالم ہوگا پھر اگر کوئی اس تسم کی گفتگو کرے تو بجز تعصب اور

ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں کہا جاتا۔

ایک عجیب تفسیری لطیفہ | معنہ ذی علم کے لفظ میں ایک اشارہ لطیف اس بات کے جواب کی طرف بھی ہے جیسے اِنَّ اللہَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں جو لفظ شے ہے اس میں ایک اشارہ لطیف خدشہ مذکور کے جواب کی طرف ہی بیان اس کا یہ ہے کہ ذی علم اور علیم ہر چند بظاہر دونوں لفظ ہم معنی ہیں لیکن ذی علم میں ایک گونہ اتنی بات نکلتی ہے کہ غیر ذات ہے کیونکہ اضافت بالانفاق تغائر پر دلالت کرتی ہے بخلاف علیم کے کہ اُس میں یہ بات نہیں۔ سو چونکہ خدا کا علم غیر ذات نہیں بالاجماع خصوصاً شیعہ کے نزدیک تو اس کو ذی علم کہنا مناسب نہیں بلکہ علیم کہنا چاہیے جیسے کہ شے اسے کہنا چاہیے جو مشیت کے تلے داخل ہو اور ذات خداوندی مشیت کے تلے داخل نہیں بلکہ معاملہ بالعکس ہے القصد جیسے خداوند کریم مشیت کے تلے داخل ہی نہیں جو اشیاء میں محدود ہو اور قدرت کے تصرفات اس پر چل سکیں، ایسے ہی خداوند کریم ذی علم میں داخل ہی نہیں جو اُس سے اوپر کوئی علیم ہوگا۔

الحاصل علم میں کوئی خدا کے ہم پلہ نہیں جیسے وہ ذات میں یکتا ہے ویسے ہی صفات میں یکتا ہے نہ انبیاء اس کے علم میں برابر ہیں نہ امام نہ ملک نہ جن نہ خواص نہ عوام اس عقیدہ میں شیعوں کا بعینہ ایسا غلو ہے جیسا نصاریٰ کا حضرت عیسیٰ کی بزرگی میں قدم حد سے بڑھ گیا ہے اور وہ تشبیہ جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ سے دی اور یوں فرمایا ہے کہ تیری مثال ایسی ہے جیسے حضرت عیسیٰ کی مثال کہ ایک فرقہ ان کی محبت میں ہلاک ہوا اور ایک ان کے بغض میں۔ وہ تشبیہ اور تمثیل سب بجا اور درست نکلی کہ خوارج نے جو بغض لیا تو روافض نے وہ محبت لی کہ جس سے حضرت امیر کو انبیاء سے تو بڑھایا ہی تھا خدا تک پہنچا دیا بلکہ انہوں نے لَدُنْیَا هُنْیْد کا کام کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فقط حضرت امیر ہی کی نسبت یہ فرمایا تھا حضرت شیعہ نے آپ کے فرمانے کی ایسی تصدیق کی کہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر دکھلایا خوارج سے تصدیق نبوی میں وہ کارگزاری نہیں بن پڑی تھی جو شیعہ سے بن پڑی القصد خوارج سے حضرات ائمہ کے باب میں وہ تفریط نہ ہوئی۔ جو شیعوں سے افراط ہوئی اور کسی نے سچ کہا ہے دشمن دانا بہتر از نادان دوست،

بالفرض اگر علوم غیب ائمہ کے لئے ثابت بھی اور اگر سلمنا ائمہ کو علم ماکان اور علم مایکون تھا ہوں تو بداد کا خدشہ دور نہیں ہوا بھی تب جو خدشہ کہ بوجہ بداد خدا کے فرمودہ میں تھا

وہ بجائے خود رہے گا کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ جو افضل الائمہ اور اعلم الائمہ ہیں وہ یوں فرماتے ہیں فی حدیث الکافی وافی الصلوة وق عن امیر المؤمنین کون لا آئہ فی کتاب اللہ لا ٰخبر تکم بہ ما یكون الی یوم القیمۃ یرید بالآیۃ قولہ یحو اللہ ما یشاء وثبت۔ حاصل اس روایت کا کہم کہ کافی جو کلینی کی تصنیف ہے اور امالی جو شیخ صدق کی کتاب ہے ان دونوں میں حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا یہ کڑا ہے آپ نے فرمایا اگر ایک آیت یعنی یحو اللہ ما یشاء نہ ہوتی تو میں ہمیں جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب کی خبر دیدیتا یہاں تک حاصل روایت ہوا اب غور فرمائیے کہ جو دلیل ان کے عالم مایکون اور عالم ماکان ہونے کی تھی وہی دلیل اس بات کی بھی ہے کہ ان کا علم خدا کے علم سے بڑھ کر نہیں پھر با اینہمہ جس وجہ سے خدا کا علم قابل اعتماد نہ تھا۔ اسی وجہ سے ائمہ کے علوم بھی قابل اطمینان نہیں خدا کے بد اسے وہ بھی تنگ تھے اور اپنے کسی علم پر مجبور نہ نکرتے تھے۔ اس خیال سے شاید شیعوں کو تو یہ رنج ہو کہ ہمارا دین ہی ہاتھ سے چلا جب ائمہ کو اپنے علم پر اعتماد نہ ہو تو یہ دین جو انہیں کے علوم کا پر تو ہے کیا قابل اعتماد رہا۔ ؟

پہلیں خوشی ہے کہ اصحاب ثلثہ اور سواران کے اور مہاجرین و انصار کی برائیاں جو شیعہ حضرات ائمہ سے روایت کرتے تھے قطع نظر اس کے کہ ان روایات کے راوی کذاب اور منفری تھے چنانچہ کچھ کچھ اس کا بیان ہو چکا یونہی قابل اطمینان نہ ہے اور ماسوا اس کے اور جو کچھ ان کی کتابوں میں خلاف مذہب اہل سنت حضرات ائمہ سے مروی ہے سب ساقط الاعتبار ہو گیا۔

باقی رہی یہ بات کہ بداد اگر ہوا بھی ہو گا تو کہیں قدر قلیل ہوا ہو گا تو جواب اس کا یہ ہے کہ اعتبار کے اٹھ جانے کو اتنا بھی بہت ہے انجیل اور تورات کو نسی ساری کی ساری اول سے آخر تک بدل گئی تھیں دس پانچ جگہ کی تحریف نے سب کا اعتبار کھودیا۔ مناقب خلفاء صحابہ بنیان امیر و میر ائمہ اور اگر کوئی یہ فرق نکالے کہ کلام اللہ میں جو کچھ اصحاب کے

فضائل نازل ہوئے ہیں یا خلفاء ثلاثہ کی بزرگیوں کی طرف اشارہ ہے وہ سب قبل وفات
..... اکثر اصحاب نازل ہو لیا تھا اور وفات سے پہلے پہلے آدمی کا کچھ اعتبار نہیں ہاں خاتمہ کا
اعتبار ہے۔ سو خدا کی تشخیص میں غلطی کا احتمال ہے پر امیر المؤمنین یا اور ائمہ نے جو کچھ فرمایا
ہو گا وہ سب بعد وفات کا قصہ ہے اس میں غلطی کا احتمال نہیں اگر ان کے کلام سے ان
کی بزرگی خاص کر اصحاب ثلاثہ میں سے کسی کی ثابت ہو جائے تو پھر گنجائش انکار نہیں اس
لئے ائمہ کی روایات پیش نظر کرتا ہوں، صبح البلاغۃ تصنیف علامہ رضی میں جس کی مرویات
شیعوں کے نزدیک متواترات میں سے ہیں، یوں منقول ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی
رضی اللہ عنہ سے جو لوگوں نے ان اصحاب کا حال پوچھا جن کا انتقال ہو چکا تھا تو آپ نے ان
کے وہ اوصاف فرمائے جو بجز اولیاء کے ہو ہی نہیں سکتے وہ عبارت بلاغت امیر بعینہ منقول ہے
كَانُوا إِذَا ذَكَرُوا اللَّهَ هَمَلَتْ أَعْيُنُهُمْ حَتَّى تَبْلُجَ أَبْهَامُهُمْ مَادُوا كَمَا يَمِيدُ الشَّجَرُ
يَوْمَ الرِّيحِ الْعَاصِفِ خَوْفًا مِنَ الْعِقَابِ وَرَجَاءَ لِلثَّوَابِ اور پھر دوسری دفعہ ان
کے حق میں فرمایا كَانَ أَحَبُّ إِلَيَّ إِلَيْهِمْ لِقَاءَ اللَّهِ وَاللَّهُمَّ يَتَقَلَّبُونَ عَلَى مِثْلِ الْحُمْرِ
مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ حاصل ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحابہ کا حال یہ تھا کہ جب
خدا کا ذکر کرتے تھے بہ نکلتی تھی ان کی آنکھیں یہاں تک کہ ان کے چہرے تر ہو جاتے
تھے اور خدا کے ڈر اور امید ثواب میں ایسے لرز جاتے اور جھومتے تھے جیسے درخت تیز ہوا سے
اور سب میں زیادہ محبت ان کو خدا کے ملنے کی تھی اور آخرت کو یاد کر کے ایسے بے چین ہو
کر وٹیں لیا کرتے تھے جانوا انگاروں پر لوٹتے ہیں، اور حضرت امام سجاد سے صحیفہ کاملہ
بڑی طول طویل دعا جس میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ان کے
لئے دعا خیر مندرج ہے منقول ہے سو ساری دعا کی نقل کی گنجائش نہیں فقط دو چار لفظ لکھے
دیتا ہوں، اَسْأَلُكَ اللَّهُمَّ وَأَصْحَابَ مُحَمَّدٍ خَاصَّةً الَّذِينَ حَسَنُوا الصَّحَابَةَ کہے
آگے کہتے ہیں فَاسْقُوا الْآثَرُ وَاجْعَلُوا لَكَ فِي أَظْهَارِ كَلِمَتِهِ وَقَاتِلُوا الْآبَاءَ وَالْأَكَا
بِيَاءَ فِي تَثْبِيتِ نَبَوَاتِهِ اس کے بعد میں فرماتے ہیں۔ فَلَا تَنْشِئْ لَهُمُ اللَّهُمَّ مَا
فَرَّكَوْاكَ وَفِيكَ وَأَسْأَلُ مِنْ سِقْوَانِكَ الْخَمْرَ پھر اس کے بعد تابعین تک

تک نوبت پہنچائی اور ان کے حق میں بھی اسی قسم کی دعائیں فرمائیں حاصل ان الفاظ کا یہ ہے "یا اللہ اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جنہوں نے نبوتِ ری کا حق ادا کیا بیوں اور اولاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بول بالا کرنے کے لئے چھوڑ دیا اور بالوں اور بیٹوں سے ان کی نبوت کے جمانے کے لئے لڑے ہو مت بھولیوان کے حق میں یا اللہ جو انہوں نے تیرے لئے اور تیرے سبب سے چھوڑ دیا اور راضی کر دے ان کو تو اپنی رضا مندی سے" یہاں تک الفاظ مذکورہ کا مضمون ہے ان روایات سے تو مطلقاً صحابہ کی تعریف اور بزرگی ثابت ہوتی ہے

مناقب صدیق اب وہ بھی سنئے کہ جس سے خاص ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت ہوئے۔ رضی کی نہج البلاغۃ میں جو شیعوں کے نزدیک مثل وحی آسمانی ہے روایت کیا عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ أَنَّهُ قَالَ لِلَّهِ بِلَادٌ إِنِّي بَشَرٌ فَلَقَدْ قَوْمَهُ أَكَاوِدَ وَدَاوَى الْعَدَّ وَأَقَامَ السُّنَّةَ وَخَلَّفَ الْبِدْعَةَ ذَهَبَ نَقَى الثَّوْبَ قَلِيلُ الْقَيْبِ صَاحِبَ خَيْرِهَا وَسَيِّقَ شَرِّهَا آتَى إِيَّاهُ اللَّهُ طَاعَتَهُ وَاتَّقَاهُ بِحَقِّهِ رَحَلَ وَتَرَكَهُمُ فِي طَرِيقِ مُشْعَبَةٍ لَا يَخْتَدِرُ فِيهَا الضَّالُّ وَلَا يَسْتَقِينُ الْمُخْتَدِرُ حَاصِل اس کا یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خدا ہی کے واسطے ہیں شہر ابو بکر کے یعنی ابو بکر میں خدا داد خوبیاں ہیں پس قسم ہے کہ انہوں نے سیدھا کر دیا کجی کو اور اصلاح کر دیا ستون کو اور قائم کر دیا سنت کو پس پشت ڈالا انہوں نے بدعت کو دنیا سے پاک دامن بے عیب گئے، خوبی خلافت کی ان کو نصیب ہوئی اور آگے چل دیئے خلافت کے فسادوں سے ادا کی انہوں نے خداوند کریم کی طاعت پر ہیز گار رہے حق پر ہیز گاری کا چل دیئے اور لوگ مختلف رستوں میں حیران ہیں کہ نہ گمراہوں کو راہ ملی ہے اور نہ ہدایت والوں کو اپنی ہدایت کا یقین ہے یہاں تک حاصل معنی خطبہ مرقومہ ہوا۔

علامہ رضی کی خیانت جو مفید مطلب ہو سکی اب گوش گزار ناظرین رسالہ یہ ہے کہ علامہ رضی

لے یعنی چونکہ ابو بکر کے شہر خدا ہی کے تھے تو خدا ہی کے رتبے کا ظہور ہوا اور ظاہر ہے کہ جس کا خدا مزی ہو وہ شخص لاجرم بڑا ہی صاحب کمال ہوگا۔

نے پاس دارئی مذہب ابو بکر کے لفظ کی جگہ لفظ فلاں بدل دیا ہے تاکہ سنیوں کو گنجائش استدلال نہ رہے اور ان علامہ رضی کی کچھ عادت ہی ہے مگر اتنا نہ سمجھے کہ نام کے چھپانے سے کیا فائدہ؟ حضرت امیر المومنین سے پہلے کل تین خلیفہ تھے سو جس کی تعریف ہوگی سنیوں کا مطلب کہیں نہیں گیا لہذا وہ اوصاف ایسے ہیں کہ خود ابو بکر صدیق کا ہاتھ پکڑا دیں ہیں خاص کر پہلا وصف اور دوسرا وصف کہ یہ دو وصف سواء ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کوئی تہلکے تو اور کس پر مستحب ہوتے ہیں؟ اور کس کی خلافت میں دین میں کجی آگئی تھی؟ اور کس رکن یعنی ستون میں ارکان اسلام میں نقصان آگیا تھا کہ اس نے اس کی درستگی کی؟

ہاں ان کی خلافت میں البتہ بسبب وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار طرف سے شور ارتداد اٹھا بہت لوگ ادائے زکوٰۃ سے جو رکن اسلام ہے مانع آئے سو نہ ابو بکر صدیق ہوں نہ یہ فتنے رہیں ان کے برکات اور حسن انتظام اور خوبی خلافت کے باعث جو حضرت امیر کے آنکھوں میں کھبے ہوئے تھے اور شیعہ بھی جی میں تو مانتے ہی ہوں گے زبان سے کہیں یا نہ کہیں حضرت امیر رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے فساد اور فتنوں کو دیکھ دیکھ نہیں یاد کرتے ہیں اور تاسف کرتے ہیں کہ ایسے زمانے میں ایسا شخص ہونا چاہیے تھا۔

صدیق کی شجاعت اور استقامت اور کیوں نہ ہو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تھے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جب چار طرف مرتدین کا زور ہوا اکثر صحابہ گھبرا گئے یہاں تک کہ حضرت عمر حبیبی جری اور ذمی ہوش اور صاحب رائے کے ہوش بھی ٹھکانے نہ رہے یہ انھیں کی ہمت بندھانے کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا اَحْبَبَ اَرْفِ الْجَاهِلِيَّةِ وَ اَحْوَا اَرْفِ الْاِسْلَامِ یعنی اے عمر کیا کفر کے زمانے میں یہ شور شور می تھی اور اسلام میں یوں بول گئے القصة حضرت عمر کی یہ رائے تھی کہ ایسا اگر لشکر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نہ بھیجا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے مبادا مدینہ منورہ لشکر مجاہدین سے خالی ہو جائے۔ اور دشمن تاخت کر بیٹھیں لیکن آفرین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور استقامت

پر کہ باوجود ان نہنگاموں کے ہرگز نہ گھبرائے، اور یہ فرمایا کہ جس لشکر کی تیاری خود سرور
 کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کر گئے ہوں یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو روانہ نہ کروں اور ایسے
 ہی مرتدین کے قتال میں جو لشکر کے بھیجنے کا ارادہ فرمایا اور اکثر صحابہ کی رائے اس باب
 میں ان کی رائے کے مخالف ہوئی تو ایسا کچھ فرمایا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں تنہا جا کر لڑوں گا۔
 اور اسی طرح زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کے قتال کے باب میں جب حضرت عمر نے یہ
 شبہ کیا کہ وہ کلمہ گو ہیں تو یہ ارشاد فرمایا کہ جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا نماز کو فرض
 کہے گا اور آقا فرض نہ سمجھے گا میں اس سے بے تامل لڑوں گا واللہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے زمانے میں ایک بھری کا بچہ لوگ زکوٰۃ میں دیتے ہوں گے اور اب نہ دینگے تو میں ان سے
 جہاد میں دریغ نہ کروں گا الحاصل یہ انہیں کی شجاعت اور فہم و فراست بھی جو یہ رائے
 صائب سوچھی اور دین کو تھامنا ورنہ دین میں وہ فتور پڑے تھے کہ خدا ہی حافظ تھا۔
 سو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے فسادوں اور بدعتوں کو جو لوگوں
 نے برپا کر رکھے تھے دیکھ دیکھ کر ان کو یاد کرتے تھے چنانچہ الفاظ خطبہ مذکورہ خود گواہی دیتے
 ہیں اسی واسطے اکثر شارحین نہج البلاغۃ کی یہی رائے ہے اور کیونکر ممکن ہو کہ اور کسی پر ان
 اوصاف کو منطبق کر دیں بہت کرتے تو یہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کا احتمال پیدا کرتے جو رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مر گیا ہوتا، جیسے بعضے نا انصافوں نے کیا ہے۔ سو شارحین کے
 ذمہ معنی کا درست کرنا بھی تو ہوتا ہے ان اوصاف کو اس پر کیونکر منطبق کر دیتے رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو کچھ خوبی ظہور میں آئی وہ سب آپ کا طفیل تھا اور کسی کا
 اس میں کیا اجارہ؟ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر اس لئے
 نہیں لا سکتے کہ سنتوں سے اس کا کیا عذر کریں گے کہ حضرت امیر نے ماحسنی لفظ فلاں کہا۔
 کس قدر گستاخی کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح سے ذکر کیا۔

مقام تعریف مقام تصریح ہوتا ہے نہ کہ مقام اخفاء اور پھر کیا باعث ہوا کہ محل تعریف میں جو مقام
 تصریح و اعلام ہوتا ہے یہ اخفاء اور ابہام بلکہ اسی نظر سے کہ یہ محل تعریف ہے یوں خیال میں آتا
 ہے کہ یہ تعریف ابو بکر ہی کی تعریف ہے اور یہ کنایہ لاجرم اعدائے صحابہ کی تعریف ہے ورنہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں تو کچھ اندیشہ ہی نہ تھا جو کسی نے یوں چھپایا اور نام نہ بتایا۔
 ہاں ابو بکر کی ضد میں بایں غرض کہ یہ مدح ابو بکرؓ کی مدح نہ ہو جائے گو رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی دشمنی کی تہمت بھی اپنے ذمہ لازم آئے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت
 (گو بہ جبر) باعث اخفاء نام ہو سکے گوارا کریں، اور اس طرح سے اس مدح کو مدح نبوی قرار دیں
 تو ممکن ہے مگر اوصاف مذکورہ اس توجیہ کو کرنے بھی دیں آپ کے زمانے میں اول تو اقامت
 سنت اور تخیلف بدعت کے کیا معنی؟ جس سے چاہو پوچھ دیجھو اقامت سنت کے لفظ
 سے کیا متبادر ہوتا ہی؟ ہر کوئی اتنا جانتا ہے کہ اقامت کے لئے سنت کا وجود اور اس کی
 پستی ہونی چاہیئے نہیں تو پھر اقامت کس کی ہوگی منو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 احکام فرماتے تھے یا خود کوئی عمل کرتے تھے تو وہ اقامت سنت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کو خود
 سنت سمجھنا چاہیئے، *یحتذ العبد مقررہ* نے احکام سنت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے زمانے میں کونسا ان میں فتور پڑ گیا؟ اور پڑ بھی گیا تھا تو آپ نے اس کی کیا اصلاح فرمائی؟
 بہر حال کچھ کچھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف یہ اوصاف ڈھلتے ہیں
 سو یہ کرامت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ہر خیر علامہ رضی نے ان کے کلام کو خراب کرنا
 چاہا مگر معنی وہی رہے اور بنیادی اپنے ذمہ لگائی بھلا اتنا بھی خیال نہ کیا کہ تعریف کے محل
 میں ایسے کنایات سے کون باتیں کیا کرتا ہے کسی نے سچ کہا ہے عیب بھی کرنے کو بہر چاہئے
 اور بعضے شارحین کی رائے یہ ہے کہ اس خطبہ میں حضرت عمر کی تعریف ہے سو حضرت عمر
 ہمیں کون سے برے ہیں اور حضرت عمرؓ پر جو وہ اس تعریف کو منطبق کرتے ہیں تو اس جو
 سے کہ وہ یوں لکھتے ہیں کہ مجھے مصنف کے ہاتھ کا یعنی علامہ رضی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخ البلاغ
 کا نسخہ مل گیا تھا سو اس میں لفظ فلانے کے نیچے عمر کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ یہ
 بھی لکھا تھا کہ مجھ سے فخار بن محمد مولوی ادیشا نے ایسا ہی بیان کیا اور میں نے ابو جعفر
 یحییٰ بن زید علوی سے جو پوچھا کہ اس لفظ سے کون مراد ہے تو انہوں نے کہا کہ حضرت
 عمر رضی اللہ عنہ مراد ہیں، میں نے کہا کیا امیر المومنین نے اس قدر ان کی تعریف کی
 انہوں نے کہا ہاں۔

الغرض اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعض خطبوں میں جو حضرت عمر کے نام سے
تعریف ہے تو اس کے الفاظ ان الفاظ سے بہت ملتے ہیں بعض شارحین حضرت عمر کی
طرف ڈھلے ہیں پھر اظہر یہی ہے کہ مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں لیکن جب
شیعوں نے دیکھا کہ آخر یہ تعریف ہو تو کسی کی اصحاب ثلاثہ میں سے ہے تو انہوں نے کہا کہ
اُو حضرت عمر ہی کی تبتلاؤ حضرت عمر آخر حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے داماد تو ہیں۔
ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تو بہر حال کچھ ان کا پاس لحاظ زیادہ ہی چاہیے۔ لیکن ہمارا ادھر
بھی لیکھا ہے اسی واسطے جو روایت کہ خاص ان کی تعریف میں ہے اس کو بھی رب
رسم کرتا ہوں۔

مناقب عمر رضی اللہ عنہ بن زبان امیر فرما لاسمان کتاب المواقف میں فرین حکیم سے روایت کرتا ہے کہ
جب حضرت عمر کا انتقال ہوا تو میں نے کہا حضرت علی کے پاس چلنا چاہیے اور ان کی سنیں
وہ کیا کہتے ہیں سو میں جو ان کی محفل میں آیا تو بہت لوگ ان کے منتظر بیٹھے تھے سو کچھ دیر
دیر ہوئی ہوگی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ اول تو سر مبارک جھکایا۔ پھر اوپر اٹھا کر
فرمایا۔ **لِلّٰہِ دَرْبَاکِیۃٌ عُمَرُوْا عَمَلُہٗ قَوْمٌ اَلَا وَاَیَّدَ الْعَمَدَ مَاتَ نَفِی الثَّوْبِ**
قَلِیْلٌ الْعِیْبِ وَاعْمَلُوْا ذَنْبَ السَّنَةِ وَاتَّقِ الْفِتْنَةَ اَصَابَ
وَاللّٰہُ اَبْرُؤُ الْخَطَا خَیْرُهَا وَنَجٰی مِنْ شَرِّهَا وَلَقَدْ نَظَرْتُ لَہٗ
صَاحِبِہٖ فَصَارَ عَلٰی الطَّرِیْقَہٗ مَا اسْتَقَامَتْ ثُمَّ قَالَ فَقَالَ وَ
رَجُلٍ الْمُرَاکِبُ فَتَشَعَّبَہُمَا الطَّرِیْقُ لَا یَذْرِی الْفَالَّ وَلَا
یَسْتِیْقِنُ الْمُہْتَدٰی۔

اس عبارت کے معنی بھی قریب قریب پہلی ہی روایت کے ہیں اس لئے بعض شارح
جن کا ذکر ہو چکا روایت مقدم کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی پر محمول کرتے ہیں لیکن اوصاف کو
دیکھئے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی پر پھرتے ہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا باقی اس روایت کے
الفاظ و اس روایت کے الفاظ کے تطابق سے کچھ یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں ایک آدمی کی تعریف میں ہوں۔ اگر
دونوں روایتوں کو جدا جدا شخص کے لئے سمجھئے تب بھی تو کچھ محال نہیں آخر حضرت عمر

کی خلافت بھی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کی خلافت کا تتمہ تھا۔ بنیاد ساری باتوں کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی باندھ گئے تھے ملک شام اور ایران پر جو جہاد ہوا تو پر واز اس کا خلیفہ اول ہی ڈال گئے تھے اور جو جو لازم خلافت تھے سب کی جڑ وہی درست کر گئے تھے چنانچہ ماہران تواریخ پر پوشیدہ نہیں وہ موجد قوانین انتظام تھے اور حضرت عمرؓ اس کے برتنے والے غرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک رستہ ڈال گئے ہیں کہ حضرت عمرؓ اسی رستہ چلتے گئے اگر اس وجہ سے کہ ابوبکر صدیق کے کاموں کو حضرت عمرؓ نے پورا کیا ان کو بھی موصوف باوصاف مندرجہ روایات اول سمجھیں تو چنداں بعید نہیں۔

باب عقیدہ تقیہ

عقیدہ تقیہ اور اس کے عقلی و نقلی مباحث | بہر حال اگر شیعوں کو یہی مرکوز خاطر ہو کہ ہم سچے اماموں کے فرمانے کے اصحاب ثلاثہ یا اور اصحاب کے قیامت تک معتقد نہ ہوں گے تو یہ غدر بھی ہم نے ان کا باقی نہ رکھا۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا جو مرقوم ہوا اگر ہم جانتے ہیں کہ وہ جوئے بدرابہا ہوا بسیار، شیعہ اپنی نا انصافی سے باز نہ آئیں اور بسبب عداوت صحابہ کے جو اہل بیت کی محبت سے پہلے ان کی رگ و پے میں رچ گئی ہے عجب نہیں کہ خلاف امید یوں بھی کہہ اٹھیں کہ حضرات ائمہ کی بات کا بھی کیا اعتبار؟ ساری عمر انہوں نے تقیہ میں گزاری اور حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہتے کہتے چلے دیئے، جب امام الائمہ حضرت امیر المومنین باپ ہمہ شہرہ شجاعت اور زور کمر کے شیر خدا اور علی ولی اللہ ان کا لقب ہے خلفا ثلاثہ سے اتنا کچھ ڈرتے تھے کہ ان کے زمانے میں تو کیا اپنے زمانے میں بھی اظہار مذہب حق نہ کر سکے ہوں تو اوروں کا تو کیا ذکر؟ ہم جب تک ہرگز نہ مانیں کہ یا تو تقیہ کو کوئی باطل کر دکھلائے یا کسی ایسے کی سمد بلالے کہ وہ تقیہ نہ کرتے ہوں۔

اس لئے ناچار تقیہ کی اصل حقیقت بھی کھول کر کچھ کچھ دکھلانی پڑی۔ نا انصافوں سے پلہ پڑا ہے دیکھئے کتنی چکچکیاں کھائیں اور ہم ان کی دم کے ساتھ لگے ہوئے کہاں کہاں تک جائیں۔ محذوم من آفرین ہے ان لوگوں کی ہوشیاری پر کہ جن کا یہ دین ساختہ پر دانت ہے۔

ایسی نامعقول باتوں کا مجرب اور تلیقہ کے رواج ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر سنیوں نے کلام اللہ کا حوالہ دیا تو بدعا کا غدر کیا، اماموں کا قول پیش کیا تو تلیقہ سے الزام دیا اب بیچارے سنی اپنا سامنہ لے کر رہ نہ جائیں تو اور کیا کریں؟ عرض جس نے اس مذہب کو تراشا واقعی نہایت ہوشیار تھا، پر کم فہم بھی ہوں تو اتنے ہوں جتنے حضرات شیعہ کہ دلم و دانہ کی ان کو کچھ ہمہ نہیں، ہا افسوس کیسے کیسے لوگ اس دام میں پھنس گئے یہ نہ سمجھا کہ دین خداوندی کو ایسی باتوں سے کیا علاقہ یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، نہ عبد اللہ بن سبا یہودی منافق اور اس کے شاگرد پیشہ ہوتے نہ یہ قواعد شیعہ تصنیف ہوتے خیر بہر حال اس حیلہ اخیر کا جواب بھی دے لیجئے: شاید خداوند کریم کسی کو ہدایت نصیب فرمائے۔

تلیقہ شیعہ کی اپنی روایات کے آئینے میں | مخدوم من اول تو یہ عذر روایات مذکورہ میں منظر غور پیش نہیں جاتا خاص کر پہلی دو روایات میں حضرت امام سجاد زین العباد رضی اللہ عنہ وعن آباءہ الکرام نے جو کچھ اصحاب کرام کی تعریف فرمائی تو عین مناجات خداوندی اور دعا کے وقت فرمائی ہے خدا سے کیا تلیقہ پڑا تھا؟ اگر کسی بنی آدم سے کلام گفتگو ہوتی تو یہ بھی احتمال ہوتا کہ شاید طرفدار ان صحابہ میں سے ہو اور اگر خدا پر بھی صحابہ کی طرفداری کی تہمت تھی تو سنیوں کے زہے نصیب کہ ان کے پیشواؤں کی خدا بھی طرفداری کرتا تھا۔ لیکن شیعوں کو اپنا فکر چاہیئے معہذا حق مذہب سوا اس کے اور کسے کہتے ہیں کہ خدا ان کی پشتی پر ہو سارا کلام اللہ انت اللہ مع المتقین اور اسی قسم کی آیات سے بھرا ہوا ہے باقی خدا کی طرف یہ احتمال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا بھی اصحاب ثلاثہ سے ڈرے تھا۔
نخوذ باللہ منہا۔

ہاں اگر شیعہ کہیں تو کچھ نہیں کیونکہ ان کے عقائد کے موافق تو حضرت علی کا تلیقہ بھی کچھ اس سے کم نہیں، شیر خدا جدا تھے۔

موت پر اختیار غیب کا علم، بے انتہا شجاعت۔ پھر تلیقہ کیوں؟ یا اینہم اپنی موت اپنے اختیار میں، چنانچہ کلینی نے اس بات کو ثابت ہی کیا ہے کہ اماموں کی موت ان کے اختیار میں ہے۔ اور

کلینی کیا سارے امامیہ اس پر متفق ہیں کہ علم ماکان مایکون جدا تھا اتنا یقیناً جانتے تھے کہ فلا نے وقت فلا نے کے ہاتھ سے شہید ہو گا اس سے پہلے نہ اس سے بیچھے، اور کام عمر میں اس طرح باسائش گذاروں گا کہ باوجود کثرت انبوه دشمنان میرا کوئی مزا حم حال یا درپے جان و مال نہ ہو گا اور اگر ہو گا بھی تو میرا کچھ نقصان نہ ہو گا پھر ان سب اختیارات اور علوم کے بعد شجاعت تو ایسی کہ ہزار رستم بھی ہوں تو مان جائیں، ابو بکر و عمر تو کس گنتی میں ہیں اور کرامت اس قدر کہ درخیر کو اٹھا کر پھینک دیں۔ خانہ ابو بکر و عمر کی کیا حقیقت۔

پھر باایں ہمہ ابو بکرؓ اور عمرؓ سے ڈرے، کوئی انصاف کر کے بتلائے کہ یہ تقیہ خدا کے تقیہ سے کس بات میں کم ہے علاوہ بریں وقت تعریف مذکور ابو بکر و عمر کا بجز نام و کام نام و نشان باقی نہ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ مرے ہوئے سے تو گیدڑ بھی نہیں ڈرتے شیر خدا علی مرتضیٰ پھر رہا مری ہوئی سے رہے تو قیامت آگئی، خیر کہاں تک کیئے مطلب اتنا ہے کہ دعا کے وقت کہ جو وقت مناجات عالم السور والخفیات ہے اس وقت تقیہ کا ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ منافقین کا نماز پڑھنا بلکہ اس بھی بڑھ کر، منافق بندوں کو دھوکا دیتے تھے اور در صورت تقیہ نعوذ باللہ حضرت امام سجاد خدا کو۔ کیونکہ یہ تو ہم یقیناً جانتے ہیں اور شیعہ بھی کتنے ہی دان کیوں نہ ہوں اس کے خلاف نہ کہیں گے کہ حضرت امام کی عبادت روی دریا تھی سو کسی سنی یا معتقد خلفا کے استرضاء کا تو ان کی عبادت میں احتمال ہی نہیں۔ بجز اس کے کہ بخیاں جانب داری خلفاء جو خدا سے ظہور میں آئی یہ خیال دل میں ہو کہ ایسا نہ ہو کہ خداوند کریم بہ سبب خلفاء اور بے اعتقادی صحابہ سے اگر چہ حق ہی ہونا راض نہ ہو جائے۔ نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات جناب من ایسی محفل میں تقیہ کا احتمال کرنا جس پہلو سے پلٹ کر دیکھو دین کو مرہم درہم کئے دیتا ہے۔ یا خداوند کریم کی طرف برائی عائد ہوگی تعالیٰ اللہ عن ذلک علو کبریا یا ائمہ کی طرف۔۔۔ نعوذ باللہ منہ کثیرا۔ بہر حال تقیہ کے پردہ میں یہ دشمنان اہلبیت ائمہ کو کیا کیا کچھ نہیں کہہ لیتے واقعی بہت خوبصورتی سے ہجو کرتے ہیں۔

حضرت امیر نے بعد وفات صدیق کے مناقب خلفا بیان کئے اس وقت خوف بھی نہ تھا | بھلا امام سجاد تو رستم

دیدہ اور ظلم کشیدہ دشمنانِ سفاک تھے سپر نہ وہ شجاعت تھی جو حضرت امیرِ یحییٰ نہ وہ کرامت تھی جو حضرت امیرِ یحییٰ تھی اگر ان کے حق میں کوئی تفتیہ کا دعویٰ کرے تو شاید کوئی بیوقوف فی الجملہ مان بھی جائے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ حضرت امیر کی نسبت با اینہمہ زور و شجاعت و باوجود یکتائے علم و کرامت و استمرارِ صحت و سلامت کہ زمانِ خلفاءِ ثلاثہ سے لے کر اپنی خلافت تک بے اندیشہ گذاری اپنی نیند سوئے اپنی بھوک کھایا یہ احتمال کیا جائے کہ انہوں نے ایسے دس جھوٹ پر رسم کھائی کہ ان کی بدولت آسمان گر جائے تو عجب نہیں اور زمین پھٹ جائے تو دور نہیں، کجایہ اوصاف جمیلہ اور محامد علیہ کہ لگ بھگ انبیاء کے اوصاف اور لوازم کے ہیں کجا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ بزعم شیعہ ابلیس سے بھی بڑھ کر کہ اس کا برا کہنا مستحب بھی نہ ہو اور ان کا تبرافرض بلکہ اس سے بڑھ کر کہا جائے تو عجب نہیں کیونکہ موافق من جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرٌ مِّثَالِهَا کے ایسے ویسے لوگوں کے فضلوں کا ثواب دس گنا ہو تو ہو اس لئے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کو وہ چند ثواب ملے گا۔

اور لعن شیعین اس قدر مقبول ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ بات مرقوم ہے کہ ابو بکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما پر صبحِ لعنت کرنی ستر نیکیوں کے برابر ہے اور پھر طرفہ یہ ہے کہ ابلیس اور عمرو داور شداد اور فرعون اور ابو جہل اور امیہ بن خلف اور ابو لہب غیر ہم دشمنانِ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لعن اور تبرا ماث بھرنیکی کے برابر نہیں کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے۔ ”ہیں عقل و دانش بیاید گریست“ بالجملہ ایسے لوگوں کی تعریف جو ابلیس اور عمرو داور فرعون اور ابو جہل وغیرہم سے بھی بڑھ کر ہوں اور پھر تعریف بھی اس قدر کہ دس بڑے بڑے کمالات بقسم بیان کئے جائیں ایسے کاملوں سے جن کا نام حضرت علی شیر خدا جن کے اوصاف اوپر مذکور ہو چکے ہیں ہو سکتی ہے کہ کافر ہونے کے یہ معنی ہوں کہ خدا کا بڑا ہی مطیع و فرمانبردار ہو، سو اگر کفر کے یہی معنی ہیں تو کون مروود برا ماننا ہے ایسی گالیاں تو جتنی چاہیں شیعہ دے لیں بجز تسلیم اس طرف سے انشاء اللہ جواب ہی نہ ہوگا

بہت۔ بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی : جواب تلخ می زید لب لعل شکر خارا
 سبحان اللہ کس کس پیچ سے حضرات ائمہ کی معصومیت بلکہ بزرگی کو بڑھ لگاتے ہیں۔
 خوارج سے شیعہ (ہم جانیں) کچھ دو انگشت زیادہ ہی ہوں گے پر اتنا ہی کہ شیعہ سنوار کر
 چھان پچھوڑ کر عیب لگاتے ہیں اور خوارج اناڑیوں کی طرح بے سوچے سمجھے گنوار کا سا لٹھ
 مار بیٹھتے ہیں۔

حکایات تقیہ کی روایات کتب شیعہ پُرندہ تکذیب کرتی ہیں | القصہ یہ غدر پوچ عاقلوں کے سامنے
 کہ ائمہ معصومین اصحاب ثلاثہ یا اور مہاجرین اور انصار کی تعریف بوجہ تقیہ کیا کرتے تھے قطع
 نظر اس کے کہ عقل کے نزدیک یہ غدر لا طائل گوند شتر کے نرخ بکتا ہے یوں بھی تو قابل
 تمسک نہیں کہ جن بزرگواروں کی طرف تقیہ کی تہمت کرتے ہیں ان ہی بزرگواروں کے
 افسانے جو ان کی معتبر کتابوں میں منقول ہیں باواز بلند تقیہ کی تکذیب کرتی ہیں ہر چند سب
 کا اس رسالہ میں درج کرنا ممکن نہیں لیکن ”مشتملہ نمونہ خروارے“ دو تین روایتیں جو امام ائمہ
 حضرت امیر کے اظہار حق اور صدق حال پر دلالت کریں درج کی جاتی ہیں تاکہ حکم متابعت بزرگان
 اوروں کی بزرگی اور خوبی بھی کذبِ ریا سے پاک و صاف ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ جب
 شمسِ الائمہ کا حال یہ ہے کہ تقیہ میں جو بقول شیعہ ان پر منجملہ فرافض ہی تھا اس قدر تقصیر
 تھے اور احکام کا تو کیا ذکر تو اور ائمہ کا کیا حال ہو گا۔ ؟

امیر کا حکم کہ سچائی اختیار کرو خواہ کچھ بھی ہو | نہج البلاغہ میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتاب
 اور متواتر ہے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا یہ قول تقیہ کے ابطال میں دلیل قوی اور بہانِ کامل
 ہے عَلَامَةُ الْاِيْمَانِ اِيْثَارُكَ الصِّدْقِ حَيْثُ يَضُرُّكَ عَلَى الْكِذْبِ حَيْثُ
 يَنْفَعُكَ يَعْنِي اِيْمَانُ كِي نَشَانِي يَهْء كِهْءَالِ سَحْء بُولِنَا ضَرْء كَرْءَا هُو اِيْسِي جَلْء سَحْء بُولِنِي كُو پَسَنْء
 رَكْء. جھوٹ بولنے پر جو نفع دیتا ہو۔ اس روایت سے صاف نکلتا ہے کہ جو تقیہ کرے اس
 میں ایمان نہیں کیونکہ علامتِ ایمان کی یہ ہے کہ جان و مال کا ضرر کو ہو جائے پر جھوٹی بات
 زبان پر نہ لائے۔

امام کی شجاعت اور اشتیاقِ جنت | دوسری روایت بھی نہج البلاغہ ہی کی ہے

قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ إِيَّيْ وَاللَّهِ لَوْ لَقِيتُهُمْ وَاحِدًا وَهُمْ مُطْلَعٌ
 أَكْثَرُ مِنْ كُفْلِهِمَا مَا بَا لَيْتُ وَلَا أَسْتَوْحِشْتُ وَإِنِّي مِنْ
 ضَلَالَتِهِمْ أَلْحَى هُمْ فِيهَا وَالْهَدَى الَّذِي أَنَا عَلَيْهِ لَعَلِّي
 لَبِصِيرٌ لَا مِنْ خَفْسِي وَلَيَقِينُ مِنْ رَبِّي وَإِنِّي إِلَى لِقَاءِ اللَّهِ وَلِحُسْنِ
 ثَوَابِهِ مُنْتَظِرٌ سَأُجِ -

مطلب یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بیشک
 قسم اللہ کی اگر ان سے تنہا مقابل ہوں اور وہ تمام زمین کو گھیرے ہوئے ہوں تو میں ہرگز
 کچھ پرہیز و انکروں۔ اور نہ گھبراؤں اور مجھے ان کی گمراہی اور اپنی ہدایت کا حال عیاں ہے اور
 اس بات کا خدا داد یقین ہے اور میں خدا کے ملنے یعنی مرنے اور اس کے ثواب کے انتظار اور
 امید میں ہوں، اب غور فرمائیے جو شخص تنہا اتنے دشمنوں سے بھی ڈرے جو تمام روئے
 زمین کو ڈھک لیں اور ڈرنا تو درکنار پروا اور گھبراہٹ تک نہ ہو۔ بلکہ مرنے اور جنت کا مشتاق
 ہو ایسے لوگوں سے تقیہ کے ہونے کے کیا معنی؟ ایسے لوگ بھی اگر ڈرنے لگے تو قیامت آگئی
 معہذا تقیہ بغیر خوف کے تو ہوتا ہی نہیں اگر مر جانے کا خوف ہے تو وہ اماموں کو ہوتا ہی نہیں
 کیونکہ اول تو ان کی موت ان کے اختیار میں ہے چنانچہ کلینی نے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے
 اور تمام امامیہ کا اس پر اتفاق ہے پھر وہ کسی سے کیا ڈریں اور کیوں ڈریں؟ دوسرے علم
 وقائع گذشتہ اور نیز وقائع آئندہ سب ان کو مستحضر خود اپنے مرنے کا حال اور کیفیت
 بتفصیل و شرح معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت سے پہلے ڈر ہو ہی نہیں سکتا۔

انبیاء اور ائمہ کا منصب صبر تحمل اور حق گوئی ہے۔ اور اگر خوف مال یا ابرو یا بدگوئی خلائق کا اندیشہ
 یا کسی قسم کی تکلیف کا خوف ہے تو انبیاء اور ائمہ کا کام یہی ہے کہ تکلیفیں اٹھایا کریں
 اور تحمل کیا کریں اور دشمنوں کی قوت و شوکت اور اپنی بے کسی اور بے زری کا لحاظ نہ کریں۔
 اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم خرمود سے نہ چھپے اور آگ میں گرنا قبول کیا حضرت موسیٰ فرعون
 سے نہ ڈرے اور آخر نوبت جلاوطن ہونے کی پہنچی حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو برس
 تک کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں شیعوں نے بھی سنی ہوں گی، حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا کا

مقتول ہونا شہرہ آفاق ہے حضرات شیعہ ہی انصاف کر کے فرمائیں کہ ان کے مقتول ہونے کا باعث سوا کلمۃ الحق اور حق گوئی کے اور کیا تھا عزت چھوڑ یہاں تو جان پر کھیل گئے۔ حضرت امیر جو انبیاء سے افضل نہیں تو مساوات میں تو شیعوں کے نزدیک کلام ہی نہیں آبرو تک کا خدا سے دریغ کریں۔

تقیہ اگر فرض تھا تو امام حسین کی شہادت معصیت ہوگی | اور خود خلف رشید حضرت امیر رضی اللہ

عنه سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ عنہ جان نازنین کو نثارِ راہ خدا کر گئے اگر تقیہ سنت حضرت علی بلکہ فرض خداوندی تھا تو اس سے زیادہ اور کونسا موقع تقیہ کا ہوگا کہ تیس ہزار فوج جرار بر سر کار نازن و فرزند ہمراہ ہنگ و ناموس کا اندیشہ نہ کھانا نہ دانا نہ پانی کا سامان نہ آڑ کے لئے کوئی مکان اور اس طرت سے فقط اتنی طلبگاری کہ بیعت نیرید قبول کر لو پھر جہاں جی چاہے چلو بڑے حیف کی بات ہے جان و مال سب برباد گئے زن و فرزند پر جو کچھ گذری سب جانتے ہیں پھر تیسرے خاتمہ ہوا تو یوں ہوا کہ فرض مفترض معمول بہ اہل بیت پر عمل نہ کیا بے گناہوں کو مفت کے مظلمہ میں گرفتار کیا ان کا وبال نعوذ باللہ اپنی گردن پر لیا نعوذ باللہ اگر یہی تقیہ ہے تو ہم جانتے ہیں کہ یہ درست بدتر از ہزار دشمن بہ نسبت حضرت امام الشہداء نعوذ باللہ عقیدہ خسر الدنیا و الاخر کا رکھتے ہیں واللہ کہ ان الفاظ کے کہتے ہوئے جی دڑتا ہے مگر خداوند عالم الغیب والشہادہ خوب جانتا ہے میں تقیہ سے نہیں کہتا کہ یہ سب دعوہ بدولت حضرات مدعیان دروغ فرقہ مسلمۃ الشیعہ کے ہے ورنہ یہ خاکپائے غلامان اہل بیت ان حضرات کو اکابر اولیاء اللہ اور عمدہ صدیقین اور افسر مخلصین اور خلاصہ محسنین اور زبدۃ متقیین اور سرحلقہ محبوبین سمجھتا ہے حاشا و کلاً جو بطور شیعہ دعوائے دروغ ہو۔

امام کا اپنی کرامت سے حضرت عمر کو مرعوب کر دینا | تیسری روایت روندی کی کہ مقتدا شیعہ اور شراح

ہج البلاغت ہے کتاب جراح الجراح میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے۔

إِنَّ عَلِيًّا بَلَّغَهُ عَنْ عُمَرَ أَنَّهُ ذَكَرَ شِيعَتَهُ فَاِسْتَقْبَلَهُ فِي بَعْضِ طُرُقَاتِ نِسَائَتَيْنِ الْمُدْنِيَّةِ وَفِي يَدِ عَلِيٍّ قَوْسٌ فَقَالَ يَا عُمَرُ بَلَّغْنِي عَنْكَ ذِكْرُكَ لِشِيعَتِي فَقَالَ إِنْ رُبِّيَ عَلَى صَلَاحَتِكَ فَقَالَ عَلِيٌّ إِنَّكَ لَهْمُنَا

ثُمَّ سَمِعَ بِالْقَوْسِ عَلَى الْأَرْضِ فَإِذَا هِيَ ثَعْبَانٌ كَالْبَعِيزِ فَأَغْرَأَ
فَأَهَ وَقَدْ أَقْبَلَ فَنَحْوُ عُمَرَ لِيَتْبَلَعَهُ فَقَالَ عُمَرُ لِلَّهِ اللَّهُ يَا أَبَا الْحَسَنِ
لَا عُدَّتْ بَعْدَ هَذَا فِي شَيْءٍ وَجَعَلَ يَنْصَرِّعُ إِلَيْهِ تَضُوبٌ يَدَهُ إِلَى
الثَّعْبَانِ فَعَلَّاتِ الْقَوْسُ كَمَا كَانَتْ فَمَضَى عُمَرُ إِلَى بَيْتِهِ - الخ -

یہ روایت بہت بُری ہے کہاں تک نقل کر دیں اتنے الفاظ بھی بہت ہیں پر حاصل معنی -
اس کا بیان کئے دیتا ہوں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کو یوں خبر
پہنچی تھی کہ عمرؓ کچھ شیعہ علیؑ کو برا کہتے ہیں سو اتفاقات سے بعض مدینہ کے باغوں کی راہ میں
ان کے سامنے آگئے حضرت علیؑ نے فرمایا اے عمرؓ مجھے یوں خبر پہنچی ہے کہ تو میرے شیعہ کو برا
کہتا ہے عمرؓ نے کہا اے میاں اپنی خیر مناد حضرت علیؑ نے فرمایا تم اتنے ہو گئے پھر کمان کو جو زمین
پر ڈالا تو ایک اڑدھا تھا اونٹ کے برابر منہ کھولے ہوئے حضرت عمرؓ کی طرف نکلنے کے ارادے
دوڑا عمرؓ نے کہا خدا کے واسطے خدا کے واسطے اے ابو الحسن پھر اس کے بعد ایسی بات کہی کہ ہونگا
اور لگے گڑ گڑانے، حضرت علیؑ نے اس اڑدھا کی طرف جو ہاتھ لپکایا پھر وہی کمان کی کمان ہو گئی۔
خیر عمرؓ نے گھر چلے گئے اس روایت کو دیکھئے تو تقیت کی تو گردن ہی توڑ دی۔ خلیفوں ..
اور اصحاب میں بڑی دھوم دھام حضرت عمرؓ کی تھی اور سنی بھی انہیں کی شوکت اور دبدبہ کو
بہت زبان پر لایا کرتے ہیں سو جب ان کا یہ حال ہو کہ ایک کمر شمع سے ان کو ڈرا دیا اور بیچارے
تو فقط اشارہ کے تھے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت امیر کا سکوت جو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے افعال
اور حرکات پر تھا یہاں تک کہ غصب نہ کیا کئے۔ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا اور ان سے
بیعت کر لی اور ان کے پیچھے سازیں پڑھتے تھے یہ سب اوجہ حقانیت تھا نہ بوجہ تقیہ ورنہ اس زور
اور قدرت اور اس کرامت کا آدمی اور کون تھا جو ان سے انارشہ یا ہراس رکھتا اور اگر بالفرض یہ زور
اور بل اور یہ قدرت خدا داد کسی میں ہوتی بھی تب غصب و ختم طاہرہ مطہرہ تو ہرگز گوارا نہ ہوتا۔
اہل ہند جو تمام ولایتوں کے لوگوں کے نامزدہ پن میں امام ہیں ان میں کا بھنگی اور چار بھی اس
سہولت سے بیٹی نہیں دیتا جس طرح حضرت امیرؓ نے اپنی دختر مطہرہ کو حضرت عمرؓ کے حوالہ کر دیا

آپ بھی دیکھتے رہے اور صا جزادی بھی، پھر صا جزادوں میں بھی ایک وہ تھے کہ جنہوں نے تیس ہزار فوج جبار کا مقابلہ کیا حالانکہ وہ زمانہ ضعیفی اور تحمل کا تھا اور بہن کے نکاح کے وقت عین شباب تھا اور تیسہرے ساشہ یہ ہے کہ ہنگامہ کر بلا میں جو دشمنان سفاکت نے حرم محترم اور زنان اہلبیت کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو کیا کچھ غضب اور جوش آیا شیعوں کو تو شہادت نامہ کر بلا از بر ہی ہوگا۔ لکھنے کی کیا حاجت۔

تقیہ از روئے عقل و نقل و عرف | بالجملہ روایات شیعہ خود تقیہ کی جڑ اکھاڑتی ہیں فقط سنیوں ہی کا قصور نہیں اور اب آگے اور لکھنا ہمیں ضرور نہیں کہ بحمد اللہ عاقلان منصف کے لئے یہ بھی بہت ہے مگر بنظر اتمام حجت اور مزید توضیح یوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نقل اور عرف سے بھی اس بات میں استغناء کیجئے تاکہ شیعوں کی آنکھیں تو کھلیں کہ ہم کس خواب خرگوش میں مدہوش ہیں جناب من عقل کی رو سے دیکھئے تو پیغمبروں اور اماموں کا تقیہ ایسا ہے جیسے کسی معلم کو لڑکوں کے پڑھانے اور تادیب کے لئے نوکر رکھا جائے اور وہ معلم تعلیم اور تادیب تو درکنار الٹا لڑکوں کے ہمرنگ ہو کر گنبد بلا یا گلی ڈنڈا کھیلنے لگے، تو پیغمبروں اور اماموں کیلئے خدا کی طرف سے تقیہ کا فرض ہونا ایسا ہی ہے جیسا معلم اور مودب کو اہل مکتب یہ حکم دے کہ پڑھائیے، پڑھا چاہیئے تمہارے اور لڑکوں کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلے، خبردار ایسا نہ کرنا اور ان کی تادیب میں تقصیر نہ ہو لیکن جس طرح سے لڑکے چاہیں سر مواس میں تفاوت نہو نہ ان کو ڈرائیو، نہ مارٹیو نہ اپنی طرف سے کچھ کہیو بلکہ وہ کھیلیں تو ان کے ساتھ تم بھی کھیلنے لگیو۔

اب اہل انصاف انصاف فرمائیں کہ یہ بات کچھ عقل کی ہے اور اس میں اور پیغمبروں اور اماموں کے تقیہ میں کیا فرق ہے؟ اور پھر تقیہ بھی اتنا کچھ کہ دین برباد ہو گیا تمام اُمت محمدی گمراہ ہو گئی تیسرا پناہنگ و ناموس جاتا رہا پڑ چلا بیٹے زبان سے کلمۃ الحق نکلے اس کی توبہ نہ آئی۔ کھل کھیلنا تو کجا اور پھر با اینہم حضرات شیعہ معتقد اس بات کے کہ دین شیعہ عین مطابق عقل ہے اور کیونکہ نہ کہیں خداوند کریم تو ان کے اعتقاد کے موافق با اینہم خداوندی اور احکم الحاکمین ہونے کے محکوم عقل ہے اور عقل کی اطاعت اس کے ذمہ فرض ہے۔ واہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدر دانی ہے جب خدا کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو کسی کو کیا شکایت؟ اول تو

خدا کو محکوم بنایا اور اس کے احکم الحاکمین ہونے سے جو کلام اللہ میں بعینہ انھیں الفاظ مذکور ہے ہاتھ اٹھایا دوسرے ایسا خلاف عقل حکم اس کے نام لگایا کہ جس سے بزعم خود نعوذ باللہ خدا کو گنہگار اور تارک فرض ٹھہرایا تعالیٰ اللہ عن ہذہ العیوب علوا کبیرا۔

تقیہ از روئے کلام اللہ اور از روئے نقل تقیہ کا حال پوچھئے تو سینکڑوں آیتیں ایسے تقیہ کی برائی

پر (جیسے حضرات شیعہ آپ کرتے ہیں اور اماموں کے ذمہ لگاتے ہیں) دلالت کرتی ہیں بلکہ

الطی تقیہ نہ کرنے کی خوبیاں کلام اللہ سے جتنی چاہو نکال لو یہاں تک کہ جان کے جانے کے وقت

بھی تقیہ کے نہ کرنے ہی کی بہبودگی کلام اللہ سے ثابت ہوتی ہے کلام اللہ کوئی عنقا چیز نہیں جو

نہ ملے اگر شیعوں کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے میری طرف جعل کا احتمال ہو تو مطابق کر دیکھیں

کہ کلام اللہ میں سورہ بقرہ میں دوسرے سیارہ میں نصف سے کچھ بعد یہ آیت ہے کہ نہیں؟

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاسَاءُ
وَالضَّرَآءُ وَفُتِنُوا لَنْ تُؤْمِنُوا
بِالْقَوْلِ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
مَتَى نَصُرَ اللَّهُ أَكَلَتْ أَنْ نَنْصُرَ
اللَّهُ قَرِيبٌ -

یعنی کیا تم کو اسے مسلمانو یہ گمان ہو گا کہ تم
جنت میں یونہی چلے جاؤ اور تم پر وہ حالت
نگہری ہو جو پہلوں پر نگہری کہ ان کو شدت
کا خوف اور تکلیفیں پیش آئیں اور جھڑ
جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے
ساتھ ایمان دار تھے گھبرا کر یوں کہنے لگے کہ
خدا کی مدد کب ہوگی سو خبردار ہو اللہ کی مدد
قریب ہی لگی ہوئی ہے۔

اور اس آیت کو بھی دیکھ لیں سورہ آل عمران میں چوتھے سیارہ میں مابین ربع اور
نصف کے یہ آیت ہے۔

وَكَايِنُ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ
كَثِيرٌ فَمَا ذَهَبُوا بِمَا أَصَابَهُمْ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ

یعنی بہت سے نبی ہوئے ہیں جنکے ساتھ میں
ہو کر بہت سے اللہ والے دشمنوں کا لڑے ہیں سو
جہادوں میں جو تکلیفیں ان کو پیش آئیں تو ان
تکلیفوں کے باعث وہ کچھ ڈھیلے ہوئے نہ سمست

ہوئے نہ کفار سے کچھ دب بکھے اور اللہ

صابروں سے محبت رکھے ہے۔

تقیہ جنت سے محرومی کا سبب ہے | ان دونوں آیتوں کو خدا بنظر غور اور بحشم انصاف دیکھئے اور بے روی و ریا فرمائیے کہ مرضی جناب باری کس طرف ہے درصوتیکہ عوام مومنین کے حق میں یوں کہا بتلئے تو امام اور پیغمبر تو امام اور پیغمبر ہیں وہ تو دین کی باتوں میں عوام سے بڑھ کر ہوتے ہیں پہلی آیت کی رو سے تو تقیہ کی صورت میں جنت سے امید ہی منقطع ہے پھر اس سے زیادہ اور تقیہ کو کیونکر وضع کرینگے باقی سنیوں کی بے بسی اور بے کسی کا عذر ہو تو جناب باری تعالیٰ نے پہلے اس کا دفعیہ فرمادیا ہے اَلَا اِنَّ نَاصِلَ لِّئِهٖ قَسِيْبٌ يَعْنِيْ كُفْرًا وَّمَتٌ بِهٖا مَدُوْبَا سَہٰی لٰكِيْ ہُوْنٰی ہے۔

خوف کفار سے سست ہونا ممنوع ہوا تقیہ تو دور کی بات ہے | اور دوسری آیت میں تقیہ تو تقیہ کفار کے خوف سے سست ہو جانے اور ضعیف ہو جانے پر تنبیہ کرتے ہیں کیونکہ تقیہ کی برائی کی طرف تو اشارہ و اشارت کا ذوق میں آگیا تھا اس لئے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ اُن لوگوں نے کفار کے آگے باوجود تکلیفات کے پھر ظاہر کی چال پوسی نہ کی اور یہی تقیہ ہے اور کیا تقیہ کے سرسینگ ہیں پھر جو دو باتیں اور فرمائیں کہ نہ سست ہوئے نہ ضعیف ہوئے تقیہ سے دو ممبر اور ادھر کو کھینچا تاکہ اس سے دور رہیں اور اس میں گرفتار نہ ہو جائیں سبحان اللہ خدا بھی کیا منتظم اور مدبر ہے یہ وہی قصہ ہی ”بمگر کش گیر تابہ تپ راضی شود“ لیکن آفرین ہے شیعوں کی بھی ہٹ دھرمی پر کہ تپ پر بھی راضی نہیں ہوتے موت تو درکنار اور کیوں راضی ہوں جہاد کو کیوں سر دھریں اور جہاد کو جب ہو گا جب ہو گا۔ سنیوں کے گھروں کے پلاؤ اور فورے کیوں ہاتھ سے کھوئے اور کیوں ان کے تیر ملامت کا نشانہ ہو کر اپنے نصیبوں کو روئے جنت گئی بلا سے گئی۔

نقد رانبیہ گزاشتہ کار خرد منداں نیست

اور میں نے جو یہ عرض کہ اس آیت میں تقیہ وغیرہ سے روکتے ہیں ہر چند اہل فہم کے نزدیک محتاج بیان نہیں لیکن باندیشہ خوش فہمی شیعہ گزارش ہی لازم ہے اس آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے جسے تامل ہو دیکھ لو کہ جناب باری تعالیٰ اس امت کے لوگوں

کو خاص کر صحابہ کو پہلی امتوں کے حال سنا سنا کر سست ہوئے اور ضعیف ہوئے اور تقیہ کرنے سے روکتے ہیں اب اہل انصاف سے التماس ہے کہ باوجود ان تنبیہات کے اگر کوئی نہ مانے اس کو کیا کہیے وہ ناکارہ لوگوں میں سے ہو گا یا عمدہ اور عمدہ بھی اس قدر کہ مستحق ثواب ہو جیسا اہل تقیہ فرماتے ہیں۔

تقیہ سبب عتاب ہے نہ کہ موجب ثواب | حق تو یوں ہے کہ تقیہ والے مورد عتاب ہیں چنانچہ ان آیات سے ظاہر و باہر ہے ثواب کجا اور تقیہ کر کے منصب پیغمبری اور مرتبہ امانت پر مامور رہنا اور درگناہی سے بھی خیر نہیں خاص کر ایسے تقیہ کے ساتھ کہ بزعم شیعوں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ائمہ کرتے تھے صحابہ معلومین کے ساتھ کہ جو ان کے عقیدے کے موافق نعوذ باللہ ابلیس سے بھی بڑھ کر تھے چنانچہ اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہمیشہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے۔ اور ہمیشہ ان کی رضا جوئی میں عمر عزیز کو بسر کیا خداوند کریم تو ارشاد فرمائے وَلَئِنْ أَتَبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تو بعد حق و ناحق کے معلوم کرنے کے ان کی خواہشوں کے موافق کچھ بھی کرے گا تو تیرا کہیں ٹھکانا نہیں نہ تیرا کوئی دوست تجھے چھڑا سکے گا نہ کوئی تیری مدد کرنے والا ہے جو خدا سے بچالے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم با اس ہمہ مانعت و تہدید پھر بھی ان کی دلجوئی سے باز نہ آئے۔ خدا کی خواہش پر ان کی خواہش کو مقدم رکھا۔

انبیاء خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے | القصہ خداوند کریم تو عوام تک کو تقیہ کے کرنے سے روکے اور شیعہ خواص کو بھی تقیہ کرنے والا اور وہ بھی دائم التقیہ سمجھیں حالانکہ خاص امانت رسالت کے پہنچانے والوں کی (جو شیعوں کے نزدیک بھی پیغمبر اور امام ہیں) جناب باری علامت ہی یہ فرماتا ہے کہ وہ کسی سے ڈرتے نہیں اور اللہ کے پیام کے پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ سورہ احزاب کے پانچویں رکوع میں یہ آیت موجود ہے انبیاء کے حق میں فرماتے ہیں الَّذِينَ يُبَتِّخُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ یعنی انبیاء کے اوصاف یہ ہیں پہنچاتے ہیں اللہ کے پیام اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوا اللہ

کے اور کسی سے نہیں ڈرتے اس آیت کو دیکھئے کہ فقط انبیاء کا نہ ڈرنا ہی اس میں نہیں جو کوئی
 شیعہ یوں کہنے لگے کہ لقیہ دین کے چھپانے کو کہتے ہیں کیا ضرور ہے کہ ڈر ہی کے سبب چھپاتے
 ہوں بلکہ کچھ اور مصلحت ہو۔ سو یہ احتمال اول تو ان کا جی جانتا ہے کہ کیسا نامعقول ہے پھر
 با اس ہمہ شاید کوئی اس بات میں کچھ زبان زور می بھی کرتا لیکن جناب باری تعالیٰ تو
 علام الغیوب، شیعوں کی ہٹ دھرمی تو پہلے ہی سے جانتا تھا اسی لئے پہلے ہی یہ پتہ لگادی
 الذین یبلغون رسالات اللہ -

خاتم الانبیاء کو تبلیغ کا تاکیدی امر | پھر انبیاء میں سے بھی خاص کر جناب سرور کائنات صلی اللہ
 علیہ وسلم کو زرا خاص کر حکم جداگانہ سنایا تاکہ مزید تاکید ہو اور کوئی کسی قسم کی سستی اور
 دمانت ظہور میں نہ آجائے چنانچہ سورہ حجر میں فرماتے ہیں فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ
 عَنِ الْمُشْرِكِینَ یعنی سناوے کھول کر دین کی بات اور مشرکین کا کچھ دھیان نہ کر، اور
 پھر اس کے آگے برابر تاکید پر تاکید اسی بات کی چلی جاتی ہے کہ کہنے میں قصور نہ کر جسے شک
 ہو دیکھ لے اور پھر بایں ہمہ سورہ احزاب میں یوں فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ
 أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَهُوَ غَيْرُ مُتَبَدِّلٍ
 رسول اللہ ہی کا اقتداء نہیں کی چال ڈھال اور راہ و روش پر رہنا اچھا ہے جسے اللہ کی اور پھیلے
 دن کی امید ہے، اس آیت نے ساری امت کے ذمہ یہ بات واجب کر دی جیسے رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم حق بات کے کہنے اور اظہار دین میں دریغ نہیں کرتے تھے تم بھی نہ کرو پھر
 خاص کر ائمہ تو ائمہ ہیں وہ تو تبلیغ دین اور اظہار حق ہی کے لئے بھیجے گئے ہیں بلکہ شیعوں
 کے نزدیک رسولوں سے زیادہ نہیں تو برابری میں تو حرف ہی نہیں اور برابری نہ سہی جب ایک
 کام پر مامور ہوئے تو اس میں اوروں سے تو زیادہ ہی کنج و کاؤ چاہیے

انبیاء اور ان کے نائب سب کا مقصد انذار و تبشیر ہے | معہذا خداوند کریم فرماتے ہیں وَمَا نُرْسِلُ
 الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ - یعنی ہم نہیں بھیجتے مرسلین کو مگر فقط بشارت
 دینے اور ڈرانے کے لئے، اور مرسلین کلام اللہ کی اصطلاح کے موافق فقط پیغمبر ہی کو نہیں
 کہتے بلکہ جو خدا کے احکام پہنچائے پیغمبر یا نائب پیغمبر چنانچہ سورہ یسین میں جَوَازِلَ إِلَيْكُمْ

ہُمْ سَلَوْنَ ہے اس سے نا بُیان حضرت عیسیٰ مراد ہیں حالانکہ وہ بنی نہ تھے نائب بنی تھے اور امام کے تو خود یہی معنی ہیں شیعوں کے نزدیک کہ نائب بنی ہو باقی کوئی یوں کہے کہ حضرت کے یاروں کو جو رسول کہا تو بایں معنی کہ وہ حضرت عیسیٰ کے بھیجے ہوئے تھے اور آیت وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ میں وہ مراد ہیں جو خدا کے بھیجے ہوئے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے نائبوں کے بھیجنے کو بھی خداوند کریم نے اپنی طرف نسبت کیا اور یوں فرمایا ہے اِذَا رَسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ یعنی ہم نے بھیجا اور یوں نہیں فرمایا کہ عیسیٰ نے بھیجا جب حضرت عیسیٰ کے نائبوں کو خداوند کریم اپنا بھیجا ہو امر سل کہے تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب تو اس کے بھیجے ہوئے کیوں نہ ہوں گے اور جب اس کے بھیجے ہوئے اور مرسل ہوئے تو موافق آیت مذکورہ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ ان کا کام بھی یہی ہے بشارت اور ڈرانا۔ پھر اب فرمائیے کہ تہقہ کہاں سے آگیا؟ ہم سے تو نہیں ہو سکتا کہ منہ اُلال کر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اہل ہمار کی نسبت یوں گمان بھی کریں کہ وہ فرمودہ الہی میں سر مو بھی تفاوت کرتے ہوں ہمہ تن اہل ہمار دین میں مشغول تھے اور کیوں نہ ہوں اول تو آیت مذکورہ سے خود مترشح ہے کہ پیغمبر تبلیغ رسالت میں قصور نہیں کرتے پھر نائب کیونکر اخفا کریں گے نہیں تو پھر نائب ہی کیا ہوئے اور مخالف ہوئے (جیسے لکھے کے مٹانے والے)۔

آنحضرت کی بعثت کا مقصد ہی اہل ہمار دین تھا | دوسرے جناب باری تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کی غرض یہی بیان فرماتے ہیں کہ اہل ہمار دین کے لئے ان کو بھیجا ہے سورہ فتح اور سورہ صفت اور سورہ توبہ میں ہے هُوَ الَّذِي ارْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ مَطْلَب یہ ہے کہ خدا ہی نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر تاکہ سارے دنیوں پر غالب اور ظاہر کر دے، اب سنئے کہ اہل ہمار دین اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس آیت میں منسوب ہے تب تو مطلب ہمار ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ اہل ہمار دین خدا ہی کو کرنا مدنظر تھا پھر اس طور پر اور اس سامان سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا سو جو کچھ دین کی ترقی ان کے سبب ہوئی وہ سب خدا

ہی نے کی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں ایسے تھے جیسے کار یگر اور کار کے بیچ میں آلات ہوتے ہیں تو اس صورت میں مطلب ظاہر کیا اظہر ہے کیونکہ خدا کا ارادہ اظہار کا ہو گا تو پھر کون چھپا سکے گا بلکہ اس آیت میں ایک دلیل کامل ہے سنیوں کے مذہب کی حقیقت کی کیونکہ در صورت تقیہ شیعہ جو سنی بن جاتے ہیں تو ظاہر میں دین اہل سنت ہوتا ہے اور باطن میں مذہب شیعہ تو مذہب اہل سنت تو دین حق ٹھہرا اس لئے کہ لینظہر میں جو ضمیر ہے تو دین الحق کی طرف راجع ہے اور مذہب شیعہ علی الدین کلمہ میں داخل رہا۔ اور ظاہر ہے کہ ماسوا دین حق کے سب دین باطل ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ اظہار جو اس آیت سے مقصود ہے وہ حضرت امام ہمدی کے زمانے سے پہلے ہونا چاہیے وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب ہونے کے لئے دو چیزیں ہونی چاہئیں ایک غالب ایک مغلوب، ایسے ہی ایک چیز جو ایک چیز سے ظاہر ہو تو وہ دوسری بھی ہونی چاہیے۔ سو اس آیت میں ظاہر ہے علی الدین کلمہ بھی لینظہر کے ساتھ ہے اور اس کے ملنے سے یہ معنی ہو گئے ہیں کہ اور دینوں سے یہ دین ظاہر ہو گا نہ یہ کہ اور دین باقی ہی نہ رہیں گے۔ سو حضرت امام کے وقت میں شیعہ ہی فرمادیں کہ اور دین رہے گا یا نہیں؟ مہذا لینظہر ارسال سے متعلق ہے تو وہ اظہار ارسال کے متصل ہی چاہیے۔ سو ایسا اظہار سوا مذہب اہل سنت کے اور کسی دین کو اب تک میسر نہیں آیا۔ شیعہ ہی فرمائیں کہ میں جھوٹ کہتا ہوں یا سچ ہے؟ اس کے بعد ہر چند اب کچھ ضرورت نہیں کہ منقولات میں سے ابطال تقیہ کی کوئی سند اور بیان کی جائے۔

تبلیغ دین انبیاء و علماء اور ائمہ پر فرض ہے | لیکن مزید توضیح کے لئے اتنا اور معروض ہے کہ جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو اول دفعہ تو وہ اکیلا ہی ہوتا ہے اگر وہ اظہار حق نہ کرے اور بالکل چپکا بیٹھ رہے تو فرض تبلیغ احکام اس کے ذمہ نہ جاتے اور فرضیت تبلیغ احکام کی انبیاء اور درویشوں اور علماء کے ذمہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور کسی اور پر نہ ہو ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام کی فرضیت اس آیت سے واشکاف ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ

اور اگر یہ نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام، اسی طرح اور لوگوں کو فرماتے ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت بلائی نیک کام کی طرف اور حکم کرتی
اچھی بات کا اور منع کرتی ناپسند کو، سو یہ حکم ظاہر ہے کہ معروف اور منکر کے جاننے والوں
کو ہے سو اسی کا نام عالم اور درویش ہے جتنا کوئی زیادہ جانے و تہی ہی اس کے ذمہ
فرضیت زیادہ ہوگی سو اماموں سے زیادہ اس باب میں اور کون ہو گا بجا لاجلہ اگر انبیاء، مہرگو
منہ پر لگا کر بیٹھ رہیں اور سرے سے منہ کھولیں ہی نہیں تب تو انبیاء کا گنہگار ہونا لازم آئے
گا اور اگر احکام الہی پہنچائیں تو ظاہر ہے کہ احکام الہی تو نفس کے خلاف ہی ہوں گے۔ اسی
واسطے مطیع و فرمان بردار کوئی کوئی ہوتا ہے ورنہ پھر بد بخت کوئی کوئی ہوتا اور جب نفس
کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو لاکھ میں سے ایک تو مثل ابو بکر صدیق کے بے کھٹکے مانتا ہے ورنہ
سو سو تجتین نکالتے ہیں بلکہ لڑتے دشمن ہو جاتے ہیں پھر اس وقت اگر آدمی لوگوں کی بدگوئی اور
اندرسانی سے ہٹ رہے تو اس میں اور دنیا داروں میں کیا فرق رہا ہر کوئی اس کو مطلب کا
یار سمجھ کر دینی تکذیب پر مکر باندھے گا اور جو ساتھ ہو گئے تھے وہ ہٹ رہیں گے سودین کی خیریت
ہوئی اور نبوت بھی ختم ہوئی اور اگر ایسے وقت میں پکارا اور لوگوں کی بدگوئی اور نقصان جان و
مال سے نہ ڈرنا آگے پھر آسانی کا وقت ہے اللہ کا وعدہ ہے کہ بعد شدت اور کلفت کے
نصرت بھیجتا ہے چنانچہ آیت اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ الْاُخْرٰی الْاٰتِ
نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ہے اپنے مقابل سے مل کر یہی کہتا ہے اور جب آسانی ہوئی اور خدا کی مدد
آپہنچی تو پھر تقیہ کس مرض کی دوا ہے الغرض انبیاء کے حق میں کوئی صورت تقیہ کے روا ہونے
کی معلوم نہیں ہوتی اور چونکہ ائمہ ہدی بھی نائبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور نائب کا
وہی کام ہوتا ہے جس کام کے لئے مینیب ہوا کرتا ہے تو بیشک تبلیغ احکام ان کے ذمہ میں۔
فرض ہوگی اور ان کی کیا تخصیص ہے سب ہی پر فرض ہے۔ چنانچہ ابھی مرقوم ہوا لیکن یہ خاص
اسی کام کے لئے ہوتے ہیں اور پھر ائمہ ہدی معصوم بھی ہیں صدور گناہ کا احتمال نہیں تو ان
سے بھی تقیہ کا ہونا ممکن نہیں جیسے کہ انبیاء سے ممکن نہیں۔

آنحضرت کی مکی زندگی تقیہ کا استیصال ہے | سو بفضلہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کے احوال کے مطابق کرنے سے یونہی معاموم ہوتا ہے کہ حق گوئی میں انہوں نے ذرہ برابر دریغ نہیں کیا بلکہ اس سبب سے جان و مال عزت و اکبر و سب کو برباد کیا ہے اور اپنی بات سے نہیں ہٹے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تو ظاہر ہے سب اہل اسلام نے سنا ہوگا، آپ کی انداؤں کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ساہا سال تک کفار نے ذات برادری سے نکالے رکھا مکہ سے باہر ٹپے ہے یہ عہد کر لیا تھا کہ ان سے نہ کوئی بیع و شرا کرے نہ ان کا کوئی کام مزدوری غیر مزدوری سے کر دے اور زبانی طعن و تشنیع اور دشنام اور دست درازیاں تو جدار ہیں۔ آخر یہ ہوا کہ قتل کا ارادہ ہوا اور آپ چھپ کر مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اگر تقیہ فرض کیا درست بھی ہوتا تو آپ کیوں اتنے مصائب اٹھاتے اور کیوں بیت جیسی اشرف چیز کو چھوڑ کر آتے ابو لہب اور ابو جہل کیوں دشمن ہوتے برائے خدا کوئی تبتائے تو سہی کہ ان ملعونوں کو سوائے حق گوئی کے اپنے اور کیا ستایا تھا زمین ملک ان کے نہیں رہا لے تھے ملک و دولت ان کے نہیں چھین لئے تھے علی ہذا القیاس حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آگ میں ڈالے گئے اور ہجرت کر کے وطن سے چلے آئے تو اپنے سوا حق گوئی اور اظہار حق کے اور کیا گناہ کیا تھا بابل جملہ مثل آفتاب روشن ہو گیا کہ انبیاء نے نہ تقیہ کیا اور نہ ان سے تقیہ ہو سکے۔

علی ہذا القیاس جو ان کے نائب ہیں نہ انہوں نے تقیہ کیا نہ ان سے ہو سکے، چنانچہ حضرت امام حسین سید الشہداء کی جان نازنین پر جو کچھ گذرا وہ سب جانتے ہیں عاٹ اس کا فقط حق گوئی تھا ورنہ یزید کا کلمہ کہہ دیتے تو جان کی جان بچتی اور الٹی مال و دولت اور اعزاز و اکرام ہوتا اور حضرت امام الاممہ حضرت امیر کا امیر معاویہ سے لڑنا سب پر روشن ہے سوائے ان کے اور اماموں کا حال بھی سنا ہوگا کہ سلاطین سفاک کے ہاتھ سے کیا کیا اندائیں ان کے نصیب ہوئیں قید خانوں میں محبوس رہے اگر تقیہ کر لیتے تو کیوں یہ ذلت اور خواری اور کیوں یہ محنت و دشواری اٹھاتے؟ ہاں عوام مومنین کی نسبت اگر کوئی کہے تو فرضیت تو درکنار البتہ جواز معلوم ہوتا ہے اگر عذر قرار واقعی ہو، مثلاً لڑکے اور عورتیں اور اندھے

اور لنگڑے اور اپاہج اور قیدی اور سوا اس کے جو کوئی ایسا ہی ناچار ہو تو اس کو بقدر ضرورت کفار سے موافقت جائز ہے بشرطیکہ جان کا یا کسی عضو کا اندیشہ ہو (اپنی یا اپنی اولاد یا ماں باپ وغیرہ کا) اور اگر کچھ یونہی تکلیف کا اندیشہ ہو جسے تحمل کر سکے تو پھر کفار سے موافقت کرنی ہرگز جائز نہیں۔

صبر کے فضائل اور ترغیب جس سے اور بایں ہمہ پھر ثواب اس میں ہے کہ تقیہ نہ کرے تقیہ کی حقیقت کھاتی ہے۔ کیونکہ صبر کی جو جا بجا تعریفیں کتاب اللہ میں آئی ہیں تو

ایسوں ہی کے واسطے ہیں نہیں تو تقیہ میں کیا ایذا تھی جو صبر کی ضرورت ہوتی اس میں تواؤ بلاؤ اور متخین میسر آتے ہیں اور حضرت اور قبلہ بن جاتے ہیں اسی لئے کلام اللہ میں جتنی صبر کی تاکید ہے اتنی کسی اور چیز کی نہیں۔ وَالْعَصَى إِنَّ الْإِنْسَانَ كَفِي خُشْيٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَكَوَا صَوَابًا لِّحَقِّ وَكَوَا صَوَابًا لِّصَّبْرٍ لِّعِنَ سَبِّ الْإِنْسَانِ لِي میں ہیں مگر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق گوئی اور حق پر قائم رہنے اور صبر کی نصیحت کی شیعوں کے مذہب میں حق گوئی تو کہاں، حق کے دبا لینے کی تاکید ہے، ابو بکر صدیق کو تو ایک فدک کے دبا لینے میں اس قدر برا کہتے ہیں یہ جو تمام حق خداوندی یعنی دین حق کے دبا لینے کی فرضیت کے قایل ہیں ان پر کتنے ہزار لعنت چاہیے؟ اور سوا اس کے إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَلَا وَغِيرَ آيَاتِ صَبْرٍ سے کلام اللہ سمجھا ہوا ہے اگر تقیہ فرض ہوتا صبر کوڑی کے کام کا بھی نہ تھا۔ معہذا کہیں ایک جگہ گو اس کا حکم آیا نا بجملة اگر تقیہ کہیں ہے بھی تو عوام کے واسطے ہے اور ان میں بھی مغدوروں کے لئے نہ ہر کسی کے لئے اور ان کے واسطے بھی جان کے خوف میں اور وہ بھی جائز ہے واجب نہیں بلکہ ثواب کی بات یہی ہے کہ نہ کرے اور کرے بھی تو واجب ہے کہ بقدر ضرورت کرے۔

جہاں اظہار حق نہ ہو سکے ہجرت واجب ہے اور عین حالت تقیہ ہجرت کی فکر میں ہے اور جب قدرت پائے آنکھ بچا کر کہیں ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں اظہار حق سے کوئی مانع نہ ہو کیونکہ کلام اللہ میں ہجرت کی برابر تاکیدیں بھری ہوئی ہیں۔ إِنَّ آذِيَ وَأُسْعَةَ

خَائِيَا فَاَعْبُدُون۔ یعنی میری زمین واسعہ ہے گھر کی کیا تخصیص ہے جہاں بن پڑے وہاں ہی چلے جاؤ اور میری ہی عبادت کرو۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كُوْفُوْهُمُ اَمْلَا دِيْكَهٗ ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِمْ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعِفِيْنَ فِيْ الْاَرْضِ قَالُوْا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاَسْعٰ فَتَهَا جِرْ وَاَفِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَا وُعِدْ جَهَنَّمُ وَاَسَآءُتْ مَّصِيْرًا۔ یعنی جو لوگ ملائکہ ان کی جانیں قبض کرتے ہیں اور وہ ہجرت کے مقدمہ میں تقصیر کرتے تو فرشتے ان سے کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ اور کہتے ہیں کہ ہم ضعیف تھے بے بس ایک زمین میں پڑے تھے فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین واسع نہ تھی جو تم ہجرت کر لیتے سو ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے انجام کی، اور سو ان آیات کے اور بہت آیات میں ہجرت کا حکم ہے سو ہجرت کا حکم اسی اندیشہ سے ہوتا ہے کہ احکام دینی ظاہر نہیں ہو سکا کرتے بالجملہ عوام کو یہ بشر الطمانہ کو رہ جائز ہی واجب نہیں، ورنہ ایسے ہی ہٹے کٹوں کو جو زمین میں لات ماریں تو پانی نکل آئے ہرگز اخفا حق جائز نہیں ان کو یہ لازم ہے کہ اگر وطن میں یا جہاں کہیں وہ ہوں اظہار حق نہ کر سکیں تو وطن چھوڑ کر چلے جائیں۔

اگر وہ میں بھی اظہار حق افضل ہے۔ چنانچہ آیہ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَيُحَذِّرْكُمْ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلٰى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ فقط اتنی ہی اجازت پر دلالت کرتی ہے کہ اپنا بچاؤ کر لو پر کفار سے موافقت اور دوستی مت کرو سو بچاؤ تو یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی اس جگہ سے چلے لیکن خاطر کے لئے، معنی ساری آیت کے لکھے دیتا ہوں حاصل یہ ہے کہ مومن کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور ان سے موافقت اور صلح نہ رکھیں، مومنوں کو سوا خدا کے اور کسی کی موافقت اور دوستی نہیں چاہی اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے حساب سے کسی شمار میں نہیں گہراں یہ تمہیں اختیار ہے کہ کچھ اپنا بچاؤ کر لو اور پھر یہ کہ اللہ اپنے آپ سے ڈرائے ہے اور پھر اللہ کی طرف سب کا ٹھکانا ہے یعنی مجھ سے ڈرنا چاہیے کہ میری طرف آنا ہے کافروں سے کیا ڈرتے ہو ان سے موافقت تو

جب کر لے جب ان کی طرف تمہیں جانا ہوتا تھا تو فقط ہاں اگر آدمی ان کے پنجوں میں پھنس جائے مجوس ہو یا مثل مجوسوں کے جیسے اندھے اپاہج لنگڑے لو لے لڑکے بچے عورتیں بیمار اور پھر تسپر کفار زبردستی بھی کریں اور وہ زبردستی بھی ایسی ہو کہ عادت کے موافق اس کو اٹھا نہیں سکتا جیسے قید و قتل تو خیر اختیار ہے اگرچہ ثواب اس میں ہے کھل کھیلے کیونکہ اَلَا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِاَلَا تَحْتِاٰنِ سے فقط اجازت ہی معلوم ہوتی ہے کہ اکراہ کی صورت میں فقط بظاہر موافقت کر لے۔ سو اکراہ اسے ہی کہتے ہیں جو مذکور ہو لیکن ان آیات سے جو خدا کی راہ میں مارے جانے کے فضائل ان میں بیان ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ثواب انہیں ہی میں ہے۔

سیدنا ابراہیم کے کسی واقعہ سے اخفاء دین ثابت نہیں باقی حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا کوئی زبان پر لائے تو کمال بے حیائی کی بات ہے انہوں نے بظاہر جھوٹ بولا، حقیقت میں جھوٹ نہیں بولا قصہ ان کا معروض ہے معلوم ہو جائے گا جب حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا اور بت پرستی سے منع کیا اور بتوں کی ہجو کرنی شروع کر دی تو حضرت کے باپ ہی اول تو مخالف ہو گئے اور ان کا کہنا ماننا اور در کنارہ ان کو دھمکانا شروع کیا یہ س فکر میں تھے کہ کسی طرح ان کے بتوں کو توڑیے اتفاقاً کفار کی عید کا دن آگیا لوگ ان کے پاس بھی آئے کہ چلو انھوں نے ستاروں کی طرف دیکھ کے یا کتاب (نجوم کی) دیکھ کے یوں فرمایا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں کفار نے سمجھا کہ جیسے ہم نجوم کا اعتبار کرتے ہیں یہ بھی نجوم کو مانتے ہیں سو انہیں نجوم کی راہ سے کچھ یوں معلوم ہوا ہے کہ میں جاؤں گا تو بیمار ہو جاؤں گا اور یہاں حقیقت میں ستاروں کو یا کتاب کو برائے نام ہی دیکھا تھا، اور یہ جو کہتا تھا کہ میں بیمار ہو جاؤں گا، یا تو کچھ آثار بیماری ہونگے یا آدمی بیمار ہوا ہی کرتے ہیں اور یہ ان سے کہا ہی نہ تھا کہ مجھے ستاروں کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار ہو جاؤں گا جو جھوٹ ہوتا تھا وہ یہ ہی سمجھ گئے کہ انہیں نجوم سے یہ بات معلوم ہوئی جب وہ اپنی عید میں چلے گئے تو انہوں نے ان کے سب بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا پر ایک بڑے بت کو کچھ نہ کہا۔

آخر جب کفار ہٹ کر آئے تو انہیں خبر ہوئی انہیں ہی اپنے بتوں کا دشمن سمجھتے تھے

سوانہیں ہی پکڑا ان سے جو پوچھا تو انہوں نے استہزاء کے طور پر کہا کہ صاحب اس بڑے
بت نے یہ کام کیا ہے سو یہ دوسرا جھوٹ ہے کہ جسے کوئی دیوانہ بھی یوں نہ کہے کہ یہ ایسا جھوٹ
ہے جسے ہم جھوٹ سمجھتے ہیں بلکہ ایسی بات ہمارے محاورہ میں بڑا پس گنا جاتا ہے ان دونوں
قصوں کو غور کیجئے اور پھر فرمائیے کہ یہ اخفاء حق ہے یا اظہار حق ہے اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ
اسی کام کی بدولت آگ میں ڈالے گئے خاص کر یوں کہنا کہ بڑے نے کیا ہے یہ جھوٹ کیا پس
سے بھی زیادہ اصلی مطلب پر دلالت کرتا ہے سب جانتے ہیں کہ یہ جواب کیا تھا ایک چڑانا تھا۔
ایسے میں تو ان کو غصہ نہ آتا تب آتا اور حقیقت میں چھپاتے تو دین کو اس وقت چھپاتے، سو
چھپانا تو رکنار حضرت نے اول تو ان کو چڑایا اور پھر کیا کیا سوال جواب کئے کہ رستم کا حوصلہ
نہیں جو ایسے وقت میں ایسی بات کہے اور اول دفعہ جو ان کو نجوم کی طرف دیکھ کر دھوکا دیا تو
کچھ جان کا بچاؤ آپ کو مد نظر نہ تھا مال کا بچاؤ آپ کو مد نظر نہ تھا ابرو کا پاس آپ کو نہ تھا بلکہ اپنی
جان کے کھونے کا شوق لگا تھا فقط مطلب اتنا تھا کہ یہ جائیں تو تنہائی میں ان کے بت
ٹکڑے کئے جائیں۔ سو یہ کام کرنا جان پر کھیلنا تھا ہاں اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ رسوم کفار
اور ان کی عبادت اور اشعار سے بھی یکسو رہیں بہر حال یہ جانبازی کا سامان تھا۔ اور
جانبازی کو تقیہ کہنا ایسوں ہی کا کام ہے کہ جنکو دُم کی اور ناک کی تمیز نہ ہو۔

اخفائے علاقہ زوجیت اخفائے دین نہیں ہے بارے رہا تیسرا جھوٹ وہ یہ ہے کہ حضرت اپنی بیوی
سارہ کو لئے ہوئے ہجرت کئے ہوئے جاتے تھے ایک بستی میں جا کر پہنچے جہاں کا حاکم بڑا ظالم اور
ہیبت زانی تھا اس کے شیطانی لشکر میں سے کسی نے حضرت سارہ کے حسن و جمال کی خبر کر لی
اس مردود نے ان کو بلوا بھیجا تب حضرت ابراہیم نے بایں خیال کہ اگر اس مردود کو حضرت سارہ
کا کچھ زیادہ خیال ہو تو یوں سمجھ کر کہ خاوند کو سب سے زیادہ غیرت ہوتی ہے ایسا نہ ہو پچھا کریں
مجھ کو مروانہ ڈالے۔ جب حضرت سارہ کے لئے جانے کو اس کے پیادہ آگئے تو یوں فرمایا کہ اے
سارہ اگر وہ ظالم تجھ سے پوچھے تو یوں کہنا کہ میں ابراہیم کی بہن ہوں کیوں میں تو دونوں بی
بہن بھائی ہیں معہذا حضرت سارہ حضرت ابراہیم کے چچا کی بیٹی بھی تھیں تو یہ بھی حقیقت میں
جھوٹ نہ تھا اور اگر بالفرض والتقدیر یہ کہنا جھوٹ ہی تھا تب دین کا اخفاء تو نہ تھا اگر اخفاء

تھا تو علاقہ زوجیت کا اخفاء تھا اور وہ بھی بایں غرض کہ یہ جان جو حق کوئی جانے کے لائق ہے ایسا نہ ہو کہ ایسے قصہ میں جائے اور خدا کی راہ میں جاں نثاری کا ارمان دل کا دل میں رہ جائے غرض اس جگہ جان کا بچانا بھی اسی لئے تھا کہ کل کو اظہار حق کروں اور خدا کے کام میں جان دوں ایسے قصے میں نہ مروں۔ بالجماعہ حضرت ابراہیم کے معاملات سے تفتیہ کا پتہ کرنا کمال دانشمندی اور خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے علیٰ ہذا القیاس جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کر جانا اور غار ثور میں چھپنا یہ سب کا سب اظہار حق کے باعث تھا، ورنہ ابو جہل اور کفار مکہ کی موافقت میں تو کچھ زبانی ہی نہ تھا۔ اس کو تفتیہ کہنا اس سے بھی بڑھ کر ہے ایسا تفتیہ یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کے وار کو ڈھال سے روکتا ہے اگر بچاؤ کر لینے کے معنی تفتیہ ہے تو یہ تو عین اظہار حق ہے کیونکہ بچاؤ کی وجہ ہی ضرورت پڑتی ہے کہ دوسرا کوئی دریغ نہ ایلان ہو۔

بچاؤ اور تفتیہ میں فرق عظیم ہے | اس مقام پر ہر کسی نے غالباً تفتیہ شیعہ اور بچاؤ میں فرق سمجھ لیا ہو گا پر مزید توضیح کے لئے میں بھی کچھ عرض کئے دیتا ہوں تفتیہ مصطلح شیعہ میں دشمن کے دل سے خیال انداز ہی نکل جائے ہے۔ کیونکہ تفتیہ میں تو اپنے مذہب کا فقط بدل لینا اور اپنے آپ کو ہم مذہب دشمن بنالینا ہوتا ہے سو چونکہ اختلاف مذہب میں دشمنی دینی کے باعث تفتیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو در صورت تبدیل مذہب دشمنی ہی نہ رہے گی بلکہ برعکس دوستی بن جائے گی اور بچاؤ کی صورت میں دشمنی اور بڑھ جاتی ہے اور خیال انداز سانی دوبالا ہو جاتا ہے کیونکہ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب تک دشمن اپنے قابو میں رہتا ہے اور ایسا موقع ہوتا ہے کہ اس کو ایذا دے سکیں۔ تو اس کا اول تو کچھ چنداں رشک نہیں ہوتا دوسریوں نے فکری ہوتی ہے کہ جب چاہیں گے اسے ذلیل و خوار کر دیں گے تیسرے جب وہ کچھ اپنا بچاؤ کر لیتا ہے تو پھر اپنا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اب یہ ہم پر وار نہ کرے تو ان وجوہ سے علماء کو خیال انداز سانی تمام قدور زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے میں جو کچھ ان سے بن پڑا کرتا ہے دریغ نہیں کیا کرتے تو اس صورت میں مقربانِ الہی کو سخت مصیبت پیش آیا کرتی ہے بالجماعہ یہ فرق لطیف یاد رکھنا چاہیے کہ بہت کارآمد ہے۔

حضرت امیر (نبرعم شیعہ) سنت احمدی و ابراہیمی | جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب اہل انصاف و موسوی پر عمل پیرا نہ ہو سکے | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و جو

ہنگام قیام مکہ معظمہ اور اثنائے ہجرت میں پیش آئے حضرت امیر کے احوال سے جو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش آئے ملا کر دیکھیں اگر اصحاب کرام مرتد ہو گئے تھے تو بیشک حضرت امیر بھی حکم متابعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ویسے ہی پیش آتے، جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل اور امیہ بن خلف وغیرہم سے پیش آئے اور آپ بھی وہ سانچے گذرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گذرے آخر کو ایک نہ ایک دن تو نوبت ہجرت پہونچتی اور سنت احمدی اور سنت ابراہیمی اور سنت موسوی کی تکمیل ہو جاتی۔ لیکن شکایت تو یہ ہے کہ حضرت امیر نے کبھی منہ کھول کر ایک فوج بھی یوں نہ فرمایا کہ میں دین حق پر ہوں اور تم دین باطل پر اور اگر آپ نے اظہار حق کیا تو دو حال سے خالی نہیں کہ یا اصحاب نے انکار مانا تسلیم کر لیا تب تو تقیہ کی کیا ضرورت اور ان پر کیا اعتراض ہے؟ بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ عین موافق مرضی مرتضوی ہوا اور نہ مانا تو کیا سبب کہ ایسے دشمن کو کسی قسم کی اندازہ دئی اور اگر یوں کہئے کہ بسبب شجاعت مرتضوی یا امداد خداوندی کے وہ کچھ ایذا نہ پہنچا سکے تو اول تو یہ خلاف معقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے حضرت امیر سے کم تھے جو آپ پر یہ آفتیں آئیں حاشا و کلا جو حضرت امیر نے کبھی تقیہ کیا ہوا اگر تقیہ کرتے تو مکہ معظمہ ہی میں کرتے اور کبھی کیا ہوتا تو امیر معاویہ کے ساتھ ضرور کر لیتے بہت ہوتا تو یہ ہوتا کہ قاتلان عثمان مارے جاتے وہ کون سے آپ کو ایسے عزیز تھے کہ جن کے پاس و لحاظ میں اتنے کچھ شرف و فساد کے دین میں روادار ہوئے۔

حضرت سید الشہداء نے تو بے گناہوں کو اور وہ بے گناہ بھی کیسے کہ اپنے قوت بازو اور اپنے لخت جگر کو اس دین ہی کی بابت قتل کروایا اور اپنے آپ بھی جان بحق ہوئے اور زن و فرزند ننگ و ناموس کا بھی کچھ لحاظ نہ فرمایا حالانکہ یہ سب کشت و خون بظاہر لا حاصل تھا تیس ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں اتنے آدمیوں اور اس بے سرو سامانی پر کیا امید کامیابی تھی بخلاف حضرت امیر کے کہ وہ اگر قاتلان عثمان غنی کو امیر معاویہ کے حوالہ کر دیتے تو خلافت کی خلافت

بنی رہتی ایک باغی جو مسعد دین تھا اپنا مطیع و متقاد ہو جاتا دین کی ترقی ہوتی، اور پھر بائیں ہمہ کچھ بے جا بھی نہ تھا آخر قاتلان حضرت عثمان ظالم تھے مظلوم نہ تھے اور نہ سہی ہمراہیاں امام الشہداء کے برابر تو بے گناہ بھی نہ تھے حق یوں ہے کہ یہ سب تہمت اخفاء حق اور عیب نامردہ پن ان حضرات شیعہ کا لگا یا ہوا ہے سبحانک ہذا جہتان عظیمہ۔

دوران خلافت میں بھی امیر پر تقیہ واجب تھا اور طرفہ تر شیعوں کا گزشتہ اور سنئے سید مرتضیٰ جو بڑے محقق مذہب شیعہ ہیں وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت امیر پر اپنی خلافت اور حکومت کے زمانے میں بھی تقیہ باقی تھا، الہی یہ تقیہ نہ ہوا ایک جان کا وبال ہوا کسی راہ حضرت امیر کا پیچھا چھوڑتا ہی نہیں مگر کوئی ان سے پوچھے کہ اگر اس وقت بھی تقیہ ان پر واجب تھا تو امیر معاویہ کو کیوں معزول کیا حضرت تو پہلے سے ان سے ڈریں تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اس شخص کا مگر بہت بڑا ہے حالانکہ مغیرہ بن شعبہ اور عبداللہ بن عباس کی صلاح بھی یہی تھی کہ ابھی معزول نہ فرمائیے بعد استقامت معزول فرمائیے مگر آپ نے نہ مانا اور یہ نہ ماننا آخر کو موجب کیا کیا خرابیوں کا ہوا یہ سب شیعوں ہی کی کتابوں میں ہے۔

سید مرتضیٰ صاحب کی دلیل سنئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلافت مرتضوی برائے نام تھی امیر معاویہ ہمیشہ ان سے لڑتے رہے مہند آپ کی فوج اور آپ کے ساتھی اکثر اولاد صحابہ تھے جو آپ کے دشمن جان گذرے ہیں اور ان کے دل میں خلیفہ اول اور ثانی کا عدل اور فضل جما ہوا تھا اگر حضرت امیر اس وقت کما بینغی اظہار حق کرتے تو بہت دشواری ہو جاتی گمان غالب تھا کہ فوج بھی پھر جاتی اس سبب سے عالم خلافت میں بھی ان پر تقیہ واجب تھا اور اظہار حق حرام،

اس اعتقاد میں ہر چند سید مرتضیٰ نے تمام امامیوں کا خلاف کیا ہے کیونکہ وہ سب اس بات کے قائل ہیں کہ قبل خلافت آپ پر تقیہ واجب تھا اور بعد خلافت آپ پر بھی حرام تھا۔ لیکن بزرگ خود بڑی دور اندیشی اور کمال چالاکی کمری تھی پر خدا نے چلنے نہ دی۔

خلافت امیر میں تقیہ کے بہتان کا پس منظر انہوں نے اپنے عندیہ میں اس کا بچاؤ کیا تھا۔ کہ مبادا کوئی سنی حضرت کے ایام خلافت کے خطبوں اور ملفوظات کو جن میں اصحاب کرام خصوصاً

خلیفہ اول اور خلیفہ ثانی کی تعریف ہے دیکھ کر ناک میں دم کر دے یا یہ گرفت کر بیٹھے کہ دین
 شیعہ حق ہے تو حضرت امیر کی خلافت تو سب میں اخیر تھی آپ نے کیوں نہ اس کو شائع
 ذائع کیا اگر آپ دین شیعہ کو رواج دیتے اور اسے مشہور کرتے تو روئے زمین میں ہی دین
 ہوتا اور سینوں کا دین نیست و نابود ہو جاتا جیسے ابو بکر اور عمر نے رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کے دین کو تمہارے گمان کے موافق نیست و نابود کر دیا اور اپنا ساختہ پر داخہ
 مروج کر دیا اور آپ کے بعد کسی نے دین کے باب میں چنداں کنج کا وہیں بسوا آپ ہی کا دین
 باقی رہنا چاہیے تھا القصر حضرت امیر آخر میں خلیفہ ہوئے تھے یہ بات دین کی ترقی کے لئے
 ایسی مفید ہوئی تھی کہ در صورت برعکس ترتیب کے ہرگز متصور نہیں پھر کیا سبب کہ دین اہل
 سنت و جماعت ہی مشہور رہا اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی دین اہل سنت ہی
 پسند تھا۔ الغرض اس اندیشہ سے سید مرتضیٰ صاحب نے یہ چکر کھایا اور یہ پلٹے لئے تھے
 حضرت امیر و سائل رکھتے ہوئے بھی اظہار دین نہ کر سکے لیکن یہ نہ سوچیں کہ خلافت اور ولایت اسے
 کہتے ہیں کہ ملک میں تصرف ہو حکم احکام چلتے ہوں محصول اور خراج رعیت سے وصول کر سکے
 چور قزاق کو نہرادے سکے سو یہ بات سوار شام کے اور کون سے ملک میں حاصل نہ تھی خصوصاً
 حجاز اور عمان اور حرمین اور بحرین اور عراقین اور آذربائیجان اور فارس اور خراسان میں
 بے کھٹکے آپ کی حکومت تھی پھر یہ کھوڑی سلطنت تھی امیر معاویہ کے پاس تو اتنا ملک تھا
 بھی نہیں وہ اپنے ملک میں جو حکم چاہتے تھے جاری کرتے تھے ادھر ابو بکر صدیق کو دیکھو
 کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط ملک عرب میں حکومت چھوڑ کر اس عالم سے تشریف لے
 گئے تھے اور پھر سپر چار طرف معاندین زور پر تھے مسلمان کذاب اور بنو حنیفہ ملک یمامہ میں
 ایک طرف اور سجاح متبیینہ بنی تمیم میں کہ ان سے بڑھ کر عرب میں کوئی قبیلہ ہی نہ تھا جیسا برسر
 پر خاش، منکرین زکوٰۃ اپنی ہی طرف کو کھینچ رہے تھے بنو عسفان جامہ سے باہر جدا نکلتے جاتے
 تھے ادھر گرد و نواح مدینہ کے مرتدین کا جلا زور شور تھا آپ کے ساتھ گئے چنے مکہ
 مدینہ والے ہی تھے اور پھر بائیں ہمہ کسی بات میں کسی سے نہ دبے، اور کسی حکم میں ممانعت
 نہ کی اگر زکوٰۃ نہ دینے والوں کو ان کے طور پر راہنی کر دیتے اور اوروں کو ان کے طور

پر تو کچھ مشقت نہ ہوئی۔

صدیق نے بے سرو سامانی میں اظہار حق کیا | ابو بکر صدیق باوجود اس قلت سامان اور عدم شجاعت کے اتنے دشمنوں سے بھی نہ گھبرائے۔ حالانکہ اکثر ان کے دشمن لڑائی کے مشاق تھے اور بعضے بعضے تو چھوٹے سے بادشاہ تھے۔ اور حضرت علی با اینہم شجاعت و کرامت اور زور و قدرت اور شوکت اور سلطنت اور امامت و ولایت کہ ابو بکر کو ایک بھی ان اوصاف جزئیہ میں سے نصیب نہ تھا اظہار حق میں (اور بھی کسی امر میں نہیں) اتنی سستی فرمائی کہ اگر ابو بکر صدیق کو یہ اوصاف کہیں سے مل جاتے پھر کافر نام کوئی پھونس آدمی بھی دنیا میں رہتا تو ہمارا ذمہ تھا باقی یہ کہنا کہ آپ کی فوج اکثر اولاد صحابہ تھی اگر کوئی سنی کہتا تو زیب بھی دیتا، سید مرتضیٰ صاحب کس منہ سے کہتے ہیں قاضی نور اللہ صاحب کی نہیں سنتے وہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت علی کے ساتھ قریش میں سے کل پانچ ہی آدمی تھے باقی تیرہ قبیلہ معاویہ کے ساتھ اس لئے آپ کو فتح میسر نہ ہوئی۔ بالجملہ شیعوں کے اقرار سے آپ کے ہمراہی کو فیان جانشین تھے جو مقتدایان شیعہ ہیں اگر وہ نہ ہوتے اور صحابہ کی اولاد ہی ہوتی تو جیسے ان کو عدل اور فضل شیخین کا دیکھ بھالے، اعتقاد تھا اور اس کے باعث ان کی راہ روش پسندیدہ تھی ایسے ہی اپنے ماں باپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی سنے سنائے یاد تھا۔

معہذا اگر پھر جاتے تو کیا تھا آخر دین مرتضوی میں وہ وہ آسائشیں اور سہولتیں ہیں کہ منکر بھی معتقد ہو جاتے متعہ کا آوازہ سن کر امیر معاویہ کے ہمراہی بھی ہمراہ ہو جاتے بلکہ جس اہل مذہب کے کان میں یہ بشارت پہنچتی کہ جیتے جی یہ مزے ہیں اور مکر یہ مرتبے۔ کیسے ہی دین کے پکے کیوں نہ ہوتے حضرت امیر کی ہمراہی اختیار کرتے علاوہ بریں غسل رجائین کی تخفیف تراویح سے بے کھٹکے ایسا دین اور ایسا ایمان تو قسمت ہی سے ملتا ہے اگر اظہار دین خود کرتے تو تمام ملک عرب اور طوائف عجم مدد و معاون ہوتے۔ سبحان اللہ سنیوں سے مقابلہ اور پھر یہ سامان، اتنا ہی سوچا ہوتا کہ ابتداء سے لے کر آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدد و معاون وہی لوگ تھے جو آپ کے دشمنان جانی کے بھائی

برادر یا اولاد تھے خالد بن الولید عکرمہ بن ابی جہل بلکہ خود حضرت عمرؓ کہ ابو جہل کے بھانجے اور ابو بکر صدیقؓ ابو قحافہ کے بیٹے، حضرت عثمانؓ ابوسفیان کے قرابتی، علیؓ ہذا القیاس اور لوگ ایسے ہی تھے۔

مقربان الہی کا طریقہ انہما حق کرنا اور جفا میں اٹھانا ہے اب بس کیجئے اور ایک دو آیت لکھ دیجئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ مقربان الہی کا کام ہمیشہ سے ستم کشی اعداء دین رہا ہے۔ اور مدام اچھے لوگوں نے ان کے ہاتھ سے انہما میں اٹھائی ہیں اور خداوند کریم کو دین کے مقدمہ میں سختی اور سختی پسندیدہ ہے نہ کہ سستی اور ملاہنت **إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَالَّذِينَ يَأْهَرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ**۔ یعنی جو لوگ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جو حق بات کہتے ہیں ان کو سخت عذاب کی بشارت سنا دے، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اور اچھے لوگ تقیہ نہیں کرتے بلکہ حق گوئی میں دریغ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ان کو قتل کر دیتے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ذَالِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔ یعنی اے ایمان والو جو تم میں سے مرتد ہو جائے گا تو بلا سے اللہ اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے خدا کو محبت ہوگی اور خدا سے ان کو محبت ہوگی مومنوں کے سامنے تو ذلیل نظر آئیں گے اور کافروں کے سامنے بڑے سخت ہوں گے خدا کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اور کسی کے بھلا برا کہنے سے نہ ڈریں گے، اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے محب و محبوب وہی لوگ ہیں جو کافروں کے سامنے دب کر نہ رہیں اور ان کی خوشامد نہ کریں۔ بلکہ ان سے کچھ ہی رہیں اور کسی کی ملامت سے نہ ڈریں اب فرمائیے کہ تقیہ میں سوا کفار کی خوشامد اور ان کی موافقت اور اندیشہ ملامت کے اور کیا ہوتا ہے؟ اس صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ محبوبوں اور محبتوں کا کام نہیں بلکہ دشمنان

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے۔

تقیہ عرف اور دستور کی کوئی پرہیز اب الحمد للہ کہ عاقلان منصف کے لئے خوبی تقیہ عقل و نقل سے خوب واضح ہو گئی مناسب وقت یوں ہے کہ عرف اور دستور خلالت پر بھی اس کو منطبق کر کے کچھ اس کی بزرگی بتلا دیجئے۔ جملہ آفاق میں پسندیدہ خلالت پختگی اور استقامت اور تلون کو سب لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ خاص کر دین کے مقدمات اور وہ بھی پھراتنا کہ ایک دفعہ شور اشوری اور پھر بالکل بے نکلی، سو بیخبران دین اور ائمہ ہدیٰ اگر ایک دفعہ احکام دین سنا کر پھر خوف جان یا خوف آبرو سے ہم کاٹھ کفار ہو جائیں تو سب کے نزدیک یہ ذہن نشین ہو جائے کہ یہ لوگ خام طمع دنیا طلب ہیں۔ پھر وہ معجزات کا عطا ہونا جو محض حسن اعتقاد خلالت کے لئے ہے سب رائیگاں ہو جائے اور جو لوگ کہ آمادہ ہدایت ہوں، وہ منحرف ہو جائیں اور جو راہ پر آئے ہوں وہ اس حب جاہ کو دیکھ کر بے اعتقاد ہو کر پلٹ جائیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو سخت دنیا دار سمجھیں۔ معہذا ظاہر ہے کہ نصیحت کی تاثیر کے لئے خود عمل کرنا رکن اعظم ہے۔ جب تقیہ ہوا تو عمل کجا؟ تو لاجرم اس صورت میں ہدایت کی کوئی صورت نہیں۔

بالجملہ تقیہ کے بطلان پر عقل و نقل اور عرف تینوں متفق ہیں پر جس کی چشم انصاف کو رہو اس کو کیا نظر آئے؟ اور نقل مشہور ہے بلکہ حدیث شریف ہے حَبْكُ الشَّيْءِ يُعْبَىٰ وَيُصَيِّمُ یعنی تجھے اگر کسی چیز سے محبت ہو جائے تو اس کے عیوب اور نقصانات کے دیکھنے سننے میں وہ محبت تجھ کو اندھا بنا دیتی ہے اگر محبت مذہب دل سے ایک طرف کر کے ان تقریروں اور اثبات تقیہ کی تقریروں کو موازنہ کریں تو انشاء اللہ مولوی عمار علی صاحب بھی توبہ کر اٹھیں میرا نادر علی کو تو شیعہ کیا بنائیں؟ اور اب ہم کو اسکی ضرورت نہیں رہی کہ بعد اس کے بھی کچھ بیان کریں لیکن اتمام حجت کے لئے اتنا اور معروض خدمت علماء شیعہ ہے کہ اگر بالفرض و التقدير فرض محال تقیہ ثابت بھی ہو جائے، تو موافق جمہور شیعہ حضرت امیر پرہنگام خلافت تقیہ حرام تھا پھر تعریف صحابہ کو تقیہ پر کیوں محمول کیا جائے؟

حضرت ابو بکر صدیق کو صدیق نہ کہنے والے | اور سلمنا کہ ہنگام خلافت بھی ان پر ترقیہ فرض تھا
 کے لئے حضرت جعفر کی بددعا، | تو قطع نظر اس کے کہ یہ تعصب ہی تعصب ہے
 اور اس قول کے قائل نے عقل کی بھی ناک کتر لی ہے اس میں کیا عذر کریں گے کہ
 حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہیں
 حالانکہ موافق مذہب شیعہ وہ خدا کی طرف سے ترقیہ کرنے سے ممنوع تھے اور ترقیہ ان
 پر حرام تھا۔ علی بن عیسیٰ اور وہابی امامی اثنا عشری اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفت
 الائمہ میں نقل کرتے ہیں۔

سُئِلَ اَكَا مَامٌ اَبُو جَعْفَرٍ عَنْ حَلِيَّةِ السَّيْفِ هَلْ يُجْوزُ فَقَالَ
 نَعَمْ قَدْ حَلَّى ابُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ سَيْفَهُ فَقَالَ الرَّاوِي الْقَوْلُ
 هَكَذَا الْفَوْتَبُ اَكَا مَامٌ عَنْ مَكَانِهِ فَقَالَ لَعَمَ الصِّدِّيقُ نَعَمْ
 الصِّدِّيقُ لَعَمَ الصِّدِّيقُ فَمَنْ لَمْ يَقُلْ لَهُ الصِّدِّيقُ فَلَا
 صَدَقَ اللَّهُ قَوْلُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ -

یعنی حضرت امام ابو جعفر یعنی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ وعن آباء الکرام سے کسی نے
 پوچھا کہ تلوار کے قبضہ پر چاندی سونے کا کچھ نقش و نگار یا بونٹے وغیرہ بھی درست ہیں یا
 نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں درست ہے اس لئے کہ ابو بکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی
 کا جھول کرایا تھا راوی نے کہا کیا آپ ابو بکر صدیق فرماتے ہیں۔ آپ غصہ میں اپنی جگہ
 سے اچک بیٹھے اور فرمانے لگے ہاں صدیق، ہاں صدیق، ہاں صدیق، جو ابھی صدیق
 نہ کہے اللہ اس کی بات کو دنیا اور آخرت میں سچی مت کیجیو فقط اب گوش گزار اہل
 انصاف یہ ہے کہ سب امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسیٰ اور وہابی علم و فضل
 میں یکتا اور نقل اور روایت میں بڑے معتمد علیہ ہیں انکی روایت پر کوئی سقم نہیں پکڑ سکتا۔
 امام جعفر ترقیہ حرام تھا | باقی ہی یہ بات کہ حضرت امام محمد باقر ترقیہ کے حرام ہونے کی کیا دلیل ہے ؟

سو یہ وجہ معقول اس کا جواب بھی ہم سے معقول ہی سے کلینی میں روایت ہے
 عَنْ مَعَاذِ بْنِ كَثِيرٍ عَنْ ابِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَ

جَلَّ أَنْزَلَ عَلَى نَبِيِّهِ كِتَابًا فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ بِذِهِ وَصِيَّتُكَ إِلَى
 النُّجَبَاءِ فَقَالَ وَمَنِ النُّجَبَاءُ يَا حَبِيرِيلُ فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ
 وَوَلَدُهُ كَانَ عَلَى الْكِتَابِ خَوَاتِيمٌ مِنْ ذَهَبٍ فَدَفَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عَلِيٍّ وَأَمَرَهُ أَنْ يُفَاتَّ خَاتِمًا مِنْهُ فَيَعْمَلَ بِمَا
 فِيهِ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى الْحُسَيْنِ فَقَاتَ عَنْهُ خَاتِمًا فَعْمَلَ بِمَا فِيهِ ثُمَّ
 دَفَعَهُ إِلَى الْحُسَيْنِ فَقَاتَ خَاتِمًا فَوُجِدَ فِيهِ أُخْرُجَ بِقَوْمٍ
 إِلَى الشَّهَادَةِ فَلَا شَهَادَةَ لَهُمْ إِلَّا مَعَكَ وَاشْتَرَى نَفْسَكَ لِلَّهِ
 فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَقَاتَ خَاتِمًا فَوُجِدَ فِيهِ
 أَنْ اطَّرَقَ وَاصُمْتُ وَالزَّمْ مَنْزِلَكَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ
 الْيَقِينُ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى ابْنِهِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ بْنِ الْحُسَيْنِ
 عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَاتَ خَاتِمًا فَوُجِدَ فِيهِ حَدِيثُ النَّاسِ وَأَفْتِهِمْ
 وَالشُّرْعُومَ أَهْلُ بَيْتِكَ وَصَدَقَ آبَاءُكَ الصَّالِحِينَ وَلَا
 تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ فَإِنَّهُ لَا سَيْلَ لِأَحَدٍ عَلَيْكَ ثُمَّ دَفَعَهُ
 إِلَى جَعْفَرٍ لَصَادِقٍ فَقَاتَ خَاتِمًا فَوُجِدَ فِيهِ حَدِيثُ النَّاسِ
 وَأَفْتِهِمْ وَلَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ وَالشُّرْعُومَ أَهْلُ
 بَيْتِكَ وَصَدَقَ آبَاءُكَ الصَّالِحِينَ فَإِنَّكَ فِي حِرْزٍ وَآمَانٍ فَفَعَلَ
 ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى ابْنِهِ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلِكُنْزٍ إِلَى قِيَامِ الْمَحْدِيِّ
 وَرَوَاهُ مِنْ طَرِيقٍ آخَرَ عَنْ مَعَاذِ بْنِ كَثِيرٍ الْبُضَاعَنِيِّ أَيْ
 عَبْدَ اللَّهِ وَفِيهِ فِي الْخَاتِمَةِ الْخَامِسِ وَقُلِ الْحَقُّ فِي الْأَمْنِ
 وَالْخَوْفِ وَلَا تَخْشَ إِلَّا اللَّهَ أَنْتَهَى

حاصل روایت کا یہ ہے کہ کلینی میں معاذ بن کثیر سے روایت ہے وہ حضرت امام
 محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے نازل کی اپنے نبی پر ایک کتاب اور فرمایا
 کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ تیری وصیت ہے نبیاء کو، اپنے فرمایا حیرل نبیاء کون ہیں

جبریل نے کہا علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد، اور اس کتاب پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں یعنی جیسے خطوں پر لاکھ لگا کر مہر لگا دیتے ہیں ایسے ہی اس خط پر لاکھ کی جگہ سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں، سو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وصیت نامہ کو حضرت علی کو دیا اور یہ فرمایا کہ ایک مہر کو توڑیں اور جو اس کے نیچے سے نکلے اس پر عمل کریں، پھر انہوں نے حضرت امام حسن کو دیا انہوں نے بھی ایک مہر توڑ کر اس کے نیچے جو کچھ نکلا اس پر عمل کیا، پھر انہوں نے حضرت سید الشہداء، امام حسین رضی اللہ عنہ کو دیا انہوں نے مہر توڑی تو اس کے نیچے سے یہ نکلا کہ ایک قوم کو شہادت کی طرف لے جا۔ اس لئے کہ ان کی شہادت تیرے ہی ساتھ ہے، اور اپنی جان کو اللہ کے واسطے خرید لے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا بعد اس کے انہوں نے حضرت امام زین العابدین کو وہ وصیت نامہ دیا، انہوں نے مہر کو توڑا تو اس میں نکلا کہ سر جھکا کر بیٹھ رہ، اور اپنے گھر ہی میں رہ، اور اپنے رب کی عبادت کئے جا، یہاں تک کہ موت آجائے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا، پھر انہوں نے وہ وصیت نامہ اپنے بیٹے امام محمد باقر کو دیا انہوں نے جو مہر کو توڑا اس میں یہ پایا کہ لوگوں سے حدیثیں بیان کر اور فتوے دے اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا، اور اپنے آبا و اجداد صلحا کو سچا کر اور سوا خدا کے کسی کے کسی سے مت ڈر اس لئے کہ کوئی تجھ پر قادر نہ ہو سکے گا، پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام جعفر صادق علیہ السلام کو وہ وصیت حوالہ کی، انہوں نے جو مہر توڑی تو اس میں بھی یہ پایا کہ حدیثیں بیان کر لوگوں سے اور فتوے دے اور کسی سے سوائے خدا کے مت ڈر اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا، اور اپنے آبا و اجداد صالحین کی تصدیق کر اس لئے کہ تو خدا کے حفظ و امان میں ہے۔ سو انہوں نے بھی ویسا ہی کیا۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام موسیٰ علیہ السلام کو وہ وصیت دی اور اسی طرح حضرت امام ہدیٰ تک ہوتا چلا گیا۔

اور دوسری سند سے کلینی ہی معاذ بن کثیر مذکور کے واسطے سے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے اور اس روایت میں پانچویں مہر میں یعنی حضرت امام باقر کی نوبت میں اتنا اور بھی ہے اور کہتا رہ حق بات امن میں اور خوف میں اور سوا خدا کے

کسی سے مت ڈر فقط اس روایت میں غور فرمائیے کہ حضرت امام محمد باقر کو کس تاکید سے تفتیہ کی ممانعت ہو پھر بھی حضرت امام محمد باقر رحمہم جن کو یہ وصیت تھی کہ حق کے سوا کبھی کچھ اور مت کہو حضرت ابو بکر صدیق کی اتنی کچھ تعریف فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ بجز نبوت کے نہیں اس لئے کہ بعد انبیاء کے کلام اللہ میں صدیقین ہی کو ذکر فرماتے ہیں اور پھر تعریف بھی اس تاکید سے کہ بدو عافرماتے ہیں ان لوگوں کے حق میں جو انہیں صدیق نہ کہیں اور برا کہنے کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔

امام جعفر کی بدو عا سے حقانیت اہل سنت پہلے اس روایت کے فقط یہی فائدہ نہیں ہوا کہ حضرت اور بطلان مذہب شیعہ ظاہر ہو گیا۔ ابو بکر صدیق کا صدیق ہونا بے غل و غش ثابت ہو گیا۔

اور کسی کو تفتیہ کے احتمال کی گنجائش نہ رہی، بلکہ شیعوں کے مذہب کا بطلان اور سبیل کے مذہب کی حقانیت بھی بہ تحقیق معلوم ہو گئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ قاطبہ خواہ امامیہ خواہ غیر امامیہ خواہ اثنا عشریہ خواہ غیر اثنا عشریہ اس بدو عا کے اندر داخل ہیں حضرت امام معصوم مستجاب الدعوات امام محمد باقر کی زبان مبارک سے صادر ہوئی ہم کو تو ہم کو شیعوں کو بھی اس کے قبول ہونے میں تاویل نہیں سوا اس سبب ہم کو بالیقین معلوم ہو گیا کہ ان کے دعوے محبت اہل بیت اور دعوے اسلام اور دعوے ایمان سب خداوند کریم کے نزدیک جھوٹا ہے اور آخرت میں بھی خداوند کریم ان کی تکذیب فرمائے گا سو اس سے زیادہ اور کونسا مرتبہ باطل ہونے کا ہو گا دوسرے حضرت علیؑ نے جو کیا سبب فرمان ایسی اور موافق وصیت پیغمبری تھا حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے جو بیعت کی، علیؑ ہذا القیاس حضرت امام حسنؑ نے جو خلافت امیر معاویہ کے حوالہ فرمائی سب حسب ایماء خداوندی اور ارشاد پیغمبری تھا بوجہ تفتیہ نہ تھا اور جب ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ سے حضرت علیؑ نے بیعت موافق ارشاد خداوندی کی تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ قابل اسی کے تھے، علیؑ ہذا القیاس دخر مطہرہ حضرت ام کلثومؓ کا نکاح جو حضرت عمرؓ سے ہوا وہ نکاح بھی خدا کے حکم کے موافق ہوئے میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح سے کچھ کم نہیں جیسے ان کا نکاح حضرت علیؑ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موافق ارشاد خداوندی ہوا تھا ویسے ہی حضرت ام کلثوم کا نکاح بھی حضرت عمرؓ سے حسب فرمانِ الہی تھا۔ وہو المراد الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ سب حیلہ و حجت امامیہ کا جواب دندان شکن بن پڑا یہ اسی خداوند نعمت کا کرم ہے، حق کو حق کر دکھایا اور باطل کو باطل۔

امام جعفرؑ پر ایک اعتراض جو خود کسی کی نوعیت رکھتا ہے | مگر ہاں اتنا کھڑکا باقی ہے کہ شاید حضرت امامیہ اہل سنت کی ضد میں اگر یہ حجت کریں کہ واقعی کلام اللہ اور اقوالِ عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے و شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے اِنِّیْ تَارِدٌ فِیْکُمْ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمَا بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِیْ اَحَدُھُمَا عَظَمٌ مِنْ الْاٰخِرِ کِتَابُ اللّٰهِ وَ عِزَّتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم میں دو چیزیں بھاری چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے ایک ان میں دوسرے سے بڑا ہے وہ دونوں کیا ہیں ایک تو کلام اللہ دوسرے میرے بیت فقط۔ اور اس حدیث کو سنی شیعہ دونوں فریق باتفاق برسرِ چشم رکھتے ہیں۔ اور اس حدیث ہونے کے قائل ہیں القصہ شیعہ اب اگر تین پارچہ کریں تو یوں کریں کہ موافق حدیث مسطور کلام اللہ اور عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل بہت ہیں لیکن اس بات کو کیا کیجئے کہ اقوالِ عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہم تک پہنچے ہیں تو وہ سب کے سب امام معصوم مستجاب لدعواتِ اعمیٰ امام محمد باقر علیہ السلام کی بدوعا میں جس کا ابھی مذکور ہوا داخل ہیں کیونکہ ہمارے سارے پیشوا، ابوبکر صدیق کے صدیق ہونے کے منکر ہیں ان سب کا قول ہرچہ باد اباد قابل تسلیم نہ رہا کیونکہ بدوعا تو یہی ہے کہ خدا ان لوگوں کی بات سچی نہ کرے پھر جب ان کی بات ہی سچی نہ ہوئی تو ان کی روایات کا کیا اعتبار؟

معہذا اکثر پیشوایانِ مذہبِ شیعہ اور راویانِ اخبار صحیحہ مذہبِ مذکور کافر مطلق اور بے دین محض تھے کہ فتویٰ شیعہ بھی ان کے حق میں بجز تکفیر اور نہیں

ہو سکتا۔ چنانچہ بعض بعض کا احوال کچھ اوپر آیت محمد رسول اللہ لآیت کے ترجمہ اور متعلقات میں گذر چکا اور اوروں کا حال کچھ نہ پوچھے کہ پردہ ہی میں بہتر ہے زرارہ بن اعین کے باب میں تو امام جعفر صادق نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ اہل نارسے ہے چنانچہ کتب معتبرہ میں ابن سمان سے موجود ہے اور قاضی نور اللہ صاحب قم فرماتے ہیں کہ زرارہ بن اعین کے چار بھائی حمران، عبد الملک، بکیر عبد الرحمن اور زرارہ کے دو بیٹے طحسین اور بھتیجے یعنی چاروں بھائیوں کے بیٹے حمزہ محمد خربش عبد اللہ جہم عبد المجید عبد اللہ اعلیٰ عمر سب کے سب زرارہ بن اعین کا سا عقیدہ رکھتے تھے یعنی مثل زرارہ، سب اس بات کے قائل تھے کہ خداوند کریم ازل میں جا، بل تھا۔ نعوذ باللہ منہا تو اس صورت میں کتنا بچل شیئ غالیہ کے مضمون کے منکر تھے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کلام اللہ کا منکر کون ہوتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اوروں کو سمجھے یہ تو بڑے مقتدوں اور بڑے حاملان اخبار کا ذکر ہے اور ضغاف اور مجاہد کا کچھ حساب ہی نہیں پھر ہم اپنی روایات کا کس طرح اعتبار کریں اس صورت میں ایک گواہ کی گواہی تو ہمارے نزدیک مسلم یعنی کلام اللہ کا فرمانا تو خیر جبراً کرنا برسر کیونکہ ہر قرن میں بتواتر منقول ہوتا رہا ہے پر دوسرے گواہ کی گواہی یعنی اہلبیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی جب قابل اعتبار ہو کہ وہ بھی ایسی ہی طرح منقول ہوا اور یہ بھی نہیں تو سند ایسی تو ہو کہ اس کے راوی دیندار مومن ہوں کا فر تو نہ ہو سو چونکہ ہماری روایات کے ایسے راوی نہیں اور سنیوں کا ہمیں پہلے سے اعتبار نہیں تو فقط ایک گواہ باقی رہ گیا اور شریعت میں ایک گواہ کا اعتبار نہیں اس لئے ہم صحابہ کے معتقد نہیں ہو سکتے گو اس میں ہمارے مذہب کی ہی تحریف و تبیہ اکھڑ جائے اور سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیعوں کے دین اور روایات کا یہ حال ہے۔

شام کہ رقیباں دامن کشان گذشتی بن گوشت خاک ماہم بر باد رفتہ باشد
سو اس کا جواب ہمارے پاس ہر چند بوجہ عقل بہت کچھ ہے لیکن اب بھی بہتر ہے کہ
یوں کہا جائے کہ اگر تم ہماری ضد میں اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہوئے تو صاحب ہم

بارے تم جلیے۔ خبر اب بفضلہ تعالیٰ یہ بات ثابت ہو گئی کہ بشہادت ثقلین عنی کلام اللہ اور عمرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذہب شیعہ غلط ہے اور یہی فقط مقصود تھا تو اب مناسب یوں ہے کہ بقدر مناسب اور باندازہ فرصت مولوی عمار علی صاحب کے خط کی بھی خبر لیجئے مگر مناسب یوں ہے کہ اول اس خط کو لفظاً لفظاً نقل کیجئے تاکہ ناظرین جواب کو لذت کامل نصیب ہو اس لئے اول وہ خط ہی پیش نظر کرتا ہوں وہ خط یہ ہے

نقل خط مولوی عمار علی

میر صاحب مظہر عنایت و کرم مجمع محامد شیم زاد فضلہ و کرمہ بعد سلام کے واضح خدمت عالی ہوئے کہ عنایت نامہ تمہارا پہنچا جو کچھ آپ نے لکھا تھا معلوم ہوا آپ نے لکھا تھا کہ مجھے صحت علماء شیعہ سے فدک کے غصب ہونے میں نہیں ہوتی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ آپ کی ملاقات کسی عالم واقف اور خبردار سے آج تک حاصل نہیں ہوئی اگر مجھ سے آپ کی ملاقات ہووے اور میری زبانی آپ سنیں تو آپ پر واضح ہو جاوے کہ اہل سنت بالکل غلطی پر ہیں اور بیٹ و مصری کرتے ہیں اور بھس پر لینا لیتے ہیں اور تین سوال جو آپ نے عبدالحق کی طرف سے لکھے تھے ان کا جواب مختصر یہ ہے کہ سوال اول میں آپ نے لکھا تھا کہ رسول خدا کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا یہ سوال بے محل ہے، اس واسطے کہ جناب رسول خدا کے نطفہ سے ایک بیٹی تھی فاطمہ زہرا سودہ حضرت علی سے منسوب تھی اور دو بیٹیاں جو اور آنحضرت کی اہلسنت مشہور کرتے ہیں وہ دونوں حضرت کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ وہ حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر کے نطفہ سے تھیں ہمراہ حضرت خدیجہ کے آئی تھیں اور نام ان دونوں صاحبزادیوں کا رقیہ اور ام کلثوم تھا ابن حجر محدث اہلسنت نے کتاب اصابہ میں لکھا ہے کہ ایک کا نکاح تو ان میں سے عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا اور دوسری کا نکاح ابوالعاص بن الربیع سے اور یہ دونوں کافر تھے اتنے بعد اسکے نکاح ان دونوں کا عثمان سے ہوا جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں ہی ہیں اور پیغمبر خدا نے ان سے علیحدہ نہ کیا۔ اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے عثمان تو خود مسلمان تھا حضرت کے رو برو

اور ان کافروں سے بدرجہ بہتر تھا۔

البتہ بعد وفات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسی بدعتیں عثمان نے کیں کہ عائشہ اس کے حق میں کہتی تھی اقتلوا لعنہ اللہ لعنہ لا اقتلوا احراقا لمصا یعنی قتل کرو اس ریش دراز کو لعنت کرو اس ریش دراز پر قتل کرو اس قرآن کے جلائے والے کو، چنانچہ استیعاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کیں کہ صحابہ رسول نے تنگ کر اسے قتل کیا یہ سب ماجرا اہل سنت کی کتابوں میں مذکور ہے اگر سند اس کی مطلوب ہوگی۔ تو روانہ کر دی جائے گی اور اگر یہ دونوں صاحبزادیاں بھی رسول خدا کے نطفہ سے ہوتیں تو ان کے فضائل کچھ مذکور ہوتے جیسے کہ حضرت فاطمہؓ کے فضائل شیعہ کی کتابوں میں مذکور ہیں سیدہ نساء، العلین سیدہ نساء اہل الحبتہ، الفاطمہ بضعتہ منی اور سوا اس کے فضائل فاطمہ کے صدا کتابوں میں مذکور ہیں اور ان دونوں کے فضائل ایسے مذکور نہیں ہیں اگر آنحضرتؐ کے نطفہ سے ہوتیں تو البتہ مذکور ہوتے۔

سوال دوسرا، علی نے عائشہ سے بہتر جنگ کئے۔ اگر باغ فدک اصحاب ثلاثہ نے غصب کیا تھا تو علی نے ان پر جہاد کیوں نہ کیا، جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سوال بھی غلط ہے اس واسطے کہ علی نے عائشہ سے بہتر جنگ نہیں کئے۔ بلکہ ایک جنگ کی تھی سو عائشہ کو شکست ہوئی چنانچہ اہلسنت کی کتابوں میں لکھا ہے اور فدک کے غصب کرنے سے جہاد لازم نہ ہوا تھا اس واسطے کہ جہاد مال دنیا کے غصب کرنے سے واجب نہیں ہے بلکہ پیغمبر اور امام واسطے ترقی دین کے جہاد کرتے ہیں نہ واسطے مال دنیا کے اور علی کے پاس جہاد کرنے کو انصار کب تھے کہ وہ جہاد کرتے جہاد کرنے کا حکم تنہا کے واسطے نہیں ہے بلکہ جس وقت انصار مددگار ہم پہنچیں اس وقت جہاد کرنا چاہیے جیسے کہ رسول خدا جب مکہ میں رہے بسبب ہونے انصار کے حکم جہاد کا نہ ہوا، جب مدینہ گئے کافروں کے خوف سے ہجرت کر کے اور انصار ہم پہنچے تو جہاد کفار پر کیا اور جب تک مکہ میں رہے کچھ نہ ہو سکا۔ بلکہ کچھ مددگار بھی وہاں موجود تھے۔ ان مددگاروں میں ایک علی بھی تھے ان سے بھی کچھ نہ ہو سکا آخر کفار کے خوف سے اپنے اپنا وطن چھوڑ دیا۔ مگر ایسے ہی حال علی کا بعد رسول خدا کے تھا کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں ان

کو انصارِ مددگار بہم نہ پہنچے تو جہاد نہ کیا اور جب بہم پہنچے تو عائشہ پر بھی جہاد کیا۔ اور معاویہ پر بھی۔

اور سوال تیسرا یہ کہ علی کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا تھا، جواب اس کا یہ ہے کہ فاطمہ کے پیٹ سے علی کی دو بیٹیاں تھیں بڑی بیٹی زینب کہ جس کا نکاح عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوا تھا اور دوسری بیٹی کلثوم بنتی کہ جس کا نکاح محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا فقط یہی سوال تھا جس کا جواب ہوا اگر کچھ زیادہ لکھتے تو زیادہ لکھا جاتا۔ اور فدک کا غصب ہونا جو آپ نے دریافت کیا تھا اس کو ایک دفتر چاہیے۔ لیکن کچھ مختصر تھوڑا سا آپ کی خدمت میں تحریر کرتا ہوں اگر آپ کی طبیعت میں انصاف ہے تو اسی قدر کفایت کرتا ہے اور جو کچھ لکھا ہو یہ سب اہل سنت کی معتبر کتابوں سے ہے جس شخص کو کچھ تردد ہو مطابق کر لے۔ اور بعد اس کے انصاف کرے کہ یہ ظلم ہے یا نہیں؟ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابوعلی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوتہ نے معارج النبوتہ میں اور سوا اس کے اور علماء اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت **وَآتَ ذَٰلَ الْقُرْبٰی حَقَّہٗ** یعنی دے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا، تو اس وقت پیغمبر خدا نے جبریلؑ سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے جبریل نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہے اور حق اس کا فدک ہے فدک اس کو دید و اس وقت رسول خدا نے فدک فاطمہ کو دے دیا پس تحریر سے ان علماء کی ثابت ہوا کہ رسول خدا نے فاطمہ کو فدک دیا اور فاطمہ مالک فدک کی تھی۔

جب رسول خدا نے دنیا سے رحلت فرمائی اور ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اٹھا دیا اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے؟ اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ تاریخ آل عباس کہ کتب معتبرہ اہلسنت سے ہے اس میں لکھا ہے کہ جس وقت اولاد حسنین نے مامون رشید خلیفہ عباسی سے دعوائے فدک کا کیا تو اس نے دو صد علماء اہل سنت جمع کر کے کہا کہ حال فدک کا راست راست بیان کرو انہوں نے بروایت واقعی اور بشیر بن ولید بیان کیا کہ بعد فتح خیبر آیت **وَآتَ ذَٰلَ الْقُرْبٰی حَقَّہٗ** نازل ہوئی تو رسول

خدا نے جبریل سے پوچھا کہ ذوالقربے میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے جبریل نے عرض کی کہ فاطمہ زہرا تمہاری فریج اور حق اس کا فدک ہے اس وقت رسول خدا نے فاطمہ کو فدک دے دیا جب ابو بکر نے اپنی خلافت میں فاطمہ کو فدک سے منع کیا تو فاطمہ نے فرمایا کہ فدک مجھ کو میرے باپ نے دیا ہے ابو بکر نے قبول کیا اور چاہا کہ فاطمہ کو کاغذ معافی کا لکھ دے اور فدک فاطمہ کو پھیر دے اس وقت عمر نے کہا کہ فاطمہ سے گواہ طلب کر کہ پیغمبر خدا نے اس کو کب دیا ہے اس وقت فاطمہ ہر حضرت علی اور ام ایمن کہ ایک بی بی تھی اور حسنین علیہ السلام کو گواہ اپنا لائی اور انہوں نے گواہی دی کہ پیغمبر خدا نے فاطمہ کو فدک دیا ہے تو اس وقت ابو بکر نے فاطمہ کو کاغذ فدک کا لکھ دیا کہ اپنے حق پر قابض ہو ورنہ عمر نے وہ کاغذ ابو بکر سے لے کر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ فاطمہ ایک عورت ہے اور علی اس کا شوہر ہے اپنے نفع کے لئے کہتا ہے ابو بکر نے بھی قبول کیا اور یہ دعوائے کرنا فاطمہ کا ابو بکر سے بیہ فدک کا اور گواہی دنیا علی اور حسنین کا اور ام ایمن کا اور رد کرنا اور نامنظور کرنا ابو بکر کا ان کی گواہی کو اہلسنت کی بہت کتابوں میں لکھا ہے مثل صواعق محرقہ اور فصل الخطاب اور معجم البلدان اور ریاض النضرہ اور کنز العمال اور تاریخ حاکم اور جمع الجوامع اور شرح مواقف اور نہایت العقول اور سوا اس کے بہت کتابوں میں ہے لیکن ابو بکر نے فاطمہ کو اور اس کے گواہوں کو اس دعوائے میں جھوٹا جانا اور وائے فاطمہ کے جس کسی نے ابو بکر سے دعوائے کیا اس کو ابو بکر نے سچا جانا اور گواہ اس سے طلب کئے جو کچھ اس نے مانگا دیدیا۔

چنانچہ صحیح بخاری میں جابر سے روایت ہے کہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ پیغمبر خدا نے اپنی زندگی میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مال بحرن کا اوے گا۔ تو میں تجھ کو اس میں سے اس قدر مال دوں گا۔ اور مال بحرن کا حضرت کی زندگی میں نہ آیا۔ لیکن اب تمہارے پاس آیا ہے تم اس میں سے مجھ کو دو کہ حضرت نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ابو بکر نے یہ بات سن کر اسی وقت تین مٹھی مال کی مجھے بھر کر دی اور گواہ مجھ سے پیغمبر خدا کے وعدہ کرنے کے طلب کئے اور فتح الباری شرح صحیح بخاری میں وجہ اسکی اس طرح لکھی ہے کہ ابو بکر نے جو جابر سے گواہ طلب کئے اور دعوائے کرتے ہی مال اس کو دیدیا سبب اس کا یہ ہے کہ

جابر صحابی معاذ اللہ پیغمبر خدا پر جھوٹا دعویٰ کرے کہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ایسا نہیں ہو سکتا اگر جابر سچا نہ ہو تو پھر کون سچا ہو سکتا ہے اس واسطے ابو بکر نے اس سے گواہ طلب کئے اور بدون گواہی اس کو مال دے دیا اب کہتا ہوں میں کہ وائے بد نینداری اہل سنت کہ فاطمہ کو جو کہ پارہ جگر رسول خدا ہے جابر کے برابر بھی نہ جانا کہ ادنیٰ صحابی تھا اور ان کے نزدیک فاطمہ کا مرتبہ جابر کے برابر بھی نہ ہوا کہ جابر کو تو بدون گواہی کے مال دیدیا اور اس کو جھوٹ سے بچایا اور کہا کہ جابر سچا نہ ہو گا تو اور کون سچا ہو گا اور فاطمہ کو جھوٹا سمجھ کر اس سے گواہ طلب کئے جب گواہوں نے اس کی گواہی دی تو ان کی گواہی کو رد کیا علی کو تو کہا کہ یہ سب اس کا ہے اپنے نفع کے لئے کہتا ہے علی کو بھی جھوٹا جانا ہر خبیث علی بھی صحابی تھے لیکن جابر کے برابر سچے نہ تھے اور حسنین کو کہا یہ فرزند اس کے ہیں اور لڑکے ہیں اور ام ایمن جو باقی رہی وہ ایک عورت ہے اس کی گواہی کیسے درست ہوئے۔

اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو اور کیا ہے۔ سو اس کے اور غصب کس کو کہتے ہیں اور یہ عداوت ہے یا دوستی اور مروت اور رعایت حق رسول، اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول کی بھی رعایت نہ کی۔ آپ نے لکھا تھا کہ مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی اب آپ کو چاہیے کہ میری صحت علماء سنت سے کرائیے اور میری باتوں کا جواب لکھو اگر بھجوائیے کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو سچا جانا، اور فاطمہ کو جھوٹا سمجھا اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رد کیا۔ اور یہ بھی سننا چاہیے کہ جب فاطمہ نے جانا کہ ابو بکر نے مجھے ہبہ فدک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعوائے وراثت کا کیا اور ابو بکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا کی بیٹی ہوں مجھے ان حضرت کا مال ارث میں پہنچتا ہے اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دیدے اس وقت ابو بکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر خدا سے سنا ہے کہ وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔ اول تو یہ روایت خلاف قرآن کے دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہنچتا ایم دعویٰ نہ کرنا اور حکم خدا کا جو کچھ ان کے واسطے تھا اس

کو ان سے چھپا کر رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا

لیکن باوجود اس کے پھر ایک مرتبہ فاطمہؑ ابو بکر کے پاس گئی اور اس وقت ابو بکر منبر پر تھا۔ کہا کہ اے ابو بکر تیری بیٹی تو تیرا ترکہ پاوے اور میں اپنے باپ کا ترکہ نہ پاؤں اس وقت ابو بکر منبر سے نیچے اتر آیا اور کہا کہ لے میں تجھ کو فدک دیتا ہوں یہ کہہ کر فاطمہ کو کاغذ لکھ دیا اتنے میں عمر آیا۔ اور ابو بکر سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے کہا کہ میں نے فاطمہ کو فدک لکھ دیا ہے۔ عمر نے وہ کاغذ ابو بکر کے ہاتھ سے لیکر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ لوگوں کو کیا دے گا؟ عربوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔

چنانچہ یہ روایت سبط ابن جوزی نے اپنی سیرت میں تحریر کی ہے اور وقادی محدث اہلسنت اور بہان الدین حلبی شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے فاطمہ نے ابو بکر سے دعوائے فدک کا کیا کہ فدک میرا ہے میرے باپ نے مجھ کو دیا تھا۔ اس وقت ابو بکر نے فاطمہ کو فدک کا کاغذ لکھ دیا جب فاطمہ وہ کاغذ لے کر وہاں سے پھری تو رستہ میں عمر سے ملاقات ہوئی عمر نے فاطمہ سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے فاطمہ نے کہا کہ ابو بکر نے مجھ کو فدک لکھ دیا ہے عمر نے وہ کاغذ ہاتھ فاطمہ سے چھین کر پھاڑ ڈالا اگر کوئی کہے کہ ابو بکر کا اس میں کیا قصور ہے۔ اس نے تو لکھ دیا تھا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ابو بکر حاکم تھا اس کو اس امر میں تا بعد ارمی عمر کی نہ چاہیے تھی عمر کو اس شر سے باز رکھنا اور اس کے کہے پر عمل نہ کرتا لیکن وہ تو اس کا ہر امر میں شریک تھا اس کے مشورہ بدون کچھ نہیں کر سکتا تھا اور میں کہتا ہوں کہ اگر صحابہ ابو بکر کو اس امر میں سچا جانتے تھے اور علی بھی ابو بکر کو سچا جانتے تھے کہ ابو بکر پیغمبر خدا کا سب سے صدیق و سچا دوست نہیں ہیں پھر علی اور عباس نے عمر کی خلافت میں عمر سے جا کر کیوں دعوائے کیا۔ پیغمبر کے ترکہ کا اس وقت عمر نے علی اور عباس کو کہا کہ تم ابو بکر کو کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے ہو اور میں وہی کروں گا۔ جو کہ ابو بکر کرتا تھا یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہے

اور سند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمان کی خلافت میں عثمان سے بھی پھر دعوائے کیا تھا پس اگر ابو بکر سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعوائے ہرگز نہ کرتے معلوم ہوا کہ ابو بکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا۔ ازراہ عداوت کے روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا اور عمر خود علی

اور عباس سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابو بکر کو کاذب اور خائن جانتے تھے اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو پس جس وقت علی نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی ان کو کاذب اور خائن جانیں گے اور یہی مطلب غصب ہے۔ اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت ابو بکر نے فدک کے دینے سے انکار کیا تو فاطمہ زہرا اس پر غضب ناک ہوئی اور تمام عمر کبھی اس سے کلام نہ کیا اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ فاطمہ نے وقت مرنے کے وصیت کی کہ ابو بکر اور عمر میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں۔ فقط۔

جواب خط

یہاں تک خط مذکور کی عبارت تھی بلکہ بلام و کاست لفظاً نقل کر دیا ہے۔ لیکن اب ہماری بات سننے کے لئے بھی تیار ہو جائے تاکہ مولوی صاحب کی اس طمطراق کی حقیقت اور مولوی صاحب کی قابلیت اور علماء شیعہ کی فہم و فراست بخوبی معلوم ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ یہ خط ہر خیر عبارت میں تو زیادہ لیکن مثل غذا قلیل الکیموس کہ باوجود قلت کیموس کے سیئی الکیموس بھی خلاصہ نکال لئے۔ تو کل دو چار ہی باتیں ہیں پھر وہ بھی غلط اگر اعتبار نہ آئے تو دیکھئے۔ اول مولوی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لطفہ سے فقط ایک ہی بیٹی تھی جن کا نام حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تھا اور اہلسنت جو دو بیٹیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مشہور کرتے ہیں وہ آپ کے لطفہ سے نہ تھیں بلکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے لطفہ سے تھیں خیر غنیمت ہے کہ جناب مولوی عمار علی صاحب نے اتنا تو لحاظ رکھا کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی اولاد ہونے سے تو ان کو خارج نہیں کیا ہم ایسی نا انصافی پر اس کے بھی شکر گزار ہیں ورنہ جہاں مولوی صاحب نے جرات کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نصب منقطع کیا تھا اگر حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے بھی ان کا نسب منقطع کر دیتے جیسے بعض ایسے ہی دشمنان نہانی اہل بیت نے کیا ہے۔ تو کون مانع تھا، بات یہ ہے کہ اس جگہ تو مولوی صاحب نے غیرت کی ناک ہی کتری ہے اور موافق

مثلاً مشہور ہے۔ درون گویم بروئے تو، یہ ستم کئے ہیں کہ سنتوں کی ضد میں اہلبیت پر جفا کر کے (سوکھی) اپنے ایمان پر بھی قلم پھیر گئے نہ کلام اللہ کی سنی نہ اپنی معتبر کتابوں کا لحاظ کیا آفرین ہے کیوں نہ ہوں مولوی عمار علیؒ اس کا راز تو آید و مرداں چنیں کنند

بنات طیبات از روئے کلام اللہ شریف | برائے خدا اہل انصاف بے رومی و ریا ہو کر میری گزارش کو سنیں اگر سچا ہو جب ہی کہیں کلام اللہ موجود ہے اگر مولوی عمار علی صاحب کو یہ غلط ہو کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا ہم کلام اللہ کے حوالوں کی کیونکر تصدیق کریں تو میں پتے وار بتلاتا ہوں۔ سورہ احزاب میں بائیسویں سیارہ میں قریب ربع کے آخر کے رکوع سے پہلے رکوع کے شروع ہی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِئِهِنَّ** یعنی کہدے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو اور مومنوں کی عورتوں کو کہ اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیا کریں فقط اب گزارش یہ ہے کہ اتنی بات تو مولوی عمار علی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ بنات جمع اور جمع کم سے کم تین پر بولی جاتی ہے اور اگر کبھی توسع کر کے دو پر بھی اطلاق کر دیں تب بھی ایک سے تو زیادہ ہی ہو گا بہر حال یہ کہنا کہ حضرت فاطمہ کے سوا اور کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹی ہی نہ تھی تب بھی غلط ہو گا افسوس مولوی صاحب کو اتنی شرم بھی تو نہ آئی کہ کوئی سنے گا تو کیا ہو گا مگر مولوی صاحب نے ہم جانے یہ سن رکھا ہے **الْحَيَاءُ يَمْنَعُ الرِّزْقَ** یعنی حیا رزق روک دیتی ہے اس لئے شاید اس پر بھی دھیان نہ فرمایا **الْحَيَاءُ شَجْعَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ** کیونکہ ایمان کا ثمرہ بالفرض کچھ ہوا بھی تو آخرت میں ہو گا رزق تو آج ہاتھ سے جائے ہے اور پہلے لوگ فرما گئے ہیں۔

”نقدرا بنیہ گذاشتن کار خرد منداں نیست“

بالجملہ یا تو مولوی صاحب یہ تسلیم فرمائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں تھیں پھر یہ آپ تسلیم کرینگے کہ وہ حضرت زقیہ وغیرہ تھیں کیونکہ سوا ان کے اور کسی کی نسبت تو کسی نے یہ دعوے کیا ہی نہیں ورنہ آیات ربانی کے منکرین کے لئے یہ تازیانہ موجود ہے۔ وَمَا يُجِدُ بَالِيَا تَنَاكَا فِرُونَ یعنی نہیں انکار کرتے ہماری آیات سے مگر کافر، اور اگر کافر بن جانا گوارا کریں اور اس بات کو نہ مانیں کہ سوا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے اور بھی کوئی بیٹی تھی تو ناچار پھر ہمیں شیعوں ہی کی کتابوں کی سند دینی لازم ہوگی انھیں تو جھوٹا نہیں بتائیں گے اور اگر ہماری ضد میں ان سے بھی دست بردار ہو جائے تو سبحان اللہ چشم مارو شن دل ماشاد۔

نبات طبیات کی تعداد از روئے کتب شیعہ بہر حال اس امید پر اس باب میں روایات کتب معتبرہ شیعہ ہی نقل کرتے ہیں، نہج البلاغہ میں جو شیعوں کے نزدیک مثل صحیفہ آسمانی اور آیات قرآنی کے ہے اور اس کے مرویات کو سب اثنا عشریہ متواتر سمجھتے ہیں علامہ رضی جو اس کے جامع ہیں حضرت امیر کا قول حضرت عثمان کے خطاب میں یوں نقل فرماتے ہیں قَدْ بَلَغْتَ مِنْ صِهْرِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ مَا لَمْ يَنَالْ لِعَنِي الشَّيْخُ حَاصِل اس کا یہ ہوا کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان ذی النورین کو کسی مقام میں یوں فرماتے ہیں کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا وہ شرف میسر آیا ہے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو بھی میسر نہیں آیا اور شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی تہذیب میں جو صحاح اربعہ شیعہ میں سے ہے اور ہم سنگ کافی کلینی ہے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کرتے ہیں۔

كَانَ يَقُولُ فِي دُعَائِهِ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى رُقَيْةَ بِنْتِ نَبِيِّكَ اللَّهُمَّ

صَلِّ عَلَى أُمَّ كُلثُومَ بِنْتِ نَبِيِّكَ لَعَنَ حَضْرَتِ اِمَامِ جَعْفَرِ صَادِقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ دُعَائِهِمْ

یوں کہا کرتے تھے کہ یا اللہ رحمت بھیج حضرت رقیہ پر جو تیرے بنی کی بیٹی ہیں یا اللہ رحمت بھیج حضرت ام کلثوم پر جو تیرے بنی کی بیٹی ہیں۔ اور اس پر بھی تسکین خاطر نہ ہوا اور جناب مولوی صاحب قبالہ اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جائیں اور اس کی یوں تاویل کرنے لگیں کہ عرف کی رو سے انہیں بیٹیاں کہہ دیا ہو لے پالک کو سارا جہاں بیٹیاں کہہ کر تے ہیں ورنہ حقیقت میں حضرت فاطمہ ہی بیٹی تھیں تو میں بھی انشاء اللہ مولوی صاحب تسلیم ہی کر کر چھوڑوں گا۔ کلینی میں روایت موجود ہے۔ تَزَوَّجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ خَدِيجَةَ وَهُوَ ابْنُ بَضْعَ وَعِشْرِينَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهُ مِنْهَا قَبْلَ بَعْثِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْقَاسِمُ وَرُقَيْةٌ وَزَيْنَبُ وَأُمُّ كُلثُومَ وَوُلِدَ لَهُ بَعْدَ الْمُبْعَثِ الطَّيِّبُ وَالطَّاهِرُ وَفَاطِمَةُ حَاصِل اس روایت کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت خدیجہ الکبریٰ سے جب نکاح کیا تو اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کچھ اوپر بیس برس کی تھی سو حضرت خدیجہ سے آپ کے لطف سے پہلے نبوت کے تو حضرت قاسم اور حضرت رقیہ اور حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم پیدا ہوئے اور بعد نبوت کے حضرت طیب اور حضرت طاہر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہم اجمعین پیدا ہوئے اس روایت میں شیعوں کو کچھ تین پانچ کرنے کی گنجائش نہیں لے پالک ہونے کے احتمال کو بھی پیش نہیں کر سکتے اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں ایک تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور تین اور۔ حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہن اور یہی سنتوں کا دعویٰ ہے

پہر مولوی صاحب نے کمال تورع کے باعث تین کے عدد کو منہ پر لانا بھی گوارا نہ کیا اور اہل سنت کی طرف دوسری صاحبزادیوں کا سوا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوے کرنا بیان کیا۔ معہذا انہوں نے سمجھا جو حریف کی بات کو جتنا گھٹایا جائے مناسب سمجھا ان اللہ اس سحر پڑاہلسنت کی بیسیوں کتابوں کے نام گناتے چلے جاتے ہیں کوئی جانے مولوی صاحب کی نظر میں سب گزری ہوئی ہیں حضور کو اس بات کی تو خبر ہی نہیں جو زبان زد عام و خاص اہلسنت ہے اہلسنت کی کتابوں کو دیکھنا تو کہاں نصیب؟ میں جانوں کسی سنی طالب علم سے کتابوں کے نام سن بھل گئے ہیں ورنہ بعضی بعضی کتابیں جو حضور نے رقمہ کریمہ میں ان کے حوالہ سے غصب فدک بیان فرماتے ہیں شاید خواب میں بھی نہ دیکھیں ہوں خصوصاً جمع الجوامع اور مسند احمد بن حنبل علیٰ ہذا القیاس اور کتابیں بھی ایسی ہی ہیں۔ ہر چند بعد اس تحریر کے مجھ کو کچھ ضرورت تھریر نہیں۔ اہل فہم اور اہل انصاف کے نزدیک دو ٹوک بات ہو گئی۔

مذکورہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے لیکن مولوی صاحب کی خوش فہمی کی تعریف بھی ہمارے ذمے واجب ہے، جناب مولوی صاحب اس دعوے کی دلیل کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سوا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی صاحبزادی نہ تھی یوں رقم فرماتے ہیں کہ اگر حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں

ہوتیں تو ان کے فضائل بھی مذکور ہوتے۔ جیسے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے فضائل طوفین کی کتابوں میں موجود ہیں کیا دلیل ہے کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے کہ رع۔ بریں فہم و دانش بیاید گر نیست۔ اگر مولوی صاحب کو قواعد استدلال کی خبر نہ تھی تو کسی سے پوچھ لینا تھا۔ آخر اتنا بھی اوروں ہی کی تے چشی کے بھروسے پر ہے جب ہی تو یوں بے تحقیق جو چاہا لکھ دیا، جناب مولوی صاحب معقولات کے طور پر تو اتنا ہی جواب بہت ہے کہ عدم الاطلاع یا عدم الذکر عدم الشے پر دلالت نہیں کرتا۔ لیکن آپ کے سامنے تو بے نقل کام نہیں چلتا کیونکہ کمال تورع سے معقولات کے ذکر کو تو آپ حرام ہی جانتے ہونگے جناب باری تعالیٰ سورہ نساء کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْنِكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْنِكَ یعنی بہت رسول تو ایسے ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے تجھ سے کہلایا ہے پہلے سے اور بہت سے رسول ایسے ہیں کہ ان کا قصہ اور احوال ہم نے تجھ سے بیان ہی نہیں کیا۔ غرض اگر کسی کا ذکر نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل ہوا کرتے تو لازم آئے کہ سوا ان رسولوں کے جن کا کلام اللہ میں مذکور ہے نعوذ باللہ منہ کوئی اور رسول پیدا ہی نہوا ہو معنہذا یہ کچھ لازم ہے کہ کسی بزرگ کی اولاد سب کی سب برابر ہوا کرے۔ اور اگر اس بات کو مانیں تو مولوی صاحب بھل کر مانیں۔ پھر حضرت امام محمد باقر اور زید شہید کو جو انکے بھائی تھے برابر کنیا پر لگایا یہ تو مولوی صاحب نے فرمایا ہوتا کہ اہل سنت حضرت ہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم کو برابر سمجھتے ہوں۔ حاشا وکلا حضرت فاطمہ کو جو شرف ہے وہ اور کے لئے نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

عمر اعلیٰ کی تاریخ دانان | باقی یہ جو مولوی صاحب رستم

فرماتے ہیں کہ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم میں سے ایک کا نکاح ابو العاص سے ہوا تھا یہ مولوی صاحب کی قوت حافظہ کی دلیل ہے۔ ”ارے دروغ گور حافظہ نباشد“ جناب من ابو العاص سے حضرت زینب کا نکاح ہوا تھا اور دونوں صاحبزادیاں من کا نام آپ نے لکھا ہے ابوہب کے دو بیٹوں سے منسوب ہوئیں تھیں اور حافظ ابن حجر کا نام کیوں بڑا کر تے ہو۔ خطا تو اپنی ہے اور لگاتے ہیں اوروں کے ذمہ، اور یہ جو مولوی صاحب

ارشاد فرماتے ہیں کہ باوجود قوت اسلام کے وہ کافروں کے نکاح میں رہیں مولوی صاحب ہی کی جرأت ہے۔ سبحان اللہ وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں نہ تھیں تو حضرت خدیجہ کی بیٹیاں تو تھیں۔

اور ہم جانیں کہ شیعہ بھی ام الاطہا حضرت خدیجہ الکبریٰ کی اتنی تو پاسداری ضرور کرتے ہوں گے کہ ان کی بیٹیوں کو مسلمان تو۔۔۔ سمجھتے ہوں گے اور خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مولوی صاحب تو ان کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر وہ دونوں کافر ہوتیں۔ تو اس کے کہنے کیا حاجت تھی جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہیں اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے علیحدہ نہ کیا اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قیامت ہے، عثمان تو خود مسلمان تھا، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اور ان کافروں سے بدرجہا بہتر تھا انتہی، پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکے ہے۔ کہ باوجود قوت اسلام اور شوکت اہل اسلام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادنیٰ مسلمان عورت کو بھی رچہ جائیکہ حضرت خدیجہ کی بیٹیاں، کفار کی قید میں رہنے دیتے۔ مسلمان عورت کو قید کفار سے رہائی دلانے کا قرآنی حکم | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خداوند کریم تو ہر خاص و عام کو اس کی تاکید فرماتا ہے کہ مسلمان عورت کو کفار کی قید سے چھڑاؤ۔ یقین نہ ہو تو سورہ نسا کی یہ آیت موجود ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ
رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ
الظَّالِمَةُ أَهْلَهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ
لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ
لَدُنْكَ نَصِيرًا۔

یعنی خداوند کریم مسلمانوں کو یوں ارشاد فرماتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم خدا کی راہ میں قتال نہیں کرتے اور ضعیفوں کے چھڑانے کیلئے نہیں لڑتے۔ یعنی واسطے ناتوانوں کے مردوں سے اور عورتوں سے اور بچوں سے جو یوں کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اس سستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی خبر گیر بلا

مرد کا رہنا دے۔

معہذا شیعوں کو بھی معلوم ہو گا کہ ان آیات کا نزول قبل فتح مکہ ہے اور فتح مکہ سے پہلے ایسی شوکت اسلام نہ تھی کہ آپ ملک عرب میں جو چاہیں سو کر لیں، سو اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ اس آیت کے نزول تک وہ مکہ معظمہ ہی میں تھیں تب تو قطع نظر جھوٹ کے ان کافار کے پیچھے میں رہنے کا قائل ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس پردہ میں طعن کرنا ہے اور اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ تشریف لے آئی تھیں۔ سو شوکت ہی آپ کو کونسی تھی جو باوجود اس کے آپ نے ان کافروں کے نکاح میں رہنا گوارا کیا۔ اور اگر ہم سے پوچھئے تو حق یوں ہے کہ قبل بعثت بنوی کے دونوں صاحبزادیوں کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتبہ سے ہوا تھا بعد بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جب ابولہب برسر پر خاش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوا وعدوت کے باعث اپنے بیٹوں سے کہہ کے آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دلوادی سو وہ دونوں اول سال ہجرت ہی میں مدینہ منورہ آگئی تھیں، یہاں تک کہ غزوہ بدر میں جو پہلے ہی سال ہجرت میں واقع ہوا ہے ایک صاحبزادی تو حضرت عثمان کے نکاح میں تھیں۔ اور انہیں کی بیماری کے باعث حضرت عثمان کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ مگر تاریخ دانی اور راست بیانی مولوی صاحب پر ختم ہے جو چاہیں فرمادیں۔

ذوالنورین کے فضائل اور واقعہ شہادت کی تفصیل باقی حضرت عثمان کے باب میں جو کچھ مولوی صاحب نے لکھ کر اپنی عاقبت خراب کی ہے اس کا جواب ہم سے نہیں ہو سکتا ہم کس کو کہیں؟ ہمیں حضرت علی اور حضرت عثمان دونوں بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں بجز اس کے کہ یوں کہیں کہ مولوی صاحب کو خدا سمجھے اور کیا کہیں؟ اور یہ جو ارشاد ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عثمان رضی اللہ عنہ نے بدعتیں کیں۔ اس کا جواب تو جب لکھا جاتا ہے ان کو لکھتے معہذا آیت وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا اور اس کے مابعد کی آیات کے ترجموں میں بزرگی اصحاب ثلاثہ بالخصوص اور باقی اصحاب بالعموم مذکور ہوئی ہے اس لئے اس گوزشتہ پر نکتہ گیری مناسب نہیں اور باقی حضرت عائشہ کا حضرت عثمان کی نسبت اُقْتُلُوا فَخْشًا يَالْعَنَ اللَّهُ فَعَثَلًا یا اُقْتُلُوا خَرَّاقِ الْمَصَاحِفِ کہنا یہ سب ابن قتیبہ اور ابن اثم

کوئی سمساطی کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں اور یہ جماعت کی جماعت کذاب مشہور ہیں اور شیعہ
 غالی ہیں ان کے کہنے کو سنیتوں کی طرف منسوب کرنا اسی مثل مشہور کا مصداق بننا ہے
 "پادے آپ لگا دے اوروں کو" مولوی صاحب کو شرم نہیں آتی کہ ان افسانہ ہائے دروغ
 کو سنیتوں کی کتابوں کی طرف منسوب کر کے ایک دوسرا جھوٹ اپنی گردن پر رکھتے ہیں۔

عما علی کی فنون عربیہ میں ہمارے | خیر جو صاحب کہ ان کتب پر عبور رکھتے ہیں وہ تو حقیقت الامر
 کو آپ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ان کے اطمینان کے لئے اتنی بات بہت ہے کہ اُقْتُلُوْا
 جو جمع ہے اس کے ترجمہ میں تو قتل کر۔ جو واحد کا ترجمہ ہی رقم فرماتے ہیں چنانچہ ملاحظہ نقل خط
 مولوی صاحب معلوم ہو جائے گا اس میں تو خیر یہ بھی احتمال ہے کہ کرو کی واو بہانہ ہو مولوی
 صاحب کے قلم سے رہ گئی ہو مگر اس میں تو سہو کی بھی گنجائش نہیں کہ لَعَنَ اللہ کا ترجمہ لعنت
 کرو، زریب رقم ہے کجا ماضی کجا معنی امر؟ بالہنہ لفظ اللہ کے ترجمہ میں ضمیر واحد غائب
 کے معنی واحد حاضر کے کہے، نہ معلوم یہ کون سے محاورہ کے موافق مولوی صاحب نے ترجمہ
 کیا ہے؟ ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ کسی طفل میزان خوان کو مصدر کے معنی
 بتلا دیجئے تو اگر اس میں پائیہم ہوگا تو وہ صحیح صحیح اُقْتُلُوْا اور لَعَنَ کے معنی بتلا سکتا
 مگر جناب مولوی صاحب اس تحریر پر کہ مقتدا، شیعہ اور امام امامیہ اسی سبب سے ہو گئے
 ہیں ہنوز جمع اور واحد اور ماضی اور امر کے فرق کو نہیں سمجھتے، بجز اس کے اور کچھ نہیں
 کہا جاتا کہ یا تو حضور کو میرا نیک کا سلیقہ نہیں اور یہ عامہ بندی اور کرتہ پوشی اور
 دعوائے علم و امامت فقط اتنی بات پر ہے کہ دو چار باتیں کہیں سے سن بھاگے ہیں اور
 بوجہ جعل سازی عوام کی نظر بندی کر کے روٹیاں مروڑتے پھرتے ہیں یا قدر قلیل مایہ علم
 تو ہے پر خداوند کریم نے موافق وعدہ واللہ لَا یُجِدِی الْقَوْمَ الظَّالِمِینَ مولوی
 صاحب کو بوجہ شامت بد اعتقادی اور بد گوئی مقربان الہی صحابہ سلیمین صلی اللہ
 علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین اظہار بطلان مذہب مولوی صاحب کے لئے اتنی بھی تو ہدایت
 نہیں کرتا کہ ترجمہ ہی ٹھیک کر لیں

بہر حال اس سلیقہ اور اس استعداد پر ایسے ایسے مضامین عالی میں گفتگو کرنے

کو تیار ہیں اور اہل سنت سے کہ ان کا طریقہ ہو ہو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس میں ہرگز گجائش حث گیری نہیں الجھنے کو موجود ہیں اور باایں ہمہ ایسی ایسی کتب کا حوالہ دیتے ہیں کہ بجز ادیب کامل ان کا مطلب صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اس استعداد کو دیکھ کر تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اگر بالفرض کچھ قسب نہیں تب بھی غلطی ہم سے تو مولوی صاحب کی باتیں خالی نہ ہونگی مگر ایک توجہ ہو سکتی ہے یعنی یوں کہئے کہ مولوی صاحب بھی کس فرماتے ہیں بیشک اہل سنت کی معتبر کتابوں میں ان روایات کو لکھ کر یوں لکھ دیا ہے کہ یہ روایات موضوع اور افترا ہیں شیعوں کی گھڑی ہوئی ہیں وہاں کچھ اور مطلب تھا مولوی صاحب کمال فطانت سے اپنا مطلب سمجھ گئے۔

سو اس قاعدہ پر اگر مولوی صاحب جے رہیں تو ہمیں یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے کتاب اللہ سے مال کے نہ دینے کے مضمون لکال کر مالداروں سے بہت سا کچھ کما لیں گے کیونکہ کلام اللہ میں لَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ مِمَّا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ کے بعد خَيْرٌ لَهُمْ لکھا ہوا ہے تو کل کو مولوی صاحب فرمانے لگیں گے زکوٰۃ کا نہ دینا بہتر ہے اور فرعون کے حق میں رَبِّكُمْ اَكَاغَلَا مذکور ہے تو فرعون کو رب اعلیٰ بتائیں گے، علیٰ ہذا القیاس مولوی صاحب یوں رقم فرمانا کہ استیعاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کہیں کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنگ ہو کر اسے قتل کیا سر اسے رفع اور بہتان صاف ہے اتنی بات تو عوام اور نادان بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت میں سے کوئی شخص حضرت عثمان کی نسبت حث گیری نہیں۔ دل و جان سے ہر کوئی اُن کا معتقد خالص ہے اور مبتدع اور اہل بدعت کو اہل سنت سر اسرگراہ سمجھتے ہیں اور کلی مخالفت ان سے رکھتے ہیں اور کیونکہ مخالفت نہ رکھیں بدعت تو خلاف سنت ہی کو کہتے ہیں سو اگر ایسی معتبر کتابوں میں حضرت عثمان کی نسبت مبتدع ہونا مذکور ہوتا تو اہل سنت میں سے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا چہ جائیکہ یہ اعتقاد۔

یہ سب مولوی عمار علی صاحب کی مجلسازی ہے مگر موافق نقل مشہور حق بزرگان جاری شود، مولوی صاحب بلکہ پیشوایان مولوی صاحب اس جھوٹ میں

بھی بیباختہ حق کہہ گزرنے اتنا تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت قابل قتل ہیں۔ سو اہل سنت کو سمجھنا چاہیے کہ وہ کس وجہ کو مقبول ہوں گے اور جب اہل سنت مقبول ہوئے تو لاجرم شیعہ مردود اور داخل زمرہ اہل بدعت اور قابل قتل ہوں گے القصہ اگر آدمی فہمیدہ ہو اور مولوی صاحب کی ان فریب بازیوں کو دیکھے تو بلا تامل و جال نہیں تو کو چک ابدال و جال سمجھو اللہ ایسے فریب باز ہم نے بھی نہ دیکھے تھے نہ سنے تھے اپنی کتابوں کی روایات کو جو حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کے بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر دلالت کرتی ہیں چھپا کر گھوٹ بول دیا تو بظاہر یہ احتمال تھا کہ اہل سنت کو شیعوں کی روایات کی کیا خبر ہوگی پر اس بے حیائی کو دیکھنا کہ اہل سنت کے سامنے اہل سنت ہی کی کتابوں کے حوالہ سے جھوٹ بولتے ہیں اور دروغ گویم بر روئے تو۔

ذی النورین کے بچاؤ کے لئے صحابہ اور اہل بیت کی جان کا ہی خیر مولوی صاحب کو تو اس شرمانے سے کب شرم آتی ہے جیسا تو حیا والوں ہی کو آتی ہے۔ اس لئے لازم یوں ہے کہ صحابہ کا اور اہل بیت کا بدل و جان حضرت عثمان کے بچانے کی تدبیروں میں مصروف رہنا اور متمنی اجازت حضرت عثمان در باب قتال اہل ہوا ہونا روایات صحیحہ اور تواریخ طرفین سے ثابت کیجئے تاکہ مسلمان سادہ لوح مولوی عمار علی صاحب کی ان ابلہ فریبوں سے فریب میں نہ آجائیں۔ اور شاید مولوی صاحب کی بھی اس خواب غفلت سے آنکھ کھل جائے اور اس نشہ ضلالت سے چونک اٹھیں بغور سنئے کہ جو کچھ مولوی صاحب نے رقم فرمایا ہے محض افتراء اور سراسر بہتان ہے لڑکے اور دیوانے بھی ہوں تو سمجھ جائیں کہ یہ فقط مولوی صاحب کی شرارت ہے اس لئے کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور حضرت عائشہ اور امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص جو حضرت امیر سے لڑتے تھے تو حضرت عثمان کے قصاص ہی کیلئے تو لڑتے تھے چونکہ قاتلان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت امیر کے ساتھ ہوئے تھے اور حضرت بنا چاری انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ بسبب کثرت اور شورہ لشتی کے کسی سے دیتے نہ تھے اور بجائے خود یوں سمجھتے تھے کہ جب ہم نے نبی بنائی خلافت کو درہم برہم کر دیا تو اوروں کی کیا ہستی ہے؟ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر وغیرہم کو تو اس قسم کے توہمات تھے کہ حضرت علی دربارہ قصاص مدائن

کرتے ہیں اور امیر معاویہ اور ان کے ذیل کے لوگوں سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان حضرت علی ہی کے اشاروں سے قتل ہوئے ہیں۔

خیر تلوار یخ طرفین شیعہ و سنی (کی) حاضرین صحابہ نے بلوا، قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے دبانے میں اپنی طرف سے کچھ قصور نہیں کیا پر مقتدریوں ہی تھا تا مقدور کلمہ کلام سے بلوائیوں کو سمجھایا جب کچھ ان کی سمجھ میں نہ آئی تو حضرت عثمان سے قتل قتال کی اجازت چاہی پر حضرت عثمان ہی قتل قتال اور جنگ و جدال کے روادار نہ ہوئے بلکہ کمال تاکید سے مانع آئے لاچار ہو کے صحابہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے بائیں ہمہ پانی کے پہنچانے اور بلوائیوں کے ہٹانے میں آخر تک تدبیروں میں مشغول رہے حضرت زید بن ثابت انصار تمام انصاریوں کو لے کر آئے اور جو انان انصار نے کہا اگر فرماؤ تو دوبارہ انصار خدا بنیں عبداللہ بن عمر تمام ہاجرین کے ساتھ آئے اور یہ کہا جنھوں نے تم پر بلوا کر رکھا ہو وہی لوگ ہیں جو ہماری ہی تلواروں سے مسلمان ہوئے ہیں اور اب تک ان صدموں کے ڈر سے پاجامہ میں گئے دیتے ہیں یہ ساری بڑھ بڑھ کے باتیں کرنی ان کی اس سبب ہیں کہ کلمہ گو ہیں اور تم کلمہ گوئی کا لحاظ کرتے ہو اگر فرماؤ تو انہیں ان کی حقیقت دکھلا دیں اور وہ بھولے دن پھر انہیں یاد دلادیں حضرت عثمان نے فرمایا۔ یہی بات مت کہو، ایک میری جان کے لئے اتنا ہنگامہ اسلام میں برپا مت کرو مگر با اینہم حضرت حسنین عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر ابو ہریرہ عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اور سوا ان کے اور صحابہ حضرت عثمان کے ساتھ ان کے گھر میں تھے اور جب بلوائی ہجوم کرتے تھے تو یہ سب صاحب پتھر لاٹھی مار مار ہٹاتے تھے اور دروازہ بند کر دیتے تھے اور حضرت عثمان کے غلام جو ایک فوج کی فوج تھے یہاں تک کہ اگر آپ ان کو حکم دے دیتے تو اہل بلوا کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہتھیار اور لڑائی کا سامان لے کر حاضر ہوئے اور کمال زاری اور بے قراری سے کہا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ خراسان سے افریقہ تک کوئی ہماری تلوار کے سامنے نہیں ٹھیرا اگر حکم ہو تو ان لوگوں کا گھمنڈ نکال دیں اور تماشا دکھلا دیں کیونکہ سمجھانے سے تو ان کی اصلاح نہیں ہوتی انہوں نے دیکھا کہ کلمہ گوئی کے باعث ہمیں کوئی چھڑ نہیں سکتا سلئے روبرو نہیں ہوتے اور تمہارے اور سوا تمہارے اور بڑے بڑے صحابہ کی بات نہیں سنتے حضرت

عثمان یہی فرمائے جاتے تھے کہ اگر میری خوشی منظور ہے اور میرا حق نمک ادا کرنا چاہتے ہو تو ہتھیار الگ کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہو۔ اور جو ہتھیار الگ کر دے گا اسے میں نے آزاد کیا واللہ خونریزی خلاق سے پہلے اگر میں مقتول ہو جاؤں تو یہ مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے اس بات سے کہ خونریزی کے بعد مارا جاؤں یعنی میری شہادت تو لکھی ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمادیا تھا تم لڑو یا نہ لڑو میں مقتول ہوں۔ سو کیا فائدہ کہ لوگ بھی مارے جائیں اور مطلب بھی حاصل نہ ہو۔

اور تواریخ فریقین میں موجود ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں اور حضرت جعفر کی اولاد کو اور اپنے چیلے قنبر کو حضرت عثمان کے دروازہ پر متعین کر رکھا تھا اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے بھی اپنے بیٹوں کو دروازہ پر بٹھادیا تھا تاکہ بلوائیوں کو دھکے دیتے رہیں۔ سو جب اہل بلوا ہجوم کر کے آتے تھے یہ سب لاٹھی لکڑی سے جوبہا تھ میں آجاتا، لڑتے تھے یہاں تک کہ حضرت سبط اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ عنہ خون آلودہ ہو گئے محمد بن طلحہ اور قنبر کے سر پر زخم لگا، جب دروازہ کی راہ سے اہل بلوا کو آنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اندر گھسنے کی کوئی تدبیر نہ بنی تو پیچھے سے بعض انصاریوں کے گھر میں نقب دیکر اندر گھس گئے اور حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔

ذوالنورین کے لئے امام کی مدافعت | نہج البلاغۃ جواہر الکتاب شیعہ ہے اس بات کی گواہ ہے حضرت امیر سے اس میں روایت ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا **وَلَدْتُ قَدْ دَفَعْتُ عَنْهُ**۔ یعنی حضرت علی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ واللہ میں نے تو حضرت عثمان سے اس بلا اور اس بلوا کو بہت ہی ہٹایا، اس کی شرح میں تمام شراح نہج البلاغۃ نے روایت کیا ہے کہ حضرت امیر بلوا کے دلوں میں جب حضرت عثمان کے گھر میں آتے تھے تو بلوائیوں کو چابک مار مار دے کر تے تھے اور برا بھلا کہتے تھے اور لعنت کرتے تھے ابن عثم کو فی یعنی شیعوں کا موبخ جو حضرت عثمان وغیرہ اصحاب کرام کا دشمن جان ہے وہی اپنی فتوح میں نقل کرتا ہے کہ حضرت امیر نے فرزند ارجمند سبط اکبر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ حضرت عثمان کے پاس جاؤ اور کہو میرے والد کا دل تمہاری ہی طرف لگا ہوا ہے فرماتے ہیں میں سنتا ہوں کہ یہ لوگ تمہارے مقدمہ میں

کچھ بہت شور و غل کر رہے ہیں اور کسی کی نصیحت نہیں سنتے اور تمہارے قتل کا مصمم ارادہ کئے بیٹھے ہیں اس لئے تمہاری طرف سے مجھے بہت اندیشہ ہو رہا ہے اگر فرماؤ تو میں بھی آ کر تمہارا مددگار ہوں اور ان لوگوں سے لڑوں اور جس طرح بن پڑے ان لوگوں کو تمہارے دروازہ سے ہٹاؤں حضرت امام حسن حسب ارشاد والد ماجد حضرت عثمان کے پاس آئے، اور یہ پیام پہنچایا انہوں نے فرمایا مجھے منظور نہیں کہ آپ تکلیف اٹھائیں اور ان لوگوں سے لڑیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے یوں فرماتے ہیں، اگر ان لوگوں سے لڑو تو لڑو فتح ہوگی اور نہ لڑو تو روزہ ہمارا پاس کھولیو۔ سواب یہی تمنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر روزہ کھولئے حضرت حسن چپ ہو کر چلے آئے۔

حضرت امام کا کوئی معاملہ ظاہر داری نہ تھا اب سنئے اہل ایمان کا تو یہ کام نہیں کہ حضرت امیر کے تمام معاملات کو نفاق اور ظاہر داری پر محمول کریں شیعہ اگر حکم المیر و یقیس علی نفسہ حضرت امیر اور صاحبزادوں کے ان معاملات اور ان تمام گفتگوں کو منافقانہ سمجھیں، تو انہیں اہل ایمان ہی کون سمجھتا ہے معاذ اللہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور نفاق، جو کفر از کعبہ بر خیز و کجا ماند مسلمان، اور اگر بالفرض محال نفاق ہی تھا تو اسی وقت ہو گا اپنی خلافت میں کوفہ میں جب خطبہ میں اس بات پر قسم کھائی کہ میں نے قاتلان عثمان کو بہت ہٹایا تو اس وقت کیا دباؤ تھا جب تو حضرت عثمان بھی شہید ہو لئے تھے اور قطع نظر شجاعت کے کار فرمائے خلافت بھی آپ ہی تھے مرنے ہوئے سے تو نامرد بھی نہیں ڈرتے اور بے سرو سامان کو ہر اس نہیں ہوتا، حضرت علی کو اس شجاعت اور اس شوکت پر کیا ہوا کہ اب تک بھی عثمان کا خوف نہ گیا اگر بزعیم شیعہ اس میں کچھ نفاق ہوتا تو حضرت عثمان کی شہادت کے بعد آواز بلند یوں کیوں فرماتے؟ دفاع عثمان کے لئے دیگر صحابہ کا رویہ اور حضرت عبداللہ بن سلام ہر صبح کو بلوایوں کے پاس جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت عثمان کو قتل مت کرو ورنہ ان کے قتل کے بعد بہت سے فتنے فساد اٹھیں گے اور حضرت حذیفہ بن الیمان جن کو منافقین کا علم تھا اور حضرت امیر نے بھی ان کے حق میں اس علم کی گواہی دی، چنانچہ شیعوں کی کتابوں میں موجود ہے بلوایوں کو حضرت

عثمان کے قتل سے بتا کید منع کرتے تھے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ ان کا مارا جانا بہت فتنوں کا باعث ہو جائے گا اب کوئی مولوی صاحب پوچھے کہ یہ لوگ جن کا مذکور ہوا صحابہ نہیں تو اور کون ہیں؟ پھر ان میں سے حضرت علی تو وہ ہیں کہ وہ اکیلے لاکھوں کے برابر ہیں۔ خصوصاً شیعوں کے نزدیک، سو اگر بالفرض والتقدیر صحابہ ہی نے ان کو قتل کیا ہوتا تو حضرت علی تو مانع ہی تھے، پھر مولوی صاحب نے کس خوبی پر سچو کے موقع میں کہہ دیا کہ صحابہ رسول نے تنگ ہو کر اُسے قتل کیا، مگر میں ہی چوکا مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام شیعہ حضرت امیر اور بزرگان مسطور الاسم کو صحابہ نہیں سمجھتے، یہ تو او باش کوفہ اور بدعاشان مصر اور منافقان امت کو صحابہ سمجھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو حضرت عثمان کے قتل کے لئے اکھٹے ہو کر آئے تھے۔ سو مولوی صاحب نے اپنے عندیہ کے موافق سچ ہی کہا ہے، زوف ہے اس عقل ناہنجار پر کہ اپنے مذہب کے پابند بھی تو نہیں، بہر حال یہ جو مولوی صاحب نے لکھا ہی کہ صحابہ نے تنگ ہو کر قتل کیا سرسہرتان اور دروغ صریح ہے، پر جسے نہ خدا کا ڈر ہو نہ خلق کی شرم وہ جو چاہے سو کرے مگر ہم تو اس بے حیائی اور اس جرأت پر غش ہیں کہ کس دلاوی سے فرماتے ہیں اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جاوے۔

ع۔ چہ دلاور ست و زردے کہ بکف چراغ دارد

حضرت علی پر زہلی کا بہتان | اور یہ جو کچھ جناب مولوی صاحب حضرت عائشہ اور حضرت علی کی جنگ کے باب میں رقم فرماتے ہیں کہ ان کی باہم بہتر جنگ نہیں ہوئیں ہیں اور جہاد مال دنیا کے واسطے نہیں ہوتا یہ بجاد درست، مگر تعجب ہے کہ اس بات میں مولوی صاحب نے کچھ جھوٹ نہیں بولا ہم جانیں یہ مثل سچی ہے، اَلْكَذُّ وَبُ قَدْ يَصْدُقُ یعنی جھوٹا کبھی سچ بھی بول دے ہے لیکن تاہم بھی حق سے چشم پوشی کر ہی گئے، حضرت علی کے صحابہ ثلاثہ سے جہاد نہ کرنے کو اس وجہ پر محمول کرتے ہیں کہ حضرت علی کے پاس انصار اور مددگار کب تھے۔ کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ انصار اور مددگار کی ضرورت جہاد میں فقط اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ تنہا آدمی مجمع کثیر کے مقابلہ میں کیا کرے گا؟ سو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر بوجہ نہ ہونے انصار کے قبل مدینہ منورہ کو آنے کے جہاد نہ کیا تو بجائے خود

تھا کہ آپ میں تنہا تاب مقابلہ کفار نہ تھی۔ حضرت امیر کو کیا عذر تھا جو انہوں نے تنہا جہاد نہ کیا دیکھو تو وہ خود اپنے حال میں کیا فرماتے ہیں:-

حضرت علی تمام دنیا پر بھاری تھے | نبی البلاغت میں جوامع الکتب شیعہ ہے علامہ رضی ثقل کمرے

یعنی فرمایا حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ

عنه نے کہ تحقیق قسم اللہ کی اگر میں ان سے

تنہا ملوں اور وہ اس کثرت سے ہوں کہ

تمام روئے زمین کو ڈھکے بھٹے ہوں تو میں کچھ

پروانہ کروں اور دھجراؤں اور مجھے انکی گہرائی

اور اپنی ہدایت (جانوں آنکھوں کی نظر آ رہی ہے)

امد خدا کی طرف سے اس کا یقین ہو گیا ہے

اور میں اللہ تعالیٰ کے ملنے اور اس کے

ثواب کا منتظر اور امیدوار ہوں۔ فقط

ہیں۔ قَالَ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ إِنِّي

وَاللَّهِ لَوْ لَقِيتُهُمْ وَاحِدًا أَوْ هُمْ

طُلَاعُ الْكَارِضِ كُلِّهَا مَا بَالَيْتُ

وَلَا أَسْتَوْحِشْتُ وَإِنِّي مِنْ

ضَلَالَتِهِمُ الَّتِي فِيهَا وَالْهَدَى

الَّذِي أَنَا عَلَيْهِ لَعَلِّي بِصِيرَةٍ

مِنْ نَفْسِي وَبِقَيْنٍ مِنْ رَبِّي

وَإِنِّي إِلَى لِقَاءِ اللَّهِ وَلِحُسْنِ

ثَوَابِهِ لَمُنْتَظِرٌ وَرَاجِعٌ۔

جو شخص کہ تمام روئے زمین کے آدمیوں بلکہ اتنے آدمیوں سے بھی جو زمین کو ڈھک

لیں تنہا نہ ڈرے اس کو انصار اور مددگار کی کیا حاجت؟ ہاں اماموں کی موت

اپنے اختیار میں نہ ہوتی تو یوں بھی کہہ سکتے کہ نہ گھبرانے اور نہ پروا کرنے سے یہ لازم نہیں

آتا کہ آدمی مارا بھی نہ جائے شاید اس سبب سے جہاد نہ کیا ہو آپ نے سمجھا میں تنہا لڑوں گا

تو فتح تو معلوم میرا ہی جاؤں گا پھر کیا حاصل؟ جہاد اعلا دین کے لئے ہے جب وہ تو حاصل

نہ ہو اور فقط جان ہی جاتی رہے پھر جہاد کا ہے کہ لئے کیجئے؟ کچھ خدا کو فقط جان گنوانا

تو مطلوب نہیں۔

حضرت علی شجاعت میں بے مثل اور اپنی | اور در صورتیکہ امام کا انتقال اس کے اختیار میں ہو

موت پر قابو یافتہ تھے (بزعم شیعہ) چنانچہ کلینی نے اس کو ثابت کیا اور تمام امام میرا

پر متفق ہیں تو پھر تنہا جہاد میں وہ ترقی دین ہوتی کہ مجمع کی صورت میں ہرگز ممکن نہیں

مددگاروں کی وجہ سے اگر آدمی نہ مارا جائے تو کوشش کی بات نہیں ہاں تنہا ہو کر پھر

تمام جہان جس کو نہ مار سکے اس سے زیادہ اور کیا معجزہ ہو گا۔ ہندو جو عجائب پرست ہیں اگر ایسا معجزہ کسی سے دیکھ لیں تو بیشک پکاراٹھیں کہ **اَلَا هُوَ اَیْکَ دُورِ** دفعہ بھی اگر ایسی لڑائی لڑ لیتے تو بہت سے بہت تکلیف ہوتی تو اتنی ہی ہوتی کہ آپ زخمی ہی ہو جاتے یا بیہوش ہو جاتے لیکن عموماً یہ اعتقاد لوگوں کے دل میں بیٹھ جاتا کہ چیرتے تو سکلتا اور موافق مخالف سب حلقہ بگوش حضرت امیرؓ ہو جاتے اور دین کی ایسی ترقی ہوتی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کرات مرآت کثیر کثیر انبواہ سے جہاد کر نہیں وہ ترقی نہ ہوئی تھی کیونکہ کفار غلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ جمعیت سمجھ کر معتقد نہ ہوئے تھے اسی واسطے اپنے غلبہ کی بھی امید رکھتے تھے اور لڑنے سے دریغ نہ کرتے تھے اگر حضرت امیرؓ تنہا لڑتے تو جو مطلب کہ حضرت امام ہمام امام ہمدی کے آنے پر موقوف تھا وہ بھی حاصل ہو جاتا اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ گزرا وہ ظہور میں نہ آتا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ لڑنا تو شے دیگر حضرت امیرؓ تو اصحاب ثلاثہ کے سامنے کبھی اتنا بھی نہ بولے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل اور امیہ بن خلف اور ابولہب اور ولید بن عقبہ وغیرہم کے سامنے بول لے تھے، طرفہ تماشلہ ہے کہ جناب سرور کائنات کے اس زور اور بل اور قوت اور شجاعت کے باب میں کوئی روایت نہ ہو، اور وہ تو حق گوئی کی بدولت کفار نگوں سار کے ہاتھ سے عالم تنہائی میں کیا کیا جفائیں اٹھائیں یہاں تک کہ علاوہ دشنام ہائے نافرجام اور دست درازی ہائے بے اندازہ کی نوبت یہ پہنچی کہ گھر باہر سب کو اوداع کیا۔

حضرت علیؓ نے پوری زندگی خوف و ذلت گزاری (زعم شیعہ) حضرت امیرؓ کو ایک دفعہ بھی یہ نوبت نہ آئی کہ علیؓ الاعلان حق گوئی اختیار کریں اور جفائیں اٹھائیں یا مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے شرف ہجرت کو اضعاف مضاعف فرماتے بلکہ ہم پیالہ اور ہم نوالہ انہیں کے پیچھے نمازیں پڑھتے عید جمعہ میں انہیں کے خطبہ سنتے انہیں سے رشتہ پیوند قرابت پیدا کرتے تمام عمر یوں ہی گذاری اور بھی کچھ نہیں ہو سکے تھا تو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقیہ نہ کیا تھا آپ بھی نہ کرتے، القصہ حضرت امیرؓ کے جہاد نہ کرنے کو اس بات پر محمول کرنا کہ آپ کے ساتھ انصار اور مددگار نہ تھے کمال سفاہت ہی بلکہ درپردہ حضرت امیرؓ کی تکذیب

کرنی ہے تو حضرت امیر تو یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے مقابلہ میں سارا جہان بھی آجائے تو کچھ اندیشہ نہیں اور پھر بوجہ موت کے اختیاری ہونے کے تنہائی کی صورت میں اور امید بہبودی تھی اور مولوی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ حضرت امیر انصار کے محتاج تھے معہذا اور کتابوں کو تو پلٹ کر دیکھیں انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عم شیعہ سب انصار و مددگار حضرت امیر تھے اولاد انصار آپ کی مددگار رہی آپ کے ایام خلافت میں اکثر اولاد انصار آپ کے ساتھ تھی پھر کیا وجہ کہ آپ نے اصحاب ثلاثہ کے زمانہ میں جہاد نہ کیا؟ انصاف یوں ہے کہ حضرت امیر بہ دل معین و مددگار خلفائے ثلاثہ رہے خصوصاً شیخین، کہ آپ نے ان کی تعریفیں اپنی خلافت میں بھی کی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ زمانہ تقیہ کا نہ تھا با اعتقاد جمہور امامیہ اس زمانہ میں آپ پر تقیہ حرام تھا چنانچہ پہلے مرقوم ہو چکا، اور نیز اس زمانہ میں ان کا انتقال ہو چکا تھا مرے ہوئے سے تو نامردوں کو بھی خوف نہیں ہوتا چہ جائیکہ حضرت علیؑ؟ پھر ان سب قائل کے ملاحظہ کے بعد اور حضرت علیؑ کی شجاعت اور کمالات اور قوت ایمانی کو خیال کر کے اہل فہم کو تو بجز اس کے خیال میں نہیں آسکتا کہ حضرت علیؑ کا سکوت فقط اسی وجہ سے تھا کہ ان کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے، حضرت علیؑ باوجود بے مثل شجاعت کے باقی جناب مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ جہاد ممال دنیا کے جگر گوشہ رسول کو فدک نہ دلا سکے لئے ہوتا ہے ہر چند درست ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مظلوم کی نصرت دین میں سے ہے یا دنیا میں سے؟ اور مظلوم بھی کون جگر گوشہ جناب الاولین و آخرین، اگر ایسے مظلوموں کی نصرت داخل دین ہے تو حضرت علیؑ نے باوجود اتنی استطاعت کے کہ اکیلے سارے جہان کا مقابلہ کر سکتے تھے اور اپنی جان کا کچھ زیاں بھی نہ تھا معہذا انصار ان کے انصار تھے کیوں حضرت زہراؑ کی مدد نہ کی؟ اگر حضرت زہراؑ معاف کر دیتی جب بھی ایک بات تھی حسب الارشاد مولوی صاحب موصوف تادم واپس ابوبکر صدیق کا ظلم ان کے پیش نظر تھا اور اگر یوں کہیے کہ نصرت مظلوم کا دنیاوی ہے تو دنیا کی خوبی اور بزرگی تو سب ہی جانتے ہیں اس صورت میں نصرت مظلوم اگر ممنوع بھی نہ ہوگی تو موجب ثواب بھی نہ ہوگی واجب تو درکنار پھر بایہمہ ترک نصرت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے جو سینہا شیعہ لبریز شکایت صحابہ اور اولاد صحابہ پر محض بیجا ہوا لیکن ہم جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نصرت مظلوم کو منجملہ دین بلکہ واجب

ہی قرار دیں گے کیوں اول تو کلام اللہ اور احادیث طرین اس مضمون سے مشحون ہیں، دوسرے صحابہ کے مطاعن کی کوئی بات چاہیے مولوی صاحب تو اس پر غش میں بلا سے حضرت امیر پر بھی حرف آجائے مگر ہمیں خدا کی ذات سے یقین ہے کہ ہم نے جو کچھ تقیہ کے باب میں اوپر لکھا ہے اگر مولوی صاحب بغور دیکھیں تو زبان سے بھی نہ کہیں گے تو دل سے تو بیشک اس بات کے معتقد ہو جائیں گے کہ حضرت امیر کا اصحاب ثلاثہ سے بیعت کرنا اور فدک کے نہ دینے پر سکوت کرنا سب بوجہ حقانیت اصحاب ثلاثہ تھا نہ بوجہ تقیہ۔ اور اگے جو کچھ آتا ہے۔

انشاء اللہ وہ تقریر ماسبق کی اور تاکید کرے گا۔ اس مجموعہ کو دیکھ کر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت امیر کی وہ لوگ زیادہ قدر کرتے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ آپ کسی سے ہارے ہوئے نہ تھے اور بسبب ضعف اور ناتوانی کے خلفاء کے ساتھ موافقت نہ رکھتے تھے بلکہ محض خدا واسطے۔ یا وہ لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ آپ ذلیل و خوار بے سرو سامان ناتوان ناچار می کے باعث اطاعت کرتے تھے اور آپ کے دل میں کچھ تھا اور نہ ہان پر کچھ تھا تمام عمر اخفاء حق اور کتمان دین میں مصروف رہے، اور یاد ہو دیکھ آیہ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ كَعَالَمُونَ (جس کا یہ مضمون ہے کہ خلط ملط مت کرو حق کو باطل کے ساتھ، اور مت چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر، آپ کو یاد تھی پھر بھی حضرت اصحاب کے ساتھ ایسی ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہوئے کہ بظاہر حق و باطل کی تمیز دشوار ہو گئی چنانچہ گروہ عظم السنت اسی دھوکے میں اصحاب ثلاثہ کی حد سے زیادہ توقیر کرنے لگے اور معاملہ سب برعکس ہو گیا دین اصلی بہت ضعیف اور مخفی رہ گیا۔

حضرت ام کلثوم کے نکاح کی بحث [میسرا مطلب حضور کے رفیقہ میں یہ تھی کہ حضرت ام کلثوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی جو حضرت علی کے صلب اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کے شکم سے تھیں ان کا نکاح حضرت محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا ہر چند یہ جواب سوال سائل پر بظاہر منطبق ہے لیکن حقیقت میں دیکھئے کہ یہ جواب سوال سائل سے ایسی ہی نسبت رکھتا ہے جیسے کہ کسی گاہک کے اس سوال کے ساتھ کہ لالہ تیل بھی ہے لالہ کا یہ جواب ہاں میاں آلو بھی ہے اتنا تو مولوی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ سائل کی غرض اس بات کے پوچھنے سے کہ حضرت

علی کی بیٹیوں کا نکاح کس کس ہوا ہے یہی ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت ام کلثوم دختر مطہرہ
 حضرت زہرا رضی اللہ عنہما کا نکاح حضرت عمر سے ہوا یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ اور یہ بھی احتمال ہے
 کہ مولوی صاحب نہ سمجھے ہوں اس لئے کہ بات بھی تو بہت مشکل ہے بہر حال جناب مولوی
 صاحب نے اس جواب میں طرفہ چالاکی کی ہے کہ جواب کا جواب دے دیا اور بات کی بات رکھ
 لی مگر نہ معلوم اس جواب میں پہلی چال کیوں بھول گئے یا اور کوئی عمدہ مصلحت نظر آئی یہ تو
 حضرت ام کلثوم کی مولوی صاحب کی طرف شکایت رہ گئی کہ ان کی خالائوں کو تو مولوی صاحب
 نے جفا قطع نسب مستحق اجر عظیم کیا انہوں نے کیا قصور کیا تھا جو مولوی صاحب نے اس عتاب
 سے محروم رکھا؟ کیا وہ اہل بیت میں سے تھے جو اس جفا سے دریغ کیا مگر مولوی صاحب کی طرف
 سے میں جواب دیئے دیتا ہوں اَلْفُضْلُ لِمُتَّقِدِم یعنی بزرگی پہلوں ہی کے لئے ہے، اس
 مثل کے خلاف کیونکر کر دیں شاید ملازمان مولوی صاحب کو یہ گمان ہوا ہو کہ حضرت
 ام کلثوم بنت سید النساء کی تزویج کا قصہ حضرت عمر سے بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کی صاحبزادیوں کے نکاح کے جو حضرت عثمان سے ہوا تھا ایک جدید امر ہے اور تازہ
 بات، مبادا اس کا کوئی جاننے والا ہو اور قلعی کھل جائے مگر میں ذمہ کش ہوں اہل سنت ان
 دونوں قصوں کو یکساں پرانا سمجھتے ہیں اور اس فرق کو فرق نہیں سمجھتے۔ اب کے جناب مولوی
 صاحب اگر میرا در علی صاحب کو یہ مضمون لکھ کر کہ حضرت ام کلثوم حضرت زہرا رضی اللہ عنہما کی
 بیٹی ہی نہ تھیں اصلاح تحریر متقدم کر دیں اور اندیشہ بطنی سیناں ہو تو غدر بکدا موجود ہے
 آپ کچھ خدا سے تو زیادہ نہیں؟ جب خداوند کریم کو بائیں ہمہ علم غیب بکدا واقع ہوتا، تو
 آپ تو آدمی ہی ہیں۔

القصة مصلحت یوں ہے کہ اسما و بنت عمیس کی طرف منسوب کر دیجئے اور جھوٹ
 ہے تو بلا سے ”چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست“، جہاں رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کی نسبت میں تصرف کیا ہے تو اسی کے نسب میں بھی یہی معہذا
 اور ابنائے روزگار فقط دنیا کے لئے سینکڑوں جھوٹ بولتے ہیں آپ نے اگر دو جھوٹ حفظ
 دین کے لئے بول دیئے تو کیا غضب ہوا بلکہ سنظر یا سننگ و ناموس دین اور متابعت

بزرگان اور ائمہ اطہار امیرِ ثواب عظیم ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا تقیہ ہے۔

عمار علی کی تبلیس | لیکن جناب مولوی صاحب کے لوازم رائے زنی اور مشورہ گوئی میں سے ہے کہ جملہ مراتب نفع و نقصان سے اطلاع کر دیجئے۔ اس لئے معروض ہو کہ بایں ہمہ منافع ایک اس میں نقصان بھی ہے کہ جناب باری تعالیٰ یوں بھی فرماتا ہے وَكَذَّبُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ یعنی حق باطل کو مت رلاؤ اور نہ چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر دوسرے یوں بھی فرماتا ہے وَكَذَّبُوا الشَّهَادَةَ مِنْ يَكْتُمُهَا فَإِنَّهُ أَثِمٌ قَلْبُهُ یعنی نہ چھپاؤ گواہی اور جو چھپائے گواہی تو اس کا دل گنہگار ہے، ان دونوں آیات پر نظر کر لیجئے مگر مجھ سے غلطی ہوئی آپ نے اب کون سی حق و باطل کے رلانے اور شہادت حق کے چھپانے میں کمی کی ہے جو اس کا اندیشہ ہو اس سے زیادہ اور کیا رلانا ہو گا کہ حضرت عمر کے نکاح کا نام ہی نہ لیا بلکہ اصل رلانا تو یہی ہے اگر صاف انکار کر دیتے اور کہہ دیتے کہ حضرت زہرا کے یا حضرت علی کے کوئی بیٹی ہی نہ تھی تو یہ رلانا نہ تھا اسے انکار کہتے ہیں اور عربی زبان میں اسے جھوٹ کہتے ہیں اور یہ جو اکثر کہتا ہے وَمَا يَنْجُ دُبَايَا تَنَا تُو اسی مقام میں آتا ہے اور یہ انداز کہ جواب کا جواب ہو جائے اور پھر بات ہاتھ سے نہ جائے جیسے مولوی صاحب نے اس مقام میں کیا ہے تو یہ عین حق و باطل کا رلا دینا ہے معند حق باطل کے خلط ملط کر دینے میں جو برائی ہے تو فقط اسی سبب سے کہ دوسرا کوئی دھوکا نہ کھائے در صورتیکہ اہل سنت جماعت نے شیعوں کی روایات سے یہ ثابت کر دیا ہو کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے ہوا تو کیا اندیشہ؟ وہ دھوکے کی بات ہی نہ رہی جس سے ڈرئے اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو یہ دیکھئے آپ کے یہاں کی روایتیں اس باب میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ آپ اپنی عادت سلف و غا و فریب کو نہ چھوڑیئے۔

فاروق سے ام کلثوم کا نکاح حضرت عباس نے کیا تھا | قاضی نور اللہ صاحب شہید رابع حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں رقم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس سے بہت محبت تھی اور ان کے حق میں یوں فرماتے تھے کہ عباس میرے باپ کی جگہ ہے اور سو اس کے بہت ہی کچھ ان کے فضائل لکھے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت عباس نے حضرت عمر کے کہنے کے موافق حضرت امیر سے حضرت ام کلثوم کے نکاح کی خواستگاری کی حضرت امیر نے

اول بابا انکار فرمایا دوسری دفعہ سکوت فرمایا، بعد ازاں حضرت عباس نے خود حضرت ام کلثوم کا حضرت عمرؓ نے نکاح کر دیا حضرت امیرؓ بوجہ تفتیہ منع نہ کر سکے اس لیے چپکے بولے یہ تو قاضی صاحب کا بیان۔
 بزعم شیعہ حضرت عباسؓ اعراف میں ہوں گے میں نے اپنے اعتقاد کے موافق حضرت عباسؓ اور حضرت کے نام پر لفظ حضرت لگا دیا ہے ورنہ قاضی صاحب سے اس تعظیم کی کسے امید ہے؟ اس لئے کہ حضرت عمرؓ تو ان کے نزدیک حضرت عمرؓ ہیں وہ حضرت عباسؓ کے حق میں بھی اسی بیان کے پس پیش میں یوں لکھتے ہیں بلکہ یہ تقریر بھی بطور دلیل ہی بیان کی ہے اور مطلب اصلی ان کا یہ ہے کہ وہ اعراف میں ہوں گے، لیکن حق بات چھپی نہیں رہتی عاقل خود جانتے ہیں کہ جو ایسے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں وہ اعراف میں کیوں کمرہ میں گئے؟ ان کے تو نیاز مند بھی اگر جنت میں چلے جائیں تو کچھ بعید نہیں، حیف صد حیف مہمان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا تو یہ رتبہ ہو کہ ان کے محبتوں کو کوئی گناہ ضرر نہ کرے بلکہ گناہ تو گناہ کفر بھی ضرر نہ کرے،

محبوب رسول اعراف میں اور یہودی و نصرائی جنت میں چنانچہ رضی الدین لغوی نے زیننا بن اسحق نصرائی کے جنتی ہونے کا فقط چند بیتوں کی تصنیف کے باعث جن کے مضمون سے محبت حضرت علیؓ شکی ہے حکم کر دیا ہے حالانکہ انہیں ابیات سے اس کا نصرائی ہونا ثابت ہے اور ایسے ہی ابن فضلونؒ یہودی کو سب علماء داس فرقہ کے بزرگ سمجھتے ہیں اس کا باعث بھی یہی دوین ہیں ہیں۔ قصہ حضرت علیؓ کا تو یہ رتبہ کہ ان کے محب بھی اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہوں جنت میں جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب بھی جنت میں نہ جانے پائیں اعراف سے آگے

شعر زیننا نصرائی لہ

لسوء و لکنی محب لها شہم
 اذا ذکر و انی اللہ لومۃ کائن
 و اہل البنی من اعز و اعاجم
 سرفی قلوب الخلق حتی البہائم
 و اعف عنی بحق ال رسول
 سید الاولیاء بعل قبول

عدتی و تیمہ کا احوال ذکر ہم
 و ما یعتبرنی فی علی و اہلہ
 یقولون ما بال نصاریٰ محبتہم
 فقلت لہم انی لا حسب جہم
 لا بن فضلون
 رب ہب لی من المعیشۃ سولی
 و اسقنی شربۃ بکف علی

قدم رکھنے کی اجازت نہ ہو اور پھر محبوب بھی کون چچا جان اور وہ بھی مسلمان، کیونکہ اگر کافر ہوتے تو اعراف تک کی نوبت میسر کہاں آتی۔ کیونکہ کفار کے لئے تو سیر تیار ہے فرماتے ہیں اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَكَنًا وَاَعْلًا وَلَا وَسْعَیْرًا یعنی ہم نے کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور سیر۔ دوسری آیت وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ خٰرُجٌ مُّہَیْمٌ یعنی جو لوگ کافر ہوئے ان کا ٹھکانہ بجز جہنم کے اور کچھ نہیں۔ بہر حال قاضی صاحب کی تحقیق کی خوبی دیکھنی چاہیے کہ کس دعویٰ کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت علی بھی ان کو بجائے پدرِ بزرگوار ہی سمجھتے تھے اگر بالفرض اپنا جی نہیں بھی چاہتا تھا تب اس وجہ سے کہ حضرت عباس کا فرمانا اس قابل نہیں کہ نہ مانے ان کا فرمانا قبول کر لیا۔ نہ کہ تفتیہ کی وجہ سے چپکے ہوئے۔ مگر حق گمراہ کرتا ہے۔ تو الٹی ہی سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت علی کی خاموشی رضامندی کی وجہ سے تھی | بہر حال اتنی بات ثابت ہے کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے بالضرور ہوا ہے باقی رہا عذرِ تفتیہ، سوال اہل عقل آپ پہچانتے ہیں کہ یہ خیال خام اہل تشیع بنے ورنہ یہ روایت خود ہی اس کی تکذیب کرتی ہے کہ یہ سانحہ بوجہ تفتیہ حضرت امیر پر گزرا ہو کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ اول تو حضرت امیر اور پھر تفتیہ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی یوں کہے کہ شیر ہو کر گیدڑوں سے ڈرتا ہے، اور پھر حضرت امیر کا تفتیہ بھی ایسے قصہ میں کہ کوئی کافر بے دین اور بے نعت اور بے مکین بھی گوارا نہ کرے، معہذا یہ بھی منجملہ محالاتِ عادی ہے کہ محبوبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ ہی کے خاندان کے ساتھ ایسی جفا ہو جس میں آئے اس لئے کہ محبت نبوی تو میزانِ حق و باطل ہونی چاہیے جس طرف کو آپ کی محبت جھکی وہ حق ہو دوسری جانب باطل، الغرض محبوبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ریب اہل حق میں سے ہوں گے پھر اہل حق سے کہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کی نو اسی کو ایک کافر بے دین کے حوالہ کر دے؟ معہذا ہم نے مانا کہ بوجہ تفتیہ ہی حضرت امیر نے یہ نکاح حضرت عمر سے کر دیا لیکن تاہم یہ عذرِ تفتیہ بدتر از گناہ ہے حضرت عمر کے ساتھ حضرت علی کو بھی کیوں سانتے ہو؟

فاروق اگر کافروں کو امام علی بھی محفوظ نہیں | بالجملہ یہ نکتہ محفوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اگر حضرت علی

مسلمان ہیں اور کامل الایمان ہیں تو حضرت عمر ضرور باایمان ہیں کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا اور حضرت عمر اگر نعوذ باللہ کافر میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے میں، کافر نہیں فاجر سہی کہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا، اپنے آپ کیا تو کفر میں کچھ شک نہیں۔ اور زبردستی کر دیا تو باوجود اس استطاعت کے اتنی بے عزتی نعوذ باللہ کہ ادنیٰ چار بھی گوارا نہ کرے حضرت علی تو درکنار الہی تو خوب جانتا ہے کہ میں عقیدہ سے بدل و جان ناخوش ہوں، اور حضرت زہرا کی صاحبزادی کا یہ قصہ بنا چاری لکھتا ہوں کہ کسی طرح مولوی عمار علی صاحب حضرت علی کی طرف سے بدظن نہ رہیں۔

ترویج ام کلثوم کا کتب شیعہ سے ثبوت اور خیر یہ بھی نہ سہی ہم بھی رہو نگے تو انشاء اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کو اماموں کے اقوال سے جھوٹا کریں گے کتب امامیہ میں صحیح صحیح روایتیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ حضرت امیر نے حضرت عمر کو لائق فائق سمجھا اپنی صاحبزادی مطہرہ کا نکاح کیا نہ کہ جبراً کرباً سئل اکامام محمد بن علی باقر عن ترونیجھا فقال لو کلا انہ رآہ اھلاً لکما کان یزورجھا ایاہ وکانت اشرف نساء العالمین جدہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واولادہما الحسن والحسین علیہما السلام سید شباب اھل الجنۃ وابوہما علی ذوالشرف والمنقبۃ فی الاسلام وامہا فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وجدتہا خدیجۃ بنت خویلد رضی اللہ عنہا حاصل اس کا یہ ہے

کہ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے حضرت ام کلثوم کے حضرت عمرؓ سے نکاح کی وجہ پوچھی گئی، انہوں نے فرمایا کہ اگر حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کو حضرت ام کلثوم کے لائق نہ سمجھتے ہرگز ان کا نکاح ان سے نہ کرتے وہ سارے جہان کی عورتوں سے زیادہ شرافت والی تھیں، اس لئے کہ نانا تو ان کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو بھائی ان کے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما جو جو انان جنت کے سردار ہیں، باپ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اسلام میں شرف اور منقبت رکھتے ہیں اور اماں ان کی حضرت

فاطمہ سید النساء و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، اور زانی ان کی خدمت کبرائے
خوید کی بیٹی رضی اللہ عنہا فقط،

شیعہ کو اہل بیت سے محبت نہیں صحابہ سے عداوت ہے۔ اس روایت کو دیکھئے اور حضرت قاضی
صاحب کی بناوٹ کو دیکھئے زوت اس دعویٰ محبت پر کہ اس پردہ میں کیا کہتے ہیں، مشہور تو
یوں کرتے ہیں کہ ہم کو اہل بیت سے محبت ہے اور اس لئے صحابہ سے عداوت ہے اور ہماری
تشخیص میں یوں آتا ہے کہ آپ کو اہل صحابہ سے عداوت ہے اور اس سبب اہل بیت
کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، سوا اہل بیت کب اس طرح کھینچتے ہیں بلکہ اس طرف سے کھینچتے ہیں
اور کیونکہ کچھیں۔ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ پر تفسیر حرام تھا چنانچہ بحث تفسیر میں اس کی
سند گذر چکی ان کے فرمانے کے بعد بھی حضرت علی اور حسنین کیا ان کے ساتھ بنی ہاشم کو
بے غیرت اور بے حیا بتلائے جاتے ہیں اور طاہرہ مطہرہ جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو جو اَلْمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لَیْسَ مِنْہُ حَبِیْبٌ عَنْکُمُ الرِّجْسُ اَہْلُ الْبَیْتِ وَ
یُطَهِّرُکُمْ تَطْہِیْرًا کی بشارت تطہیر میں داخل ہے بد شنام و زنا نعوذ باللہ پیش آتے
ہیں خدا ان خبیثوں کو سمجھے پھر اہل بیت کا ان پر غصہ نہ ہو تو اور کیا ہو جس کے دل میں
ایمان ہے وہ ایسی واہیات کو سن کے کانپ اٹھتے ہیں پر خدا جلنے ان تیرہ دروہوں کو
کیا ہوا کہ اپنے اس عیب قبح کے ہنر بنانے کے لئے اماموں پر بھی بہتان باندھتے ہیں یہ بے
ایمان کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر بہتان باندھتے ہیں اور اپنا لٹا ہ ان ...
کے سر دھرتے ہیں اور اس نکاح کے عذر میں یہ ناپاک الفاظ نقل کرتے ہیں کہ جن کی نقل سے
بھی جی ڈرتا ہے ترجمہ تو درکنار وہ الفاظ یہ ہیں وَهُوَ اَوَّلُ فَرْجٍ غُصِبَ مِنَّا اِیْخُوَانًا
عالم الغیب بچھروشن ہو کہ میں بدل و زبان اس خیال ناپاک سے بری ہوں اور یوں سمجھ
کر کہ نقل کفر نہایت بایں خیال نقل کرتا ہوں کہ شاید کوئی بے خبر ان دغا بازوں کے
دام میں پھنسا ہو ان کے کہ کفریات سن کر شاید راہ راست پر آجائے۔

حب حضرت علی کفر کے باوجود اگر خبیثی بناتی ہے تو قربت بھی بنائیگی افسوس ایک حضرت عمر کی عداوت
کے سبب خاندان بنوی کو تو اتنا بٹہ لگا دیا ہے کہ یہ نہ ہو سکا کہ تبصدق اہل بیت حضرت عمر

ہی کو شامل رحمت اور مغفرت خداوندی سمجھ لیتے کیا یہ نسبت تزویج زنیان اسحق
 نصرانی اور ابن فضلون یہودی کے اشعار سے بھی گئی؟ حب علی رضی اللہ عنہ میں یہ تاثیر
 کہ ایمان کی بھی ضرورت نہیں حالانکہ کلام اللہ سے کفار کا ٹھکانا جہنم ہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ
 مرقوم ہو چکا۔ پھر کیا اتنی بھی تاثیر نہ ہوگی کہ اپنے واسطے داروں کو بخشوالیں، بہر حال علماء
 شیعہ حضرت ام کلثوم کے حضرت عمرؓ سے نکاح ہونے میں متفق ہیں پر بعضے بھولے چو کے
 حق بات بول جاتے ہیں اور معنی بری طرح ادا کرتے ہیں۔ سو ہمارا تو مذہب یہ ہے کہ
 خُذْ مَا صَفَا وَذَعْ مَا كَرِهَ لَیْکِن مَوْلٰی عَمَارِ عَلٰی صَاحِبِ سَبِّ بڑھتے رہے انہوں
 نے سمجھا حق کو حق کیے تو مذہب کی خیر نہیں بلکہ مذہب تو مذہب ہنیوں سے ہزار مرتبہ
 زیادہ حضرت عمرؓ کا معتقد ہونا پڑے گا کہ وہ اہلبیت میں داخل ہو جائیں گے اور تقیہ کی
 صورت میں بھی باوجود جھوٹ بولنے کے وہی خرابی کی خرابی برسر، بلکہ اس سے زیادہ کیونکہ
 بطفیل اہلبیت حضرت عمرؓ کے ناحق میں اتنی خرابی نہیں جتنا بطفیل عمر اہل بیت کے نہ ماننے
 میں خرابی ہے خصوصاً حضرت امیرؓ کے، اور در صورت تقیہ ظاہر ہے کہ کمال بے غیرتی اور
 نزدلی اور بے حیائی اور دین کی سستی اور حدود اور احکام میں مداہنت اور مداہنت
 بھی اس قدر لازم آتی ہے، سو مولوی صاحب نے ہمارے نزدیک بہت اچھا سمجھا کیونکہ جب
 جھوٹ بولنا ہی ٹھیرا تو معقول ہی کیوں نہ بولے گو کچھ زیادہ ہی سہی

پو آب از سرگذشت : چہ یک نیزہ چہ یک ست

چونکہ مولوی صاحب کے اس جمل سے فی الجملہ ہوشیاری ٹپکتی ہے تو عجب نہیں
 کہ اگر تپے کی بات کہی جائے تو ان کے دل میں لگ جائے اور شاید اس سبب سردست
 ہمیں تو رفتہ رفتہ حق کو حق سمجھ جائیں ہمیں بھی لازم پڑا کہ کوئی اور روایت بھی بیان کریں کہ
 اس میں ایک تو مولوی صاحب کا حضرت عمرؓ پر غیظ و غضب کم ہو جائے گا دوسرے کثرت
 روایات سے شرم اگر شادان و فرحان نہیں تو ملتے ہی زبان سے شاید مان جائیں وہ روایت
 یہ ہے رَوٰی ابْنُ اَبِی الْحَدِیْدٍ شَارِحُ نَهْجِ الْبَلَاءِ عَنْهُ فِی قِصَّةِ تَزْوِیْجِ
 اُمِّ کُلْثُومَ فَجَاءَ عُمَرَ اِلٰی فِجْلِیْ لَمَّا جَرِنَ بِالرَّوَضَةِ وَقَالَ

رَفِئُونِي رَفِئُونِي قَالُوا اِمَّا اَيَا مِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قُلْ تَزَوَّجْتُ
اُمَّ كَلثُومَ بِنْتِ عَلِيٍّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ۔

حاصل یہ ہے کہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ حضرت ام کلثوم کے نکاح کے قصہ
میں بیان کرتا ہے کہ جس جگہ ہاجرین روضہ میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے اور یہ فرمایا کہ
مجھے مبارک باد دو مجھے مبارک باد دو، انہوں نے کہا یا امیر المؤمنین کلہے کی مبارک باد؟ حضرت
عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضرت ام کلثوم علی ابن ابی طالبؓ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے فقط، اس
روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس نکاح سے بڑا افتخار تھا، اہل انصاف کے نزدیک
یہی بات کفایت کرتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے معتقد ہو جائیں کیونکہ بظاہر افتخار اسی وجہ سے ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہو گئی، اور کوئی یوں نہ سمجھے، لوہم کون سے گلے پر
چھری رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت ام کلثوم سے فاروق کی اولاد اب مناسب یوں ہے کہ اس بات کا خاتمہ کچھ پر بطور تنبیہ
ایک اور امر معروف و نہی خدمت ہے بعضے امایوں نے سنیوں کے سامنے شرم اتارنے کے لئے حضرت
سارہ زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں سے اخذ کر کے یوں بات بنائی ہے کہ حضرت
عمرؓ حضرت ام کلثوم پر قادر نہ ہوئے اور وجہ یہ ہوئی کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو جاتا تھا۔ سو
ہر خیر اس جا جھوٹا ہونا اس روایت نامعقول سے بھی نکلتا ہے کہ جو حضرت امام جعفر صادق
کی طرف سے بنالی ہے مگر بایں ہمہ تواتر ثابت ہے کہ حضرت ام کلثوم کے شکم مبارک سے حضرت
عمرؓ کے ایک بیٹا پیدا ہوا ان کا نام زید رکھا، وہ جوان ہوئے آخر کو بیس برس کی عمر میں بنی
عدی کی باہم کی خانہ جنگی میں شہید ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، اور ان کی والدہ بھی اسی
روز بیماری میں انتقال کر گئی تھیں، اور نوجنازوں کو ایک دفعہ لکالا اور حضرت امام حسین
اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جنازہ کی نماز پڑھ کے دفن کر دیا اور یہ بھی نہ سہی یہ کیا تھوڑی بات
ہے کہ مدت العمر حضرت عمرؓ کے پاس رہیں حضرت سارہ کسی ایسے کی نواسی نہ تھیں۔ جیسے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جب ان کو ایک دم میں چھڑا دیا تو حضرت ام کلثوم کی تو زیادہ
ہی قدر کرنی چاہیے۔

باب مباحث فدک

الحمد للہ کہ مولوی عمار علی صاحب کی تمام افراط پر دازیوں کے جواب سے فراغت پائی مگر جو کچھ انہوں نے دوبارہ فدک زبان درازیاں اور افراط پر دازیاں کیں ہیں اس کی مکافات میں حسب مثل مشہور جیسے کو تیسرا اور جواب ترکی بہ ترکی، مناسب تولیوں تھا کہ ہم بھی کچھ نظم و نثر سے پیش آتے اور مولوی صاحب کی مہملات کے جواب میں مولوی صاحب کو بے نقط سنا۔ مگر چونکہ ایسی خرافات کا بکنا پاجیوں کا کام ہے ہم کو کیا زہیہ ہے کہ ایسی نازیبا باتوں میں مولوی صاحب کے ہمنصر ہوں اور اپنی زبان کو گندہ کریں اور اہل عقل اور ارباب حیا سے شرمندہ ہوں؟ مہندہ اصحاب ثلاثہ کی اہانت کے انتقام میں مولوی عمار علی صاحب کے دست و گریباں ہونا تو ایسا ہی ہے جیسا چاند سورج پر بھونکنے کی سزا میں کتے کے کوئی پتھر لگائے یا آسمان کی طرف بھونکنے کے عوض میں کسی کم عقل نا بخار کے منہ میں کوئی پیشاب کی دھار لگائے ظاہر ہے کہ اول تو چاند سورج کو ان حرکات ناشائستہ سے کیا نقصان؟ بلکہ عقلا کے نزدیک اور دلیل رفعت مکان ہے دو کج شمس و قمر کج اسگ و کم عقل سگ نرا ذمہ مساوات ہو تو ایک بات بھی ہے ورنہ سگ اور سگ مزاجوں کی اتنے میں کچھ عزت نہیں جاتی ہاں اپنی اوقات البتہ فی الجملہ خراب جاتی ہے۔ سو ایسے ہی اصحاب ثلاثہ کو اول تو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کی اہانت یا برا کہنے سے کیا نقصان؟ بلکہ الٹا باعث رفعت شان ہے۔ چاند سورج کی طرح وہ روشن ہوئے تو کتے ان پر بھونکے اور اوروں پر کیوں نہ بھونکے؟ دو کج اصحاب ثلاثہ کج امثال مولوی عمار علی جو ان کے برا کہنے کے عوض میں ان کو برا کہہ کے جی ٹھنڈا ہو اور دل کا بخار بکلتے یہاں تو یہی نسبت مذکور ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کے برا کہنے میں ان کی تو کچھ عزت نہیں جاتی جو قصاص تبرا یا اہانت اصحاب ہو، ہاں اپنی اوقات خرافات میں صرف ہوگی۔ سو ہم کون سے محترمہ زمانی طوسی ثانی مولوی میرن صاحب کے چیلے چانٹوں میں سے ہیں جو عقل کی یہ شہادت دوبارہ دشنام نہ سنیں ”دشنام بمذہب کہ طاعت باشد مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم“ اور دشنام کو عبادت نہ سمجھ کر مولوی عمار علی صاحب کو گالیاں دے کر

ان کی عزت بڑھائیں اور مولوی عمار علی صاحب یا امثال مولوی عمار علی صاحب کو چھوڑ کر کسی
بمے کو برا کہیں تو کس کو کہیں۔

حب اہل بیت و حب صحابہ ایمان کے دو پر ہیں | اہلبیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے حق میں
چشم و چراغ ہیں ہمارے نزدیک اعتقاد صحاب اور حب اہل بیت دونوں کے دونوں ایمان کے
لئے بمنزلہ دو پر کے ہیں، دونوں ہی سے کام چلے ہے، جیسے ایک پر سے طائر بلند پرواز نصف
پرواز کو کیا ایک بالشت بھی نہیں اڑ سکتا، ایسے ہی ایمان بھی بے ان دو پروں کے ہمارے
کے موجب فوز مقصود جس کی طرف اُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ یا فَاز فَوْزًا عَظِيمًا وغیر
میں اشارہ ہے نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا ایمان ایسا ہی ایمان ہے جس کا آیت لَا يَنْفَعُ نَفْسًا
إِيمَانُهَا مِثْلُ بَيَانِهَا ہے ہاں اگر ہم قدم بقدم حضرات شیعہ ہوتے تو جیسے انہوں نے موافق
مثل مشہور غیروں کی بدشگنی کے لئے اپنی ناک کا ٹلی سنیوں کی ضد میں اصحاب کرام کو برا کہہ
کے اپنے ایمان کا زیان کیا ہم بھی شیعہوں کی ضد میں نعوذ باللہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو برا کہہ کر مثل خوارج و نواصب اپنے ایمان کو خراب کرتے لیکن ہم کو تو پابندی
عقل و نقل سے ناچاری ہے شیعہ تو نہیں کہ مثل شتر بے ہمار پر الگ نہ رفتار جائیں۔

حب اہل بیت و حب صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں | راہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کو دونوں فریق بمنزلہ
دو آنکھوں کے ہیں کس کو پھوڑ دیں جس کو پھوڑیں اپنا ہی نقصان ہی بلکہ جیسے کوئی
حبیب متناسب الاعضا ہو کہ اس کی آنکھ ناک سب کی سب متناسب اور متناسب
اور پھر اس کی ایک آنکھ بیٹھ جائے تو دوسری آنکھ کی زیب بھی جاتی رہے گی، اور تیسرے
اگر بیٹھتی ہوئی آنکھ کے حصہ کی فراخی بھی دوسری آنکھ میں آجائے اور اس میں بجائے
سپیدی بھی سیاہی ہی چھا جائے بجائے حسن ایسا قبیح المنظر ہو جائے کہ دلدادگان قدیمی
اور عاشقان صمیمی بھی اس کی صورت پر لا حول پڑھنے لگیں، خاص کر دوسری آنکھ جو
باقی رہی ہے بسبب اس کے کہ اپنے اندازہ سے زیادہ فراخ اور کشادہ اور سپیدی کی جا
بھی سیاہی ہی ہو گئی ہے، ایسی بری اور بد شکل ہو جائے گی کہ کچھ نہ پوچھو بلکہ اگر چشم
باقی ماندہ کو شعور اور اختیار ہو تو اپنی اسی حالت اصلی پر آجائے اور دوسری آنکھ کو بھی

بدستور قائم کر دکھلائے کیونکہ اپنا حسن بھی اصل کیفیت اور دوسری آنکھ کی معیت میں ہے
شیعوں نے اپنے ایمان کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی | سو بعینہ ہی قصہ حضرات شیعہ کے ایمان کے ملاحظہ
کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اعتقاد صحابہ اور حب اہلبیت جو بمقتضائے شہادات کلام اللہ اور
عمرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کیلئے بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں (چنانچہ رسالہ
ہذا کے ملاحظہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہ رہے گا۔ ان دونوں آنکھوں میں سے شیعوں
نے ایک آنکھ کو پھوڑ دیا اور اس کے حصہ کی فراخی اور کشادگی بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ
دوسری آنکھ کو دے کر اس کو خراب کر دیا۔ یعنی اعتقاد صحابہ کو جو بمنزلہ چشم ایمان ہے اپنے
ہاتھ کھو کر دوسری آنکھ یعنی حب اہل بیت کو اس قدر بڑھایا کہ صحابہ کے حصے کی محبت بھی
انہیں کے لئے سرف کردی، پھر جیسے کہ آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیاہی آجائے ان حضرات
بزرگوار فرقہ سمئے بشیعہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسے آنکھ میں تل اور سیاہی اور سفیدی غرض چند قسمیں ہوتی
ہیں ایسے ہی عمرت میں بھی چند قسمیں تھیں، اولاد اور ازواج اور سوا ان کے اور اقربا کیونکہ
بالتفاق اہل لغت عمرت کے معنی خویش اور اقربا کے ہیں۔ سوا ان سب میں سے حضرات
شیعہ نے فقط اولاد کو اور اولاد میں سے بھی فقط دس بارہ کو اور سوا اولاد ایک آدمی
کسی اور کو تو مخدوم و مکرم سمجھا باقی سب کے لئے برابر ہے، پر جنگو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا اور
مخدوم و مکرم ٹھہرایا ان کے حق میں محبت کو کچھ ایسا حد سے بڑھایا کہ گویا صحابہ باقی ماندگان
عمرت کے حصہ کی محبت بھی انہیں کے نثار کی، سو یہ بعینہ وہی مثل ہے کہ آنکھ اپنے اندازہ
سے زیادہ کشادہ تو ہوئی تھی پر سفیدی کے عوض بھی سیاہی ہو گئی، شاید اس اجمال میں
ناواقفان شیعہ کو حکم مثل مشہور المرء یقبیس علی نفسیہ کے احتمال جعل قلیس ہو اس
لئے تفصیل اس اجمال کی ضرور کرنی پڑی، تاکہ اپنی کتاب اور اہل کتاب کی طرف مراجعت
کر کے باسانی تحقیق کر کے بعد تطبیق اس پیمبروں کی تصدیق کریں۔

شیعوں نے عمرت میں سے بعض کی تکریم اور اکثریت تبرا کیا | سو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات
شیعہ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے یہاں تک کہ زبان
 زد خاص شیعہ یہ بات ہو گئی ہے عام تو درکنار خاص بھی اسی حساب عام ہی ہیں بلکہ عام سے
 بھی پرے، اور تو کیا کہوں، حالانکہ انہیں کی کتب معتبرہ سے ان دونوں مطہرات کا بہ نسبت
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں ہونا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ قریب ہی اس بات
 کی شرح مرقوم ہو چکی، اور حضرت عباس عم بزرگوار سید لاہر صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی
 اولاد اور ایسے ہی حضرت زبیر بن العوام کو بھی داخل عترت نہیں سمجھتے، اور اس قرابت قریبہ
 پر بھی لحاظ نہیں کرتے حضرت عباس کی قرابت تو مشہور و معروف ہی ہے پر حضرت زبیر رضی اللہ
 عنہ بھی بسبب کثرت علاقہ ہائے قرابت گویا بمنزلہ برادر حقیقی کے تھے اول تو ان کی والدہ حضرت
 صفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمہ اور ان کی دادی ہالہ بنت وہب بن عبد مناف
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی خالہ اور ان کے باپ کی بھوپھی ام حبیب بنت اسد
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی اور ان کی حقیقی بھوپنی حضرت ام المومنین خدیجہ الکبریٰ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ پھر ان سب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 ہم زلف ان کی بیوی حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما حضرت ام المومنین
 عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن، ماسواں سب کے پانچویں پشت یعنی قصی بن کلاب میں رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتے ہیں، علما و نسب لکھا ہے کہ اتنی کثرت سے قرابت کے علاقے رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔
 لیکن آفرین ہے حضرات شیعہ کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے دشمن
 ہوں تو ایسے ہوں کہ حضرت زبیر حبیب قریب عزیز کو تو باوجودیکہ وہ ہاجرین اولین میں
 اور مجاہدین سابقین میں سے ہیں۔ اور سینکڑوں بشارات فرقانی اور وعدہ صائے
 قرآنی ان لوگوں کی بزرگی پر گواہ ہیں۔ از جملہ کفار کونسا اور منافقین بدکردار سمجھتے ہیں،
 اہل بیت سے مراد کون ہیں؟ باقی رہیں ازواج مطہرات جو اہمات مومنین یعنی سب مسلمانوں کی
 مائیں ہیں، ان کی نسبت جو کچھ حضرات شیعہ ثنا خوان ہیں سب ہی جانتے ہیں، حالانکہ اصل
 اہلیت وہی ہیں کیونکہ اول تو اہل بیت کے معنی بعینہ اہل خانہ ہے اتنی بات تو دو گوچہ نہ جانتے ہوں

مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں گے دو سرے لفظ اہل بیت جو کلام اللہ میں واقع ہوا ہے تو ازواج مطہرات ہی شان میں وارد ہوا ہے۔ گو حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسین بھی بوجہ عموم لفظ یا بہ سبب التماس حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم البیت ہونے کی تفصیلت میں داخل ہو گئے ہیں مزید تسکین کے لئے جس آیت میں یہ لفظ واقع ہے ما قبل اور ما بعد سمیت لکھ کر اس کا ترجمہ لکھے دیتا ہوں تاکہ سب شیعہ و سنی متنبہ ہو جائیں

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ
النِّسَاءِ إِنْ تَقِيْنَ شَيْئًا فَلَا تَخْضَعْنَ
بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ
فَرْسٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا
وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ
الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَ
أَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا
يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ
الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ
تَطْهِيرًا وَادْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي
بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا۔

یعنی اے نبی کی عورتوں تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی
عورتیں، اگر تم ڈر رکھو، تو دب کر نہ کہو بات
پھر لاپح کرے کوئی جس کے دل میں روکے
اور کہو بات معقول، اور قرار پکڑو اپنے
گھروں میں اور دکھائی نہ پھرو جیسا دکھانا
دستور تھا پہلے نادانی کے وقت میں اور کھڑی
رکھو نماز اور دیتی رہو زکوٰۃ، اور اطاعت میں
رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اللہ ہی چاہتا ہے
کہ دور کرے تم سے گندمی باتیں اے گھر والو
اور سٹھرا کرے تم کو ایک سٹھرائی سے، اور یاد
کرو اے پیغمبر کی بیوی جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے
گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقلمندی،
مقرر اللہ ہے بھید جانتا خبردار،

یہاں تک ترجمہ تھا۔ اب عرض یہ ہے کہ شیعہ ہی اپنے علماء سے پوچھیں کہ
میں نے ترجمہ صحیح کیا یا غلط۔ بہر حال ان آیات سے اول ہی سمجھ میں آتا ہے کہ
اہل بیت ازواج ہی ہیں۔

خاندان امام کو عبا میں لے کر دعا کرنے کی وجہ | اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو ایک عبا میں لے کر یہ دعا کی کہ

الہی یہ میرے اہل بیت ہیں تاکہ وہ بھی اس فضیلت میں داخل ہو جائیں، یہ ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ قدرت شناس چشم پوش اپنے وزیر سے یوں کہے کہ تمہارے گھر کے سب لوگوں کو ہم جدا جدا جگہ کر دیں گے تو وہ وزیر موافق محاورہ کے یوں سمجھ کر کہ ایسے موقع میں بی بی اور بیٹیاں مراد ہوا کرتے ہیں اور بیٹی اور نو اسی مراد نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ دوسرے گھر کی ہوتی ہیں۔ کچھ اپنے جی میں سوچ کر وقت دیکھ کر بیٹی اور داماد اور نو اسوں کو بھی پیش کرے، وہ بادشاہ اگر پوچھ بیٹھے کہ یہ کون ہیں تو بایں لحاظ کہ بیٹی اور نو اسی اور داماد بھی قرابت میں کچھ بیٹی اور پوتی اور بی بی سے کم نہیں، یہ کہے کہ حضور میرے گھر کے لوگ ہیں، تو اس بادشاہ کو گو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ داماد اور نو اسی اور بیٹیاں ہیں اس کے گھر کے لوگ نہیں، پر بمقتضائے اپنی چشم پوشی ذاتی کے انکو بھی جا کر دیگا۔

یا لفظ اہلبیت اصل سے عام ہے ازواج اور حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہم سب کو شامل ہے گو فقط ازواج ہی کی شان میں نازل ہوا ہو، جسے دلی والا ایک لفظ عام ہے سب دلی والوں کی نسبت بول سکتے ہیں اگر کوئی دو دلی کے رہنے والوں کو یوں کہے کہ یہ دلی والے ہیں تو اس سے کوئی کو دن گنوار تک بھی یہ نہیں سمجھتا کہ دلی والے فقط یہی ہیں ان کے سوا اور کوئی دلی والا نہیں اس تقریر سے سب پر واضح ہو گیا کہ کلام اللہ سے جو ازواج کا اہل بیت ہونا اور حدیث سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کا اہلبیت ہونا ثابت ہوتا ہے سب صحیح اور درست ہے اگرچہ شیعوں کی سمجھ میں نہ آتا ہو، بالجملہ ازواج مطہرات کو باوجودیکہ وہ اصلی اہلبیت ہیں اور کلام اللہ میں ان کی شان میں یوں آیا ہے **وَازْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ** یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں، پھر بھی حضرات شیعہ اپنی زبان نہیں سنھالتے اور لگام نہیں دیتے، اگر دوسری آیت کالیوں جواب دیں کہ وہ مومنوں کی مائیں ہیں ہماری تو نہیں تو سلمنا پر آیت اول کا۔ یعنی جس سے ان کا اہل بیت ہونا ثابت ہوتا ہے کیا جواب دیں گے؟ بالجملہ ازواج مطہرات کے اعتقاد اور محبت کا اس مذہب میں یہ حال ہے۔

شیعہ اولاد فاطمہ کی اکثریت کے دشمن ہیں | باقی رہی اولاد سوان کا حال بھی سنئے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اکثر اولاد کے حضرات شیعہ دشمن جانی ہیں اور براہ کتنے ہیں منجملہ ان کے حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام ہمام امام زین العابدین رضی اللہ عنہما جو عالم متقی اور متورع تھے، اور مروانیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور ان کے بیٹے یحییٰ بن زید ہیں جو بزرگم اثنا عشریہ مرتد ہیں، اور ایسے ہی ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم اور حضرت بن امام موسیٰ کاظم جن کا لقب شیعوں نے کذاب رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور یازید بسطامی انہیں کے مرید ہیں اور جعفر بن علی برادر امام حسن عسکری کہ شیعوں کے عرف میں کابھی لقب کذاب ہے اور حسن بن حسن مثنیٰ، اور ان کے فرزند عبداللہ محض، اور ان کے فرزند محمد نام جو ملقب بنفیس زکیہ ہیں کافر اور مرتد سمجھے ہیں۔ اور ابراہیم بن عبداللہ کو اور زکریا محمد باقر کو اور محمد بن عبداللہ بن الحسین بن الحسن، اور محمد بن القاسم بن الحسن، اور یحییٰ بن عمر کو بھی جو حضرت زید شہید کے پوتوں میں سے تھے، کافر اور مرتد جانتے ہیں اور جماعت کی جماعت سادات حنیفہ اور حسینیہ کو جو حضرت زید شہید کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں گمراہ اور اہل ضلالت میں سے سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کتب انساب اور کتب تواریخ سادات اس بات پر شاہد ہیں کہ اکثر سادات حسنی، حسینی حضرت زید کی امامت اور فضیلت کے معتقد تھے،

حاصل یہ کہ اکثر اثنا عشریہ ان بزرگواروں کو کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور بزرگم خود یوں کہتے ہیں کہ یہ سب جگر گوشہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لخت جگر حضرت بتول ہمیشہ ہمیشہ ابدال آباد تک جہنم میں رہیں گے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک دوازدہ امام میں سے کسی امام کی امامت کا منکر الیسا ہی کافر جیسا کسی نبی نبوت کا منکر اور سب جانتے ہیں کہ کافر ابدال آباد تک جہنم میں رہیں گے، الغرض قول اکثر اثنا عشریہ کا یہی ہے اور یہی ان کے قواعد پر منطبق ہے کہ یہ بزرگوار ان مذکور کافر ہیں اور ان کے لئے کبھی نجات نہ ہوگی، اگرچہ بعضے اس بات کے قائل ہیں کہ یہ گروہ مثل حضرت عباس عم بزرگوار سید الارباب صلی اللہ علیہ وسلم اعراف میں رہیں گے، اور بعضے کہتے ہیں کہ بعد

عذاب شدید کے اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پائیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں قول پوچھ میں کیونکہ جب منکر امامت کا فرہوا، تو شفاعت کے ہونے اور اعراف میں رہنے کے کیا معنی، شفاعت بالاجماع کافروں کے حق میں نہ کوئی کر سکے اور نہ مقبول ہو، اور اعراف میں کافروں کا جانا خلاف قرآن ہے

یعنی مقرر جو لوگ کہ کافر ہوئے اور کفر پر ہی مرے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے ہمیشہ ہمیں ہنگے نہ ان سے عذاب کم کیا جائے گا اور نہ ان کو ہمت ملے گی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ
كُفَّارًا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ
اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ
أَجْمَعِينَ خَالِدِينَ فِيهَا كَأَنَّهُمْ
يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ
وَكَأَنَّهُمْ يَنْظُرُونَ -

الحاصل حضرات شیعہ کو دعوائے محبت تو اس قدر اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اور اقرباء اور ازواج رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اماموں کی اولاد اور ان کے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، خاک پڑے اس محبت پر ان میں اور نا صبیوں میں دس بارہ ہی نہیں کافری ہے فقط اتنا ہی تو ہے کہ شیعہ دوازدہ امام اور ان کے بعض اقربا کی بزرگی کے معتقد ہیں اور نا صبی معتقد نہیں، سو اس اعتقاد سے تو ان کی بے اعتقادی ہی بھلی، کیونکہ اول تو یہ فرقہ محبت کے پردہ میں حضرات ائمہ کے ذمہ صدمہ عیب لگاتے ہیں اور پھر ان کفریات کو ہر کس و ناکس اپنے پیگانے کے سامنے گاتے ہیں، چنانچہ کچھ کچھ تو اس سالہ کے دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔

اہل شیعہ کی حضرت علی سے محبت جو دشمنی سے بدتر ہے یہاں ہر چند اس بات کے مفصل لکھنے کا موقع ہے لیکن اس رسالہ مختصر کے مناسب نہیں اس لئے بطور نمونہ اشارہ کئے جاتا ہوں، حضرت امام الائمہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے احوال کچھ ایسے تراش رکھے ہیں کہ جس سے ہر کوئی سمجھ جائے کہ نعوذ باللہ وہ بڑے بے غیرت نامرد جھوٹے کذاب بھی، کہ اپنی بیٹی کافروں کے حوالہ کر دی، اور بہ خوف جان نہ اس مقدمہ میں کچھ چون و چرا

کی نہ کسی اور بات میں دم مارا، کافروں کے پیچھے ساری عمر نمازیں پڑھیں اور ہمیشہ ان سے ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہے اور ان کی تعریفیں بارہا ایسی کریں کہ مومنان باخلاص کی اس کے عشر عشر کبھی ایک دفعہ بھی نہ کی جب ان کا یہ حال ہے تو اور دلوں کا تو کیا ذکر،

ع۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

خارجی اور ناہبی ہر چند حضرت علی کو برا سمجھتے ہیں پر اتنا نہیں سمجھتے،

انبیاء ائمہ سے بلکہ تمام مخلوق سے افضل ہیں | دوسرے پھر اس محبت نامعقول کو اتنا حد سے بڑھایا کہ انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کو بھی اماموں سے گھٹایا، چنانچہ مذہب امامیہ بنسبت تمام ائمہ ہدی کے کہتا ہے کہ وہ سب تمام انبیاء سے افضل ہیں حالانکہ کلام اللہ اور خود ان کی کتابیں اس بات پر شاہد ہیں کہ انبیاء سب سے افضل ہیں، کلام اللہ میں برابر انبیاء کی نسبت اصطفیٰ اور اجتبا جو بمعنی چھانٹ لینے کے ہے مستعمل ہے اور ظاہر ہے کہ چھانٹی ہوئی چیز باقی سے افضل ہوتی ہے، معجزا کل چار فرقوں کی خداوند کریم تعریف فرماتا ہے انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین سو ہر جگہ انبیاء ہی کو مقدم کیا ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ نبی باقی نبین فرقوں سے افضل اور رتبہ میں مقدم ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے ائمہ ہدی نبی تو تھے ہی نہیں پھر ان تینوں فرقوں میں سے جو نسے کو شیعہ پسند کریں اختیار ہے بہت سے بہت اماموں کو صدیق کہیں گے اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے۔ تب بھی انبیاء سے بعد ہی میں رہے۔

افضلیت انبیاء کتب شیعہ سے | لیکن ہم جانتے ہیں کہ شیعہ کلام اللہ کی کاہے کو سنیں گے اس لئے مناسب ہے کہ انھیں کی کتابوں سے ان کو جھوٹا کیجئے اور جتا دیجئے کہ یہ جو مثل مشہور ہے کہ دروغ گور حافظ نباشد۔ اور ایسے ہی یہ مثل کہ ”حق بزبان جاری شود“ دونوں سچی ہیں، پیشوایان شیعہ نے ہر چند ان روایات کے تراشنے میں جہد بلیغ کیا جس سے اماموں کا انبیاء سے افضل ہونا ثابت ہو جائے لیکن بمقتضائے مثل اول چوک کر بمقتضا مفہوم مثل ثانی حق بات کہی گئی روی الکلی عن ہشام الاحول عن زید بن علی

أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ أَفْضَلُ مِنَ الْأَئِمَّةِ وَإِنْ قُلَّ غَيْرُ ذَلِكَ فَهُوَ قَلِيلٌ

یعنی کلینی بواسطہ ہشام احول کے زید بن علی سے روایت کرتا ہے کہ مقرر انبیاء اہل بیت
افضل ہیں اور بیشک جو اس کے سوا کہے گمراہ ہے فقط، ادھر ابن بابویہ کتاب الامالی میں
بروایت صحیح ایک حدیث طویل کے ضمن میں جس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت
امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا قصہ مندرج ہے اس طرح روایت فرماتے ہیں۔
عَنْ الصَّادِقِ عَنْ آبَائِهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ
لِسُكَّانِ الْجَنَّةِ مِنَ الْأَمْثَلِ ثَلَاثَةٌ وَأَرْوَاحُ الرُّسُلِ وَمَنْ فِيهَا أَكْثَرُ
إِنِّي زَوَّجْتُ أَحَبَّ النِّسَاءِ إِلَى مَنْ أَحَبَّ الرِّجَالَ إِلَيَّ بَعْدَ النَّبِيِّينَ۔

یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے باپ دادوں سے روایت کرتے ہیں کہ
مقرر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جنت کے رہنے والوں سے، یعنی فرشتوں سے اور رسولوں کی
ارواح سے اور جو سوا ان کے جنت میں تھے، ان سے خداوند کریم نے فرمایا کہ خبردار رہو کہ میں
نے اس عورت کا نکاح جو سب عورتوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے اس مرد سے کر دیا ہے کہ جو سب
مردوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے، انبیاء کے بعد، غور فرمانے کی جسا ہے یہ روایتیں باوازا بلند ہی
کہتی ہیں کہ حضرت امیر کا رتبہ بعد انبیاء کے ہے مگر ستم یہ ہے کہ باوجود ان روایات کے پھر ائمہ
کو انبیاء سے افضل ہی بتلائے جاتے ہیں، ظاہراً اس کا سبب یہی ہے کہ صحابہ کے حصہ کی محبت
اور نیز اکثر اہلبیت کے حصہ کا اعتقاد فقط انہیں چند اشخاص محدود کے حق میں صرف
کرتے ہیں، سو بہ سبب اوغام اور اجتماع محبت ہائے کثیرہ کے محبت دوازده امام اپنی
حد سے باہر نکل گئی۔

اور فی مثل شیعوں کے وہی مثل ہو گئی۔ جو نصرانیوں کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے
ساتھ اس قدر محبت کو بڑھایا کہ ان کو عبودیت سے نکال کر معبودیت تک پہنچایا چونکہ یہ قصہ
بعینہ آنکھ کی مثال کا سا ہے، یعنی جیسے کسی حسین متناسب الاعضا متناسق الاطراف کی
ایک آنکھ بالکل پٹ ہو جائے اور اس کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے۔ اور
اس ایک ہی کی مساحت دونوں کی مساحت کے برابر ہو جائے اور پھر اس آنکھ میں بھی بجائے
سفیدی سیاہی ہی چھا جائے ایسے ہی حضرات شیعہ نے حب اہل بیت اور حب اصحاب میں

سے ایک کو رکھا اور ایک کو کھود دیا، اور جس کو رکھا اس کو ایسا بڑھایا کہ دونوں کے برابر اس ایک ہی کو کر دیا، اور جیسے آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیاہی ہی چھا جائے تو انہوں نے بھی تمام اہل بیت میں سے چند اشخاص محدود کو بزرگ سمجھا اور بانی کو مردود اور مرتد قرار دیا، اور بایں وجہ کہ جن کے ساتھ شیعہ محبت کرتے ہیں ان کی محبت حد سے ... بڑھی ہوئی ہے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ باقیوں کے حصہ کی محبت بھی انہیں چند اشخاص معلوم کے لئے ہے تو اس صورت میں جیسے آنکھ مذکور خود نازیبا معلوم ہوگی اور تمام چہرے کو بے زیب کر دیگی، ایسے ہی حب اہل بیت اور حب اصحاب جو بمنزلہ ایمان کی دو آنکھوں کے ہیں ان میں سے اگر ایک جاتی رہے اور دوسری بڑھ جائے تو دوسری بھی نازیبا ہو جائے گی اور ایمان کے حسن کو بھی بے زیب کر دے گی اس لئے بالیقین یوں سمجھ میں آتا ہے کہ دوازده امام بھی اس محبت سے خوش ہوں بلکہ متنفر ہوں، اور اس بات کے خواست گار ہوں کہ ان کی محبت اپنے اندازہ پر آجائے تاکہ بری نہ معلوم ہو، اور اس کے ساتھ اصحاب کی محبت اور اعتقاد دل میں جمایا جائے تاکہ جیسے ایک آنکھ سے دوسری کی زیب زینت ہونے ہی سے چہرہ پر حسن آتا ہے، ایسے ہی حب اصحاب سے حب اہل بیت کو زینت ہو اور دونوں سے ایمان اور اسلام کی خوبصورتی ظاہر ہو،

شیعوں نے صدیق کے بارے میں خدا کی سوچ چوٹ کہ اہل سنت رضا اہل بیت میں اپنی سعادت گواہی اور ائمہ کی شہادت بھی مذکور کی سمجھتے ہیں تو یہ خاکپائے غلامان اہلبیت کی طرف سے نیابت تمام شیعوں کے عموماً اور مولوی عمار علی صاحب کے خصوصاً کان کھولتا ہے کہ اے مدعیان محبت اہلبیت یہ محبت نامعقول جب تک مقبول نہ ہوگی جب تک کہ حب اصحاب اس کے برابر نہ ہو ورنہ ان کے برا کہنے میں تمہارا ہی برا ہوگا، خصوصاً رفیق غار جان نثار سیدالابرار صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت ابو بکر صدیق جن کے صحابی ہونے کا خدا خود گواہ ہے چنانچہ مرقوم ہو چکا اور جن کے صدیق ہونے کی اماموں نے شہادت دی ہے اور کمال العرف ان کی تعریف کی ہے چنانچہ معلوم ہو چکا ان کا برا کہنا خدا اور ائمہ کو جھٹلانا ہے ایسی صورت میں تو ہزار عجیب بھی اگر آنکھوں سے نظر آئیں تو یوں سمجھے کہ ہونہ ہو ہماری نظر اور فہم کا

قصور ہے خدا کا فرمایا اور ائمہ ہدیٰ کا کہا غلط نہیں ہو سکتا، جن کو ہم عیب سمجھتے ہیں وہ ہنر ہی ہوں گے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو مت آؤ ہم تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود اس جلالت قدر اور کمال علم و فضل اور نور نبوت اور نور عقل کے حضرت خضر کی کشتی کے ٹوڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کو کہ وہ ظلم ہرگز نہ تھا، عین مطابق مرضی خداوندی تھا ظلم عظیم سمجھا حالانکہ خداوند کریم کی ہدایت کے موافق گئے تھے اور جناب باری تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت خضر کے علم اور بندگی کی اطلاع کر دی تھی، چنانچہ یہ تمام قصہ سورہ کہف میں رکوع وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاٰهُ سَلِّ لِي رُكُوعًا وَكَيْسَلُوكَ عَنْ خِيَا الْقَرْيَتَيْنِ تک مذکور ہے پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے رسول جو مرسلین الوداعہ میں سے بھی اکثروں سے زیادہ ہیں آدھے قرآن کے قریب انہیں کے ذکر سے پُر ہو گا۔ حضرت خضر کے افعال کی حقیقت کو نہ سمجھیں حالانکہ حضرت خضر محققین کے نزدیک ولی ہیں بنی نہیں اور اگر بنی بھی ہیں تو بالاتفاق اس رتبہ کے ہرگز نہیں جو رتبہ کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوا تو حضرات شیعہ تو نہ بنی ہیں نہ ولی نہ عقل و دانش سے ان کو کچھ بہرہ، چنانچہ اسی لئے یہ مثل ہی ہو گئی ہے کہ الشَّيْعَةُ نِسْوَانٌ لَّهٰذَا الْاٰمَّةِ - یعنی شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں۔“

ایسے نادان اگر امت مصطفوی کے سید الاولیاء کے کسی فعل کی حقیقت نہ سمجھیں تو کیا بعید ہے بلکہ عین مقتضائے قیاس ہے کیوں کہ یہ امت اور امتوں سے افضل اس امت کے اولیاء پہلی امتوں کے اولیاء سے افضل اور بھی نہیں تو جو اس امت میں ایسا ہو کہ خدا اور ائمہ ہدیٰ دونوں اس کی تعریف کریں وہ تو بیشک پہلی امتوں کے اولیاء سے افضل ہو گا، ایسے شخص کے افعال کی حقیقت تو اگر ائمہ ہدیٰ بھی نہ سمجھیں اور ظلم و ستم کا گمان کریں تب بھی اہل عقل کے نزدیک کچھ حرج نہیں بہت ہو تو شیعوں کو یہ خلجان ہو کہ ائمہ ہدیٰ ہمارے عقیدہ کے موافق افضل الخلاق ہیں ابو بکر اگر بزرگ بھی ہوں تب بھی ان سے افضل یا ان کے برابر نہیں ہو سکتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تم خداوند کریم اور ائمہ ہدیٰ کی گواہی ابو بکر صدیق کی بزرگی کے باب میں قبول کر لو پھر اس کا جواب ہم سے سنو

اگر بالفرض التقدير الممہ ہدیٰ ابو بکر صدیق سے افضل ہی ہوں اور خدا کا ہماجرین کو علی العموم
باقی امت سے صراحتہً افضل بتلانا پھر ان میں سے ابو بکر صدیق کو اشارۃً سب سے افضل کہنا
چنانچہ اول مفصل مرقوم ہو چکا تھا کہ عقیقہ غلط کے موافق غلط ہو تب بھی تو کچھ دشوار نہیں
حضرت موسیٰ بھی تو حضرت خضر سے افضل تھے پھر ان کے افعال کی حقیقت نہ سمجھے اور احسان
کو نقصان اور عدل کو ظلم سمجھ کر ایسے مغلوب الغضب ہوئے کہ اپنے سب عہد و پیمان بھول گئے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ کچھ فہموں کے لئے عبرت ہے | القصہ مقتضائے ایمان خدا اور اور

الممہ ہدیٰ تو یوں تھا کہ اگر بالفرض والتقدير حضرت ابو بکر صدیق بظاہر ملحد و زندقہ ہی شیعوں
کو نظر آتے تو خدا کی گواہی اور الممہ کی شہادت کے بعد جو ان کی بزرگی کی نسبت اول میں اور
اوسط میں اس رسالہ کے مرقوم ہو چکی ہے اپنی بھی نہ سنتے اور اپنی عقل نارسا کی تکذیب کرتے
اور حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کے قصہ کو پیش نظر کر کے تسکین خاطر پریشان اور
تسلطی طبع کج کر لیتے، کیونکہ جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو ایسے ہی کو دونوں کے واسطے بیان
فرمایا ہے حضرات شیعہ جیسے عقل کے دشمن اپنی کج فہمی کے باعث خدا کے مقرروں اور دستوں
سے بدگمان ہو کر خدا کو اپنا دشمن بنا لیں۔ قربان جانیے خدا علیم کے۔ کتنی دور کی مو جھتی ہے
مگر آفرین ہے شیعوں کی عقل پر بھی کہ اس پر بھی نہ سمجھے، خیر خدا انہیں سمجھے القصہ مقتضائے
ایمان و ادب تو یہ تھا۔

بالفرض اگر صدیق سے گناہ ہوا تو وہ نیکی اور اگر حکم و چشم اندیش کہ برکندہ باد نہ عیب نماید نہرش در نظر
بن چکا، ورنہ الممہ ان کی تعریف نہ کرتے یہ بات ان کو دشوار ہی تھی تو یہ تو شیعہ بھی خواہ مخواہ مایں

ہی گئے کہ قیامت کو بعض گنہگاروں کے اعمال بد کو حسد بنا دیں گے کیونکہ کلام اللہ موجود
ہے۔ دیکھو کیا فرماتے ہیں اَلَا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ
يَبْدِلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ خَيْرَاتٍ یعنی مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل
کئے تو ان کے گناہوں کو بھی خدائیکیاں بنا دے گا فقط، اور اگر خوردہ بنیان مذہب شیعہ
کو یہ خلجان ہو کہ اس آیت میں جن گناہوں کی نیکیاں بنانے کی طرف اشارہ ہے ظاہر میں وہی
گناہ معلوم ہوتے ہیں جن کا سیاق میں ذکر ہے۔ اور ظاہر ایام کفر کے گناہ ہیں، سو اگر ابو بکر

صدیق کا کوئی گناہ نیکی بنے گا بھی تو وہی بنے گا جو ایام جاہلیت کے گناہوں میں کا ہو گا۔
 ہمیں تو ایسی بہت سی باتوں میں کلام ہے جو بعد زمانہ ایمان ان سے صادر ہوئیں۔ مثلاً
 غصبِ ذک کہ وہ بعد وفات سرور کائنات علیہ و علی آلہ الصلوٰات والتسلیمات ان سے
 ظہور میں آیا تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ ایسا شیوہ انہیں لوگوں کا ہے کہ جن کا دل شبہ
 میں پڑا ہوا ہے، اور اب تک درجہ یقین ایمان تک نہیں پہنچا، اگر ماضی میں گناہان زمانہ کفر
 ہی کا ذکر ہو اور انہیں کی نسبت تبدیل کا یعنی نیکی بنادینے کا اشارہ ہو تب بھی اتنی بات ثابت
 ہو گئی کہ خدا کو گناہوں کا نیکی بنادینا آتا ہے پھر جب کفر کے زمانہ کے گناہوں کو کہ وہ نسبت
 گناہان ایام ایمان کے گناہوں سے زیادہ ہی ہوتے ہیں، خدا کو نیکی بنادینا آتا ہو تو ایام ایمان
 کے گناہوں کا نیکی بنادینا تو سہل ہی ہو گا پھر جس کی خدا اور ائمہ ہدیٰ تعریف فرمائیں اس کے
 ایمان اور بزرگی میں اسے ہی شک ہو سکتا ہے جس کو خدا اور ائمہ ہدیٰ کی بات میں شک ہو غرض
 جب ایمان اور صلاحیت اعمال بالو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بشہادت خداوندی اور بلوای ائمہ
 ہدیٰ ثابت ہو گئی تو اس بات میں کیوں تامل ہے کہ ان کے گناہ نیکیاں ہو جائیں۔

گناہ سے توبہ پر حجت میں داخلہ سب کو مسلم ہے اور اگر یوں کہیں کہ گناہوں کا نیکیاں بن جانا توبہ
 کے ساتھ معلق ہے البو بکر صدیق کا ہے سے معلوم ہو کہ توبہ کر کے مرے ہیں تو اس کا جواب اذل
 تو یہ ہے کہ اگر معلق ہو بھی تو گناہوں کے نیکیاں بنادینے کا وعدہ معلق ہو گا کچھ امکان تو معلق
 نہیں پھر جب خداوند کریم اور ائمہ دین ان کی تعریف فرمائیں تو اگر ان سے یہ خطا ہوئی بھی تھی۔
 تب بجز اس کے ان کی تعریف کی اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان کی خطا کو بھی جناب پاری
 تعالیٰ نے نیکی بنادیا ہو گواہوں نے توبہ نہ کی ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر توبہ ہی پر تبدیل سیئات بحسنات موقوف ہی تو خداوند متین
 اور ائمہ دین کی تعریف خود اس بات کی گواہ ہے کہ وہ توبہ کر کے اس عالم سے تشریف لے گئے،
 نہیں تو وہ قابل تعریف تو کجا البتہ لائق بحج و اور مستوجب سزا تھے۔

ہاں اگر شیعہ یہ گرفت کریں کہ خداوند علیم نے تو تعریف پہلے کی تھی یہ خطا ان سے
 بعد میں سرزد ہوئی تو اس کا جواب ہمارے پاس بجز اس کے کچھ نہیں کہ البتہ شیعوں کا خدا

ایسا ہی ہوگا جسے چار دن کے بعد کی بھی خبر نہ ہو ہمارا خدا عالم الغیب سے ازل سے ابد تک سب اس کے پیش نظر ہے اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حسب گمان بد شیعہ برے ہی ہوتے، تو خداوند کریم ہرگز تعریف نہ فرماتا، اس کو کیا ضرورت تھی کہ ایک غلط بات کہہ کے آج شیعوں سے شرماتا۔ اگر خدا کی نہیں مانتے تو نعوذ باللہ ائمہ ہدیٰ تو برعم شیعہ خدا سے بھی بڑھ کر ہیں، خدا کو تو بد بھی واقع ہوا، ائمہ کو تو بد بھی نہیں ہوتا پھر اس پر علم ماکان اور علم مایکون ان کو حاصل، ان کی تعریف کا تو بجز اس کے کچھ جواب ہی نہیں کہ حضرت صدیق اکبر کے گناہ بھی نیکیاں ہی بن گئے ہوں۔

توبہ کا ثبوت بروایت شیعہ | اور یہ بھی نہ سہی ہم اور جواب رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ روایات شیعہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ابو بکر صدیق گناہ غصب زر کے تائب ہو کر مرے ہیں چنانچہ انشاء اللہ تعالیٰ قریب ہی بحوالہ روایات کتب شیعہ یہ مضمون مرقوم ہوگا کہ ابو بکر صدیق نے گو فدک غصب کر لیا تھا، لیکن پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کے حوالہ کر دیا اور نیز یہ بھی مرقوم ہوگا کہ حضرت فاطمہ ان سے راضی ہو گئیں اب فرمائیے توبہ اور کسے کہتے ہیں اسی کا نام توبہ ہے۔

نیکیاں زیادہ ہونے پر جنت میں داخلہ متفق علیہ ہے | اور اگر اس پر بھی شیعوں کے دل کا کفر نہ جائے تو اس کی اور بھی تدبیر ہے آخر شیعوں کے نزدیک بھی اتنی بات مسلم تھی کہ قیامت کو حساب کتاب کے بعد جس کے اچھے عمل زیادہ نکلیں گے وہ جنت میں جائے گا، جس کے برے عمل زیادہ ہوں گے وہ دوزخ میں۔ اور اگر بنظر دور اندیشی اس وقت اس عقیدہ میں کچھ شک بھی آجائے تو لیجئے یہ کلام اللہ کی آیت موجود ہے اور کلام اللہ میں سے عم ہی کے سپارہ کی، اس میں سے بھی اول ہی کی سورتوں میں کی، جو شیعوں کے یاد بھی نہیں مثل یاد و ضرور ہی ہوں گی وہ آیت یہ ہے۔ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمَّةٌ هَاوِيَةٌ وَمَا أَذْرَاكَ فَاهِيَةٌ نَارُ حَامِيَةٍ یعنی جنکے عمل تول میں بھاری ہوں گے تو وہ اچھے، اور جن کے عمل ہلکے نکلیں گے ان کا ٹھکانہ ہاویہ اور بھکو کیا معلوم وہ کیا ہے؟ وہ ایک آگ ہے گرم دھکتی فقط، اتنے کچھ تکرار کی بات باقی نہیں۔

سو اس صورت میں خداوند علیم اور ائمہ تعلیم جس کی تعریف فرمائیں وہ اگر خطا وار بھی تھا، تب معلوم ہوا کہ اس کے اچھے عمل زیادہ تھے پھر ان خطاؤں کے باعث ان سے رنجیدہ رہنا و لیا ہی ہے جیسا کسی نے کہا ہے "مدعی سست گواہ چست" یا عربی کی مثل ہے رَضِيَ الْخَصْمَانِ وَمَا رَضِيَ الْقَاضِي، یعنی مدعی مدعا علیہ تو راضی ہو گئے۔ پر قاضی جی راضی نہ ہوئے خداوند کریم اور ائمہ دین تو راضی ہو جائیں پر شیعہ راضی نہ ہوں۔

ہاجرین اولین سے جنت عدن میں مغفرتِ رضا اور اس پر بھی خاک ڈالو ابوبکر صدیق کے اچھے عملوں کا وعدہ ہو چکا۔ اور خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

کچھ دھوکا ہی نہیں کہ وہ ہاجرین اولین اور مصاحبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ سو ہاجرین اولین اور ہمراہیانِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال آیت والسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ اور آیت محمد رسول اللہ اکایۃ کی شرح کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جناتِ عدن تیار کر رکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ مغفرتِ گناہان اور وعدہ اجرِ عظیم کا کر لیا ہے۔ سو اگر بالفرض والتقدیر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گناہ ہی زیادہ تھے یا فرض کرو کہ وہ سراپا گناہ اور ہمہ تن ظلم و جفا ہی تھے تب اس صورت میں جائے طعن باقی نہ رہی کیونکہ خداوند کریم اپنے وعدہ کا سچا اور بات کا پکا ہے۔ مثل حضراتِ شیعہ نہیں جن کے دین کی باتوں میں بھی جہل ہے، دنیا کا تو کیا ذکر؟ سو ہم کو یقین ہے کہ خدا ان سے راضی ہے گو شیعہ ناراض ہوں، وہ ناراض ہوں گے خدا کو ناراض اور اہل بیت کو رنجیدہ کرینگے، کیونکہ اہل بیت تو ایسے نہیں کہ گوشتِ عنایتِ خداوندی کسی طرف کو دیکھیں پھر اس طرف کو نہ جھکیں بلکہ ان کی سعادتِ ازلی اور ہدایتِ لم یزلی سے یوں یقین کامل ہے، کہ اگر بفرض محال حسبِ مقالہ شیعہ ابوبکر صدیق نے کچھ ان پر ظلم اور تعدی بھی کی ہو تب اپنے حقوق سے درگزر میں اور لحاظِ رضا خداوندی حسبِ مثل مشہور، ہر عیب کہ سلطان بہ پسند و ہنر راست، اپنے اوپر جفا کو وہ سمجھیں، نقل مشہور ہے، جدھر رب اُدھر سب، اور اہل بیت اپنے حقوق سے آپ کیا درگزر کریں گے اور کیا راضی ہوں گے خداوند کریم جب راضی ہو گا سب کو راضی کر دے گا آخر کلام اللہ میں موجو

ہے وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلِيٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ یعنی خداوند کریم بعضے جنتیوں کے حق میں فرماتے ہیں، "اور انکال ڈالے ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں رنج تھے، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے ہوئے فقط، اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ بعضے جنتی ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے باہم دنیا میں رنج و عداوتیں تھیں، پر جب خداوند کریم ان کو جنت میں داخل کرے گا ان رنجوں کو ان کے دلوں سے نکال ڈالے گا۔ سو اسی طرح یہاں بھی تصور فرمالینا چاہیے۔ آخر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا بشہادت کلام خدا اور کلام ائمہ ہدیٰ شیعوں کو جبراً کرہاً تسلیم کرنا تو پڑا ہے، اور اہلبیت کے جنتی ہونے کا پہلے ہی سنیوں، شیعوں کو باتفاق یقین ہے اور اگر شیعہ سنیوں کی ضد میں ان کے جنتی ہونے میں کلام کرنے لگیں تو ان کی ہٹ دھرمی سے کچھ بعید بھی نہیں غرض جب دونوں فریق جنتی ہوئے تو ان کے کینے اور عداوتیں خداوند کریم آپ نکال دے گا۔

حضرت کلیم کا بچھڑے کو جلانا مبنی بر حکمت تھا اور اگر بایہنہ نہ ہائش بلیغ متبعان عبد اللہ بن سبا کو کچھ اثر نہ ہو۔۔۔۔۔ اور جیسے سامری کے ایک کرشمے پر بنی اسرائیل بہک گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزار معجزوں پر بھی ڈھیٹ راہ پر نہ آئے اس دغا باز کے سخن بے سرو پا پر ایسے چپس کہ میرے ان دلائل محکم اور مستحکم سے بھی اکھڑ جائیں تو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دستاویز ضلالت آمیز سامری کو باطل کر دیا یعنی اس سونے کے بچھڑے کو جو برکت خاکپائے حضرت جبریل علیہ السلام بولنے لگا تھا اور بنی اسرائیل اسے پوجنے لگے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلا کر دریا میں ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا، تاکہ ہر کس و ناکس سمجھ جائے کہ اگر یہ معبود بحق اور خدا، برحق ہوتا تو بندوں کے ہاتھوں سے یوں کیوں ذلیل ہوتا۔ اسی طرح میں بھی حیلہ ہائے حجت نمائے مولوی عمار علی صاحب کو دکھایا ہو طرز و انداز میں عبد اللہ بن سبا ثانی اور دغا ہائے تازہ کے بانی مبنی ہیں بلکہ ان کی حجیتیں اسی سرگروہ شقاوت پڑوہ کی تراشی ہوئی باتیں ہیں۔ اور اسی کی پرانی خرافاتیں ہیں۔ سو ان دلائل قاطعہ سے قطع نظر کر کے مولوی صاحب کے ہاتھ کاٹے دیتا ہوں تاکہ ہر کوئی جان جائے کہ سخنان پریشان مولوی صاحب اگر قابل پذیرائی اہل انصاف ہوتے۔ تو یوں مثل گوز شتر ہوا کے

سہارے نہ اڑ جاتے۔

غضب فدک پر آیت ذی القربی سے استدلال | سو گوش گزارانِ مولوی صاحب کو یہ بات یاد رہے کہ دربارہ غضب فدک جو کچھ مولوی صاحب نے مکاری کر کے زیب رقم فرمایا ہے بزرگ خود بہت ہی چالاکی کی تھی۔ لیکن جن کا خدا حافظ ہو ان کو ایسے دھوکوں سے کیا اندیشہ۔
چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد لوح کشتیان

ہاں ایسے عقل کے اندھے جیسے (گستاخی معاف) ملازمانِ مولوی صاحب ہیں۔ البتہ اس جال میں پھنس جاتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہی مولوی صاحب اپنے نامہ موسومہ میرزاور علی صاحب میں کہ مثل نامہ سیاہ مولوی صاحب کے خوبی کا اس میں نام و نشان نہیں یوں رقم فرماتے ہیں کہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر و روشور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابولعلی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوت نے اور سوا اس کے اور علمائے اہلسنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت وَالتَّيَّابَاتِ ذَاتِ الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ یعنی دے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریبوں کو حق ان کا، تو اس وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل سے پوچھا کہ قریب میں سے کون ہیں؟ اور حق ان کا کیا ہے؟ جبرئیل نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہؑ یا اور حق اس کا فدک ہے۔ فدک اس کو دے دو، اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دیدیا۔ پس تحریر سے انکی ثابت ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دیدیا۔ اور فاطمہ مالک فدک کی تھی جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی اور ابوبکر خلیفہ ہوئے، تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اٹھا دیا۔ اب یائے کہ یہ غضب نہیں تو کیا ہے۔ انتہی۔ یہاں تک مولوی صاحب کی عبارت تھی۔

غضب فدک کے بہتان کا تاریخی جائزہ | اب ہماری سند ہے کہ یہ اعتراض غضب فدک ایک پرانی بات ہے کچھ ملازمانِ مولوی صاحب ہی کو نہیں سوجھی، سارے شیعہ اسے ہی گاتے رہے ہیں القصد مولوی صاحب وہی پرانی قے چاٹتے ہیں جو اگلے اگلے چلے آئے ہیں، پر افسوس یہ ہے کہ ابتدا میں کسی نے یہ دروغ بے فروغ اگر زبان سے نکالا تھا تو جب تک علماء اہل سنت کو اس کی خبر بھی نہ تھی، نکالا تھا۔ لیکن جس وقت علماء اہلسنت نے جوابات دندان شکن سے شیعوں کے

دانت توڑ دیئے تب تو غیبت کی بات یہ تھی کہ اس بات کو منہ پر بھی نہ لاتے اگر صواب اور صواب کی بات تھی تو بفضلہ تعالیٰ تحفہ اثنا عشریہ تصنیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ، اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مناظر بے بدل مولوی حیدر علی سلمہ ربہ کہ علماء لکھنؤ بھی ان کے سامنے بول گئے تھے کثرت سے موجود ہیں ان میں اس دروغ بیفروغ کے جو کچھ جواب لکھے ہیں پہلے ان کو رد کرنا تھا جب کہیں اس بات کو زبان پر لانا تھا اگر خدا سے شرم نہ تھی کیا غیرت دنیاوی کو بھی طاق میں اٹھا دھرا، کیسا ہی کوئی نامعقول کیوں نہ ہو، پر اپنی بات کا جواب معقول سن کر ایک دفعہ کوچپ ہی ہو رہا کرتا ہے۔

ہاں نامرد جیسا کہ یہ کام ہے کہ اگر دلاور ان شجاعت نر ادا کسی ناسنرا کی سنرا میں کچھ سر زنش کرتے ہیں اور ہاتھ پاؤں سے معقول کرتے ہیں تو وہ چونکہ ہاتھ پائی سے مارا ہوا ہوتا ہے۔ اپنی زبان چلانے سے باز نہیں آتا اور اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جایا کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے مرد کے ہاتھ چلیں نامرد کی زبان، سو یہی وطرہ حضرات شیعہ کا ہے کہ اہل سنت کے جوابات دندان شکن سنگر بھی منہ بند نہیں کرتے اور وہی بکے جاتے ہیں اس موقع میں مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی جوابات سابقہ پر اکتفا کرتے لیکن چونکہ مولوی عمار علی صاحب نے اپنے عندیہ میں میدان خالی دیکھ کر یہ ہاتھ پاؤں ہلائے ہیں۔ تو ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کو ان کی حقیقت دکھلا دیجئے۔

یہ آیت مکیہ ہے مکہ میں نذک کہاں تھا؟ سو عرض یہ ہے کہ ملازمان مولوی صاحب کو تو کلام اللہ نہ یاد ہے نہ یاد ہو، اگر یقین نہ ہو تو کوئی صاحب بھی پوچھ دیکھیں کہ یہ آیت کون سے سیپارہ میں ہے؟ بالجملہ اگر مولوی صاحب اور ہم مذہبان مولوی صاحب کو کلام اللہ یاد ہوتا تو اس آیت کو نذک کے باب میں زبان پر بھی نہ لاتے، بلکہ اگر ہم بھی کہتے جب بھی نہ ملتے، وجہ اس سخن کی یہ ہے کہ یہ آیت کل دو جگہ کلام اللہ میں آئی ہے، ایک سورہ بنی اسرائیل میں، دوسری سورہ روم میں، سو دونوں کی دونوں خیر سے مکہ میں نازل ہوئیں تھیں۔ علماء تو اس بات کو جانتے ہی ہیں، پر عوام کی تفہیم اور تسکین کے لئے اتنا اشارہ بہت ہے کہ دنیا میں ہزاروں کلام اللہ موجود ہیں کھول کر دیکھ لیں ان دونوں سوروں کے اول میں مکیہ لکھا ہوا ہوگا، اور اگر کوئی الٹی کا سمجھن ہار مصا

کا بایں وجہ اعتبار نہ کرے، کہ کلام اللہ تو سنیوں ہی کی سی کہے گا تو لہجے شیعوں ہی کی گواہی
موجود ہے۔ طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے سورۃ الروم مکیۃ الا قولہ فیہا
اللہ الخ یعنی علامہ طبرسی جس کے حوالہ سے یہ مذکور ہو گا کہ جب آیت فات ذالقرآن نازل
ہوئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ کو عطا فرمایا وہی تفسیر مجمع البیان
میں رقم فرماتے ہیں کہ سورہ روم سواء آیت فسبحان اللہ الخ سب مکی ہے اب کوئی مولوی صاحب
سے پوچھے کہ مکہ میں فدک کہاں تھا؟ فدک تو ہجرت سے چھٹے ساتویں سال بعد رسول اللہ صلی
علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا تھا۔ اس صورت میں تو سنیوں کی معتبر کتابوں میں بھی اگر تبصریح
یوں لکھ دیتے۔ کہ یہ آیت بعد خیبر کی فتح کے نازل ہوئی ہے تب بھی اعتبار نہ کرنا تھا۔
کسی آیت کے مکی یا مدنی ہونے سے کیا مراد ہے؟ بالجملہ پیشوایان مذہب شیعہ نے بات تو بنائی تھی۔
لیکن کیا کریں کلیہ ہی دروغ گوہ حافظہ نہ باشد۔ تقدیر سے چوک گئے، باقی کسی کو یہ شبہ ہو۔
کہ مکی اسے بھی کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ یا نواح مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہو۔ خواہ قبل ہجرت ہو یا بعد
ہجرت، سو ہو سکتا ہے کہ غزوہ فتح میں مثلاً یہ سورتیں نازل ہوئی ہوں اور اس سبب ان کو
مکی کہتے ہوں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت وَكَانَ تَجَهُّرُ
بِصَلَوَاتِكَ الخ اور سورہ روم کی پہلی آیت کی شان نزول خود اس بات پر شاہد ہے کہ ان کا
نزول ہجرت سے پیشتر ہے۔

علاوہ بریں مولوی دلدار علی صاحب رسالہ ضعیفہ میں سنیوں کے اس استدلال پر
کہ آیت اَلَا عَلَیْکَ اَذْفَلُ جِہِمُ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ حرمت متعہ پر دلالت کرتی ہے۔ جو
اعتراض کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت مکی ہی ہو سکتا ہے کہ مکی مدنی سے یہی مشہور
اصطلاح مراد ہو یعنی مکی وہ ہے جو قبل ہجرت نازل ہوئی ہو، اور مدنی وہ جو بعد ہجرت نازل ہوئی ہو، اور مولوی
دلدار علی صاحب اس باب میں ہمارے موافق ہوں مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں آیت وَاَنْتَ
ذالقرآن کی یہ تفسیر جو مولوی عمار علی صاحب اور سوانہ کے اور شیعہ کرتے ہیں ہر امر غلط ہوگی
ذالقرآن سے سیدہ ادرحقہ سے فدک مراد ہو تو | ماسوا اس کے اہل فہم و دانش سے یہ التماس
کئی محذور لازم آئیں گے۔ پہلا محذور خویش پوری ہے کہ خدا را میری رو رعایت نہ کریں پر انصاف

کرنا بھی تو کچھ اہل بیت پر ظلم کے برابر نہیں جو اتنا پرہیز ہے کیا ذالقرنی کے یہی معنے ہیں او
حقہ کا یہی ترجمہ ہے جو اس روایت میں مذکور ہے، بھلا سنیوں کو اول تو پاس ایمان،
دوسرے خبر بھی ہے کہ یہ روایت ساختہ وپرداختہ حضرات شیعہ ہے پر جیسے یہودی نصرانی،
ہندو عربی خوان کہ نہ ان کو یہ خبر ہے، کہ یہ خبر سراسر غلط ہے، اور نہ کچھ پاس عزت و عظمت رسول
اکرم بنی محترم صلی اللہ علیہ وسلم، اگر اس آیت کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے ہو بدولت عنایات
حضرات شیعہ بجز اس کے اور کیا ہو گا کہ دشمنان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے مہمت دنیا
طلبی اور حیلہ پردازی متہم کر کے یوں کہیں گے کہ یہ جبریل کا حوالہ فقط اس لئے گھڑ لیا تھا کہ
اپنی بیٹی کے دینے میں کوئی تکرار نہ کرے، ورنہ کلام اللہ کے الفاظ سے اس تفسیر کو کچھ مساس
نہیں ذالقرنی ایک لفظ کلی ہے معنی قریب، فقط حضرت فاطمہ میں کیوں کر منحصر ہو جائے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتی کچھ ایک دو نہ تھے ہزاروں تھے خاص کر حضرت زینب
حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم جو بے شہادت قرآن اور صحیح الکتب شیعہ کافی کلینی قرابت میں
حضرت فاطمہ ہی کے برابر تھیں، کچھ کم نہ تھیں، چنانچہ سند اس کی اوپر مرقوم ہو چکی، اور اگر
یوں کہیں کہ یہ دونوں صاحبزادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پا چکی تھیں تو یہ تو غلط
کیونکہ یہ مکتی ہی اور ان دونوں کا انتقال مدینہ میں ہوا۔

دوسرا بلاغت کی مخالفت تیسرا بقیہ اقربا پر ظلم اور سلمنا حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرات
حنین اور حضرت جعفر و عیمہ و فداک کے قبضہ میں آنے کے وقت موجود تھے۔ اور یہ سب
بآفاق عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتی ہیں، تو اس صورت میں حضرت فاطمہ کو
حق کیا دیا، اور سب قرابتیوں کا حق تلف کر دیا، اور اگر ہمارا یقین نہ ہو تو ان معنوں کی تصدیق
کے لئے ہم۔۔۔۔۔ مولوی عمار علی صاحب کو ہی شاہد لاتے ہیں، دیکھ لیجئے وہ خود اس
آیت کے معنے یہی لکھتے ہیں کہ بددے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا، دوسرے حقہ کی تفسیر میں
فداک کا کہنا بعینہ ایسا ہی اہل جواب ہے، جیسا کسی نے اپنا نام تجوں سے نبھایا تھا، عرف زبر
عرف عرف زبر عرف، میرا نام محمد یوسف، بھلا ایسی پوچ باتیں اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف
نسبت کرنے میں انہیں اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کسی نے کچھ کہہ لیا تو کہہ لیا، پر خدا اور

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی کیا کہے گا، شاید ان افترا پمدازوں سے یہ غرض ہو کہ ہم سے اگر خدا اور رسول کے موافق نہیں ہوا جاتا، اور جتنا ہو سکے خدا اور رسول ہی کو اپنے موافق کر لیں۔ سبحان اللہ ان تیرہ دُڑوں سے یہ تو نہ ہوا کہ اعجاز کلام اللہ اور شرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آب و تاب دیں اور ظاہر کر دکھلائیں، پر ایسی باتیں کر کے دونوں کو چھپالیا بلکہ ایسی باتیں تراشیں کہ جن کو سن کر ناواقفوں کے تو ایک ذمہ کاں کھڑے ہو جائیں، اور جی میں متروڑوں کہ یہ بلاغت اور فصاحت کلام اللہ کا شہرہ اسی خوبی پر ہے تو بلاغت اور فصاحت معلوم، اس چیتان لاجل بولنے سے کیا حاصل تھا اگر و آت فاطمہ فہ فہ فرما دیتے تو لفظ مختصر اور معنی واضح ہو جاتے۔

چوتھا آنحضرت کی طرف ادائیگی حقوق میں کوتاہی کی نسبت ہاں اگر اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بیع یا ہبہ وغیرہ سے حضرت فاطمہ زہرا کی ملکیت فدک میں ثابت ہو جاتی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے دینے میں کسی وجہ سے نعوذ باللہ کچھ تقصیر ہوئی ہوتی تو البتہ اس صورت فدک کی جگہ حقہ کہنے کا موقع بھی تھا، کیونکہ اگر کوئی کسی کی کوئی چیز دالیتا ہے تو اس کو کہا کرتے ہیں کہ فلانے کا حق دے دو۔ القصہ جہاں مخاطب کے پاس کوئی کسی کی خاص چیز دینی ہوتی ہے یا کسی کے ذمہ کوئی حق معلوم ہوتا ہے تو وہاں البتہ اس چیز کا یا اس حق کا لفظ حقہ سے تعبیر کرنا بجائے خود ہوتا ہے، چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہیں، کم فہم نہ سمجھیں تو بلا سے نہ سمجھیں۔

سو اگر مولوی صاحب کا کہنا سچ بھی ہو۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ احتمال محال ہو بھی سکے تب بھی کام نہیں چلتا۔ کیونکہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ فدک اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے حضرت فاطمہ کی ملک میں ہو، حالانکہ یہ بات خلاف مزعوم شیعہ ہے۔ کیونکہ بیع کے انعقاد سے تو شیعوں کو بھی انکار ہے۔ باقی رہا ہبہ، سو وہ ان کے اعتقاد کے موافق بعد نزول اس آیت ہی کے واقع ہوا، اس لئے کہ وہ اس آیت ہی کو قبالہ ہبہ سمجھتے ہیں، چنانچہ اس آیت مذکورہ سے صاف ظاہر ہے اور ظاہر ہے کہ شے موہوب قبل از ہبہ واہب ہی کے ملک میں ہوتی ہے، تو پھر فدک کو حقہ کی تفسیر میں کہنا روایت کے

بنانے والے کی کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، عیب کرنے کو مہتر چاہیئے۔

پانچواں بنی ہاشم کے لئے خمس کا اور اگر پیاس خاطر حضرات شیعہ مولوی صاحب کی بات کے بنانے کے لئے موافق نقل مشہور دروغے راجز اباشد دروغے، ہم بھی یوں کہنے لگیں کہ ہاں سچ ہی یہ روایت سچی ہے اور ذالقرنی سے مراد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حقہ کے معنی فدک ہی ہیں تو مولوی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے کہ اس صورت میں جہاں کہیں کلام اللہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا کا ذکر بلفظ ذالقرنی ہو گا تو لازم ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی مراد ہوں اور جب یہ قرار پایا تو بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے کسی اور کو بنی ہاشم میں سے خمس کا حصہ لینا درست نہ ہو اور وجہ اس نادرتی کی (در صورت مرقومہ) یہ ہے کہ آیت **وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ** وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَلِلْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ کا ترجمہ یہ ہی ہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت بلاؤ کچھ چیز سوال اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور قرابت والے کے واسطے اور محتاج کے لئے اور مسافر کے لئے فقط، اب خمس کی تقسیم جو اس آیت میں مذکور ہے ہماری تمہاری مقرر کی ہوئی نہیں خدا کی مقرر کی ہوئی ہے اس میں کمی و بیشی مسلمانوں سے تو ہو ہی نہیں سکتی، پھر جب کہ ذالقرنی حضرت فاطمہؑ ہر س تولد ان کے اور کسی کو اولاد میں سے یا بنی ہاشم میں سے ان کے خمس میں سے لینا درست نہ ہو، حالانکہ مذہب شیعہ اس باب میں یہ ہے کہ نصف خمس امام وقت کا اور نصف باقی یتامیٰ اور مساکین اور ابن السبیل کے لئے، اور ظاہر ہے کہ امام شیعوں کے نزدیک سواد و ازد و ائمہ کے اور کوئی نہیں۔ سو وہ سب کے سب بالفاق شیعہ معصوم ہیں، شیعوں کی تقسیم کے موافق جو کچھ حضرت علیؑ نے اپنی خلافت میں خمس میں سے لیا، یا حضرت امام ہدی رضی اللہ عنہ لینگے یفتولے روایت مرقومہ بالاطلم اور حرام ہو گا اور اگر کوئی شیعہ مذہب جو در طبع کو کار فرما کر یوں کہے کہ ہر خاندان ذالقرنی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی ہیں۔ اور خمس اصل میں انہیں کے لئے ہے لیکن ائمہ کو بوجہ میراث خمس کا لینا جائز ہے تو میری یہ عرض

ہے کہ اول تو میراث بقدر حصہ وارث چلیے، سو کیا بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اماموں کے وقت میں سب اماموں کے سادات میں سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا اور کوئی وارث ہی نہ تھا؟ جو نصف خمس سارے کا سارا امام کے لئے تجویز ہوا۔

چھٹا، بعد وفات سیدہ جو غنائم آئیں وہ ان اور سلمنا کہ حضرت زہرا کے مال کی وراثت انہیں کی ملک نہ تھیں۔ تو حقہ کیوں فرمایا؟ اشخاص محدودہ کے لئے ہی لیکن جو چیز کہ حضرت

امیر رضی اللہ عنہ اور حضرت امام ہمدی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں غنیمت آئی یا آئے گی وہ حضرت فاطمہ کی ملک ہی میں نہیں، مالک ہونے کے لئے حیات ضروری ہے تو اس صورت میں اول تو خداوند علیم حکیم کے اس فرمانے کے کیا معنی ہوں کہ جو کچھ غنیمت لاؤ اس کا خمس ذالقربی یعنی حضرت فاطمہ اور تیمامی وغیرہ کے لئے ہے۔

ساتواں، مالی غنیمت اللہ کے لئے حرام | دوسرے جب وہ حضرت فاطمہ کی ملک ہی نہ ہوئی تو بوجہ ورنہ دیگر مستحقین کے لئے بھی جائز | وراثت اماموں نے کیوں لیا، اور یہ بھی نہ سہی خمس وراثت

میں نہ آیا ہو بلکہ استحقاق خمس وراثت میں آیا ہو۔ لیکن یہ کیا انصاف ہے کہ ذالقربی یعنی حضرت فاطمہ کا استحقاق خمس تو بطور وراثت اولاد میں منتقل ہو جائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یتیموں اور مساکین اور مسافروں کا استحقاق خمس بطور وراثت ان کی اولاد میں منتقل نہ ہو، اگر یہی توریت ہے تو اس زمانے کے تیمامی اور مساکین اور انبیا، سبیل کی اولاد بھی ہرچہ بادا باد یتیم ہوں کہ نہ ہوں، اور مساکین ہوں کہ غنی، مسافر ہوں یا یتیم مصرف خمس ہوں اور اماموں کے زمانہ کے یتیم اور مسکین اور انبیا، سبیل کو اس میں سے دینا درست نہ ہو وہ یوں ہی خاک پھانکتے پھریں، معینا جو سخن شناس ہیں وہ اس لفظ ذالقربی حقہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ جناب باری کا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں ارشاد ہوا ہے کہ ذالقربی کا حق پورا پورا ادا کر دو،

آٹھواں، سید کیلئے صرف فک اور غیار کے لئے سب کچھ سوا اگر ذالقربی حضرت فاطمہ ہوں نہیں۔ اور ان کا حق فک ٹھیرا، تو اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فک دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے لو ادا ہو گئے، باقی جو کچھ بچا اور جو کچھ

سوا اس کے بطورنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا، یا اس کے بعد غنیمتوں میں سے خمس میں آیا یا اس سے پہلے غنیمت میں سے خمس میں آیا تھا، یا سوا اس کے جو کچھ اس آیت کا مفہوم قرار دیکھے، وہ سب مساکین اور ابن سبیل کا رہا، اور ظاہر ہے کہ فدک اس قدر مجموعہ کے ساتھ ہزاروں حصہ کی نسبت بھی نہیں رکھتا، سو موافق گفتار شیعان "قدر شناسی عالم بالا معلوم" اس تقسیم میں خدا سے بھی بڑی افراط فریض ہوئی، کہ حضرت فاطمہ سیدۃ النساء جگر گوشہ سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ اجمعین کے لئے تو فقط فدک اور باقی ساری دولت اغیار کے لئے اگر دنیا سے بچانا تھا تو اس قدر کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی قوت لایموت تو فدک سے پہلے بھی ملے تھا، نعوذ باللہ منہا خداوند کریم علول کجا اور یہ تقسیم ناموزوں کجا، یہ بعینہ ایسی ہی تقسیم ہے جیسا کہ مشہور ہے "داز سخن خانہ تا بلب بام از آن من و زبام کاخ تا بہ ثریا از آن تو"۔

نوال، خدا پر بے انصافی کا الزام سنیوں کے طور پر تو اس تقسیم کے جو ان کی ایک صورت بھی ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی شان وہی ہے جیسے کلام اللہ میں ہے "إِلَّا فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مِنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ"۔ لیکن شیعہ تو خداوند احکم الحاکمین کے ذمہ عدل بمعنی معلوم ایسے امور میں واجب تہلاتے ہیں۔ سو بڑے حیف کی بات ہے کہ نعوذ باللہ خدا ہو کر ایسی نا انصافی کہ زیادہ استحقاق والوں کو کم، اور کم استحقاق والوں کو زیادہ۔ اور اگر کوئی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ یہ روایت سنیوں کی کتابوں کے حوالوں سے مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے، اگر غلط ہو تو شیعوں کو کیا نقصان، سنیوں کے الزام کے لئے اتنا بھی بہت ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے۔ تو اس کا جواب ہم سے سنئے۔

اول تو یہی غلط کہ روایت شیعوں کی نہیں، کیونکہ مجمع البیان طبری میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق کے حوالہ سے یہ روایت موجود ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو فدک عطا فرمایا اور اس کو ان کے سپرد کر دیا۔

اہل سنت کے یہاں روایت کے صدق و کذب کا معیار قرآن مجید ہے | باقی رہا یہ سنیوں کی کتابوں میں یہ

روایت پائی جاتی۔ تو اس کا جواب معقول ہم سے سنئے۔ جناب من یہ روایت میرا سرور و رخ
 ساختہ پر داختہ حضرات شیعہ ہے چنانچہ تقریر ماسبق میں بخوبی اس بات کی تحقیق مندرج
 ہو چکی ہے۔ لیکن مزید تسکین کے لئے اتنا اور بھی سنئے کہ سنی اول تو ایسے بے عقل نہیں، کہ
 جھوٹ سچ کی تمیز ان کو نہ آتی ہو، پس کلام اللہ کے حرف، حرف کے اکثر سنی حافظ اور محافظ،
 ان کو ہر آیت کے سیاق سباق پر نظر رہتی ہے اور ایک مضمون کی جتنی آیتیں ہوتی ہیں ان سب
 کی خبر رکھتے ہیں جیسے شیعہ بہ سبب اپنی تیرہ درونی اور کج عقلی اور کلام اللہ کے محفوظ نہ ہونے اور مروج
 استدلال کے سیاق سباق کے یاد نہ ہونے کے باعث صحیح مطلب کی جگہ غلط سمجھ جاتے ہیں
 سنی غلط نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ وہ بفضلہ تعالیٰ ان عیوب سے پاک ہیں، بلکہ جیسے کسوٹی پر چاندی سونے
 کو لگا کر کھرا کھوٹا پرکھ لیتے ہیں سنی روایات کو کلام اللہ پر مطابق کر کے صحیح ضعیف کو دریا
 کر لیتے ہیں، سو وہ کیونکر ایسی روایات بے سند کو کہ قطع نظر بے سند ہونے کے اس آیت کا
 سیاق اور سباق بلکہ خود اس روایت کے لفظ اور معنی اس کے غلط ہونے کے گواہ ہوں۔
 اپنی کتب میں درج کریں، یہ سب مقتدایان شیعہ کی چالاکی ہے تاکہ عوام اہلسنت کو اس
 تلبیس ابلیس سے جاوہ مستقیم سے برطرف کر دیں۔

روایت فدک آیت کے سیاق سباق کی مخالف ہے | اول سیاق سباق آیت کی مخالفت تفسیر مذکور
 سے گوش گزار اہل انصاف و خدا را غور سے سنیں، میں نہیں کہتا کہ میری روایت کریں، ہا
 البتہ انصاف کا خواہاں ہوں، سورہ بنی اسرائیل میں دوسرے رکوع وَقَضَى رَبُّكَ
 لے کر ما بعد تک آیت وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ کو ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ حروف خطاب سے
 مقصود فقط نفس نفیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا تمام امت؟ سواہل فہم جانتے
 ہیں کہ مقصود خطاب سے تمام امت کا خطاب ہے۔ کیونکہ لَا تَعْبُدُوا اور رَبِّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا
 فِيْ نَفْسِكُمْ الخ اور لَا تَقْتُلُوْا وَاُولَادَكُمْ وغیرہ میں تو ضمائر جمع ہی کے ہیں، باقی رہا
 اِمَّا يَنْبَغُ عِنْدَكَ الْكِبَرُ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ وغیرہ میں ہر چند بظاہر بوجہ وحدت
 خطاب اور بقربینہ وَقَضَى رَبُّكَ جس میں ظاہر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب
 معلوم ہوتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ وغیرہ میں خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے

مگر نظر بعوم حکم و لحاظ قرینہ لا تعبدوا وغیرہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب ہر شخص کے لئے ہے اور اس کا مخاطب ہر عام و خاص ہے، اس میں اور لا تعبدوا میں اگر فرق ہی تو یہی ہے کہ وہاں اعنی لا تعبدوا وغیرہ میں مخاطب متعدد، پر خطاب ایک، اور یہاں دونوں متعدد ہیں، جتنے مخاطب، اتنے ہی خطاب۔

رہی یہ بات کہ بقرینہ وقفے ربك خطاب بجانب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام و علی آلہ الکرام معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ وقفے ربك اس امر کے لئے جب ہی قرینہ ہو سکتا ہے کہ جملہ وآت ذالقرنی وغیرہ اس پر معطوف ہوں، سو اس بات کو اہل معانی و بیان سے دریافت کرنا چاہیے کہ انشاء کا عطف خبر پر اور ماضی کا عطف امر پر درست ہے کہ نہیں؟ حق یہی ہے کہ جملہ وآت ذالقرنی اگر معطوف ہی تو لا تعبدوا پر معطوف ہے اور اگر یوں کہنے کہ وَقَفْ رَبِّكَ اگرچہ بظاہر خبر ہے پر حقیقت میں بمعنی امر ہے قرینہ لا تعبدوا موجود ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی لا تعبدوا کا قرینہ اس بات پر شاہد ہے کہ اگر یہ جملہ خبر بمعنی امر ہی تو خطاب بھی عام ہے۔

ہاں یہ بات اس صورت میں قابل استفسار ہے کہ جب دونوں جگہ مخاطب تمام امت ہی تھی تو نظم و نسق عبارت یوں مختلف کیوں ہوا؟ یا دونوں جگہ ضمیر جمع ہوتی؟ یا دونوں جگہ ضمیر واحد آتی؟ سو وجہ اس تغیر و تبدل کی بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی حکم احکام متعددہ میں سے جو ایک ساتھ صادر فرمائے جائیں، بہ نسبت اور احکام کے زیادہ عظیم الشان ہوتا ہے یا بہ نسبت کسی خاص حکم کے مخاطبوں کی طرف سے تقاعد اور تکاسل کا گمان ہوتا ہے تو ایسی صورت میں حکام والا نشان بنظر مزید تاکید ہر ہر فرد بشر کی طرف خطاب کر کے حکم کیا کرتے ہیں سو یہاں بھی یاس لحاظ کہ شرک کی برائی اور بر والدین کی بھلائی ہر عاقل کی عقل میں خود بخود جمی ہوئی ہے اس کی ضرورت نہ دیکھی کہ تہدید منع فرمائیں اور تاکید راہ پر لائیں فقط تقدیم کر ہی پر کہ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے۔ اکتفا فرمایا۔

ہاں ادا حقوق ذوی القربی، علیٰ ہذا القیاس لحاظ صرف بجانبیں، اکثر بشر قاصر اور غافل نظر آئے، مناسب مقام یہ ہوا کہ زیادہ تر اہتمام کیا جائے۔ علاوہ بریں امر نہی دربارہ توحید

وشرک سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ خالق سے کیونکر معاملہ رکھنا چاہیے، ادھر اوامر و اداء سے حقوق اہل حقوق اور نواہی اسراف و تبذیر سے یہ غرض ہوتی ہے کہ خلاق کیسے کیونکر رہنا چاہیے غرض معاملات کی دو قسمیں ہیں ایک خالق کے ساتھ ایک مخلوق کے ساتھ، علیٰ ہذا القیاس اور امر و نواہی بھی منقسم بدو قسم ہیں چونکہ اصلاح معاملات منظور ہے اور ہر معاملہ دو ہی شخصوں سے تمام ہوتا ہے سو معاملہ خالق میں تو تمام مخلوق برابر ہیں ایک ہی خالق اور پھر سب کے ساتھ ایک ہی نسبت اس لئے اس کو تو ایک ہی معاملہ تصور کیجئے، اور معاملہ مخلوق میں ہر شخص کا حال جدا، کیونکہ اول تو ہر ایک کے اقربا جدا، پھر اقربا میں سے بھی ہر شخص سے جدا قرابت، اس لئے ہر قرابتی کے ساتھ ایک جدا ہی معاملہ ہوگا، جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ اول صورت میں تو بلحاظ وحدت معاملہ ایک ہی خطاب مناسب ہے، اور صورت ثانی میں نبض تعدد معاملہ خطاب بھی جدا جدا چاہیے۔

وآیت ذی القربیٰ میں مخاطب اور اگر اب بھی کسی کے دل سے خلجان بچائے تو پھر بجز اس خاص اور خطاب عام ہے کے اور کیا کہا جائے کہ یہ تعصب بیجا ہے مگر تاہم ہمارا مطلب کہیں نہ گیا اگر خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگا تب بھی صحیح یہ ہے کہ مخاطب ساری ہی امت رہے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اِنَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدٌ هُمْ اِلٰحُ کے معنی یہی ہیں اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ماں باپ میں سے ایک یا دونوں، تو نہ کہنا ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو، اور کہہ ان کو بات ادب کی الٰح فقط، اب میں پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد چالیس برس کے کلام اللہ نازل ہونا شروع ہوا اور والدین آپ کے چھٹپن ہی میں گذر گئے تھے پھر جو آپ کو یہ حکم سنایا گیا تو بجز اس کے اور بھی کچھ معنی ہیں کہ امتیوں کو سنا سنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے ہیں سو اسی طرح لفظ آیت ذی القربیٰ کو سمجھنا چاہیے۔ اور بیشتر اس قسم کے خطاب کے سب سے بڑے کو منہ پر دھر لینا وہاں کہا کرتے ہیں کہ کسی وجہ سے اس کام کا زیادہ تر اہتمام اور عوام کی طرف سے اس میں کسی طرح کا تقاعد ظہور میں آیا ہو یا تقاعد کا گمان ہو تو ایسے میں بڑے محبوبوں اور مقربوں اور افسروں کو منہ پر دھر کے کہا کرتے ہیں تاکہ سب سمجھ جائیں کہ جب

ایسے محبوب اور مقرب کو اس حکم کی یہ تاکیدیں ہیں تو ہمارا تو کیا ذکر ہے ہم کو بدرجہ اولیٰ اس حکم کی رعایت چاہیے بالجملہ اِقَائِبُ بَلْخَنَ کے قرینہ سے مثلِ آفتاب روشن ہے کہ گو مخاطب خاص ہے پر خطاب عام ہے چنانچہ لَا تُبْذِرْ تَبْذِيرًا بھی فی الجملہ اس کی طرف اشارہ کرے ہے۔ کیونکہ تبذیر سے منع کرنا کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں اور پھر یہ بات بھی قرینہ مذکور سے واضح ہو گئی کہ ماں باپ بھی ذوالقربیٰ میں داخل ہیں، بلکہ اس آیت میں زیادہ تر لحاظ انہیں کی طرف ہی لیکن خطاب عام بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ حقہ سے مطلقاً صلہ رحمی مراد ہو، چنانچہ ظاہر اور متبادر بھی یہی ہے، ورنہ حقہ کا مصداق اگر فدک ہی ہو تو پھر کس کس مومن مسلمان کے پاس فدک ہے جو اقربا کے حوالہ کرے۔ بالجملہ سیاق سباق آیت اِتِّذُوا الْقُرْبٰی الخ من درجہ سورہ بنی اسرائیل تو بشہادت وجوہ مذکورہ اس تفسیر سے انکار کرتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس سورہ روم کو خیال فرمائیے کیونکہ اللہ یبسط الرزق سے لفظ آیت ذوالقربیٰ کے ما بعد تک اگر بغور تامل کیا جائے تو صاف واضح ہو جائے کہ یہاں بھی گو مخاطب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن خطاب عام ہے کیونکہ پہلے تو یہ مضمون ہے کہ اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے روزی فراخ دے جس پر چاہے تنگ کر دے، اسی پر تفریع کر کے فرماتے ہیں کہ تو قرا بتیوں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دیتا رہ۔ یعنی ہم نے اپنی بے نیازی سے کسی کسی کو مفلس اور تنگ دست بنادیا۔ سو تو ان میں سے اس ترتیب کے موافق خبر لیتا رہ۔ پھر اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ یہ بات بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور وہی لوگ فلاح کے پہنچنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد اور بھی ایسے ہی مضمون عام ہیں۔ الغرض یہ جو لفظ اللہ کا اشارہ ہے یعنی یہ جو ارشاد ہوا کہ یہ بات بہتر ہے یہ اسی قرا بتیوں کے حقوق اور مساکین اور ابناء سبیل کے حقوق کے ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے، سو اسی طرح سے اشارہ فرما کر کہنا کہ یہ بات بہتر ہے ایمان والوں کے لئے، جیسا صحیح ہو سکتا ہے کہ کوئی حکم عام ہو۔ سو در صورتیکہ فدک مراد ہو تو اس تفسیر کا حال ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ ایسا ہو جائیگا۔ جیسے نعوذ باللہ مشہور ہے۔ من چہ می گویم و طنبور من چہ می گوید۔ الغرض دستاویز یہ فدک و

فرمان عطاء فدک شیعوں کے نزدیک سورہ روم کی آیت تھی۔ سو اس کے سیاق
سباق کا بھی حال معلوم ہو گیا۔

حَقَّقَ کا معنی فدک | معہذا حقہ کی تفسیر فدک ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا معنی حقیقی
کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا ہو یا معنی کا ایک فرد ہو۔ اور جیسے کوئی شخص گھوڑے کو نہ جانتا ہو۔

اور وہ کسی سے پوچھے کہ گھوڑا کیا شے ہوتا ہے۔ اور اتفاق سے کوئی گھوڑا اس وقت سامنے
آجائے تو وہ دوسرا کہنے لگے کہ دیکھو یہ ہے گھوڑا، تو یہ جواب بیان معنی اور تفسیر حقیقت نہیں۔

بلکہ حقیقت اسی کے ایک فرد کو تبا کر گویا یوں سمجھا دیتا ہے کہ باقی افراد بھی اسی پر قیاس کر کے
حقیقت مشترکہ کو سمجھ لو۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے

ہوں؟ اور حضرت جبریل نے ایک فرد کو افراد حقوق ذی القربیٰ میں سے بتلا کر مطلب کا راہ
نکال دیا ہو؟ یا یوں کہیے کہ نہ یہ معنی لغوی ہیں، اور نہ کوئی فرد معین منجملہ افراد کے۔ بلکہ جناب

سرور کائنات فقط مقدار حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں، سو اسی کا سوال کیا اور حضرت
جبریل علیہ السلام نے اس مقدار ہی کا ذکر فرمایا۔ بالجملہ ان تین احتمال سے زیادہ اور کوئی احتمال

نہیں جس کو غرض اصلی تفسیر مذکورہ کی قرار دیجئے اور حقیقت میں دیکھئے تو ایک بھی احتمال
نہیں مطلب آیت کا ظاہر ہے تفسیر کی کچھ حاجت نہیں۔

سو خیر اگر اس معنی کو معنی لغوی قرار دیجئے تو یہ تو ظاہر ہے کہ ظاہر البطلان ہے، کونسا
کو دن یوں کہہ دے گا کہ اس لفظ کے معنی لغوی اور موضوع لہ مطابق یہ معنی ہیں؟ اور اگر

یوں کہیے کہ مدنیۃ العلم اور معدن حکمت یعنی سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوات
والتسلیمات حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے تھے اور حضرت جبریل نے ایک فرد کا بیان

فرما کر حقیقت الامر سے مطلع فرمادیا تو یہ جرات بھی مولوی عمار علی صاحب جیسے صاحبوں سے
ہو سکتی ہے اہل فہم کی زبان تو ایسی باتوں کے لئے نہیں اٹھتی، عاقل چھوڑ دیوانے بھی اتنا تو جانتے

ہیں کہ حقیقت حق ذی القربیٰ یہی دنیا دلا نا ہے چنانچہ لفظ آت خود صاف یہی کہتا ہے
پھر جب کبھی کچھ دینے دلانے کا اتفاق ہو گا۔ وہی ایک فرد اس حقیقت کا ہو چکے گا۔ باقی

رہا تیسرا احتمال بادی النظر میں البتہ فی الجملہ کچھ آیت مذکورہ کے پاس پاس کو پھرتا ہی نہیں

بغور دیکھئے تو جواب خیر سے یہ بھی بعید ہے کیونکہ اول تو اقربا کے حق کی کوئی حد نہیں۔
 شیعہ سنیوں کا سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جتنا کرے اتنا تھوڑا، دوسرے اس صورت میں
 لازم تھا کہ بیگھوں سے یا جریبوں سے مثلاً، یا باعتبار ربع یا ثلث مال کے تعین مقدار بیان
 فرمائے، اس صورت میں اس سوال و جواب کی وہی مثل ہو جائے گی۔ سوال از آسمان
 جواب از سماں۔ لعوذ باللہ اگر اس احتمال پر حضرات امامیہ جہیں، تو غرابیہ کے اس عقیدہ کو
 بھی منظور فرمائیں کہ خداوند کریم کی طرف سے حکم حضرت علی کے پاس وحی کے لئے جانے
 کا ہوا تھا۔ پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے غلطی کے باعث حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کو وحی پہنچادی۔ کیونکہ اس جواب سے بھی حضرت جبرئیل کی خوش فہمی کچھ اس خوش فہمی سے
 جو غرابیہ کے طور پر دربارہ وحی رسانی ان سے ظہور میں آئی ہے کم نہیں۔

القصد یہ تینوں احتمال اس تفسیر کے ابطال سے مالا مال ہیں۔ ہاں اگر فک پہلے
 سے مملوک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہوتا۔ اور بوجہ غلطی مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے قبضہ میں ہوتا تو البتہ یہ تفسیر باعتبار ظاہر ٹھیک ہو جاتی لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اتنی بات
 کے سنی تو درکنار شیعہ بھی قائل نہیں بلکہ باتفاق شیعہ فک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وآلہ وسلم تھا، پر بعد نزول اس آیت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا
 رضی اللہ عنہا کے حوالہ کر دیا علی ہذا القیاس ذوالقربیٰ کی تفسیر میں جو حضرت زہرا رضی اللہ
 عنہا کا نام ہے اس میں بھی ان تینوں احتمالوں کا بطلان سمجھئے۔

ابن سبیل اور مسکین بھی اسحقاق اور ان سب باتوں کو جانے دیجئے اگر ذوالقربیٰ۔ اور
 میں ذوالقربیٰ کے ہم پلہ ہیں کے معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھے تو لفظ

مسکین اور ابن سبیل بھی اس طرح کے اشکال اور خفاء معنی میں کچھ ذوالقربیٰ اور حقہ
 سے کم نہ تھا۔ علی الخصوص تعین مقدار حق مسکین اور حق ابن سبیل، کہ ان دونوں کا عرف میں
 بھی کوئی قانون نہیں بخلاف قرابتیوں کے کسان کے لینے دیے کا ہر قوم میں ایک دستور بندھا
 ہوتا ہے، پھر کیا وجہ، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوا اقربا کے حقوق کو تو حضرت جبرئیل
 سے پوچھا اور مسکین اور ابن سبیل بچاروں کی بات بھی نہ پوچھی؟ اگر یہ عذر ہے کہ اس روایت

میں نہ سہی کسی اور روایت میں ہوگا تو مسلم لیکن کسی دوسری ہی روایت سے مثل ذالقرنی کے مسکین اور ابن سبیل کے اشخاص معین کیجئے۔ اور تصنیف مقدار حق مسکین اور ابن سبیل بیان فرمائیے اور قطع نظر اس بات کے جناب باری تعالیٰ اس آیت میں ایک ساتھ تینوں کو ذکر فرماتا ہے آیت واعلموا انما غنمتم وغیرہ کے ملاحظہ سے بھی یوں سمجھ میں آتا ہے کہ مسکین اور ابن سبیل استحقاق میں ذالقرنی کے ہم پلہ ہیں، جیسا ان کا دینا ضروری ہے، ویسا ہی ان کا، پھر کیا وجہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذالقرنی کے حق کے ادا کرنے کا توفیق ہوا، اور اس باب میں کجی کا واور تفتیش اور استفسار فرمایا اور دربارہ مسکین اور بیچارہ ذلیل ابن سبیل کچھ لب کشا نہ ہوئے۔؟

باقی رہی روایات طرفین کی جو درباب فضیلت خدمت گذاری مساکین اور ابن سبیل کے وارد ہیں، سو ایسی روایتیں صلہ رحمی کے فضائل میں بھی صدہا مشہور معروف ہیں، اگر مساکین اور ابن سبیل اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا پہلے سے معلوم ہوتا اس قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے تو ذالقرنی اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا معلوم ہونا بھی صلہ رحمی کے فضائل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے مسکین اور ابن سبیل کے باب میں اگر پوچھنے کی حاجت نہ تھی تو یہاں بھی نہ تھی۔ اور اگر احادیث فضائل صلہ رحمی میں یہ احتمال ہے کہ شاید بعد اس آیت کے نزول کے لب مبارک نبوی سے صادر ہوئی ہوں تو یہاں بھی وہی احتمال، نہ انکی کسی کے پاس تاریخ لکھی ہوئی نہ انکی۔

آیت ذالقرنی اگر امدنی ہے | یہ سب رد و کد تو اس صورت میں ہے کہ جیسا تمام امت خاص تو واعلموا کی طرف اشارہ ہے | کہ شیعہ اس آیت کو مکی کہتے ہیں مکی ہی کہیں۔ اور اگر سارے جہان کے برخلاف جیسے مولوی صاحب نے واقدی اور بشیر بن ولید کے حوالہ سے اس آیت کا مدنی کیا بعد خیبر کے نازل ہونا بیان فرمایا ہے۔ ہم بھی اس کے بعد خیبر کی فتح کے قائل ہوں تب ایک بات میں جھگڑا ہو چکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ آیت بعد خیبر کے نازل ہوئی تو آیت واعلموا انما غنمتم پہلے نازل ہوئی ہوگی کیونکہ یہ تقسیم آیت واعلموا میں ہے اسی تقسیم کے موافق فتح خیبر سے پہلے ہمیشہ غنیمتیں تقسیم ہوتی رہیں۔ سو اس صورت میں

کیا حاجت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے پوچھا؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس تقدیر پر آیت آت ذالقرنیٰ حقہ میں تقسیم مذکور کی طرف اشارہ ہوگا، اور چونکہ اس تقدیر پر ذوی القربیٰ اوصیٰ اور مسکین اور ابن سبیل تینوں کے حق سے شرح مشرح معلوم ہو جائے گی، تو جو جو خرابیاں بر تقدیر صحت روایت معلومہ معلوم ہوتی تھیں سب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جائیگا، بہر حال چار طرف وجوہات متعددہ اور قرائن داخلی خارجی اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ روایت محض دروغ اور سراسر بہتان ہے، بالجملہ باعتبار روایت کے توسنیوں کو اس آیت کے غیر معتبر ہونے میں نہ جوئے مل نہیں اور بے تامل یہ سمجھتے ہیں کہ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ مومنو اقربا اور مساکین اور مسافروں سے سلوک کرتے رہو۔ اور اقربا میں سے ہر ایک کے ساتھ درجہ بدرجہ احسان اور محبت اور ادب اور تواضع سے پیش آؤ۔ ماں باپ کے ساتھ ادب اور خدمت گذاری، اور اولاد کے ساتھ محبت اور خبر داری، اور بھائی بند کے ساتھ حسن اخلاق اور مددگاری سے ملتے رہو۔ القصہ علی العموم سب مومنوں کو یہ حکم ہے۔ گو مخاطب فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، نہ یہ کہ فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حضرت فاطمہ زہراؑ کو فقط فدک حوالہ کر کے اس بار حکم سے سبکدوش ہو کر فارع البال ہو جائیں۔

روایت مذکورہ کے وضعی ہونے | باقی رہا بطور قواعد روایت کے اس روایت کا غلط ہونا۔ سوا دل کی دلیل خود عمار علی ہے۔ | تو اس روایت کے غلط ہونے میں اس وجہ سے شک و شبہ نہیں کہ مولوی عمار علی صاحب اس بات کے ناقل ہیں، کہ یہ روایت سنیوں کی معتبر کتابوں میں ہے۔ اس سے زیادہ اس روایت کے غلط ہونے کی اور کیا نشانی ہوگی؟ کیونکہ مولوی صاحب کا صدق مقال اور راستی گفتار در بارہ نقلیات (ان تحریروں سے جو قریب ہی حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ دختران مطہرہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ام کلثومؓ جگر گوشہ حضرت تبول رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدم میں گذریں ہیں بلکہ سوا اس کے اور تحریروں سے بھی) واضح ہو چکا ہے، پھر جب مولوی صاحب روایت میں ایسے امانت دار بھڑے کہ شیعہوں کی ضد میں اپنے علما اور اپنی معتبر کتابوں کو جھوٹ کی طرف نسبت کر دی ہو اور اپنے سب

دین وائین کا اعتبار کھودیا ہو۔ سنیوں کے ذمے ایک بہتان باندھتے ہوئے ان کو کیا اندیشہ رہ گیا۔؟ ایسی باتوں میں یا خدا کا ڈر ہوتا ہے یا دنیا کی شرم ہوتی ہے سو قربان جائیے تقیہ کے اس کے صدقہ سے دونوں کو بخل میں مارا مگر بایں ہمہ منتظروں کے اطمینان خاطر اور ناظرین کے دفع خلعان کے لئے لازم ہے کہ کچھ مفصل بھی بیان کیا جائے تاکہ یہ جو بالا حمال مولوی صاحب کا جھوٹا ہونا ثابت ہوا ہے خوب دل نشیں ہو کر اہل فہم کو اہل سنت کی حقانیت اور شیعوں کا بطلان کا عیان ہو جائے مگر شاید مولوی صاحب کو اپنی اہانت کی شکایت ہو سو ملازمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ التماس ہو کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا کب ہو سکتا ہے؟ آپ کے دین کو تو دروغ ہی سے فروغ ہے سو فروغ کی باتوں میں اگر آپ کی استقامت ہماری تقریر یا تحریر سے ثابت ہو جائے تو ہمارا ممنون احسان ہونا چاہیے۔

فصل کتاب مصنف کتاب کے قابل | بالجمہ مزید اطمینان کے لئے اس باب میں کچھ دل لبریز نوکریر قبول ہونے کی چھ شرطیں | قلم ہے مگر اول بطور تنبیہ یہ گزارش ہے کہ کتابیں آدمیوں ہی کی تصنیف ہوتی ہیں، جیسے آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں جھوٹے سچے معتبر غیر معتبر، فہمیدہ غیر فہمیدہ۔ ایسے ہی کتابیں بھی سب طرح کی ہوتی ہیں۔ ملحدان بے دین نے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے اچھے اچھے بزرگوں کے نام لگا دیئے ہیں۔ اور اس میں اپنے واپسات سینکڑوں بھردیئے ہیں اور جو کتابیں کہ کبرائے اہل سنت کی تصنیف ہیں۔ اس میں سے بھی اکثر ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کی فیض رسانی کے لئے تصنیف نہیں ہوئیں بلکہ بطور بیاض کے جمع کی گئیں، تاکہ نظر ثانی کر کے ان کی روایات کا حال معلوم کریں، اور اتفاق سے نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا یا ہوا اور کسی وجہ سے وہ بیاضیں لوگوں کے ہاتھ پلہ پڑ گئیں۔ اور بعض کتابیں ایسی ہیں کہ وہ بہت کمیاب اور بدرجہ غایت نادر الوجود بلکہ بمنزلہ مفقود ہیں۔ اور وہ ملحدوں اور متبدعوں کے ہاتھ لگ گئیں ہیں انہوں نے اپنی گھڑی ہوئی روایات اس میں داخل کر دیں یا اہل سنت کے مقابلے کے وقت کسی روایت کو ان کتابوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تاکہ اہل سنت خاموش ہو جائیں۔

سواہل تشیع اکثر ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسی ہی کتابوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں اس لئے

اہل حق کو لازم ہے کہ جب کسی شیعہ سے کسی کتاب کا حوالہ سنے تو اول تو یہ دریافت کرے کہ یہ روایت اس کتاب میں ہے کہ نہیں؟ دوسرے اس کتاب کا حال تحقیق کرے کہ معتبر ہے کہ نہیں؟

پہلی شرط اور معتبر ہونے کی یہ صورت ہے کہ کسی کتاب کی روایات کے معتبر ہونے میں چند باتیں ضروری ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کتاب کے مصنف کو تفریح طبائع مخرونہ کے لئے فقط قصہ گوئی اور افسانہ خوانی مد نظر نہ ہو، بلکہ واقعات واقعی کے مشاققوں کی تسکین کے لئے اس کتاب کو تصنیف کیا ہو۔ ورنہ چاہیے کہ بہار دانش اور بوستان خیال کے افسانے، اور چہار درویش اور بکاؤلی کی کہانیاں، اور فسانہ عجائب اور فسانہ غرائب کے طوفان، سب کے سب دستاویز خاص و عام ہو جائیں۔

دوسری شرط دوسرے یہ کہ مصنف کتاب کسی کی روایت اور کسی سے بغض و عداوت نہ رکھتا ہو اور اس کا حفظ اخبار اور صدق گفتار اس درجہ کو مشہور ہو کہ اس کی تحریر کی نسبت کسی کے دل میں شک و شبہ نہ ہو، ورنہ طومار کے طومار اخباروں کے لڑکیوں کی زبانوں میں اپنے بزرگوں کی شجاعت اور ان کے غنیموں کی بزدلی سے مشحون ہوا کرتے ہیں، بالاتفاق مسلم ہو جائیں؟ اور یہ جو زبان و خاص و عام ہو کہ اخباروں کا کیا اعتبار؟ ایک حرف بیجا اور عقیدہ ناسنرا ہو جائے اور شیعہ سنیوں کی، اور سنی شیعوں کی سندیات برسر و چشم رکھنے لگیں اور ہر کس و ناکس کی بات قبول کرنے لگیں، اور یہ فرق قوت و ضعف، حفظ و تفاوت، صدق و کذب، اور علیٰ ہذا القیاس یہ تہمت زور و رعایت، اور کینہ و عداوت، ہرگز قابل لحاظ نہ رہے۔

تیسری شرط تیسرے یہ کہ مصنف کتاب باوجود صدق و دیانت اور حفظ عدالت کے اس فن میں جس فن کی وہ کتاب سے دستگاہ کامل اور ملکہ کما ینبغي رکھتا ہو۔ نہ یہ کہ دین میں مثلاً نیم ملا ہو جس سے خطہ ایمان ہو یا طب میں مثلاً نیم طبیب ہو کہ بیماروں کو خطہ جان ہو۔

چوتھی شرط چوتھے یہ کہ وہ کتاب باوجود شر الطمذکورہ کے قدیم سے مشہور و معروف اور ایسے قسم کے لوگوں کے واسطے سے جو مجموعہ اوصاف مرقومہ ہوں دست بدست ہم تک پہنچی ہو

ورنہ لازم کیا الزم تھا کہ انجیل اور تورات جو کلام ربانی ہیں اور اس خدا کی تصنیف ہیں جو
 بوجہ اتم جامع اوصاف مذکورہ کیا۔ مجموعہ جمیع صفات کمال اور معدن جملہ کمالات
 جلال و جمال ہے۔ اعتبار اور اعتماد میں ہم پلہ قرآن مجید اور فرقان جمیع ہو جائے؟
 پانچویں شرط پانچویں یہ کہ روایت کی کتاب میں اعتبار کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کتاب نے
 اول سے التزام اس بات کا بھی کیا ہو کہ بجز صحیح روایتوں اور محقق حکایتوں کے اور روایتیں
 اپنی کتاب میں درج نہ کروں گا۔ جیسے صحاح ستہ کہ ان کے مصنف نے یہ شرط کر لی ہے کہ بجز
 صحیح روایت کے اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے۔ اسی واسطے ان کتب کا نام صحاح ستہ مشہور
 ہو گیا۔ سو اگر کوئی کتاب کسی کی بیاض ہو کہ اس نے اس میں ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اور
 صحیح غلط حکایتیں اس غرض سے فراہم کر لی ہیں، کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح کو قائم رکھ
 کر باقیوں کو نقل کے وقت حذف کر دوں گا۔ جیسا امام بخاری اور امام مسلم نے کیا یا صحیح کو
 صحیح بتلا کر موضوع یعنی بنائی ہوئی باتوں اور گھڑی ہوئی حکایتوں اور ضعیف وغیرہ کو لکھ کر اس
 کے بعد لکھ جاؤں گا کہ یہ موضوع ہے یا ضعیف ہے مثلاً جیسے امام ترمذی نے کیا۔ لیکن اتفاقات
 تقدیر سے ان کا یہ ارادہ پیش نہ کیا، اور یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی تھی، جی کی جی ہی میں تھی کہ
 اجل نے آدیا، تو ایسی کتاب کی روایات کا ہرگز اعتبار نہ ہو گا۔ ورنہ کونسا مصنف نہیں کہ اس
 نے اول ایک مجموعہ بیاض بطور کلیات کے فراہم نہیں کیا؟ امام بخاری سے بہت سندوں
 منقول ہے کہ انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر بخاری شریف کی حدیثیں نکالیں ہیں
 اور عبد الرزاق بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے کوئی تین دفعہ حدیثوں
 کی بیاض اکٹھی کی تھی۔ چھانٹ کر بخاری شریف کا مسودہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ مضمون بخاری شریف
 مطبوعہ دہلی مطبع احمدی کے مقدمہ کی دوسری اور تیسری فصل میں مندرج ہے۔

بہر حال ایسی بیاضوں کا جمع کرنا ایسے ایسے ائمہ حدیث کی نسبت بھی ثابت ہے سو اگر
 اتفاق سے امام بخاری مثلاً بعد فراہمی بیاض قبل اس کے کہ بخاری شریف کی حدیثیں اس میں
 سے چھانٹ کر بخاری تصنیف کریں، اس دار فانی سے کوچ کر جاتے تو گو وہ بیاض امام بخاری
 ہی کی تصنیف سمجھی جاتی لیکن کوئی بتائے تو کیا وہ قابل اعتبار کے ہو جاتی؟ سب جانتے ہیں کہ

اگر وہ ایسی ہوتی تو امام بخاری کو چھانٹنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس صورت میں خود امام بخاری ہی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میری بیاض قابل اعتبار نہیں، پھر ہم کیونکر فقط اس سبب سے اس کا اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ایسے بڑے محدث امام المحدثین کی تصنیف ہے کہ جہاں میں نہ کوئی ثانی ان کا ہوا ہے نہ ہو۔ غرض اگر کوئی کتاب اس قسم کی کسی کو مل جائے اور اس کے مصنف کو کتنا ہی بڑا محدث کیوں نہ ہو، اس کی تہذیب اور تالیف کا اتفاق نہ ہوا ہو تو وہ کتاب کسی طرح علماء کی اجمال کے نزدیک بھی بے شہادت عقل قابل اطمینان نہیں۔ ہاں مولوی عمار علی صاحب جیسے ماہر فن حدیث کا ذکر نہیں کہ وہ الٹی کے سمجھن ہار ہیں۔ وہ اگر ایسی نامعقول بات کہہ پڑیں چنانچہ ان کا خط ایسی باتوں سے مشحون ہے۔ تو اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہوگا کہ باضات مصدر الی المفعول کسی نے کہا ہے۔ جواب جاہلان باشد خموشی۔ بہر حال یہ نکتہ محفوظ رکھنا چاہیے کہ سبب اس کے ملحوظ نہ رہنے کے اکثر عالم نام سے گرفتارِ دامِ اودھام ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ جاہل،

چھٹی شرط چھٹے یہ کہ اگر چند روایتیں باہم مختلف ہوں اور پھر اختلاف بھی حد تصاد یا تنافس کو پہنچ جائے دونوں کا صحیح ہونا فقط مستبعد ہی نہ ہو تو پھر ترجیح باعتبار قوت سند ہی کے ہوگی ورنہ لازم ہے کہ شیعوں کے نزدیک روایات شیعہ اور روایات اہل سنت جو مخالف روایات شیعہ میں دونوں صحیح ہوں، ایسے ہی کلینی کی یہ روایت کہ کلام اللہ کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔۔۔۔۔ لیکن ماسوا، مندرجہ مصاحف متداولہ کے سب چوری گئیں، اور ابن بابویہ صدوق کی روایت کہ کلام اللہ اتنا ہی تھا جتنا اب ہے، دونوں صحیح ہو جائیں۔ سو سب جانتے ہیں کہ اجتماع نقیضین ارتفاع نقیضین نون محال ہیں بات مقرر ہو چکی، تو گوش گزار اہل انصاف ہو کہ اول تو یہ روایت اور نیز باقی روایتیں جو الزام اہل سنت کے لئے اہل سنت کی کتابوں کے حوالہ سے مولوی عمار علی صاحب نے اپنے رقیبہ میں درج فرمائی ہیں ان کتب میں نہ سمجھنی چاہیے۔ کیونکہ اعتبار کے ساقط ہو جانے کے لئے آدمی کا ایک جھوٹ بھی بہت ہے۔ مولوی صاحب کا دروغ تو امور متعذر میں متحقق ہو چکا۔ چنانچہ ناظرانِ ابحات متعلقہ نکاح حضرت ام کلثوم جگر گوشہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور ملاحظہ کنانِ تقریر سب حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم نبات مطہر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود جانتے ہیں۔ گذارش مکرر کی کچھ حاجت نہیں۔ اگر یاد نہ رہا ہو تو پانچ سات ورق پلٹ کر ملاحظہ فرمائیں معلوم ہو جائے گا کہ جب مولوی عمار علی صاحب نے اپنی کتب مشہورہ معتبرہ کی مرویات سے چشم پوشی کر کے ایک غرض خفیف یعنی سنیوں کی بات کے ہلکا کرنے کے لئے رقیمہ موسومہ میرزا در علی صاحب میں بہت سا کچھ خلاف واقع لکھ دیا، اور پھر جرات کر کے یہ کہہ دیا کہ اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جائے۔ اور یہ خیال نہ فرمایا کہ ہماری صحیح روایتیں غلط ہوئی جاتی ہیں اگر سنیوں کے سر پر بھی ایک طوفان دھردیں تو اس میں تو یہ بھی اندیشہ نہیں اور بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ جن کتابوں کے حوالہ سے یہ روایت درج رقیمہ مولوی صاحب نے خود انہیں کتب کے مصنفوں کی مشہور کتابیں اس روایت کو رد کرتی ہیں چنانچہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ مذکور ہوگا۔

اہل سنت کی کتب میں | اور ستمنا کہ یہ روایتیں سنیوں کی بعض کتابوں میں ملتی ہیں لیکن وہ اہل تشیع کے الحاقات | کتابیں ایسی غیر مشہور ہیں کہ کمیابی میں بیضہ عنقا سے کم نہیں ہنسیوں کو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا حفظ اور ضبط تو درکنار۔ سو اگر یہ روایتیں ان کتابوں میں ہوں بھی تو بیش بریں نیست کہ جیسے بعض سیہ کاران قبیلہ یہود نے منافقانہ نصرانی بن کر انجیل میں بہت سی خرافات خلاف عقل صریح اور مناقض نقل صحیح درج کر دی ہیں، ایسے ہی مقتدیان عبداللہ بن سبا یہودی منافق اعنی حضرات شیعہ بھی کہ یقین تبدیل و تحریف میں کوچک ابدال یہود مردود اور موافق نقل مشہور ”سگ زاد برادر شغال“ تیرہ درونی میں ان کے ہمزنگ اور قسادت قلبی اور سنگدلی میں ان کے ہمزنگ ہیں، قدیم سے درپے تحریف دین احمدی اور سمہ تن مصروف تحریف آئین محمدی علیہ علی آلہ الصلوٰۃ والسلام رہے ہیں اور اہلسنت و جماعت کی جماعت پر دانت پیستے چلے آئے ہیں لیکن بایں وجہ کہ امتیان مسیح علیہ السلام کو نہ حفظ و محافظت انجیل سے کچھ کام تھا۔ اور نہ اس کی تلاوت اور یادداشت میں چنداں اہتمام تھا، یہود مردود کا انجیل پر بھی داؤ چل گیا، چہ جائیکہ دیگر کتب زائد غیر مشہور۔

اہل سنت کا نظام حفاظت لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ایک ایک حرف قرآن پر لکھو کھا سنیوں نے جھوٹے پٹریا باندھ رکھا ہے۔ اور ہر روایت صحاح ستہ وغیرہ کتب صحاح احادیث پر ہزاروں

محدثین بیدار مغز نے تنقیح اور تفتیش اور حفظ و ضبط کی یہ نوبت پہنچا دی کہ کسی طرح بے دین کو
 مجال زیادہ کم کرنے کی باقی نہ رہی، چنانچہ کثرت حفاظ قرآنی اور شیوع محدثین ربانی فرقہ
 اہلسنت میں اس درجہ کو پہنچی ہے کہ ماہ الامتیاز اور ماہ الافتراق اہل سنت اور شیعہ ایک یہ
 بات بھی ہو گئی ہے الغرض اس وجہ سے کتاب اللہ اور صحاح ستہ وغیرہ کتب مشہورہ اہلسنت
 تک تو ان تیرہ درجوں کا دستِ لطاؤل نہ پہنچا۔ گو بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور وعدہ ہائے
 اِنَّا لَهُ لَكَافِطُونَ اور وَاللّٰهُ مُتِمِّمٌ ذُرِّيَّتَہِ نے ان نابکاروں کی سعی بجا کو انجام تک نہ
 پہنچایا۔ لیکن نقل مشہور ہے "اصل بد از خطا خطانہ کند۔" جیسے اس بات سے ہارے تھے جھک مار
 کر چپ ہو رہتے۔ لاچار ہو کر کتب غیر مشہورہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے دل کے پھوپھ لے پھوٹے
 اور بہت سے طوفان الیے جوڑے کہ عوام کیا بعض علماء، سادہ لوح بھی ایک دفعہ کو بچل جائیں
 سو منجملہ ان کے روایات مندرجہ رقمہ مذکور بھی ہیں۔ لیکن بحمد اللہ فرقہ اہلسنت جماعت کہ ایک
 جماعت کمال ہے۔ محققین سے کبھی خالی نہیں رہا، ان کو خداوند کریم جزائے خیر دے وہ لوگ
 ان کی دھوکہ بازیوں کو سمجھ گئے، اور بامدادِ خداوندی انہیں روایات میں سے علامات اور
 امارات کذب و دروغ نکال کر عاقلوں کو متنبہ کر دیا اور عاقلوں کو طریقہ تمیز حق و
 باطل کا بتلا دیا، چنانچہ ان روایات کے ابطال کی تقریر کو دیکھ کر انشاء اللہ یہ دعوے
 مدلل ہو جائے گا۔

القصد دغا بازان شیعہ کی یہ چالاکی کتب غیر مشہورہ میں چل گئی، اسی واسطے علمائے
 اہل سنت ان کتب کو ہمنگ تورات و انجیل سمجھتے ہیں اور ان کی روایات کو معتبر نہیں رکھتے
 ہاں ان کی روایات کو روایاتِ صحاح ستہ و دیگر کتب صحاح مشہورہ پر پیش کر کے جو مطالب
 نکلے اس کو برسرِ چشم رکھتے ہیں، اور جو مخالف نکلے اس کو ملحدانِ بدعت کیش دروغ پیشہ شیعہ
 و خوارج وغیرہ کے سرمارتے ہیں اور جو روایات خلاف و وفاق سے برطرف ہو اگر دلائل عقلیہ کے
 مخالف ہوں تو اس کا بھی یہی حال ہے، ورنہ اگر تکذیب نہیں کرتے تو تصدیق بھی نہیں کرتے۔
 بہر حال جو روایت کہ ان کتب میں بلا شریک غیر بھی پائی جائے اگر روایت صحاح کے مخالفت
 بھی نہ ہو تب بھی قابلِ تمسک اور لائقِ حجت نہیں سمجھتے۔ اور مثل مرویات اہل کتاب بلکہ خود

انجیل و تورات نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

مصنف معتبر ہو تو ضروری نہیں | سو اگر کسی شیعہ کم فہم کو ان کتب کے غیر معتبر ہونے میں اس وجہ سے واثق نہ ہو کہ ان کتب کے مصنف منجملہ مقتدیانِ اہلسنت

ہیں تو کوئی ان سے پوچھے کہ انجیل و تورات کے مصنف تو خود خداوند اکرم الاکرمین ہیں اگر

کامعتبر ہونا موجب اعتبار کتاب ہو جائے تو قرآن تو قرآن انجیل و تورات شیعوں کے نزدیک

معتبر ہو جائیں، ورنہ لازم آئے کہ خود باللہ جناب خداوند تعالیٰ کا شیعوں کے نزدیک کچھ اعتبار

نہ ہو، مگر ہم جانتے ہیں کہ شیعوں کو اس الزام سے کچھ اندیشہ نہیں، کیونکہ وہ اب کون سے

خدا کا اعتبار کرتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا بے اعتباری ہوگی کہ خدا کی رائے اور علم کو قابل

اعتبار نہیں سمجھتے اور بد کے قائل ہو گئے لعنۃ اللہ علیٰ ہذا المذہب۔ بہر حال اہلسنت و

جماعت کتب غیر مشہور غیر متداولہ کو ہرگز قابل اعتقاد نہیں جانتے اور بملاحظہ عداوت اور تجرّبہ

عادت دروغ بزرگوارانِ شیعہ اس سے مطمئن نہیں۔ کہ جیسے انجیل و تورات کو دشمنانِ

دین نے تحریف کر دیا کتب غیر مشہورہ کو ان حضرات نے حسب مطلب بدل دیا ہو،

مصنف تحفہ کی ایک عبارت | اور اگر کوئی سادہ لوح میری اس بات کو کوئی بات اور واہیات

سمجھے، تو بڑوں کی بات تو بڑی ہوتی ہے دیکھئے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو شیعوں

سے بھی زیادہ شیعوں کی عادات اور اصول و فروع مذہب کے واقف ہیں تحفہ اثنا عشریہ

میں باب مکائد شیعہ میں جو دوسرا باب ہے کیا فرماتے ہیں، احتیاطاً بعینہا انھیں کی عبارت

بلاغت آمیز نقل کرتا ہوں۔

کیدسی و دوم آئمہ جمعی کثیر از علماء ایشان سعی بلیغ نموده اند و در کتب اہل سنت

خصوصاً تفاسیر کہ بیشتر در شمال علماء و طلباء مے باشند و بعضی از کتب احادیث کہ شہرہ

ندارد و نسخ آن کتب متعدد بدست می آید، اکاذیب موضوعہ کہ مؤید مذہب شیعہ و مبطل

مذہب سنیان باشد الحاق نمایند چنانچہ قصہ ہبہ فدک در بعض تفاسیر داخل نموده اند

کہ سیاق آن حدیث چنین روایت نموده کہ لَمَّا نَزَلَتْ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ دَعَا

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ وَأَعْطَاهَا فِدَكَ، اما حکم آنکہ

دفع گوارا حافظہ نباشد بیاو شان نماںد کہ این آیت مکی است و در مکہ فدک کجا بود؟ و نیز
 بایستے کہ برائے مساکین و ابن السبیل نیز چیزے وقف می کرد تا عمل بر تمام آیت میسر میشد
 و نیز اعطا فدک کے لالت صریح برہمہ و تملیک نمی کند پس لفظ و بہا بایستے وضع کرد۔ و علی
 ہذا القیاس در تفاسیر و سیر حبستہ جستہ الحاقات ایشان یافتہ میشود، و درین کید ہم اکثر
 مغفلان از علمائے اہل سنت بخط می کنند و تشویش می کشند، و در شہر دہلی در عہد بادشاہ
 محمد شاہ دو کس بودند از امراء این فرقہ کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ و مشکوٰۃ و
 بعض تفاسیر بخط خوش مے نویا نیندند و در آن حدیث مطلب خود از کتب امامیہ بر آورد
 داخل نمودند و آن نسخ را مجرول و مطلقاً و مذہب نمودہ بقیمتہ سہل در گذرے میفرودختند،
 و در اصفہان آغا ابراہیم ابن علی شاہ کہ یکے از امراء کبار سلاطین صفویہ بود، ہمیں اسلوب
 غفل کردہ، لیکن بایں کید ایشان حاصل نشد، زیرا کہ کتب مشہورہ اہلسنت بچہ کمال شہرت
 و کثرت نسخ قابل تحریف نیستند و کتب غیر مشہورہ را اعتبارے نہ، و لهذا محققین اہلسنت
 از کتب غیر مشہورہ نقل را جائز نداشتہ اند، مگر در ترغیب و ترہیب، و در حکم صحائف
 انبیاء پیشین می شمارند کہ پیچ عقیدہ و عمل رازان اخذ نتوان کرد بچہ احتمال
 تحریف انتہی، کلامہ الشریف۔

ترجمہ۔ بتیسواں مکہ۔ ان کے علماء کے بڑے گروہ نے بے حد کوشش کی ہے کہ کتب
 اہل سنت میں (خصوصاً تفاسیر میں) جو ان کے طلباء و علماء کی دستمال نبی رہتی ہیں، اور
 بعض کتب احادیث میں جو غیر مشہور ہیں اور ان کے متعدد نسخے ہاتھ نہیں لگتے، خود ساختہ ایسے
 بڑے جھوٹ شامل کر دیں جو شیعہ مذہب کی تائید کریں اور مذہب اہل سنت کی جڑ کاٹ
 دیں چنانچہ مکہ فدک کا قصہ بعض تفاسیر میں داخل کر کے یوں روایت لاتے ہیں کہ جب
 آیت **وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّہٗ** نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ
 کو بلایا اور ان کو فدک عطا فرمایا۔ لیکن موافق مثل مشہور۔ ”جھوٹے کی یادداشت نہیں
 ہوتی“ ان کو یہ یاد نہ رہا کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں فدک کہاں تھا؟ اور یہ بھی تو چاہیئے
 تھا کہ آپ ابن سبیل اور مساکین کے لئے بھی کچھ وقف کرتے تاکہ پوری آیت پر عمل ہو جا۔

نیز اَعْطَا فِدْلُکُ یہ الفاظ ہبہ و تملیک پر صریح دلالت بھی نہیں کرتے وہبہا کا لفظ گھڑنا چاہیے تھا۔ الغرض اس جیسی کئی مثالیں تفسیرات اور کتب سیرت میں پائی جاتی ہیں۔ اور اس چال میں کئی سیدھے سادھے علمائے اہل سنت بھی چکرا جاتے ہیں، شہر دہلی میں محمد شاہ کے عہد میں دو آدمی جو فرقہ شیعہ کے امراء میں سے تھے، اہلسنت کی کتابیں مثل صحاح ستہ مشکوٰۃ اور بعض تفسیریں خوشخط لکھتے۔ اور ان میں کتب شیعہ ایسی روایتیں داخل کر دیتے جو ان کے مطلب کی ہوتیں، پھر ان کی اعلیٰ جلد بندی، جس پر سونے چاندی کا کام بنا ہوا ہوتا کہہ کر کے سستے داموں کسی راہ گذر میں فروخت کر دیتے۔ اسی طرح اصفہان میں آغا ابراہیم ابن علی شاہ جو سلاطین صفویہ کے بڑے امراء میں سے تھے۔ یہی چال چلتا تھا۔ لیکن اس مکر سے ان کو کچھ حاصل نہ ہوا، کیونکہ اہل سنت کی مشہور کتابیں بے حد شہرت اور کثرت تعداد کی وجہ تحریف اور تبدیل کو قبول نہیں کرتیں اور غیر مشہور کتابیں ان کے ہاں معتبری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے کتب غیر مشہور سے سند لانے کو جائز نہیں رکھا رسولؐ نے ترغیب و ترہیب کے، بلکہ ان کو صحف انبیاء جیسا سمجھا ہے، جن پر حقیقہ و عمل کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ کلام مبارک ختم ہوا۔ ترجمہ از ناشر۔

عمار علی نے بعض کتب شیعہ | اگر ہم بیاس خاطر مولوی عمار علی صاحب اور بھی حشیم پوشی کریں بھی اہل سنت کی طرف مسوب کہیں اور ان کے اور ان کے بزرگواروں کے ذمہ اس بات کی نسبت نہ کریں کہ انہوں نے اپنے مطلب کے موافق بعضی روایتیں سنٹیوں کی غیر مشہور کتابوں میں رلامطامی میں اتب بھی مولوی عمار علی صاحب کی بات کا پتہ معلوم، کیونکہ جن کتابوں کا حوالہ مولوی صاحب نے درج رقمہ کریمہ فرمایا ہے۔ ان میں بعضی کتابیں تو ایسی ہیں کہ سنیوں میں کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا اور نہ ان کے مصنفوں کا اہل سنت میں سے کوئی نام نشان جانے، مثل تاریخ آل عباس کہ علماء سنت نے اس کتاب کو شاید کبھی سنا بھی نہ ہو بلکہ اس قسم کی کتابیں جیسے شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے۔

» گید بست و یکم آنکہ کتابے رانست کنند یکے از کبرا اہل سنت دوران مطاعن صحابہ و مبطلات مذہب اہلسنت درج نمایند الے آخرہ «

ترجمہ۔ از ناشر۔ اکیسواں مکر۔ کسی کتاب کو اکابر علمائے اہلسنت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں پھر اس میں مطاعن صحابہ اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایتیں گھر کر داخل کر دیتے ہیں۔ سو اگر یہ کتاب موجود بھی ہو تب کسی شیعہ مکار کی ہوگی اور بعضی کتابیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مصنفوں کو فن حدیث اور فن تاریخ میں دست بگاہ کامل اور تیز صبح و غلط ہرگز نہ تھی، جیسے معارج النبوة، ہال مدارج النبوة کا حوالہ اگر زیب رفیمہ ہوتا تو ہمارے برسر چشم تھا۔ لیکن ایسی معتبر کتاب میں سے مولوی صاحب کے ہاتھوں میں کیا آتا۔؟

علامہ سیوطی کی تصانیف پر اور بعضی کتابیں ایسی ہیں کہ ہر چند ان کے مصنف فن حدیث میں مصنف کتاب کی رائے جہارت کامل اور مشتق کما ینبغی اور تبحر وافر رکھتے تھے، جیسے شیخ

جلال الدین سیوطی وغیرہ، لیکن انہوں نے اپنی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب کے رفیمہ میں مندرج ہے یہ التزام نہیں کیا کہ بجز روایات صحیحہ اور کچھ داخل نہ کریں گے بلکہ رطب و یابس بطور بیاض کے جمع کر لیا ہے، جیسے جمع الجوامع، کہ اس کا نام ہی اس بات پر شاہد ہے اور نیز اس کا حال شہرہ علمائے آفاق ہے، یا بغرض تفریق و تمیز صحیح و غلط جمع کیا، جیسے تفسیر در منثور اور علی ہذا القیاس موضوعات ابن جوزی۔ کہ ان دونوں کتابوں میں اگرچہ ہر قسم کی مخالف موافق روایتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان روایتوں کے ساتھ اس میں یہ بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے کہ یہ روایات غلط ہیں اور یہ اس واسطے کیا، کہ کل کو مولوی عمار علی صاحب جیسے مکار دغا باز ان روایتوں کے بھروسے کسی سادہ لوح کو دھوکا نہ دے بیٹھیں۔ اور اسی غرض کے لئے متقدمین محدثین بھی ایسا کرتے ہیں، چنانچہ امام ترمذی اور امام ابو داؤد اکثر جگہ لکھ جاتے ہیں ہذا حدیث ضعیف۔

اور بعضی کتابیں ایسی کمیاب ہیں۔ کہ اگر مولوی عمار علی صاحب یوں فرمانے لگیں کہ اس کی تمام روایتیں ہو بہو مطابق مذہب شیعہ اور اصول و فروع شیعہ تمام ہمارے اس کی روایات کے مطابق ہے تو بوجہ کیا بی ان کتب کے مولوی صاحب کی کسی سے زبان نہ پکڑی جائے، سچا تو خدا سے ڈرے جھوٹے کو کس کا ڈر، اس کی زبان کو لگام بھی نہیں ہوتی مگر خبنا کچھ اس خط میں مولوی صاحب نے کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں، اور انہوں نے کیا کیا، یہ

مکاریاں اور دغا بازیاں تو میراث بزرگواران شیعہ سے چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ العزیز رقم فرماتے ہیں۔

و کید لبست و دروم آنکہ مطاعن صحابہ و مبطلات مذہب اہلسنت از کتب نادر الوجود کیاب ایشان نقل نمایند حالانکہ در آن کتب اثرے ازان بنات شد و بسبب آنکہ آن کتب پیش ہر کس و در ہر وقت و ہر مکان موجود نمیشود اکثر ناظران در شبہ و شک افتند بخاطر نشان رسد کہ اگر ایں نقل صحیح باشد تطبیق در میان او و دیگر روایات اہل سنت چہ قسم خواهد بود۔ حالانکہ ایں بیچارہ باعث درد سر می کشند و نمی فهمند کہ اگر بالفرض نقل صحیح ہم باشد محتاج تبطیق و تفتی خواہیم باشد کہ ہر دو روایت در یک رد باشند از شہت و صحت ماخذ و صراحت دلالت و کمیت رواۃ و چون ایں امور در ان نقل مخفی مستور است مقابل روایات مشہورہ صحیحہ الماخذ صریحہ الدلالت چہ باید کرد و کتابہائے کہ ازان فرقہ شیعہ برائے الزام اہلسنت نقل می کنند ہمہ از ایں قبیل است کہ نادر الوجود کیاب میباشد و علی تقدیر الوجدان مصنف آن کتب التزام صحت جمیع ما فیہانہ کردہ اند بلکہ بطریق بیاض و یالیں در آن جمع نمودہ محتاج نظر ثانی گذاشتہ اند از روایتی صاحب کشف الغمہ و چلی صاحب الیقین از ہمیں قبیل دفتر دفتر نقل کنند و بزعم خود گوئے از میدان مناظرہ بزد و ابن طاؤس نیز در مؤلفات خود از ہمیں جنس خمر و ہار پر کردہ و با اعتقاد خود اہلسنت را الزام دادہ انتہی کلامہ الشریف “

ترجمہ از ناشر۔ بائیسواں مکر۔ یہ ہے کہ اہلسنت کی نادر الوجود کیاب کتابوں سے صحابہ کی اہانت کرنے والی اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایات نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کتابوں میں ایسی روایات کا نام نشان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ ہر جگہ ہر وقت ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتیں لہذا اکثر سننے دیکھنے والے شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل میں یہ آتا ہے کہ اگر یہ نقل صحیح ہوئی تو اس میں اور دیگر روایات اہل سنت میں مطابقت کس طرح ہوگی حالانکہ (یہ بیچارے مفت پریشان ہوتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے) اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو تطبیق کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب دونوں روایتیں شہت و صحت ماخذ و صراحت دلالت و عدد رواۃ وغیرہ میں برابر ہوں اور جب یہ باتیں اس مخفی روایت

کے بارے میں معلوم ہی نہیں۔ تو روایات مشہورہ صحیحۃ الماخذ و صریحۃ الدلائل کا مقابلہ
کیسے کر سکتی ہے اور وہ کتابیں جن سے اہل شیعہ اہل سنت کو التزام دینے کے لئے روایات
نقل کرتے ہیں وہ ایسی ہی ہیں جو ہاتھ نہ آنے والی اور کیاب ہوں۔ اور اگر ملیں بھی تو ایسی
ایسی ہوتی ہیں کہ مصنف نے ان میں مندرجہ تمام روایات کی صحت کا التزام نہیں کیا ہوتا۔ بلکہ
بطریق بیاض رطب و یابس اس میں جمع کر کے نظر ثانی کے لائق چھوڑا ہوتا ہے۔ اردو میں صاحب
کشف الغمہ اور چلی صاحب التیقین اس قسم کی روایتوں کے دفتروں کے دفتر نقل کر کے
اپنے خیال میں گویا میدان مناظرہ میں جیت جاتے ہیں اور ابن طاووس نے بھی اپنی مؤلفات
اسی طرح کی دھوکہ باز یوں سے بھر رکھی ہیں اور بزرگم خود اہل سنت کو بڑے بڑے التزام دے دیتے ہیں
بہر حال جب ان بزرگواروں کی ایسی ایسی بزرگیاں تجربہ معلوم ہو چکی ہوں،
تو پھر کتب کیاب کے حوالہ کا کیا اعتبار رہ گیا؟ اول تو یہی یقین کرنا چاہیے کہ ان کتب میں
اصل سے ان روایات کا نام و نشان بھی نہیں اور اگر اس پر تسکین نہ ہو تو بالفرض اگر ایسی
روایتیں ان کتب میں ملیں بھی تو وہ انہیں کذابوں کی تراشی ہوئی ہیں۔ پھر تفسیر اکثر یہ کتابیں
بطور بیاض کے مجموعہ رطب و یابس ہیں ان کے مصنفوں کو نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا۔ جو مختصر
کر کے صحیح صحیح روایتیں جدا کر کے باقیوں کو حذف کر دیتے، یا لکھ جاتے کہ یہ روایتیں
موضوع ہیں یا ضعیف ہیں۔

واقعی کے بارے میں ائمہ محدثین کی رائے | معتمد مولوی صاحب نے بعض ایسی کتابوں کا حوالہ لکھ
دیا ہے کہ نہ ان کتابوں کو کوئی جانے نہ اس کے مصنف کو کوئی پہچانے، جیسے تاریخ آل
عباس، پھر جرات تو۔ دیکھو کس دلیری سے کہتے ہیں کہ تاریخ آل عباس اہلسنت کی معتبر
کتابوں میں سے ہے پھر تفسیر اس کتاب میں یہ روایت بھی ہے تو واقعی کی روایت سے جن
کی جھوٹی تو جھوٹی سچی بات بھی جھوٹی ہی سمجھی جاتی ہے ان کی تعریف میں جو کچھ محدثین نے
لکھا ہے دیکھنے پیش نظر کرتا ہوں، مجمع البحار میں امام نسائی کے حوالہ سے جو فن حدیث میں
امام ہیں اور ان کی کتاب منجملہ صحاح ستہ ہے یوں لکھا ہے کہ امام نسائی نے فرمایا ہے
کہ ایسے کذاب جو حدیثوں کے بنانے میں معروف ہیں، چار ہیں۔ ابن ابی یحییٰ مدنیہ میں

واقعی بغداد میں، مقاتل بن الیمان خراسان میں، محمد بن سعید مصلوب شام میں، اور پھر زید نے شرح الشفاء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ واقعی کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔ بعد ازاں امام شافعی کا قول واقعی کی شان میں مقاصد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ واقعی کی کتابیں جھوٹی ہیں۔ اب مولوی صاحب انصاف فرمیں کہ جب تاریخ آل عباس کا تو یہ حال ہو کہ علماء اہل سنت میں سے کوئی اسے جانتا ہی نہیں اور پھر ان کے راوی ایسے نور علی نور، وزیر برے چناں شہر یارے جن ہیں، تو پھر اہلسنت کیونکر ان روایات پر اعتماد کریں اگر شیعوں کی طرح سنیوں کے دین کا جھوٹ پر دار و مدار ہوتا تو البتہ مضائقہ نہ تھا، سو ایسی کتابوں کا ناواقفان اہلسنت کے سامنے حوالہ دینا کمال بددیانتی اور دغا بازی اور بیجانی کی بات ہے، اہل فہم پر مثل آفتاب روشن ہے، کہ یہ کتاب اگر ہے بھی، تو کسی شیعہ دغا باز کی تصنیف ہے۔

غلام علی کی تاریخ دانی پر اس دغا کا حوصلہ مولوی صاحب کا تو معلوم نہیں ہوتا ہاں البتہ کسی پرانے ابلیس طینت کی کڑوتوت ہے، ورنہ اس استعداد اور اس سلیقہ پر کہ مامون عباسی کے نام پر لفظ رشید بھی بڑھا دیا، یہ فتنہ گرمی ممکن معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ عیب کرنے کو ہنر چاہیئے۔

فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا : ستمگر ایک تیرانا زہے سائے زمانے کا سبحان اللہ مولوی صاحب کو اس تبصر اور اس علم و فضل پر کہ اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ ملقب بر رشید ہارون تھا یا مامون تھا؟ دربارہ غصب فدک یہ یقین ہو گیا ہے کہ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا شاید اب تک آپ کو اتنا یقین نہ ہو؟ اور تنہائی میں سنیوں پر یہ جوش و خروش ہے کہ جامہ سے باہر نکلے جاتے ہیں۔

فدک فحی تھا موہب مملوک نہ تھا کوئی مولوی صاحب کو تھا تو ہم مولوی صاحب کو سارے مراتب سمجھا کر اتنا اور سمجھائیں کہ اگر ہم ان سب مراتب سے درگزر کریں تو ہمیں ابھی اور بہت گنجائش باقی ہے کیونکہ اول تو آیت مَا آتَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ جو سورہ حشر میں واقع ہے اس بات پر شاہد ہے کہ قریہ فدک ہو یا غیر، بالاتفاق از قسم فحی تھا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم ہی نہ تھا چنانچہ الشاہد اللہ بحت میراث میں جو حدیث لاخوڑت مآثر کتہ صدقہ سے متعلق ہے معلوم ہو جائے گا یہ ہبہ ہونے کی کونسی صورت ہے جو روایت ہبہ فدک کو صحیح سمجھئے؟ بلکہ بالیقین غلط ہوگی کیونکہ اس صورت میں روایت ہبہ کلام اللہ کی مخالف ہوگی اور جو روایت کہ کلام اللہ کے مخالف ہو وہ بالاجماع بالیقین غلط ہے، مہذا مشہور کتابوں میں جو تمام علماء کی دستمال رہتی ہیں اور اعتبار میں قریب قریب کلام اللہ کے ہیں، وہ روایتیں موجود ہیں کہ وہ فدک کے ہبہ نہ ہونے پر ایسی واضح دلالت کرتی ہیں کہ مولوی صاحب نے جو روایتیں اپنے صحیفہ میں درج فرمائی ہیں وہ فدک کے ہبہ ہونے پر اتنی دلالت نہیں کرتی، سو ان روایتوں کی شہرت اور صحت اور صراحت دلالت کو چھوڑ کر ایسا کون مادا ہو گا کہ مولوی صاحب کے ان بیانات پر کان لگائے گا۔ اور سوائے مولوی صاحب کے ایسا کون ہے کہ ان افسانہ ہائے بے سند پر تکیہ جائے گا اگر باور نہ ہو تو ملاحظہ فرمائیے۔

فدک کے مختلف تاریخی دور مشکوٰۃ شریف جو اشہر کتب اہلسنت ہے اس میں یہ روایت موجود ہے۔ ابو داؤد کی روایت سے حضرت مغیرہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ جب عمر بن عبد العزیز بن عمر بن مروان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مروانیوں کو جمع کیا اور کہا کہ

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهُ فِدَاكَ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيُعَوِّدُ مِنْهَا عَلَى صَغِيرِ بَنِي هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا أَيْمَهُمْ وَإِنَّ فَاطِمَةَ سَأَلَتْهُ أَنْ يُجْعَلَ لَهَا فَاكِى فَكَانَتْ فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى مَضَى بِسَبِيلِهِ فَلَمَّا أَنْ وَلِيَّ أَبُو بَكْرٍ عَمَلَ بِهَا بِمَا عَمَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَيَاتِهِ حَتَّى مَضَى بِسَبِيلِهِ فَلَمَّا أَنْ وَلِيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَمَلَ فِيهَا بِمَا عَمَلَ حَتَّى مَضَى بِسَبِيلِهِ ثُمَّ أَقْطَعَهَا مَرْوَانَ ثُمَّ مَارَتِ الْعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَرَأَيْتُ أَمْرًا مَنَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِي بِحَقِّ وَائِي أَشْهَدُكُمْ أَنِّي رَدَدْتُهَا عَلَى مَا كَانَتْ، يَعْنِي عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَأَبَى بَكْرٍ وَعُمَرَ

حاصل اس کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا۔ سو اس میں سے خرچ کیا کرتے تھے، اور دیتے رہتے تھے بنی ہاشم میں کے یتیموں کو اور بے شوہر عورتوں کے نکاح اس مال میں سے کر دیا کرتے تھے، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یہ درخواست کی کہ فدک حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو عنایت فرمائیں اور سہہ کر دیں، سو آپ نے اس بات سے انکار فرمایا اور بدستور مذکور اسی طرح آپ اس میں سے تادم واپس خرچ مذکور نہایتے رہے، یہاں تک کہ آپ اس عالم سے لشرف لے گئے، بعد میں جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی جیتے جی یہی عمل کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ بھی واصل بحق ہوئے، پھر جب حضرت عمروالی ہوئے تو وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کے موافق عمل کرتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی چل دیئے، پھر جب مروان کا (یعنی اپنے وقت میں) قابو چڑھا تو اس نے اسے اپنی جاگیر کر لیا پھر رفتہ رفتہ مجھ تک نوبت پہنچی اور یہ چیز میرے قبضہ میں آئی، سو میری رائے میں یوں آتا ہے کہ جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو نہ دی ہو مجھے سزاوارہ نہیں اور میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ میں نے فدک کو اسی امتلاز پر کر دیا۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تھا۔ فقط،

یہاں تک، حاصل مطلب روایت تھا اب اول تو عرض یہ ہے کہ اس روایت میں جو بعد حضرت عمر کے ذکر کے مروان کی جاگیر بنا لینے کا ذکر ہے تو مولوی صاحب یا کوئی ان کا ہم رنگ ہمسنگ یہ نہ سمجھ جائے کہ حضرت عمر کے بعد متصل ہی فدک پر اس کا قبض و تصرف ہو گیا تھا، بلکہ یہاں قصہ کو مختصر کر کے یوں کہہ دیا ہے کہ انجام کار مروان کے قبض و تصرف میں آگیا، ورنہ باتفاق اہل تواریخ حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی بدستور سابق ہی رہا، اور قصہ کے مختصر کرنے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اول تو لفظ اقطعہا اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ یہ کام اس نے اپنی خلافت میں کیا چنانچہ عربی دان جانتے ہیں کہ اقطاع کے معنے جاگیر کر دینے کے ہیں، سو جاگیر کر دینے کا اختیار بجز خلیفہ اور کسی کو نہیں ہوتا، دوسرے

اگر قصہ مختصر نہ ہو تو یہ معنی ہوں کہ بعد حضرت عمر کے متصل ہی مردان قابض ہو گیا، اور علی الاتصال قابض رہا اور پھر بعد اس کے متصل ہی حضرت عمر بن عبد العزیز کے قبض و تصرف میں آ گیا۔

سو واقفانِ فن تاریخ پر روشن ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، بعد حضرت عمر کے حضرت عثمان کے اختیار میں تھا اور ان کے بعد باتفاق شیعہ و سنی حضرت علی کے اختیار میں تھا، پھر جب کبھی مروان کا زمانہ ہوا تو البتہ اس نے اس کو اپنی جاگیر کر لیا، پھر اس کے مرنے کے بعد کئی خلیفہ ہوئے ان کے بعد کہیں حضرت عمر بن عبد العزیز کی نوبت آئی۔ اور یہ قصہ کا مختصر کرنا کلام اللہ میں بیسیوں جگہ موجود ہے حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف کے قصہ کو ملاحظہ فرما دیجیے۔ بہر حال قصہ مختصر یہ ہے باجماع اہل سیر و تواریخ و علمائے حدیث ثابت اور متحقق ہے کہ فدک وغیرہ متروکہ بنوی حضرت عمر کی خلافت میں حضرت علی اور حضرت عباس کے قبضہ میں تھا، پھر حضرت علی ہی کا قبضہ رہا، حضرت عباس کا دخل اٹھ گیا حضرت علی کے بعد حضرت حسن حضرت حسن کے بعد حضرت امام حسین پھر امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن کا قبضہ رہا، اس کے بعد زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا قبضہ رہا رضی اللہ عنہم اجمعین، یہاں تک تو اس کا جمع خرچ بدستور قدیم رہا ان سب کے بعد مروان کے بچوں میں پھنس گیا یہاں تک کہ نوبت حضرت عمر بن عبد العزیز کی آئی، انہوں نے بہ سبب کمالِ عدل کے پھر بدستور قدیم کر دیا،

جب یہ گزارش ہو چکی تو اب یہ التماس ہے کہ مشکوٰۃ و شہرہ آفاق ہی ہے۔
ابوداؤد صحاح ستہ میں سے ہے توجہ روایت کہ ایسی کتابوں میں ہو اس کی صحت اور شہرت کو خیال کرنا چاہیے کہ کس قدر اور کس مرتبہ کی ہوگی۔ معہذا یہ روایت کتنی صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تادم و الیس فی ذک جناب سرور کائنات علیہ و آلہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات کے قبضہ میں رہا، اور باوجود استدعا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے آپ نے ان کو فریک عنایت فرمایا بلکہ جیسے حکیم تیمار دار بیمار سے ان چیزوں کے دینے سے انکار کیا کرتا ہے جو اس کو خلل کریں، ایسے ہی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاۃ البیت

سے فدک کے دینے سے جو مال دنیا تھا انکار فرمایا۔ (اور کیونکر انکار نہ فرمائیں آیت
 إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔
 جس کا یہ حاصل ہو کہ »اللہ کا ارادہ اے اہلبیت یوں ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تم کو
 خوب پاک کر دے« اس مال دنیا ہی کی طلبگاری کے مقدمہ میں نازل ہوئی ہے)

ہبہ اور عطاء میں فرق | بہر حال یہ روایت فدک کے ہبہ نہ ہونے پر مثل آفتاب روشن
 دلالت کرتی ہے، اور وہ روایت جو بزعم شیعہ دستاویز ہبہ ہے، ہبہ کے ہونے پر صراحتاً
 دلالت نہیں کرتی کیونکہ عربی کی روایت میں جس کا ترجمہ مولوی صاحب نے زیب رقم فرمایا ہے
 لَفْظاً عَطَاكَ هَآءِ سَوِيہ لَفْظِ عَامِ هَآءِ ہبہ میں بھی بولا جاتا ہے اور عاریت میں بھی استعمال
 کرتے ہیں سب موافقت نہیں، دونوں مواقع میں بلا تفاوت بولتے ہیں، اور بڑی دلیل
 اس کے عموم کی ہے کہ اعطاء کا ترجمہ ہندی زبان میں دینا ہے۔ سو سب جانتے ہیں کہ بسا
 اوقات عاریتاً کو کہا کرتے ہیں کہ فلا نے شخص کو دی ہے یا دے رکھی ہے، القصہ لفظ اعطاء
 سے ہبہ ثابت نہیں ہو سکتا، سواب روایت مشکوٰۃ کو تو ایک طرف دھریے اور اس روایت
 کو جو مولوی صاحب نے درج صحیفہ شریفہ فرمائی ہے، ایک طرف رکھے، اور پھر اسکی صحت
 اور شہرت اور صراحت دلالت کو اس روایت کے ضعف اور اخفاء اور عدم دلالت مقصود سے
 موازنہ فرمائیے اور پھر فرمائیے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟ سو اگر مولوی صاحب عقل کو کار فرمائیے
 تو بیشک اس بات کو تسلیم فرمائیں گے کہ واقعی قابل اطمینان اور لائق اعتماد روایت مشکوٰۃ
 ہی ہے۔ اس روایت مندرجہ مشکوٰۃ سے صاف واضح ہو گیا کہ اگر بفرض محال روایت ہبہ فدک
 کتب مذکور میں ہو بھی اور یہ کتابیں بھی سب کی سب ایسے لوگوں کی تصنیف ہوں جو موصوف
 بشرائط اعتبار روایت یعنی صدق و صلاح و فہم و فراست و حفظ و دیانت ہوں اور پھر اس
 کے بعد اعطاء سے مراد بھی ہبہ ہی ہو تو بیش برین نیست کہ ان کتب کے مصنفوں نے یہ
 کتابیں بطور بیاض کے اکھٹی کر لی تھیں، اور رطب و یابس غلط صحیح سب ان میں جمع کر لیا تھا،
 تاکہ بعد ان فراغ جمع نظر ثانی کر کے تلخیص کر نیگے۔ چنانچہ سب مصنفین کرتے ہیں لیکن اتفاقاً
 تقدیر سے ان کی عمر نے وفات کی یا فرصت نہ ملی سو اس لئے بہت سی روایتیں شیعہوں کی بنائی

ہوئی ان کی کتب میں درج ہو گئیں اور کم فہم اپنی غلطی فہم سے ان روایات کو اکابر محدثین کی تصنیفات میں دیکھ کر بچل گئے

اہل شیعہ کی مستندات رطب | چنانچہ شاہد اس کا موجود ہے شاہ عبدالعزیز صاحب جو عمدة المحدثین
دیال بس سے زیادہ نہیں | اور زبدۃ الموضحین ہیں تحفہ میں رقم فرماتے ہیں کہ صاحب
جامع الاصول نے نقل کیا ہے کہ خطیب نے جو متاخرین محدثین اہلسنت سے ہے شریف
مرتضیٰ سے جو اجلہ علمائے شیعہ میں سے ہے اور علامہ رضی شیعہ مذہب کا بھائی ہے شیعوں
کی حدیثیں اسی غرض سے نقل کیں کہ بعد جمع و تالیف کے ان میں نظر کرے کہ ان کی کچھ
اصل بھی ہے کہ نہیں، اور اس سے اول شاہ صاحب عمدة المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب
ہی رقم فرماتے ہیں کہ جو محدثین کہ فرقہ اہلسنت میں آخر میں پیدا ہوئے ہیں انہوں نے جو
دیکھا کہ پہلے محدث روایات صحیحہ اور حسنہ کو تو خوب ضبط کر گئے ہیں اور ان میں سعی کی گنجائش
نہیں، تو وہ ایسی حدیثوں کی طرف جن کی سندیں ضعیف ہیں یا وہ جھوٹی بنائی ہوئی ہیں
یا غلطی سے کسی حدیث کی سند کسی متن کے ساتھ لگ گئی ہے، ایسے متوجہ ہوئے ہر ایک سب
کو بطور بیاض کے ایک جافراہم کر کے نظر ثانی کریں، اور موضوعات کو حسان وغیرہ سے جدا
کر دیں۔ لیکن بسبب کوتاہی عمر اور قلت فرصت کے یہ ہم ان سے تمام نہ ہو سکی، مگر جو محدث
کہ ان کے بھی بعد پیدا ہوئے انہوں نے ان کی بیاضوں کی حدیثوں میں باہم امتیاز کر لیا چنانچہ
ابن جوزی نے جس کا حوالہ مولوی صاحب بھی اپنے رقیہ میں رقم فرماتے ہیں
موضوعات کو جدا کر دیا۔ اور اس کے مقابل میں حسان لغیرہ کو مقاصد حسنہ میں
جدا لکھ دیا۔ اور ایسے ہی سیوطی نے تفسیر درغشور میں کیا، اور خود ان محدثوں
نے اپنی کتابوں کے مقدمہ میں جو بطور بیاض کے ہیں اس غرض کو کھول
کر لکھ دیا ہے انتہی۔

اہلسنت نے جو روایات بغرض تردید نقل | اس نقل سے ہر کس و ناکس سمجھ جائے گا کہ جن کتب
کی ہیں شیعہ انکو سند بناتے ہیں۔ | کا حوالہ مولوی صاحب نے اپنے خط میں درج کیا
ہے وہ اکثر ایسی ہیں کہ ایسی ایسی روایتوں کے رد کرنے اور حقیقت حال کے بتلانے

کے واسطے جمع کی گئیں تھیں جن روایتوں کو مولوی عمار علی صاحب اور ان کے پیشوا گاتے پھرتے ہیں لیکن اتفاقات سے ان کے مصنفوں کو اجل نے آدیا، اور بعض ایسی کتابیں ہیں، جیسے تفسیر نور منشور اور کتاب ابن جوزی، کہ ان میں اگر ایسی روایتیں ہیں بھی جن سے شیعہ تمسک کرتے ہیں تو وہ اس طور پر ہیں جیسے تحفہ اور منتہی الکلام اور مواقع وغیرہ میں ہبہ فدک کی روایت مندرج ہے، تو ایسا کون ہے جو یہ نہیں جانتا کہ تحفہ میں اس روایت کو لکھ کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ روایت بنائی ہوئی ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب بڑے چوکے کہ تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ تصنیفات مولانا حیدر علی کا نام نہیں لکھا، اس میں دو فائدہ تھے ایک تو کتابوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی، جس سے ہر کسی کے ایک دفعہ کو کان کھڑے ہو جاتے دوسرے عوام اور جہال اہل سنت شاہ عبدالعزیز اور مولوی حیدر علی صاحب کو جس قدر جانتے ہیں۔ اتنا متقدمین کو نہیں جانتے، اور پھر تسپر یہ مشہور ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے رد ورفض پر کمر حسیٹ باندھ رکھی ہے، سو اگر ان صاحبوں کا نام بھی ہوتا، تو چنداں جھوٹ بھی نہ تھا اور عوام کو ایک بار تو یہ وہم ہو ہی جاتا کہ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نے باوجود شہرہ علم و فضل و تحرفن حدیث و با اینہم صرف ہمت و بارہ رد ورفض اس روایت کو اپنی کتاب میں درج کر دیا، تو ہونہ ہو یہ روایت صحیح ہی ہوگی، مگر شاید یہ اندیشہ ہوا ہو کہ یہ کتابیں فارسی زبان میں اور پھر کشمیر الوجود اور فارسی خوان بکثرت مبادا قلعی کھل جائے۔

یہ حال زوف ہے اس دنیاداری پر اور اس پر ہنر گاری پر، اگر شیوہ دغا بازی اختیار ہی کرنا تھا تو اس کے لئے بھی دنیا جیف تھی۔ دین کو کیوں بٹہ لگایا، اور دین احمدی کو خراب کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر بھی خیر گزری کہ آپ نے سنیتوں کے دغا دینے کا ارادہ کیا، جو ایسے ایسوں کو لا حول میں اڑا دیتے ہیں، اور ایسے ویسے دام میں نہیں آتے۔ لیکن شیعوں کی خیر نظر نہیں آتی، کیونکہ جب ان کے ایسے مقتدا کا دغا چلا ہے۔ کہ یہ تمیز باقی نہیں رہی کہ فلاں روایت فلاں کتاب میں کس غرض سے بیان کی ہے

آیا بطور رد کے یا بطور اعتبار کے اور اعتقاد کے، تو لاجرم عنقریب ہی مولوی صاحب اس بات کو تشہیر کریں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند کریم ساحر اور مجنون اور کاہن اور منفری فرماتا ہے، اور پھر شیعوں کی اندھی عقل سے یقین ہے کہ اس کو تسلیم کر جائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ کلام اللہ میں کفار کا قول منقول ہے۔ اور وہ بھی بایں غرض کہ ان کے قول کو رد فرماتے ہیں، پھر حال مولوی صاحب کی یہ چالاکیاں دیکھ کر مجتہان دینی اور دینداران یقینی کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ان مکاروں پر نہ جائیں۔ ایسے ہی دجالوں نے دین میں رخنہ ڈالا ہے اس علم کے پردہ میں انہوں نے جاہلوں کے نام کو بھی عیب لگایا، عالم تو درکنار۔

درنثور کے حوالہ کی حقیقت اب آگے عرض یہ ہے کہ مجلاً تو اس روایت کا ہونا نہ ہونا بہ نسبت سب کتابوں کے معلوم ہو گیا۔ لیکن اگر مفصل بھی کچھ بیان کیا جائے تو اور اچھا ہے اس لئے ایک دو کتابوں کو بالخصوص ذکر کر کے ان میں اس روایت کا ہونا نہ ہونا بیان کرتا ہوں تاکہ موافق مثل مشہور ”مشتے نمونہ خروارے“ مولوی صاحب کے سب جوابوں کا حال معلوم ہو جائے مگر چونکہ ان سب کتابوں میں سے تفسیر درنثور کا حوالہ عوام تو عوام بعض علماء سادہ لوح کو بھی شاید متردّد کر دے کیونکہ مصنف شیخ جلال الدین سیوطی خاتم المحدثین اور خلاصۃ المفسرین ہیں۔ اور بسبب کثرت تصانیف اور رواج جلالین وغیرہ کے ان کا نام شہرہ آفاق ہو گیا ہے تو اس لئے میں بھی انہی کی کتابوں کی نسبت اس روایت کے ہونے نہ ہونے کی تحقیق کرتا ہوں، سو اس لئے گوش گزار اہل انصاف ہوں کہ تفسیر درنثور میں اس روایت کے ہونے کا کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ وہ موضوعات وغیرہ ہی کے امتیاز کے لئے تصنیف ہوئی ہے۔ سو اس میں یہ کیا اور بہت سی موضوع روایتیں ہیں، لیکن موقع سند میں اس کا نام لینا مولوی صاحب کی کمال حیا اور خوبی ذہن و ذکاوت کی دلالت کرتا ہے سو اگر یہی استدلال ہیں تو کل کو کہنے لگیں گے کہ حضرت علیؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ کیونکہ کلام اللہ میں موجود ہے۔

جلالین اور اتقان میں ذالقرآن اور حقہ کی تفسیر اور اگر بوجہ کمیابی درمثور اس بات کی تسلیم میں تامل ہو تو جلالین اور اتقان تو کثیرا لو جو وہیں یہاں تک کہ دونوں چھپ گئی ہیں خصوصاً جلالین، کہ تفسیروں میں میزان الصرف کا حکم رکھتی ہے۔ بلکہ تفاسیر کی بسم اللہ کیسے۔ سو اس میں ملاحظہ فرما دیکھیں کہ آیت وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی کی تفسیر میں ذالقرآن اور حقہ کی کیا تفسیر کی ہے اگر ان کے نزدیک روایت متنازع فیہا معتبر اور صحیح ہوتی تو اول تو مع حوالہ اس حوالہ کو لکھتے، نہیں تو اختصار ہی کرتے تب بھی اس میں کیا دریغ تھا کہ ذالقرآن کے بعد حضرت فاطمہ زہرا کا نام اور حقہ کے بعد لفظ ذلک لکھ جاتے؟ حالانکہ اور جا ایسا ہی کیا کہ جو تفسیر کسی لفظ کی کسی صحیح حدیث سے ثابت ہوئی ہے وہی بعینہ لکھ دی ہے۔ بلکہ حدیثوں کے حوالہ تک لکھ دیئے ہیں۔ معہذا اتقان کے مضامین سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی بنائی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس میں اول ہی نوع میں اسانید متعددہ سے کہ جن میں سے بعضی سندوں کو اپنے آپ جید لکھتے ہیں۔ سورہ روم اور سورہ بنی اسرائیل کا مکی ہونا مرقوم ہے اور پھر بعد اس کے سورہ قمرآنی کی تفصیل کی ہے کہ فلانی فلانی سورہ میں اختلاف ہے کہ مکی ہے یا مدنی؟ اور فلانی فلانی میں اتفاق ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی، اور پھر تیسرے سورہ روم اور سورہ بنی اسرائیل کو ان میں داخل رکھا ہے جو باتفاق مکی ہیں، کسی ایک متنفس کو بھی اس کے مکی ہونے میں خلاف نہیں اور اسی اثنا میں یہ بھی تحقیق کی ہے کہ فلانی سورہ اگر مکی ہے تو اس میں فلانی فلانی آیت مدنی ہے۔ پر ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کو استثنا نہیں کیا، اور اس بات کی سند بھی وہی سند ہے جس کو وہ جید لکھتے ہیں۔ اور اگر بعض علماء کے اقوال کے موافق ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کا استثنا کیا بھی ہے تو اور ہی آیتوں کا استثنا کیا ہے پر اس آیت کو کسی نے یوں نہیں کہا کہ یہ مدنی ہے۔ الغرض اتقان کی عبارت باواز بلند یوں کہتی ہے کہ یہ دونوں سورتیں خاص کر یہ دونوں آیتیں باتفاق اہل ملت مکی ہیں۔ اور طرفہ تماشایہ ہے کہ شیعہ بھی اس بات میں سنیوں کے

موافق ہیں۔ چنانچہ طبری صاحب مجمع البیان کا قول پہلے مرقوم ہو چکا ہے کہ سورہ روم سوا آیت فسبحان اللہ کے سب مکی ہے۔ الغرض اول تو اتقان کی اس تحقیق سے محقق ہو گیا کہ آیت ذالقرنی مکہ ہی میں نازل ہو چکی تھی۔ تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال و جواب میں حضرت جبرئیل کا یوں کہنا کہ ذالقرنی حضرت فاطمہ ہیں ان کا حق فداک ہے ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ اور ایسا جواب نامعقول حضرت جبرئیل سے نہیں ہو سکتا، ہاں اگر حضرت جبرئیل شیعہ مذہب ہوتے تو البتہ کم فہمی کا احتمال ہو سکتا تھا۔

سیوطی نے اس روایت کو موضوع دوسرے انہترویں نوع میں جو دربارہ معرفت شروط سمجھ کر نقل نہیں کیا۔ مفسر ہے۔ فصل اختلاف تفسیر میں یوں رقم فرماتے ہیں،

کہ ایسی تفسیریں جن کی سند صحیح ہو بہت کم ہیں۔ اور پھر اس میں بھی ایسی جن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، اور بھی کم ہیں، اور پھر وعدہ کیا کہ میں ان سب کو برابر ترتیب وار بیان کروں گا، چنانچہ موافق اپنے وعدہ کے بہ ترتیب سور قرآنی ان تفاسیر کو مع بیان ماخذ بیان کیا، اور تیسرے سورہ بنی اسرائیل میں اس روایت متنازع فیہا کو بیان کیا۔ اور نہ سورہ روم میں جس کی آیت کو شیعہ دستاویز مہبہ فداک سمجھتے ہیں۔ بلکہ والناس کے متعلق کی جو روایت تھی اس کو لکھ کر آخر میں یہ لکھا کہ یہ ہے جو کچھ مجھے معلوم ہے اور حاضر ہے تفاسیر مرفوعہ میں سے جن کے مرفوع ہونے پر لوگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ وہ صحیح ہیں۔ خواہ حسن ہیں خواہ ضعیف۔۔۔ خواہ مرسل خواہ معضل لیکن موضوعات اور باطلیل کو میں نے نہیں لیا۔

اب عرض یہ ہے کہ اس وعدہ اور وعدہ کے قرینہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو روایت لکھی ہے وہ سمجھ کر لکھی ہے، اور جو باوجود معلوم ہونے کے چھوڑ دی ہے وہ سمجھ کر چھوڑ دی، بھولے چو کے نہیں چھوڑی۔ سو یہ روایت متنازعہ فیہا جو نہیں لکھی، تو دیدہ و دانستہ نہیں لکھی۔ اس کو موضوعات اور باطلیل میں سے سمجھا ہو گا جو نہیں لکھا، ورنہ اس کتاب میں ضعیف اور مرسل اور معضل تک نہیں چھوڑا، تو

اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی کتابوں میں کسی ضعیف طریق اور ضعیف روایت سے بھی یہ نہیں ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نزول آیت مذکورہ کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ کیا ہے۔ جو روایت اس بات پر دلالت کرے وہ لاریب موضوع ہے، بلکہ صحیح یہی ہے کہ فدک تادم واپس جناب پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ چنانچہ روایت صحیح اس مضمون کی گزر چکی۔

فدک کے معاملہ میں حضرت علی کا رویہ اور قطع نظر قوت سند اس روایت کی بڑی دلیل اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے اس کی صحت کی (اور دلیل بھی کونسی جس کو شیعہ بھی مان جائیں) یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے بھی موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے فدک میں عمل کیا، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں پر اس کو تقسیم نہ کیا۔ بلکہ بدستور قدیم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے رہے، اگر اپنا حصہ خدا کی راہ میں دیا تھا تو سب وارثوں کو کیوں محروم رکھا؟ اور یہ بات شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اسی واسطے اس کے چار جواب دیتے ہیں، ان چاروں جوابوں کو مع ان کی تردید کے پیش نظر کرتا ہوں تاکہ خوش فہمی اور انصاف پرستی علماء شیعہ ہر کس و ناکس پر آشکارا ہو جائے۔

اہل شیعہ کی طرف سے حضرت اول تو یہ کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم غصب کی ہوئی چیز کو علی کے رویہ کی پہلی تاویل نہیں لیا کرتے، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کو جو بعد ہجرت کے کفار نے دبا لیا تھا کفار سے نہ لیا، یہ اسی قسم کا جواب ہے۔ جیسا مثل مشہور ہے کہ مرد کے ہاتھ چلیں اور نامرد کی زبان چلے۔

تاویل کا جواب جناب من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اول تو مکان ہی بہ وقت ثابت ہو گا۔ کیونکہ اول تو آپ کے والد اپنے والد کے آگے مر گئے تھے، دوسرے بنی کے وارث ہونے میں کلام، ہاں حضرت علی کے مکان کی نسبت کہیے تو بجا ہے

اور اگر بوجہ وصیت عبدالمطلب کوئی مکان آپ کا ہذا ت خود ملوک بھی ہو، جیسے بعض علماء کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے یا کوئی اور وجہ فرض کیجئے، تو اس صورت میں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے گھر کو نہ لینا تو مسلم۔ لیکن یہ کاہے سے شیعوں کو محقق ہو گیا کہ آپ نے اس وجہ سے نہیں لیا؟ نہ لینے کے لئے بہت احتمال ہو سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ بسا اوقات اپنی چیز چور کو یا غاصب کو معاف کر دیتے ہیں اور معاف کرنا وراں ہی ہوتا ہے جہاں آدمی اپنے آپ بھی لے سکتا ہے اور اگر اُس کو اس کا لینا درست ہی نہ ہو تو پھر معافی کے کیا معنے؟ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معاف کر دیا ہو، پھر معاف کرنا اپنے حق کا تو صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے کے معاف کرنے کے کیا معنے؟ سو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اگر فدک کا لینا ہی درست نہ تھا۔ تو یہ تو اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور اگر بوجہ معافی نہیں لیا تو اپنا حق معاف کیا ہوتا۔ حسنین کا اور ان کی بہنوں کا حق کیوں معاف کر دیا؟ معہذا معاف کرنے کے تو یہ معنے ہیں کہ غاصب یا اس کی اولاد کو چھوڑ دے نہ یہ کہ اپنے قبضہ میں رکھے اور اوروں کو دیا کرے۔

دوسرا احتمال یہ ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ جب کسی چیز پر کفار کا غلبہ اور تسلط ہو جائے، اور مسلمانوں کی حکومت باقی نہ رہے اور نہ کوئی ایسا حاکم رہے کہ جس سے مظلوم فریاد کر کے اپنی داد کو پہنچے، بلکہ خود حکام کفار ہی اس کو دیا لیں، تو وہ چیز کفار کی ملک میں آجاتی ہے اور ان کے سب تصرفات بیع شرا وغیرہ اس میں جاری ہو جاتے ہیں، اور مشتریوں کو وہ چیز حلال طیب ہو جاتی ہے اور یہ حکم اس لئے جائز رکھا گیا کہ اگر یوں نہ کیا جائے تو ایک عالم کی مصیبت آجائے اور سب کے سب حرام خوار پھریں۔ یا ہزاروں کلینیس اٹھائیں، کیونکہ ایک ولایت والوں کو دوسری ولایتوں کی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ سو جس ولایت کی چیز کی ضرورت ہو اگر کفار اس کو فتح کر لیں اور وہاں کے اسباب و متاع کو لوٹ کر بیلام کرنے لگیں تو دوسری ولایت والے اگر خریدیں اور استعمال کریں، تو ظالم اور مرتجب حرام کے ٹھہریں، اور اگر نہ خریدیں

یا خریدیں اور استعمال نہ کریں بلکہ اصل مالکوں کو ہٹا کر دیدیں تو یہ سخت دشوار ہے۔ ہر چیز میں اور ہر شخص سے نہیں ہو سکتا۔ اس حکمت کے لئے یہ حکم شارع نے تجویز کیا۔

چنانچہ علماء اہل سنت نے کلام اللہ ہی میں سے اس کی طرف اشارے پائے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے نہ لینے کو اسی پر محمول کیا ہے۔ ورنہ اگر گھر کے نہ لینے کی یہ وجہ ہو کہ اہل بیت شے منسوب کو نہیں لیا کرتے، جیسے شیعہ فرماتے ہیں، تو یہ تو بے شہادت مولوی عمار علی بلکہ بے شہادت عام اسلاف شیعہ غلط ہے کیونکہ مولوی عمار علی صاحب اپنے رفیمہ کریمہ میں رقم فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں بھی حضرت علیؓ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم نے دعوے فدک کا کیا۔ سو اگر شے منسوب اہل بیت نہیں لیا کرتے تھے تو حضرت علیؓ نے کس لئے یہ دعوے کیا تھا۔؟

اور اگر یوں کہیے کہ ان دونوں خلافتوں میں دعوے کیا سنیوں کی روایتوں کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ ان کو اس سے الزام نہیں دیا جاسکتا تو یہ شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فدک غصب کر لیا اور زہرا کا دعوے سنا تو حضرت زہراؓ نے میراث کا دعوے کیا۔

از روئے قواعد شیعہ سیدہ رضی اللہ عنہا [سو اگر اہل بیت بنوی رضی اللہ عنہم شے منسوب کو نہیں لیا کرتے تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے پھر کیوں فدک طلب کی؟] کا مطالبہ فدک غلط تھا۔

اور اگر عقلاً شیعہ سنیوں کی ضد میں عقل و انصاف کو طاق میں دھر کر یوں فرمانے لگیں کہ یہ دونوں دعوے اگرچہ بصورت دو ہیں۔ لیکن چونکہ متصل بلا فصل واقع ہوئے ہیں ہم ایک ہی دعوے اسے قرار دیتے ہیں۔ سو بعد گفت و شنود کے ختم ہو جانے کے غصب متحقق ہوا اور پہلے غصب تھا ہی نہیں، جو کچھ خرابی لازم آوے۔

تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم ایسے ایسے فقروں میں درگزر کر جاتے ہیں۔ ورنہ اسی بات سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا فدک منسوب کی نسبت دعوے

کرنا ثابت کیا؟ مثل آفتاب روشن ہے۔ لیکن چونکہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کی عقل کی رسائی معلوم ہے۔ اس لئے اس بات سے چشم پوشی کر کے ہم اور جواب دیتے ہیں وہ یہ ہے، کہ یہی فدک عمر بن عبدالعزیز کے وقت میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے لیا۔ اور وہ انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر خلفاء عباسیہ اس پر متصرف ہو گئے یہاں تک کہ سنہ دوسو بیس میں مامون عباسی نے اپنے عامل تھم بن جعفر کو لکھا کہ فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہ کی اولاد کے حوالہ کر دے۔ سو اس وقت امام علی رضی اللہ عنہ لیا، پھر متوکل عباسی اس پر متصرف ہو گیا۔ بعد ازاں معتضد نے پھر ہٹا دیا۔ چنانچہ یہ سب قصہ مفصل قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے اگر کوئی سنی لکھتا تو شیعوں کے نزدیک اعتبار کے قابل بھی نہ ہوتا۔

تو اعدہ شیعہ کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اس کو بھی جانے دیجئے مجالس المؤمنین کا حال کا خلافت قبول کرنا بھی درست نہ تھا تو پڑھے لکھے یا صحبت یافتہ علماء جانتے ہوں گے یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے بعد شہادت حضرت عثمان کے خلافت منصوبہ قبول کی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ پلید سے خلافت منصوبہ کے طالب ہوئے، یہاں تک کہ نوبت شہادت کی پہنچی، اور اگر ان امور میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا، تو شیعہ منصوبہ کے لینے کے جواز میں اور دلالت کے وجوب میں عقلائے ابوالالباب کے نزدیک پھر بھی کچھ تامل نہ تھا۔ کیونکہ سابق میں محقق ہو چکا ہے کہ آیت و آیت ذوالقربیٰ میں گو مخاطب خاص ہے لیکن خطاب عام ہی ہو۔ اگر ذوالقربیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قرابتی مراد ہوں تو ان کے حق کا دلالت سب کے ذمہ واجب ہو۔

اور نیز وجوب عدل و انصاف کی فرضیت سے کلام اللہ بکھرا ہوا ہے اور عدل و انصاف اسے ہی کہتے ہیں کہ اہل حق کے حقوق دلائے جائیں۔ سو بعد غصب کے اگر مالک کا حق باقی رہتا ہے تو حضرت علی کے ذمہ فدک کا حضرت زہرا کے وارثوں کو پہنچانا فرض تھا۔ اور اگر بعد غصب اہل بیت کا حق ساقط ہو گیا۔ تو اس میں اور عفو میں

کیا فرق ہے؟ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باب میں یہ زبان درازیاں تھیں۔

حضرت علی کے رویہ کی تائید [دوسرا جواب علمائے شیعہ نے حضرت علی کے فدک میں تصرف مالکانہ نہ کرنے کا اس طرح دیا ہے، کہ حضرت علی نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا اقتدا کیا۔ یعنی جیسے انہوں نے فدک سے کچھ انتفاع نہیں اٹھایا، اس جواب پر تو مناسب یوں ہے کہ علمائے شیعہ کے قربان ہو جائے۔ سبحان اللہ کیا فہم کی رسائی ہے۔ خیر فہیدہ لوگوں کے لئے تو اس جواب کی تردید کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیونکہ عقل خود اس جواب کے مضمون کو ایسے اگلتی ہے جیسے مکھی کو معدہ۔

تائید کا جواب [لیکن چونکہ سب ایک قسم کے نہیں ہوتے۔ تو اس لئے یہ گزارش ہے کہ جن اماموں نے بعد حضرت علی کے باقرار سرگروہ شیعہ قاضی نور اللہ فدک کو لیا، چنانچہ ابھی مذکور ہوا ہے، انہوں نے حضرت فاطمہ بلکہ حضرت امیر کا بھی کس لئے اقتداء نہ کیا؟ اور نیز یہ اقتداء فرض تھا یا نفل؟ اگر فرض تھا، تو اور اماموں نے کیوں نہ کیا؟ اور اگر نفل تھا تو اول تو ائمہ اہلبیت سے ایسی سنت معمول بہا حضرت علی اور حضرت فاطمہ بلکہ معمول بہا حسنین اور معمول بہا حضرت امام زین العابدین کا ترک کرنا مستبعد ہے، اور معمول بہا ہونا حسنین اور امام زین العابدین کا خود ظاہر ہے۔ کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جیسے بنا چاری فدک سے منتفع نہ ہوئیں تھیں، ایسے ہی یہ بزرگوار بھی بنا چاری منتفع نہ ہو سکے، دوسرے حضرت امیر المومنین نے اس نفل کے واسطے حقداروں کے حق پہنچانے کو جو ان کے ذمہ فرض تھا کیوں ترک کیا؟

اقتداء کن افعال میں ہوتا ہے [اور نیز کسی کا اقتداء احتمال اظہار یہ میں ہوا کرتا ہے افعال اضطراریہ میں کوئی کسی کا اقتداء نہیں کیا کرتا، ورنہ لازم آئے کہ حضرت امام ہمدی حضرات ائمہ ماضیین کا اقتداء تقیہ میں جو بوجہ بنا چاری وہ کیا کرتے تھے کریں، اور ایسے ہی حضرت امام حسین تقیہ میں اتباع حضرت امیر کرتے، سو اگر حضرت زہرا کسی کے ظلم و ستم کے باعث فدک سے منتفع نہ ہو سکیں، تو ناچار تھیں حضرت علی کو اپنے

وقت خلافت میں اس مظلومیت کے اقتدار کے کیا معنی؟ باایں ہمہ اگر حضرت امیر کو حضرت زہرا کا اقتدار ہی کرنا تھا۔ اپنے حصہ میں کیا ہوتا۔ حضرات حسنین اور ان کی بہنوں کو کیوں محروم المیراث کر دیا۔

اہل شیعہ کی تیسری تاویل | تیسرا جواب جو شیعوں نے اعتراض معلوم کا دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امیر اس لئے فدک سے منتفع نہ ہوئے تاکہ لوگوں کو متحقق ہو جائے کہ حضرت امیر کی گواہی دربارہ ہبہ فدک حسبہ للہ تھی اپنے نفع کی امید پر نہ تھی۔

تاویل کا جواب | یہ جواب بھی مثل جواب ہائے سابق سرتاپا خلل ہے، اول تو جو لوگ اس مقدمہ میں حضرت امیر کی طرف سے گمان فاسد رکھتے ہیں، وہی لوگ ہوں گے، جنہوں نے حضرت امیر کی گواہی کو قبول نہ کیا، سو وہ لوگ پہلے ہی اس جہان سے چل دیئے تھے، ان کی خلافت میں ان میں سے کون تھا۔ جو اس کے جتلائے کے لئے آپ نے فدک نہ لیا۔؟ اور اگر مردوں کا جتلانا مد نظر تھا تو اول تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی، دوسرے اپنے مرنے کے بعد ان کو خود حضرت امیر کی حقانیت اور اپنا ظالم ہونا معلوم ہو گیا ہو گا۔ سو یہ نہ لینا یوں ہی رائیگاں گیا، بیوجہ حضرت امیر نے مال حلال کو ہاتھ سے کھویا نہ نفع دین نہ نفع دنیا،

اور اگر یوں کہیے کہ خلفاء ثلاثہ مر گئے تھے تو کیا ہوا، ان کے مقتقد اور نواسب صوبہ تو موجود تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو یہ احتمال پھر بھی باقی رہا۔ جب آپ کی بعض اولاد نے لیا، خصوصاً مامون کے زمانہ میں، کہ وہ مائل بہ تشیع تھا اور فدک کو حق اہل بیت ہی سمجھ کر حضرت امام علی رضا کے حوالہ کیا، جب بھی آخر تو اس کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو گا کہ حضرت امیر کی گواہی اس پیش بندی کے لئے تھی، بلکہ بیشتر اولاد ہی کے لئے ایسی ایسی تدبیریں دراز کیا کرتے ہیں۔ سو نواسب بحکم المرء یقیس علی نفسہ کے بالضرور یہ سمجھے ہوں گے کہ حضرت امیر کی گواہی فقط اس لئے تھی کہ اگر یہ تیر ہمارے زمانہ میں نشانہ پر نہ بیٹھا، تو کبھی نہ کبھی تو کارگر ہو گا ہی۔ سو اگر یہی رفع تہمت مد نظر تھا۔ تو لازم تھا کہ اپنی اولاد کو وصیت کر جاتے کہ ہرگز اس

مال کو نہ لیجیو۔ نہیں تو میری شہادت میں خلل آجائے گا۔

اہل شیعہ کی جو بھی تاویل [چوتھا جواب شیعوں کی طرف سے یہ ہے کہ یہ سب پرہیز گاری اور فدک سے دست برداری تقیہ کی وجہ سے تھی، القصہ شیعہ لاچار ہو کر اپنیوں پر آ گئے۔ لیکن دروغ گورہ حافظہ نباشد] علمائے شیعہ کو اس جواب کے وقت یہ یاد نہ رہا، کہ سب آدمیوں کا مذہب تقیہ میں یہ ہے، کہ جب امام جہاد کے لئے تیار ہو اور قتل و قتال میں مشغول ہو تو پھر اس پر تقیہ حرام ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ہرگز تقیہ نہ کیا۔ سو اگر حضرت امیر اپنی خلافت کے زمانہ میں تقیہ کرتے تو اور الٹے مرکب فعل حرام کے ہوتے، نعوذ باللہ اس جواب والوں نے حضرت علی کی وہی مثل کر دی ہے۔ جیسے کہا کرتے ہیں، ”یکے نقصان مایہ دیگر شہادت ہمسایہ“، مال کا مال گیا و بال گنا پلہ بندھا، خدا نادانوں سے باہ تباہ نہ ڈالے، کسی نے سچ کہا ”دشمن دانا بہتر از نادان دوست۔“

تاویل کا جواب [معہذا اگر تقیہ خلفائے ثلاثہ سے تھا تو وہ خود پہلے ہی اس جہان سے چل دیئے تھے اور مردوں سے تو نامردوں کو بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ یا باقیماندوں سے؟ سو وہ یا تو آپ کے لشکری تھے اور شیعہ مخلص۔ یا منجملہ رعیت، سورعیت میں سے ایسے امور میں اگر اندیشہ ہوتا ہے تو ان سے ہوتا ہے جن کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ سو یہاں وہ فقرا اور مساکین اور ابن سبیل تھے، ان سے ڈرنا بھی ہموزن خوف مردگان ہے۔ سوائے ان کے اور کسی کی بلا کو کیا غرض تھی کہ فدک کے سبب حضرت علی رضا کے مقابل ہو کر اپنی جان کو خطر میں ڈالتا۔؟

اور اگر بفرض محال یہ صورت ظہور ہی پکڑتی، تو اول تو حضرت امیر کے برابر کسی میں زور اور بل اور شجاعت اور لشکر نہ تھا، اگر کچھ گمان ہو بھی تو امیر معاویہ یا حضرت عائشہ کی طرف ہوتا، سو انہوں نے اب کونسی کمی کی؟۔ دوسرے ایسے مفسدے

کا اثبات آتا ہے، جب یہ بات محقق ہو چکی تو ہر دانا و نادان کو محقق ہو گیا کہ روایت متنازع فیہا جو مستند شیعہ ہے، سراسر مبتیان اور دروغ تراشیدہ حضرات شیعہ ہے۔ اور جسے حسب روایت اس کا غلط ہونا صحیح ہو گیا تھا با اعتبار ثوانین روایت بھی ایک افسانہ ہے اصل نکلا، علیٰ ہذا القیاس مامون عباسی کے زمانے میں ولاد حسنین کا بہ نسبت فدک دعویٰ کرنا، اور اس کا دو سو علماء اہل سنت کو جمع کر کے دربار فدک استفسار کرنا، الی غیر ذلک بمنزلہ خیالات بوستان خیال اور حکایات باغ بہار اگر سراسر غلط نہیں تو مثل مرویات صحیحہ بالکل صحیح بھی نہیں۔

اتنی بات بیشک ظہور میں آئی کہ مامون عباسی نے بوجہ میلان تشیع فدک کو ولاد حسنین کے حوالہ کر دیا، القصہ جب ان افسانوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا تو دعویٰ ثبوت مہربہ جس پر مولوی عمار علی صاحب بیڑا اٹھا کر عزم اثبات غصب کیا تھا، مثل خانہ شیخ چلی مکہ سوائے خیال اور کچھ نہ تھا، بنا بنایا ڈھ گیا۔ اور بعد ازیں ہم کو کچھ ضرورت تر دید نہ رہی۔ کہ اہل انصاف کے لئے فدک کے غصب نہ ہونے میں اتنا ہی سامان سامان علم الیقین ہے، اور حضرات شیعہ جیسے ناانصافوں کے لئے اسی قدر جواب دندان شکن اور قاطع ہر مہین و کہین ہے۔

کتب اہل سنت میں دعویٰ سیدہ برائے لیکن بایں ہمہ اور زیادہ طریق تنزل مناظرہ فدک بروایت ضعیف بھی مذکور نہیں۔ میں علامت حقانیت ہوتا ہے۔ اس لئے بطور

تنزل معروض ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں سند ضعیف سے بھی یہ روایت نہیں کہ بعد وفات سرور کائنات علیہ و علی آلہ۔۔۔۔۔ افضل الصلوات و اکمل التحیات حضرت فاطمہ زہراؑ نے دعویٰ مہربہ فدک کیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کا دعویٰ نہ سنا اور گواہ مانگے، اور حضرت زہراؑ حضرت علیؑ اور حضرت ائمہ یا حنین رضی اللہ عنہم جمعین کو علی اختلاف الروایات گواہ لائیں۔ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے (بسیب نہ ہونے دو مردوں یا ایک مرد و عورتوں کے) ان کی گواہی کو رد کر دیا، یہ سب خوبی اور بزرگی انہی بندگانِ شیعہ کی ہے، کہ ان روایات کو گھڑ کر زراہِ جہنم تیار کیا اور سرمایہ

نعمت ابدی بہم پہنچایا۔ اور پھر جرأت تو دیکھو کہ علمائے اہلسنت نے جواب طلب ہے۔
 مجاہد دین کی خدمت میں یہ اتہاس ہے کہ اہل سنت کا شیوہ یہ نہیں کہ وقت
 پڑے پر جھوٹ بول جائیں۔ ان کے مذہب میں تقیہ کے جواز کی بھی کوئی صولت ہوتی تو
 مضائقہ نہ تھا، اس لئے جو امور واقعی ہیں۔ اگرچہ ظاہر نظر میں جائے گرفت اور محل
 طعن ہوں، اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔ اور انکار نہیں کرتے مثلاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ
 عنہا کا میراث کا دعویٰ کرنا اور حضرت ابو بکر صدیق کا نہ دنیا، اور قضیہ قرطاس اور
 واقعہ جمل کہ یہ سب امر واقعی ہیں، اور ان کے جواب معقول رکھتے ہیں، اگر جھوٹ ہی
 بولتے تو جیسے شیعہ وقت پڑے پر جاہلوں کے سامنے اپنی مرویات صحیحہ سے بھی انکار کر
 جاتے ہیں، سنی بھی ایسے امور سے انکار کیا کرتے، لیکن جوابات اصل سے بے اصل
 ہو اس کو کیونکر سر دھریئے۔

پھر اس عداوت اور اس دیانت کو دیکھئے۔ کہ سنیوں کے دین کی خوبی کے حسد
 میں مقتدایان شیعہ اور پیشوایان امامیہ اپنے دین کو بھی خراب کرنے لگے، اور جھوٹی
 روایتیں تراش کر سنیوں سے گریباں گیر ہونے لگے، سودر و نغ پسندوں کو جھوٹی باتیں ہی
 سنکر اطمینان ہوتا ہے، اس لئے ہم بھی ان کی عوشی کے لئے یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ شیعہ فرمیں
 سب سچ ہے۔ بع۔ دروغ را جزا باشد دروغ

روایت ہبہ کے غلط ہونے کی دو دلیلیں مگر بیاس خاطر اہل صدق اس روایت کے غلط ہونے کی دو دلیلیں بیان
 کرتا ہوں، ایک سنیوں کی طرف سے، ایک شیعہوں کی طرف سے، سنیوں کی طرف کی دلیل تو
 ایسی لیجئے کہ جس سے اپنے دل کا تردد رفع ہو جائے۔ اور دشمن کا اعتراض دفع ہو جائے
 سو وہ وہی روایت مشکوٰۃ ہے جس میں عمر بن عبدالعزیز کا فدک کو بدستور سابق کرنا
 مذکور ہے۔ اس روایت کی صحت اور شہرت کی طرف پہلے بھی اشارہ گذرا اور اب بھی
 کہنا پڑا کہ مشکوٰۃ کی شہرت تو سب ہی کو معلوم ہے۔ اور ابو داؤد جو اس روایت کا ماخذ
 ہے۔ وہ خود صحاح ستہ میں سے ہے۔

بالجملہ یہ روایت صحیح سنیوں کی کتابوں میں موجودہ پھر جو روایت اس کے مخالف

ہو اور وہ بھی ایسی کہ نہ اس کی سند اس کی سند کے برابر اور نہ اس کا ماخذ اس کے
ماخذ کے برابر، وہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی۔ پھر اسکے بعد اگر کوئی کہے کہ سنیوں کی کتابوں میں
بطریق صحیح ایسی حدیث موجود ہے جس سے یہ ہونا مذکور کا ثابت ہوتا ہے، تو نادان بھی
سنکر یقین کر لے گا کہ یہ بات غلط ہے۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ بطور تردید
کے، یعنی اس بات کے بتلانے کے لئے کہ یہ روایت غلط ہے۔ اس روایت کو کسی کتاب میں
داخل کیا ہوگا، یا کسی نے اپنی کتاب میں اور ربط یا بس کے ساتھ اس روایت کو بھی
داخل کر دیا ہوگا، کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح غلط میں امتیاز کر دیا جائے جو علماء شیعہ
نے بوجہ چالاک کی اور غلط انداز سے ایسے مواقع سے اس قسم کی روایات کو چن لیا ہے۔

دوسری دلیل شیعوں کی طرف سے جس سے وہ الٹے التزام کھائیں اور خاموش
رہ جائیں، سو وہ حضرت علی کا مذکور سابق فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسیم
کرنا، اور آپ نہ لینا، اور حضرت زہرا کے داروں کو نہ دینا، جس کو شیعہ ہر مرد و چشم
رکھتے ہیں، اور اس کے واقعی ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کی تحقیق اوپر گزر
چکی ہے، اور یہ بھی گزر چکا کہ شیعوں نے اس کے غدر میں ہر چند بہت دست دیا ہمارے
لیکن سب رائیگاں گئے۔ بالجملہ اس قضیہ مسلم الثبوت طرفین اور نیز روایت مشکوٰۃ سے
یہ بہ کا معین ہونا سراسر بہتان اور غلط ہے۔ پھر کیا امکان کہ سیدۃ النساء، جگر گوشہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ
ہیں، ایسا دعوائے دروغ با این بزرگی سرزد ہوا؟ اور پھر حضرت علی اور حضرت حسنین جو
باعتبار طرفین یا معصوم ہیں یا محفوظ، شہادتِ زور جو ہم سنگ کفر ہے اس طرح
بر ملا علی الاعلان ادا کریں۔

بہر حال یہ روایت سنیوں کی کتاب میں اصلاً موجود نہیں۔ شیعوں کا افتراء اور
بہتان ہے، پھر ایسی روایتوں سے سنیوں کے التزام کے درپے ہونا اور ان سے ان کا
جواب طلب کرنا کمال سفاہت اور عین حماقت کی دلیل ہے۔ باقی یہ جو مولوی صاحب نے
نو دس کتابوں کے نام لکھ دیئے ہیں، یہ وہی قدیمی کید ہے، اور پرانی دغا اور فریب کی بات

جو مولوی صاحب کو سینہ بسینہ پہنچی ہے، اور ہم نے اس کی طرف بحوالہ تحفہ اشارہ کیا، جس کا یہ مضمون ہے کہ شیعہ اکثر اپنے مطلب کی باتیں کیا با نادرا لوجود کتا بوں نقل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کتا بوں اس بات کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر ایک نسخہ میں کسی کتاب کی یہ روایت ہو دے بھی، تو وہ بھی بیشک ایسے ہی دغا بازوں کی چال ہے۔ کیونکہ ان کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ کتب غیر مشہورہ میں جو خال خال ملتی ہیں، اکثر روایات اپنے مذہب کی یا اپنے آپ تراش کر داخل کر دیتے ہیں، چنانچہ تحفہ ہی کے حوالہ سے یہ بات بھی مفصل مرقوم ہو چکی ہے۔

کتب محولہ کے مؤلفین نے اور اگر فرض کیجئے کہ ان سب کتابوں کے سبھی نسخوں میں یہ صحت کا التزام نہیں کیا روایت ہے، تو اول اس بات کا اثبات چاہیے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے التزام کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم ان کتابوں میں درج کریں، صحیح صحیح درج کریں گے، ضعیف اور موضوع درج نہ کریں گے۔ سو اس بات کا ثابت ہونا تو معلوم، البتہ معاملہ برعکس ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رسالہ اصول حدیث کے آخر میں جو مشکوٰۃ مطبوعہ مطبع دہلی کے اول میں لگا ہوا ہے۔ یوں رقم فرماتے ہیں کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے جمع الجوامع میں کوئی پچاس کتابوں سے زیادہ کتابوں کی حدیثیں جمع کی ہیں اور پھر اس میں صحیح حسن ضعیف ہر قسم کی حدیثیں لائے ہیں، اسی پر اور کتابوں کو بھی قیاس کر لیجئے۔ "مشتہ نمونہ خروارے،" رع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

الغرض ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ التزام نہیں کیا کہ ان میں بجز صحاح کے ضعیف حدیثیں داخل نہ کریں گے اور یہ بات ویسے بھی تو ظاہر ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کو بھی بمنزلہ صحاح ستہ سمجھتے، اور صحاح میں داخل رکھتے، اور اگر فرض کیجئے کہ ان کے مصنفوں نے اپنی طرف سے التزام ہی کیا تھا، کہ بجز صحیح اور کسی قسم کی روایت ان میں درج نہ کریں گے، تب بھی اطمینان کے قابل نہیں، کیونکہ اہل سنت کے نزدیک صحت و ضعف حدیث کے باب میں ایک آدمہ کا کہا نہیں چلتا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلطی کھا جاتا ہے، اس لئے ان امور میں ضرور ہے کہ اگر سب محدثین کا اتفاق

بھی نہ ہو تو اکثر تو اس کی صحت کے یا ضعف کے قابل ہوں۔

اور یہ بات اول تو بشہادت عقل ضروری ہے، دویم بہت سے شیعہ خبیث باطن نے بوجہ تقیہ متورع اور متقی بنکر اول تو اپنا اعتبار پیدا کیا۔ اور پھر محدثین اہلسنت کی خدمت میں رہ کر ان سے صحیح حدیثیں روایت کیں، اور انہیں سندوں سے اپنے مطلب کی باتیں بھی ان کے ساتھ رلا کر عالم میں پھیلا دیں اور بوجہ تقوایں ظاہر اور پردہ تقیہ یہ پیچ ان کا چل گیا۔ اکثر ثقات نے بھی ان کو متورع اور متقی گمان کر کے ان کی روایتیں قبول کر لیں اور بوجہ حسن ظن استد کو ثقہ سمجھا اور سوا اس کے اوپر کے اساتذہ کو ائمہ حدیث پایا، اس کی وجہ سے ان کی روایات کو منجملہ صحاح سمجھا، اور اس دعا میں آگئے۔

تقیہ کے پردہ میں اہل شیعہ | گو متاخرین نے بامداد خداوندی اس دعا کو سمجھا اور ان حدیثوں کی خطرناک خیانت کو موضوع قرار دیا۔ اور مردود اور متروک ٹھیکرایا۔ چنانچہ

شاہ عبدالعزیز صاحب تحفہ میں باب مکاید میں مکاران شیعہ کی شان میں رقم فرماتے ہیں۔ "کید شاذم آنکہ جماعت از علماء ایشان خود را از محدثین اہل سنت و انمودہ علم حدیث مشغول شدند و از ثقات محدثین اہل سنت سماع حدیث حاصل کردند و اسانید صحیحہ آنرا یاد گرفتند و بظاہر بجلیہ تقوے و ورع متحلی گشتند تا طالبان را اعتقاد صادق در حق آنها بہم رسید، و اخذ علم حدیث انا نہا شروع نمودند و احادیث صحیح و حسان روایت کردند و در اثنا روایت بہمان اسانید صحیحہ موضوعات را کہ مطابق مذہب ساختہ بودند نیز در جملہ مرویات درج نمودند این کید ایشان راہ بسیاری از خواص اہلسنت زدہ است چہ جائے عوام،

زیرا کہ تمیز در میان احادیث موضوعہ و صحیحہ بر حال سند است، و چون رجال بسبب اس دغل و تلبیس متحد شدند تمیز مشکل افتاد، و ما بہ لامتیاز مفقود گشت، اما چون عنایت الہی شامل علوم اہلسنت بودہ، ائمہ این فن بعد از تحقیق و تفتیش اس دغل را دریافتند و متنبہ شدند بعد از انکشاف جلیہ جال طائفہ از ایشان بوضع اقرار نمودند

وطائفہ صریح اقرار نہ نمودند لیکن امارات اقرار در انہا قائم شدہ و تا حال آل احادیث
در معاجم مصنفات و اجزاد و امرو سامراست، و اکثر تفسیلیہ و متشیعین بدال احادیث
تمسک کنند،

اول کسیکہ این دغل را موجود شد جابر جعفی است، کہ بعد از تحقیق حال او بخاری و مسلم
بنابرا حقیقا مطلق مرویات اورا از درجہ اعتبار ساقط و مطروح ساختند، و ترمذی و
ابوداؤد و نسائی با متعابعات و شواہد قبول کنند، و آنچه او بدان متفرد است رونمایند
و ابوالقاسم سعد بن عبداللہ ابی خلف قمی نیز دین باب استاد پر کارست۔ اکثر ناواقفان
اہلسنت بجهت تبلیس اسانید او گمان برند کہ از رجال معتبرین ماست، حالانکہ چنین نیست
نجاشی کہ صاحب قدر رجال شیعہ است اورا فقیہ طائفہ و جیہ طائفہ قرار دادہ انتہی بلفظہ
ترجمہ۔ پندرہواں مکر یہ ہے کہ اہل شیعہ کے علماء میں سے ایک جماعت اپنے
آپ کو محدثین اہل سنت ظاہر کر کے علم حدیث میں مشغول ہوئی۔ اور ثقات محدثین اہل
سنت سے سماع حدیث حاصل کیا۔ اور ان کی اسانید صحیحہ کو یاد کر لیا اور بہ ظاہر تقویٰ و
پرسیزگاری سے آراستہ ہو گئے حتیٰ کہ طلباء علم کو ان کے بارے میں سچی عقیدت پیدا
ہو گئی اور انہوں نے ان سے استفادہ علمی شروع کر دیا۔ اور صحیح اور حسن حدیثیں
روایت کیں اور اثناے روایت میں اسناد صحیحہ کے ساتھ اپنے مطلب کی وضع کی
ہوئی روایات بھی درج کر دیں۔

علمائے شیعہ کے اس مکر نے بہت سے خواص اہلسنت کا راستہ کاٹ دیا ہے
عوام کا تو ذکر ہی کیا، وجہ یہ کہ احادیث صحیحہ اور روایات موضوعہ میں امتیاز تو صرف
رجال سند ہی سے ہو سکتا ہے۔ جب اس مکر و فریب سے رجال سند ہی گٹھڑ ہو گئے
تو تمیز مشکل ہو گئی۔ اور جس امر سے امتیاز حاصل ہوتا وہ مفقود ہو گیا۔

لیکن چونکہ تائید خداوندی اہل سنت کے علوم کو حاصل تھی۔ اس لئے آئمہ فن
نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس فریب کو سمجھ لیا۔ اور متنبہ ہو گئے۔ پھر حقیقت حال کے
ظہور کے بعد علماء شیعہ کے ایک گروہ نے وضع احادیث کا اقرار کر لیا۔ اور دوسرے

نے صریح اقرار تو نہ کیا۔ لیکن ان روایات میں اقرار کی علامتیں قائم ہو گئیں۔ اور اس وقت بھی وہ روایات معاجم، مصنفات و اجزاء میں دائر و سائر ہیں۔ اور اکثر تفسیلیہ اور متشیعین ان سے تمسک کرتے ہیں۔

پہلا شخص جو اس فریب کا موجد ہے وہ جابر جعفی ہے کہ اس کی حقیقت کھل جانے کے بعد بخاری و مسلم نے احتیاطاً اس کی تمام مرویات کو ساقط الاعتبار اور مطرح قرار دیا۔ اور ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی اس کی روایات کو شواہد اور متابعات طے پر قبول کرنے لگے۔ اور جن روایات کے شواہد و متابعات نہیں ملے، ان کو مردود قرار دیا۔ نیز ابوالقاسم سعد بن عبداللہ ابی خلف قمی بھی اس فریب کاری میں استاد پڑھا رہے۔ اکثر ناواقفان اہلسنت اسانہد کی گڑبڑ کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے راویانِ موثقہ میں سے ہے۔ حالانکہ یہ خیال خلاف واقعہ ہے۔ نجاشی جو ناقدِ رواۃ شیعہ ہے۔ اس نے قمی کو نفعہ طائفہ اور وجیہ طائفہ قرار دیا ہے۔ اتنی ترجمانِ شیعہ اب عرض یہ ہے کہ شاہ صاحب کا لکھنا تو آنکھوں کے دیکھنے کے برابر ہی۔ شیعہ سنی سب ان کے علم اور تاریخ دانی اور تبحر مذہب طرفین کے قائل ہیں، حتیٰ کہ علم اہلسنت تو اپنا علم تھا، علم مذہب شیعہ بھی اس قدر رکھتے تھے کہ علماء شیعہ کو بھی میسر نہیں چنانچہ تحفہ اثنا عشریہ اس کے لئے گواہ موجود ہے۔ لیکن اگر شاہ صاحب نہ فرماتے۔ کوئی اور کہتا تب بھی اس بات کا شیعوں کی نسبت یقین بیساختہ ہو جاتا۔ کیونکہ اس نفعہ کی قبح پر جھوٹ کو ان کیلئے حلال طیب کیا واجب اور فرض تک کر دیا ہے۔

لسان المیزان میں چند فریب | لسان المیزان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بہت سے
کاروں کی نشان دہی۔ | شیعان نابکار نے کیا ہے، منجملہ حارث بن غصین ہے جو غمش

سے روایت کرتا ہے، اور اسی قبیل سے حارث بن محمد معکوف ہے۔ اور ازاجملہ حسن بن علی بن زکریا بن صالح ابوسعید عدوی مصری ہے، جو ثقات کے نام سے جھوٹی باتیں روایت کرتا ہے، خیر کہاں تک بزرگواران شیعہ کی بزرگی کی تعریف اور مدح میں رطب لسان رہے، کہ اس قسم کے مضمون بہت بھی تھوڑے ہیں۔

پر رفع استبعاد اور تسکین خاطر سادہ لوحان کے لئے یہ معروض ہے کہ آیت
 فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا س جس کا یہ ترجمہ ہو کہ ان سے زیادہ
 اور کون ظالم ہوگا جنہوں نے ۔۔۔ اللہ کے ذمہ بھی بہتان لگا دیئے۔ یوں معلوم
 ہوتا ہے کہ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ امت کے ذمہ طوفان چوڑ لیا کرتے ہیں، اور کم
 عقلوں اور سادہ لوحوں کو بمنزلہ شیاطین راہ سے بے راہ کر دیتے ہیں۔ سو اس آیت
 میں اس فن میں حضرات شیعہ سے زیادہ اور کوئی چالاک معلوم نہیں ہوتا۔ اور کیوں
 نہ ہو جھوٹ سے ان کے دین کا قوام ہے۔ اگر یہ جھوٹ نہ بولیں، تو اور کون بولے۔ سو
 ان کی نسبت جتنا کچھ کہئے تھوڑا ہے، بالجملہ اگر کتب مذکورہ میں روایت دعویٰ فدک
 ہو بھی؟ تو بوجہ حسن ظن علمائے اہل سنت اور ترقیہ مکارانِ مذہب شیعہ اول وہ روایت
 سائر ہو گئی، پیچھے سے محققین نے گو اس کے بطلان کا اشتہار کر دیا لیکن تاہم کہاں
 تک؟ پھیلی ہوئی بات کا سمیٹنا چھوٹے ہوئے تیر کے ہٹانے کے برابر ہے۔

بہر حال وہ روایتیں مشہور ہو گئیں۔ اور مغفیلین کو ہراسیمہ کر دیا، اور شیعین
 اور مردمانِ تفضیلی کے لئے سامانِ اضلال ہو گئیں، جیسا کہ تواریخ و انجیل کی تحریفات
 باعثِ ضلال و اضلالِ عالم ہو گئیں، پر جسے قرآن مجید نے تواریخ و انجیل کی غلطیوں
 کی اصلاح کر دی، اور قسمت والوں کو ظلمات سے نکال کر نور میں پہنچا دیا، ایسے ہی روایات
 صحاح اور تحقیقاتِ محققین اولوالالبصائر بھی ان تحریفات کا تدارک کر دیا۔ اور جن کا مادہ
 قابلِ اصلاح تھا ان کو ہدایت کر دی۔ اور ضلالت سے نکال دیا۔ باقی مولوی عمار علی
 صاحب یا ان کے اقران و امثال کی اگر اصلاح نہ ہو تو کیا بعید ہے؟ جن کے دلوں پر نہر
 لگی ہوئی تھی ان کے لئے قرآن جیسی حقانی کتاب سے اصلاح نہ ہوئی، بلکہ تحریفات
 آجانی اور تبدیلیاتِ اسلاف کے پابند رہے۔ ایسے ہی مولوی عمار علی صاحب بھی اس بات
 میں انہیں کے قدم بقدم ہیں اور موافق نقل مشہور۔

کنہم جنس باہم جنس پروار : کبوتر با کبوتر زاغ با زاغ
 کذابوں کی روایات پر جم گئے اور اہل صدق کی بات کو نہ مانا۔ سو وہ کیا کریں؟

مَنْ يُضِلَّ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ

دعوتے مذکور کی روایت اگر صحیح اور اگر ہم تسلیم کریں اور مناظرہ میں شیعوں سے نرمی ہی بھی ہو تو بھی کام نہیں چلتا۔ برتیں، اور اس بات کے قائل ہوں کہ اس روایت میں

کسی طرح کا قصور نہیں، باون تولہ پاؤرتی ہے تب بھی شیعوں کی آنکھوں میں خاک ہی رہے گی۔ کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو مشکوٰۃ کی روایت اصح ہے، اور یہ قوی ہے تو وہ روایت اقویٰ ہے، اس کو اس پر ترجیح نہیں ہو سکتی۔ وہی بہ طور مرجح رہے گی اور یہ بات کچھ ہمیں نہیں کرتے کہ اصح اور اقویٰ کو صحیح اور قوی پر مقدم رکھتے ہیں، تمام عالم ہی کرتا ہے عقل اسی بات کی شاہد ہے، شیعہ ہر چند عقل سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔ اسی طریق پر چلتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ کریں تو پھر دین سے دست بردار ہوں، کیونکہ ان کے یہاں کے اختلاف کے برابر کسی مذہب میں اختلاف ہی نہیں، چنانچہ ناظران تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مولانا حیدر علی پرلو شید نہ رہے گا، اور قدر قلیل کچھ اس کا تپہ اس رسالہ میں سے بھی ملے گا۔

اور دور کیوں جائیے، مولوی عمار علی صاحب تویوں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اور کوئی بیٹی ہی نہ تھی، اور کلینی بصراحت، اور نہج البلاغۃ بلکہ خود کلام ربانی تعدد نبات نبوی پر شاہد ہیں چنانچہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

تو اب ہم مولوی صاحب سے استفسار کرتے ہیں کہ آپ اگرچہ جھوٹے ہیں، پر بزعم خود تو سچے ہی ہیں، اور معتقدوں کے نزدیک تو آپ کی بات سے پھرنا، خدا کی بات سے پھرنا ہے۔ تو آپ کی روایت بھی خواہ مخواہ آپ کو صحیح مانتی پڑی، اور کافی کلینی خود اصح الکتاب ہے اور نہج البلاغۃ بمنزلہ وحی آسمانی، اور قرآن خود وحی آسمانی ہے۔ پھر آپ نے بایں وجہ کہ خدا کے فرمودہ میں تو بدکا احتمال ہے، اور کافی اور نہج البلاغۃ میں ائمہ کا قول اس بات میں منقول ہے، اور ان کے علوم، علم خداوندی اور علم نبوی سے ماخوذ ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا ہی سے لیتے ہیں، تو اس صورت میں ان کے

اقوال میں بھی وہی احتمال رہا، اور آپ کو نہ خدا سے واسطہ نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واسطہ، آپ نے جو اپنے ہنریاں اور بکواس کو کافی کی روایت اور حضرت امیر اور خدا کی شہادت سے اصرار سمجھ کر مقدم رکھا، یہ ترجیح آپ کے نزدیک صحیح ہے یا غلط۔ اگر صحیح ہے تو نہ ہو المراد، ورنہ ”چشم مارو شن دل ماشاد“ یہ بات تو آپ مانیں گے۔ کہ ہاں میرا یہ قول کہ ”سوائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی بیٹی ہی نہیں“ غلط ہے۔ باقی اس ترجیح کو کہ صحیح اصرار پر راجح ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہم مر جوح کر دینگے جو نہج البلاغۃ میں مندرج ہے۔

النَّزْمُ وَالشَّوْازُ لَا عَظَمَ فَإِنَّ يَدَ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ
وَالْفِرَاقَةَ فَإِنَّ الشَّاخِزِينَ النَّاسَ لِلشَّيْطَانِ كَمَا إِنَّ الشَّاخِزِينَ الْغَنَمَ
يَلْزِقُ يَبْطُ يَعْنِي كَرْدَهُ عَظَمَ كَسَاتُورَهُ، اس لئے کہ اللہ کا ہاتھ بڑی جماعت کے سر پر ہے اور دیکھو مجمع سے الگ مت ہو، اس لئے کہ مجمع سے نکلا ہوا آدمی شیطان کے لئے ہے، جیسا کہ ریوڑ سے الگ رہی ہوئی بکری بھڑیے کے لئے ہوتی ہے فقط، سو بالفرض بغرض محال مولوی صاحب کی جھوٹی بات یعنی فقط حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کا بیٹی ہونا اگر سچ بھی ہو تب مرتبہ صحت سے تو آگے چلنے ہی کی نہیں، پھر اس کو اصح اقوال پر ترجیح دینے میں تمام عالم سے علیحدہ ہونا ہے۔ سو اس وجہ سے شیطان کے زمرہ میں داخل ہونا مولوی صاحب کو مبارک سبحان اللہ

ہر یکے را بہر کارے ساختند مہراواند دلش انداختند

شیعوں کو خداوند کریم نے غلطی ہی پر جمے رہنے کے لئے پیدا کیا ہے، جو ایسے ایسے براہین قاطعہ سن کر بھی باز نہیں آتے، اور جیسے اندھا دن کو بھی نور آفتاب فیض نہیں ہوتا، یہ گوران دین بھی ان دلائل سے جو مثل آفتاب روشن ہیں مستفیض نہیں ہوتے، الغرض روایت مشکوٰۃ کے مزج ہونے میں وہی متردد ہو سکتا ہے۔ جو دن کو آفتاب کے ہونے میں متردد ہوتا ہے۔

شیعوں کی پیش کردہ روایت سے بشرطاً لیکن ایسے حجتی لائیتوں کی حجت جواب بھی نہ مانیں یہیں
 حجت بھی بہت ثابت نہیں ہوتا بھی ختم کر دینی ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں کہ سلمنا
 علماء شیعہ کی رائے غلط ہی صحیح سہی، اور روایت مشکوٰۃ کو روایت مندرجہ صحیحہ مولوی
 صاحب پر ترجیح نہ سہی، لیکن جھوٹی بات کسی طرح پاؤں نہیں چلتی، اب بھی شیعوں کی
 مطلب براری اس روایت سے نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو روایت اس مضمون کی شیعوں
 کی چالاکی سے بعضی گمنام کمیاب سنیوں کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہے، تب اس میں
 ایسا لفظ کوئی نہیں جس سے بہت ثابت ہو جائے۔ بلکہ لفظ اَعْطٰی واقع ہے جو بہ اور
 عاریت دونوں میں استعمال کرتے ہیں۔ دفع تردد کے لئے اس روایت ہی کو بعینہ
 نقل کئے دیتا ہوں۔

صواعق محرقہ میں جو درباب رد و اقص تصنیف ہوئی ہے، ابن حجر مکی کی دفتار
 میں ابو بکر صدیق کے، اس روایت سے اگرچہ شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے، ابو بکر صدیق کی
 فضیلت ہی نکلتی ہے اور شیعوں نے ہر چند طعن کی بات گھڑی تھی پر خوبی قسمت سے
 تعریف ہو گئی ہے گو مولوی صاحب اور ان کے اتباع کو وہ پھر بھی عیب ہی نظر آئے۔
 سے چشم بداندیش کہ برکت دہ باد : عیب نماید ہنرش در نظر
 خیر وہ روایت یہ ہے۔

اخرج الى فظ ابن شيبه ان زيدا اهذ الامام الجليل قيل له ان
 ابا بكر انتزع من فاطمة، فقال انه كان رحماً و كان يكره ان
 يغير شيئاً تركه رسول الله صلى الله عليه وسلم فانت فاطمة
 رضي الله عنها فقالت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اعطاني
 قدك فقال هل لك شاهد فشهد لها علي و أم آيمن فقال لها
 فسر هل و أم آيمن انة تتقينها ثم قال و الله لو رجع الامر فيها
 الى لفضيت بقضاء أبي بكر۔

حاصل یہ ہے وہ حافظ عمر بن شیبہ نے کسی سند سے بیان کیا ہے، کہ حضرت زید سے

جو امام جلیل القدر ہیں یعنی زید بن امامین عابدین سے کسی نے کہا کہ ابو بکر صدیق نے حضرت فاطمہ سے فدک چھین لیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ بڑے رحم دل ہیں (یعنی ان سے ایسا کام کب ہو سکتا ہے یہ تو سنگدلوں کا کام ہے وہ تو بڑے رحم دل تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی انداز کے بدلنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا، اور اس کے بدلنے سے ان کو کراہت آتی تھی، سو حضرت فاطمہ ان کے پاس تشریف لائیں اور یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو فدک دیا تھا، سو انہوں نے فرمایا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے، اس پر حضرت علی اور حضرت ام ایمن نے گواہی دی، انہوں نے فرمایا کہ ایک مرد اور ایک عورت سے تو حق ثابت نہیں ہو سکتا، اس کے بعد حضرت زید فرماتے ہیں کہ واللہ اگر یہ مقدمہ میسر یہاں رجوع ہو تو میں اس میں وہی حکم دوں جو ابو بکر صدیق نے حکم دیا۔ فقط،

اب غور فرمائیے کہ یہ ہر چند انفر کردہ کذابان شیعہ ہی جو بظاہر بخیلہ تقیہ متقی اور بباطن بدکردار تھے۔ لیکن موافق مثل مشہور، "حق بر زبان جاری شود، لفظ و ہبہا" جو صریح ہبہ اور تملیک پر دلالت کرتا تھا، واضعان روایت کو نہ سوچھا، لیکن تعریف صدیق اکبر صاف صاف کہنی پڑی، اور یہ تعریف بھی کیسی کچھ؟ اور وہ بھی امام زادہ سے، اور امام زادہ بھی کون؟ جو خود بھی جلیل القدر اور والد ماجد تو ہیں ہی،

خیر منصفوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اگر یہ روایت جملہ عیوب قاصح اعتبار سے مبرا ہو، اور پھر ہمدرد روایت مشکوٰۃ بھی ہو تب بھی اعطاء سے بدو وجہ ہبہ ثابت نہیں ہوتا۔ اول تو یہ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ جواب از قبیل مما شئت مع الخصم، یعنی بطور تنزل اور تسلیم ہے، یعنی اگر تسلیم کیجئے کہ چھین ہی لیا تھا۔ تو اس کی نلانی وجہ بھی مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس روایت سے ہبہ کا ثبوت نہ ہوگا، بلکہ انکار نکلیے گا۔

لفظ عطاء ہبہ اور عاریت میں مشترک ہے | دوسرے یہ کہ اردو میں اعطاء کا ترجمہ دینا ہے۔ سو اس پر مسلمہ حدیث سے استدلال جیسے ہبہ میں دینا اور اعطاء بولتے ہیں ایسے ہی عاریت میں بھی یہ دونوں لفظ دونوں زبانوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور سند اس کی حدیث صحیح

مقبول الطرفین ہے، وہ حدیث یہ ہے۔ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
يَوْمَ خَيْبَرَ لَا تُعْطَيْنَ الْمَنَآئِدَ اَعْدَاءُ رَجُلًا يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمُحِبُّهُ اللَّهُ وَ
رَسُولُهُ الخ مطلب یہ ہے کہ ”غزوہ خیبر میں حضرت علی کے جھنڈا عنایت کرنے سے ایک
روز پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ کل کو لشکر کا جھنڈا ایسے شخص
کو دوں گا جو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محب اور خدا و رسول صلعم کا محبوب ہو، فقط“
اب غور فرمائیے کہ اس حدیث میں بھی اعطاء کا مادہ موجود ہے، پر کسی نادان کو بھی یہ دہم
نہیں ہو سکتا کہ جھنڈا ہتھ کر دیا، بلکہ جیسا دستور ہے کہ چہر اس سپاہیوں کو، اور قلمدان
وزارت و زیروں کو، اور خزانہ کی کنجیاں خزانچوں کو دیدیا کرتے ہیں، اور وہ دینا بطور امانت
ہوتا ہے اسی لئے جب ان کو معزول یا موتوف کر دیتے ہیں، تو یہ سب اشیاء چھین لیتے
ہیں، ایسے ہی سپہ سالاران کو جھنڈے کا دیدینا بھی بوجہ دیانت ہوتا ہے خصوصاً رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کہ اس زمانہ میں بلکہ اصحاب کرام کے زمانہ میں ہر
جہم کیا ہر لڑائی کا ایک جدا ہی افسر ہوتا تھا، اور اس لڑائی میں تو خود سرور کائنات علیہ
وعلی آلہ افضل الصلوٰت واکمل التحیات ہی سپہ سالار تھے، فقط لڑائی کے وقت حضرت
امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو اس قدر انبوهہ کا افسر کر دیا تھا، جو مقابلہ پر بھی بھیجے گئے
تھے، الغرض جھنڈا عطا کرنا بطور امانت تھا۔

اور جب عطاء اور اعطاء امانت میں بھی مستحل ہوتا ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ
زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا اِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَانِي فِدَكَ
یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو فدک عطا فرمادیا ہے۔ یا میں معنے ہو کہ فدک
مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کے لئے مستعار دے رکھا ہے۔ اور
محاصل اس کامیے کے لئے معاف تھا۔ سو گو اس کو اپنا مملوک نہیں سمجھتی۔ لیکن آخر تم کسی
نہ کسی کو اس کو یا اس کے محصول کو دو گے ہی، سو مناسب یوں ہے کہ ہمارے ہی پاس
رہے۔ کیونکہ ہمارے پاس پہلے سے بھی ہے، اور اس کے محصول کو ہم مدت سے کھاتے
ہیں، تم اس کے محصول کو مثل محصول دیگر متروکہ بنوی علیہ صا جبہا الف الف صلوة وسلم

کے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسم نہ کرو۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا باوجودیکہ رحم دل تھے چنانچہ حضرت زید نے فرمایا ہے، اور رحم دلوں کا یہ کام نہیں کہ ایسی سنگدلی برتیں، اور وہ بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بنت رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جن پر مکافات رحمت پوری تمام عالم کو رحم کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ ابوبکر صدیق جیسا بنیاد رحمہاں اس وجہ سے تصور فرمانا چاہیے، کہ مثلاً قریب وفات سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التسلیمات نے فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو برائے چندے مستعار عطا فرمایا ہو، پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ قصہ معلوم نہ ہوا ہو، بلکہ بایں نظر کہ مدام فدک میں تصرف مالکانہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، بجائے خود یہ سمجھے ہوئے تھے کہ فدک بھی حسب ایمان حدیث مَا تَرَکْنَا لَا صَدَقَہُ کے (جس کا مذکور عنقریب ہی آتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ) وقف عام ہے، اس میں اچانک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یہ بات سن کے اس وقت جان صدیق رضی اللہ عنہ شگنہ میں آگئی کہ نہ ادھر ہوئے۔ نہ ادھر ہوئے، رعایت رضا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک طرف، اور پابندی اتباع سنت نبوی علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام جس کی طرف حضرت زید نے بایں لفظ اشارہ نہ فرمایا وَكَانَ يَكُونُ أَنْ يُفَيِّرَ أَخِيَّ اَبَاكَ، اور دونوں جانبیں واجب الرعايت

مگر چونکہ رعایت جانب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بھی مبنی وجوب اتباع نبوی و اقتدار مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر تھی، اور پاسدار فی قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت اور فرضیت ہر چند کبراتب موکد ہے، لیکن لم اوسکی یہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے ”بمگر گش گیر تا بہ تپ راضی شود“، تو جیسا کہ آیت لَا تَقْلُ لَهُمَا آفٌ وَكَأَنَّ تَهْرُ هُمَا میں ممانعت تو بظاہر ہوں۔ کہنے اور جھڑکنے سے ہے۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ جب ہوں کہنے اور جھڑکنے سے رکیں گے تو گالی گفتار اور جونی پھیرا بدرجہ اولیٰ نہ ہوگی، تو

ایسے ہی پاسداری قرابت سے بھی مقصود یہی ہے کہ جب امور دینی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناخوشی گوار نہ کریں گے۔ تو امور آخریہ میں تو بالاولیٰ مطیع و متقاد رہیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول کر کے بھیجنا اصل امور دینی کی اصلاح کے لئے ہے، خصوصاً حقوق مالی میں اور وہ بھی فدک۔ کہ بشہادت دستور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی حق تلفی کافی الجملہ خلیجان ساتھ لگا ہو۔

کیونکہ تادم آخرین حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ مصرف فدک ہے، معہذا اہل حق موقع رعایت میں رعایت والوں کو زیادہ دبایا کرتے ہیں۔ اس لئے انصاف والے اپنوں کی رعایت نہیں کیا کرتے، تو ان وجہ سے مزج اور وجہ یہی تھا کہ محاصل فدک میں دستور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہرچہ بادا باد دستور العمل رکھئے۔

لیکن حکم فاکا یذرت ککھہ لا یثرت ککھہ کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بسبب کمال اخلاص اور نہایت پاس و نیاز کے اس بات کے جو یا ہوئے، کہ تا مقدر دلداری حضرت زہرا کی جائے، اور جس قدر بن سکے خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر میل نہ آنے دیجئے۔ بایں ہمہ اپنی غلط فہمی کا جدا احتمال۔ اس لئے طالب شہود ہوئے۔ تاکہ شاید کسی گواہ کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس بات کی طرف پایا جائے۔ کہ گو ترکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقف عام ہے لیکن پھر بھی مستعیر یا اقربا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اولیٰ اور اقدم ہیں، چونکہ حضرت ابو بکر صدیق بوجہ پاسداری قرابت نبوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے دو ٹوک بات کہنے میں متامل اور متردد تھے اور اپنا مافی الضمیر دیکھتے کہ میں وہی کروں گا۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے راجحاً وہی سہی جو گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آشکارا نہیں کہہ سکتے تھے۔

تو خدا ساز غیب سے تذارک ہوا۔ اور حکم ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً ایسے جو شخص خدا سے ڈرے۔ خدا اس کے لئے بلاؤں سے نکاسی کی صورت کر دے ہے۔ وہ لطیفہ غیبی پیدا ہوا کہ جس سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رنجش کا کھٹکا بھی جاتا

ہا، یعنی گواہ ملے تو ایک مرد اور ایک عورت ہی ملی، نصاب شہادت بھی پورا نہ ہوا، جو کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہے، بلکہ ایک عذر معقول ہا تھا آیا اور عذر معقول اہل عقل اور دینداروں کے نزدیک مقبول ہی ہوتا ہے وَالْعُذْرُ عِنْدَ كِرَامِ النَّاسِ مَقْبُولٌ اس لئے ہم بالیقین جانتے ہیں کہ یہ بات موجب مزید اقتدار حضرت ابوبکر صدیق نہیں تو باعث رفیع رنج قلب پاک حضرت زہراؑ تو ضرور ہی ہوئی ہوگی،

چنانچہ حضرت فاطمہ زہراؑ رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہو جانا جو شیعوں کی کتابوں کے حوالہ سے عنقریب انشاء اللہ مذکور ہو گا۔ اس بات پر شاہد ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول وَاللّٰهُ لَوْ رَجَعَ الْاَمْرُ اِلَيَّ لَحَمَكْتُ فِيْهَا بِمَا حَكَمَ الْبُؤْسُ بِعَنِي وَاللّٰهُ اَكْبَرُ یہ مقدمہ میسر پاس رجوع ہوتا تو میں وہی حکم کرتا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا، با واز بلند یہ کہتا ہے کہ حضرت زہراؑ کو حضرت ابوبکر سے کچھ ملال نہ تھا، اور تھا تو انجام کار باقی نہیں رہا، بلکہ مبدل بخوشی ہو گیا تھا ورنہ اگر ابوبکر صدیق سے حضرت فاطمہ زہراؑ رضی اللہ عنہا اس جہاں سے ناخوش تشریف لے جاتیں تو اہلبیت میں سے ایک بھی ابوبکر کو بھلائی سے یاد نہ کرتا، چہ چاہیں کہ ایسی بڑھکے تعریف؟، القصہ اگر علمائے شیعہ کو ہمارا یہ کہنا کہ یہ روایت موضوع ہے مسلم ہو تو فہم، ورنہ اس روایت میں کوئی بات خلاف اہل مذہبیت کو نہیں پہنچتی، جو علمائے شیعہ دہن دہیدہ ہو کر زبان دراز کریں۔ اور الزام اہلسنت کے لئے اس روایت کو زبان پر لائیں، ہاں اگر توجیہ وجیہ جو مذکور ہوئی، نہ بن پڑے تو البتہ شیعوں کی فی الجملہ کچھ بن پڑے۔

لفظ عطا کو بمعنی ہبہ بنانے | مگر شاید علماء شیعہ بعد تجسس بسیار وجد و جہد بیشمار یوں بات کی ناکام کوشش بنانے لگیں کہ ہر چند عاریت کے موقع میں اعطاء کا استعمال ہونا مسلم،

لیکن یہ معنی حقیقی ہیں اور عاریت معنی مجازی، اس لئے استعمال میں جب تک کوئی قرینہ صارفہ معنی ہبہ سے نہ پایا جائے، تب تک معنی عاریت مفہوم نہیں ہو سکتے، سو اول تو یہ بات ہی غیر مسلم، مستدل و مدعی کو لازم ہے کہ دعوائے بے دلیل زبان پر نہ لائے، ورنہ

ایک حرف خفیف لانسلم میں وہ دعوائے مسترد ہو جائے گا۔

اور یہ بھی نہ سہی، جیسے علمائے شیعہ ایک دعوائے بے دلیل پیش کر کے بزعم خود اہلسنت کے سامنے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، ہم بھی ایک بے دلیل یوں دعویٰ کرتے ہیں، کہ یہ لفظ ان دونوں فردوں میں مشترک مفہوم ہے، یا ان دونوں معنوں میں مشترک لفظی ہے اور یہ دعوائے ایک وجہ سے بہ نسبت دعویٰ علمائے شیعہ معقول بھی ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ لفظ اپنے معنی موضوع کہ میں مستعمل ہو، سو اس صورت میں ہر ایک معنی کے لئے کوئی قرینہ چاہیے جو دوسرے معنی سے صارف ہو۔

تعیین معانی کے لئے قرآن کی بحث | معہذا یہ کچھ ضرور نہیں کہ قرینہ مذکور لفظی ہی ہوا کرے، اور وہ بھی لفظ کثیر المعنی کے پس و پیش ہی لگا ہوا ہو، بلکہ قرینہ کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ مخاطب کو فہم مطلب میں غلطی نہ پڑے، سو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے بعد از نبی دینے مسند خلافت اس بات کی تحقیق کی ہو، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترک مملوک کیا کیا ہے، سو اس تحقیقات میں یہی متحقق ہو گیا ہو کہ فدک تادم باز پس مملوک مقبوضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہا، بلکہ خود حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر اہلبیت کے اقراروں سے یہ بات ثابت ہو گئی ہو۔ اور ظاہر بھی یہی ہے۔ کیونکہ ایسی بات گھر ہی کے لوگ جانا کرتے ہیں۔

لیکن جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بطور خود اس کا بندوبست اور جمع خرچ کرنا چاہا، تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بایں وجہ کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دے رکھا ہے، مزاحم حال ہوئی ہوں، اور اس حجت سے یہ غرض ہو کہ گو فدک ہمارا مملوک نہیں لیکن اولیٰ یہ ہے کہ یہ ہمارے پاس ہی رہے، اور اس کی آمدنی ہمارے ہی پاس آیا کرے، اب منصفان شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ بشہادت قواعد علم مناظرہ مدعی کے خصم کے لئے بھی تو احتمالات ممکنہ خلاف دعوائے مدعی ہی کفایت کرتے ہیں۔ سو اس احتمال کے امکان میں اہل عقل تو کیا امکان ہے جو انکار کریں؟ اور ایسے ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد وقوع اس ماجرا کے حضرت زہرا کا یہ فرمانا کہ مجھ کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، بجز عاریت اور کسی معنی پر محمول نہیں ہو سکتا۔ اور یا وجود ملوک نہ ہونے کے پھر اتنا حکم بوجہ ناز اہل بیت و نیاز صدیق اکبر جو خصوصاً اس موقع میں کہ رعایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئے اور کئے کے بھروسے ہر صحابی خلفاء پر محکم کر لیتا تھا، چہ جائیکہ اہلبیت؟ اور ان میں سے بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور وہ بھی حضرت صدیق اکبر پر، کہ نیاز مند خاص اہلبیت تھے، رضوان اللہ علیہم اجمعین،

حضرت عمر کا بوجہ قرب سجد حضرت عباس کے پرنا لے کا ٹوڑا لٹا، اور ان کا یہ حکم کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کا لگایا ہوا تھا تم نے کیوں ٹوڑا؟ اور پھر حضرت عمر کا اس پرنا لے کو اپنے ہاتھ سے درست کرنا کتابوں میں مذکور ہے لیکن۔ ع۔ ہر سخن دقت و ہزکتہ مکالمے دار و بہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ حکم برسر، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ حدیث قاتر کنا صدقہ جس کا ذکر قریب ہی انشاء اللہ تعالیٰ آتا ہے۔ مجبور تھے، اور پھر گواہوں کی تقریر سے بھی کچھ عقدہ کشائی نہ ہوئی، کوئی اشارہ کسی قسم کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس رہنے دینے پر گواہوں کی تقریر سے ظاہر نہ ہوا۔

فدک کے لئے سیدہ کی | معہذا گواہی بھی اپنی مقدار معین کو نہ سمجھی، اور اوپر شہادت شہادت بھی ناممکن تھی | دستور نبوی شرکت فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی جس قسم اور جس مرتبہ کی کہی جائے، اس مال میں ثابت، القصہ روایت متنازع فیہا، اگر بیاس خاطر شیعہ تسلیم ہی کریں! تو کوئی بات خلاف مذہب اہلسنت اور مناقض حدیث مشکوٰۃ اس روایت سے نہیں نکلتی۔ بلکہ الٹی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف نکلتی ہے۔ سو علمائے شیعہ اگر اس روایت کو موضوع سمجھیں تو فیہا ور نہ اگر تسلیم کریں تو بجمع اجزا اہل تسلیم کریں۔

حضرت زید کے بارے میں | اور اگر یہ عندنا معقول پیش کریں، کہ ہر خدیہ روایت صحیح دریدہ دینی اور اس کا جواب ہے لیکن حضرت زید ہمارے عقیدہ کے موافق نعوذ باللہ منہا

کافر مرے ہیں، کیونکہ امامت حق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا تھا کہ وہ امام وقت تھے۔ اور امام ہر زمانہ میں ایک ہی ہوتا ہے، پھر جو انہوں نے جہاد کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو امام سمجھتے تھے اور جو شخص کہ امام نہ ہو اور با ایں ہمہ دعویٰ امامت کا کرے، تو وہ بعینہ ایسا ہی ہے، جیسا کوئی بنی نہ ہو اور پھر دعوائے نبوت کا کرے، سو جیسا وہ کافر ہے، بلکہ کافروں میں بھی اس شدہ ایسا ہی یہ ہے۔ پھر ان کی بات کا اپنے مذہب کی تائید میں کیا اعتبار؟ ہاں یہ ہونا فدرک کا جو مخالف مذہب حضرت زید یعنی مذہب اہل سنت ہے البتہ مقبول ہوتا، لیکن اس کو توجیہ عاریت نے نہ چلنے دیا تو اس کا جواب قاضی نور اللہ صاحب، سنیتوں کی طرف سے آپ دے گئے ہیں، اس لئے ہم کو کیا ضرورت کہ حضرت زید کی برتری کے اثبات میں در دسراٹھائیں؟ ان کی روایت نقل کئے دیتا ہوں، کہ ان کا لکھا شیعوں کے نزدیک وحی آسمانی سے بھی زیادہ ہے، مثل نوشتہء تقدیر کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا، قاضی نور اللہ صاحب مجالس المؤمنین میں فضیل بن یسار کے اقوال میں امالی شیخ ابن بابویہ نقل کر کے بروایت فضیل بن یسار ہی رستم فرماتے ہیں کہ ”گفت در محاربہ زید بن علی با طاغیان لشکر ہشام با او ہمراہ بودم، و چون بعد از شہادت زید بمکہ نہ رفتم و بخدمت حضرت امام جعفر صادق رسیدم، آنحضرت از من پرسید کہ اے فضیل باعم من در قتال اہل شام حاضر بودی؟ گفتم بے، انگاہ پرسید کہ چند کس را از ایشان کشتی؟ گفتم شش کس را، فرمود مبادا ترا شکے در استحلال خون ایشان باشد؟ گفتم اگر شکے دران میداشتم چرا ایشان را می کشتم؟ آنگاہ شنیدم

اے ترجمہ از ناشر ”فضیل نے کہا کہ زید بن علی کی لڑائی جو طاغیان ہشام کے ساتھ ہوئی تھی میں اس میں شریک تھا۔ حضرت زید کی شہادت کے بعد جب مدینہ گیا اور حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں پہنچا۔ تو آپ نے مجھ سے پوچھا کہ اہل شام کے ساتھ جو میسر چچا نے قتال کیا۔ تو اس میں حاضر تھا؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ اس وقت آپ نے پوچھا کہ تو نے کتنے شامی قتل کئے؟ میں نے عرض کیا چھ آدمی۔ فرمایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ان کا خون حلال ہونے میں شبہ ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھے کوئی شک ہوتا تو میں ان کو قتل کیوں کرتا۔ اس وقت میں نے سنا کہ آنحضرت نے فرمایا۔ الخ

کہ آنحضرت گفت، اَشْرَکْنِی اللّٰہُ فِی تِلْکَ الدِّمَاءِ وَاللّٰہُ زَیْدٌ عَلٰی حُصُو وَاَصْحَابُہٗ شَہَدَۃٌ مِّثْلَ مَا مَضٰی عَلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ وَاَصْحَابِہٖم اُنْتِہٰی بلفظہ فارسی کا ترجمہ تو اکثر جانتے ہی ہیں پر عربی کا ترجمہ لکھا پڑا۔ وہ دیوں ہے۔ خدا مجھ کو ان خونوں کے ثواب میں شریک کرے، واللہ حضرت زید میرے چچا اور ان کے اصحاب سب شہید ہیں، اور یہ سب قصہ ایسا ہی ہے۔ جیسا حضرت علی اور ان کے یاروں پر گذرا فقط، اب حضرت امام تالیق بحق امام جعفر صادق کی اس تمنا اور اس تشبیہ کو دیکھنا چاہیے! امام کے منہ سے جو لفظ نکلے تو سراسر صحیح ہے، سو اگر یہ تشبیہ صحیح ہو تو یہ معنی ہوں کہ حضرت زید کا حال حضرت امیر المومنین کے حال کے ہم پلہ تھا۔ تو اس صورت میں حضرت زید کا کافر ہونا تو غلط۔ البتہ زیدہ اولیا اور عمدہ اتقیا میں سے ہوں گے۔ ورنہ شہید ہونا کجا۔؟ اور پھر حضرت امیر کے حال کا ان کے حال سے مماثل ہونا تو محال ہی ہو گا؟ یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقیدہ اور عملاً اور حالاً حضرت زید متبع اور مطابق حضرت امیر کے ہوں فرق ہو تو مقدار ہی کا ہو۔ یعنی جیسے چھوٹی تصویر اپنے سے بڑے ذمی تصویر کے ہر بات میں سوا مقدار کے مطابق ہے، حضرت زید بھی حضرت علی کے (سوائے عظمت اور زیادتی مراتب کے ہر بات میں مطابق ہوں، سو یہ فرق اور انکمہ میں بھی ہے۔ حضرت امام باقر اور حضرت امام جعفر صادق وغیرہم بلکہ حسین رضی اللہ عنہم اجمعین درجہ میں کون سے حضرت علی کے برابر ہیں۔؟

نک کے بارہ میں حضرت زید کا قول ہی صحیح ہے۔ بہر حال حضرت زید کی بات باون تولہ پاؤرتی کی ہوگی خصوصاً ایسی اختلافی بات کہ جس میں بے غور لب کشائی نہیں کی جاتی۔ کیونکہ سنی شیعہ دونوں کے قول کے موافق بالاتفاق اس خلاف میں ایک طرف جنت اور ایک طرف جہنم ہے، بالجملہ روایت متنازع فیہا بالیقین موضوع ہے، اور بایں ہمہ موضوعیت جو سنیوں کی بعضی کتابوں میں پائی جاتی ہے، تو اول تو اس کا حال خوب مفصل معلوم ہو چکا۔ دوسرے اس روایت کو بغرض الزام شیعہ بھی درج کرتے ہیں کہ جو روایت تمہاری بنائی ہوئی اور تمہاری دستاویز اعتراض ہے، وہی روایت ہمارے مفید مطلب ہے۔

چنانچہ صواعق محرقہ میں حضرت ابو بکر صدیق کے فضائل ہی میں اس کو لکھا ہے۔ پر جو الٹی کے سمجھن ہار ہیں۔ وہ الٹی ہی سمجھتے ہیں، اور بے سوچے سمجھے ایسے ایسے مواقع میں سے بھی لوگوں کے دھوکا دینے کو (جیسا کہ مولوی صاحب نے کیا ہے) نقل کر دیتے ہیں چنانچہ مولوی عمار علی صاحب نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور پھر ہرگز شرم و حیا پاس کو بھی نہیں پھٹکتی۔

شیعہ قرآن و حدیث کے کسی اور اگر اس پر بھی علماء شیعہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ لفظ کے معنی متبادر مراد نہیں لے سکتے آئیں! اور شرم کی آنکھیں بند کر کے یوں فرمانے لگیں کہ گو اعطاء بمعنی عاریت بھی آتا ہے لیکن تاہم متبادر معنی ہیہ ہی ہیں خصوصاً۔ اس روایت میں، تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ متبادر ہونا ہیہ کا لفظ اعطی سے اس روایت میں مسلم، لیکن اول تو شیعہ ملفوظات ائمہ خصوصاً کلمات مرتضوی کے جو صحابہ کرام اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی مدح میں صادر ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اس سال میں بھی منقول ہوئے ہیں، معنی متبادر ہی لے کر شیعہ ہونے سے دست بردار ہوں، اور ایسے ہی آیات قرآنی جو صحابہ کی مدح میں وارد ہوئی ہیں، ان کو اپنے معنی متبادر ہی پر رکھ کر بدل و جان معتقد ہو جائیں، اس وقت اگر ہم --- سے اس قسم کی درخواست کریں، تو فی الجملہ بجا بھی ہے۔ اگر وہاں وہ مان جائیں، تو خیر جوں توں یہاں ہم مان جائیں، دوسرے اگر معنی متبادر ہی ہر کلام کے لئے جایا کریں تو پھر یہ فرق باریک نہیں وغیرہ سراسر لغو ہو جائے، اور اکثر غلط فہمیاں درست ہو جائیں، کیونکہ بیشتر سبب غلط فہمی کا یہ تبادر نہیں ہوتا ہے چنانچہ ظاہر ہے۔

اور اختلافات ائمہ اہلسنت اور ایسے ہی اختلافات باہمی مجتہدین شیعہ مبنی اس اصل پر ہیں، خاص کر اصولیوں اور اخباریوں کا اختلاف جو شیعوں میں باہم پیدا ہوا اس کی وجہ یہی ہے، کہ اخبار ظاہرہ پر عمل کرتے ہیں۔ اور جو معنی متبادر ہوتے ہیں۔ اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور اصولی اپنے عندیہ میں غور کر کے معنی مقصود شارع پر عمل کرنے ہیں، اور تبادر معانی ظاہر اخبار کا لحاظ نہیں کرتے، سو حضرت مولوی

عمار علی صاحب اگر اس روایت میں بوجہ تبادر معنی ہبہ ہم سے اُلجھنے کو تیار ہوتے ہیں، تو پہلے اپنے مذہب اصولیین سے دست بردار ہو کر اخباری بن جائیں۔ پھر ہم سے دو چار ہوں۔ اس وقت ہم بھی ناچار حکم کلّموا الناس علی قذر عقولہم اس رد و کد سے کہ عاقل کو ہر جگہ معنی متبادر ہی ملحوظ رکھنا چاہیے، جیسے عوام کا کام ہے؟ یا معنی محقق کی تحقیق ضروری ہے۔ جیسے محققین کا شیوہ ہے؟ اعراض کر کے دوسری طرح مولوی صاحب کے کان کھولیں گے۔

روایت فدک منقطع ہے | اعمیٰ ہم نے مانا کہ لفظ اعطاء کے معنی روایت متنازع فیہا میں ہی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہبہ ہی کر دیا تھا۔ لیکن مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام علمائے شیعہ اس میں کیا ارشاد کریں گے کہ یہ روایت منقطع ہے، حضرت زید اس زمانہ میں کہاں تھے؟ جب حضرت فاطمہ زہرا زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق سے دعوے ہبہ فدک کیا؟ یہ بات اگر بالفرض واقع میں وقوع میں آئی ہے تو قریب وفات حضرت سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات ظہور میں آئی ہے۔ بلکہ متصل بعد وفات ہی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ سو اس زمانہ کے وقائع کا مشاہدہ اور ان کی روایت اور شہادت بجز صحابہ اور کسی کا کام نہیں۔

قصہ حضرت زید کا یہ قول ایک قول بے سند ہے۔ کوئی بات بے سند متصل لائق اعتبار نہیں، ہاں اگر حضرت زید شیعوں کے امام ہوتے تو علم غیب کی وجہ سے سنیوں کو نہیں، تو شیعوں ہی کے نزدیک اُن کا قول حجت ہو جاتا؟ پر شیعوں کے نزدیک تو مومن بھی نہیں، چہ جائیکہ علم غیب اور امامت؟ ہاں منکر امامت امام وقت تھے جس سے دلی بھی کافر ہو جائے، اور سنیوں کے نزدیک گو حضرت زید اکابر اولیائیں سے ہوں۔ لیکن تاہم آدمی ہیں۔ جب تک سند نہ ہو کیونکر معلوم ہو کہ انہوں نے جس سے یہ بات سنی ہے وہ معتبر ہے کہ نہیں؟ صحابہ کی ملاقات میں تو احتمال ہے، باقی رہے تابعین سو ان میں جھوٹے سچے نیک و بد سب طرح کے ہیں۔

اور اگر بالفرض کسی معمر صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی تو بھی کیا لازم ہے کہ وہ صحابی اس وقت حاضر ہی تھے؟ یا ان کو کسی دوسرے صحابی سے یہ بات پہنچی ہی تھی، اور پھر حضرت زید نے بھی انہیں سے سنا ہو! احتمال ہے کہ جس صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی ہو۔ ان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہو؟ اور اگر معلوم بھی ہو تو انہوں نے ان سے نہ سنا ہو بلکہ کسی تابعی سے سنا ہو؟ بلکہ زبان زد عوام ایک بات دیکھ کر اسی کے موافق نقل کر دیا ہو، یا بطور تسلیم قول معتضین یہ بات فرمائی ہو؟ ہر حال احتمالات چند در چند قاذح اعتبار روایت موجود ہیں، پھر بایں ہمہ احتمالات کوئی کیونکر اس روایت کو دربارہ دعویٰ مہمہ فدک قبول کر لے۔

مشکوٰۃ کی روایت مرفوع متصل ہی | خصوصاً در صورتیکہ آیت اور روایت صحیح متصل بلکہ مرفوع اعنی روایت مشکوٰۃ اس کے مخالف موجود ہو مگر شاید کوئی کم فہم اس کے وقوع ہونے میں اس وجہ سے کلام کرے کہ روایت مشکوٰۃ میں بھی عمر بن عبد العزیز سے جو تابعی ہیں ایک روایت بے سند منقول ہے کیونکہ وہ بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ سو گو ہم کو بعد غیر معتبر ہو جانے روایت متنازع فیہا کے اس روایت کا غیر معتبر ہونا مضر نہیں لیکن تاہم بپاس خاطر شیعہ اس کسر کو بھی مٹائے دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں ہر چند حضرت عمر بن عبد العزیز ہی کا قول ہے۔ لیکن اس قول کو مغیرہ بن شعبہ جو صحابی ہیں۔ نقل کرتے ہیں۔ اور صحابی کا ایسی بات کو بیان کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ یا فرمایا ہے، حکماً مرفوع ہی چنانچہ واقفان اصول حدیث جانتے ہیں۔

معہذا قرینہ نقلیہ بھی اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا یہ فرمانا صحیح ہو۔ کیونکہ اس قول کو حجت (نہ لینے فدک کی) قرار دیتے ہیں، کوئی بات مفید مطلب اس سے ثابت نہیں کرتے، اور نہ لینے کے لئے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کا نہ دنیا حجت ہو سکتا ہے، اس سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہ دنیا ہو سکتا ہے۔ سو اگر یہ قضیہ ان کے نزدیک صحیح نہ ہوتا۔ بلکہ الظاہیہ کا

کرنا صحیح ہوتا تو ان کو کیا ضرورت تھی، کہ نقصان دنیاویوں کرتے کہ فدک کو دے دیا، اور نقصان دین یوں کرتے کہ جھوٹ بولا، اور جھوٹ بھی کس پر؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس کی سزا میں جہنمی ہونے کا وعدہ ہے، اور وعدہ بھی متواتر، کیوں کہ حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَى مُتَعَمِّدٍ أَفْلَيْتَبَوُّا مُقْعَدًا مِنَ النَّارِ جس کا ترجمہ یہ ہے جو شخص جان بوجھ کر میسر ذمہ کوئی جھوٹی بات لگا دے۔ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں کر لے۔ بالاتفاق محدثین کے نزدیک متواتر ہے، بلکہ متواتر باللفظ اگر ہے تو یہی بہر حال اگر روایت حضرت زید بن علی بن الحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہم موضوع نہ کہیں، اور چشم پوشی کر کے یوں تسلیم ہی کر لیں کہ واقعی یہ بات حضرت زید ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ تب اس کے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مٹ گیا ہے۔

فدک تادم آخر خاتم الانبیاء کے تصرف میں تھا معہذا جیسے علاماتِ صحتِ روایت مشکوٰۃ ظاہر ہیں، چنانچہ مذکور ہو چکا، ایسے ہی روایت متنازعہ فیہا کے علاوہ بے سند ہونے کے امارات کذب بھی ظاہر و باہر ہیں۔ کیونکہ باتفاق موزعین فدک تادم باز پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ اور بے قبض ہبہ موجب ملک موہوب لہ نہیں ہوتا۔ واجب ہی کی ملک میں رہتا ہے۔ اور ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال خود حضرت ابو بکر صدیق کو معلوم تھا کہ بعد وفات وقف ہو جاتی ہے، پھر جو دربارہ ہبہ گواہ طلب کئے، تو یوں کہیے، ابو بکر صدیق کی دنیا کی ہوشیاری اور ان مسائل کی واقف کاری کے کہ جو امور دنیا میں مفید پڑیں شیعہ بھی معتقد ہیں۔ جب نہ دنیا ہی ٹھیرا۔ تو ایسی مشکل راہ کیوں چلے جس میں اندیشہ بار جانے کا ہو۔؟

کیونکہ اگر گواہ اپنی مقدار معین کو پہنچ جاتے تو پھر یہ عذر بھی بے جا تھا۔ کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا، ہر کوئی یوں جانتا کہ سارے نہ دینے کے بہانے ہیں۔ اگر یہ عذر قابلِ سماعت تھا۔ تو پہلے ہی کیوں نہ پیش کیا اور اگر گواہوں کے طلب کرنے کو

شیعہ محول تحقیق حق پر کرتے ہیں، تو اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ خواہ مخواہ عدل و انصاف ہو گا۔ کیونکہ حکم خداوندی ہی کے موافق علم کیا ہے، کوئی قاعدہ نہیں گھڑ لیا، باقی ہیں جو کچھ تقریر دربارہ طلب گواہان لکھی ہے، اگر اس کو شیعہ تسلیم کر لیں تو چشم مارو شن دل ماشاد، ورنہ ان کی کوتاہ فہمی سے امید تو یہ نہیں۔

اگر فدک و رختہ تھا تو شخص واحد علاوہ بریں جب بالاجماع یہ بات مقرر ہوئی کہ فدک کا قبضہ بقیہ وراثہ پر ظلم تھا تا دم آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض میں رہا، تو باتفاق شیعہ و سنی اگر آپ نے ہبہ کیا بھی، تب بھی حضرت فاطمہ کی ملک میں نہ آیا پس حضرت فاطمہ جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں کہیں ایسا غلط دعوے کرتے ہیں جس میں بہر حال حق تلفی خلافت ہے؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی ہے تو وارثوں کی حق تلفی ظاہر ہے، ورنہ فقراء اور مساکین کی حق تلفی، یہ بھی نہ سہی بلکہ آپ کا ترکہ وقف ٹھیکر خلیفہ کو اختیار ہے جسے چاہے دیدے۔ پس اگر حضرت فاطمہ کے پاس آگیا تو اور بھی اچھا ہے، لیکن اس طرح فن و فریب سے لینا فریب بازوں اور دنیا سازوں کا کام ہے

بہر حال علامات صدق روایت مشکوٰۃ اور امارات کذب روایت متنازع فیہا اہل فہم کے نزدیک تو ایسی روشن ہیں، جیسے اہل نظر کے سامنے آفتاب یوں مولوی عمار علی صاحب یا ان کے آفران و امثال اگر نہ سمجھیں تو پھر ہمیں کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیا کہتا ہے، ان کے حسب حال پھر یہ شعر پڑھا جائے گا۔

گر نہ بیند بروز شیر چشم : چشمہ آفتاب را چہ گناہ

غرض روایت مشکوٰۃ کی وہ روایت ہم پلہ نہیں ہو سکتی جو اس کو چھوڑ کر اس روایت پر یقین کریں۔ بلکہ موافق قواعد مرقومہ بالا کے لازم ہے کہ بسبب تعارض روایت مشکوٰۃ کے (کہ وہ درحقیقت روایت ابو داؤد ہے، جو صحاح ستہ میں سے ہے اور صحاح ستہ کی روایات کی صحت اور قوت کو یہی بہت ہے کہ ان کا نام صحاح ہے) اس روایت کو جو حضرت زید کے نام لگا رکھی ہے، رد کریں۔

دعوے ہبہ بغیر قبض مسلم اور سلمان کہ روایت بھی صحیح اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نہیں، علامہ حلی کا فرمان کا ہبہ کا دعوائے کرنا بھی درست لیکن اتنی بات سنی و شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مسلم ہے کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا، تاوقتیکہ قبض و تصرف واجب کار ہے گا، اسی کی ملک بھی رہے گی، چنانچہ ارشاد علامہ حلی میں مطلب اول مقصد دعوائے میں مرقوم ہے **فَلَا تَسْمَعُ دَعْوَى الْهَبَةِ فَجَرَّدَةً عَنْ دَعْوَى الْقَبْضِ** یعنی نہ سنا جائے گا دعوائی ہبہ بے دعوائے قبض کے، اور فدک بالاجماع تادم واپس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں تھا، آپ حین حیات تک فدک میں تصرف مالکانہ کرتے رہے۔ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا دخل آپ کی زندگی میں نہیں ہونے پایا، اس بات میں مورخین طرفین، بلکہ محدثین فریقین متفق ہیں۔ مورخین کے اخبار کے لکھنے کی اول تو اس وجہ سے حاجت نہیں کہ کتب تواریخ پر ہر کسی کو عبور میسر آسکتا ہے، پر علم حدیث تک نوبت کسی کسی کی پہنچتی ہے۔ اکثر وں کو مضامین احادیث کی اطلاع نہیں ہوتی۔ دوم تواریخ کی بات اعتبار میں احادیث کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

دعوے ہبہ فدک کے بطلان پر اس لئے طرفین کی روایات احادیث ہی کی طرف اشارہ احادیث طرفین سے استدلال کئے جاتا ہوں، پہلے تو یہ وقف ہونے کے معنے میں ہی نہیں تراشے، سنیوں کی روایت لیجئے، اول تو وہی روایت مشکوٰۃ جو مرقوم ہو چکی اس بات پر تبصریح شاہد ہے۔ دوسرے مشکوٰۃ ہی میں ابو داؤد کی حدیث بروایت مالک بن اوس بن الحدثان مرقوم ہے جس میں اس بات کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے اس بات کے استدلال میں کہ مال فئے قابل تقسیم نہیں کچھ ایسا بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین چیزیں جدا جدا مصرف کے لئے وقف رکھیں تھیں۔ **بَنُو النَّضِيرِ خَيْرُ فِدَكٍ**، سو فدک کے مصرف کے بیان میں فرماتے ہیں، **وَأَمَّا فِدَاكُ فَكَانَتْ حَبًّا لِأَبْنَاءِ السَّبِيلِ** یعنی فدک مسافروں کی خدمت گزاری کے لئے وقف ہے اب حکیم قواعد مناظرہ تو ہمیں اپنی ہی کتابوں کا حوالہ بہت ہے، کیونکہ ورد و اعتراض کے

لئے ضروری ہے کہ ایسی بات ہو، کہ جس پر وہ اعتراض ہو، اس کے مسلمات اور مافی
ہو فی باتوں کے خلاف ہو۔ اور در صورتیکہ اس کے مسلمات کے خلاف نہ ہو تو اعتراض
اعتراض ہی نہیں، سو در صورتیکہ ہم نے اپنی کتابوں سے یہ ثابت کر دیا کہ فدک تاہم
باز پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں رہا اور پھر کتاب بھی ایسی معتبرہ، کہ
حجت، منجملہ صحاح ستہ ہے، تو پھر از روئے دعوائے ہبہ اعتراض ہی لغو ہو گیا۔ کیوں کہ ہبہ
بالا اتفاق طرفین بے قبض موجب ملک ہی نہیں۔

لیکن معتراض کا سکوت اور ہے، اور الطینان کچھ اور اتنی بات سے شیعہ
ساکت ہو جائیں گے۔ لیکن بجائے خود سنیوں کی بات سے ان کا دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔
اس لئے گذارش دیگر ہے، محتاج السالکین جو کتاب معتبر امامیہ ہے، اور نیز دیگر کتب
معتبر امامیہ میں روایت ہے جس کا اس جگہ فقط مضمون ہی لکھے دیا ہو۔ عبارت بعینہا
الانشاء اللہ آئندہ مرقوم ہوگی۔ اس کا مضمون یہ ہے

”جب ابو بکر صدیق نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ ان سے کھینچنے لگی۔ اور ملنا ملنا چھوڑ دیا،
اور پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ نہ بولیں تو یہ بات انہیں بڑی دشوار معلوم ہوئی۔ اسلئے
یوں چاہا کہ انہیں راضی کیجئے، سو ان کے پاس جا کے عرض کیا، کہ اے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی صاحبزادی آپ کا دعویٰ سچا ہے پر کیا کروں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو دیکھا ہے کہ تمہارے خرچ کے موافق ہمیں دیکر اور عاملوں کی مزدوری دے کر جو
کچھ بچتا تھا، اسے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے، انہوں نے
فرمایا۔ تو اچھا اسی طرح کرتے رہو۔ جس طرح میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کیا کرتے تھے، حضرت ابو بکر صدیق نے عرض کی، کہ لو میں قسم کھاتا ہوں کہ جیسے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، ویسے ہی کئے جاؤں گا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے
فرمایا کیا قسم بھی کھاتے ہو کہ اس طرح ہی کرو گے؟ آپ نے مکرر عرض کی کہ قسم خدا کی
میں اسی طرح کروں گا، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یوں فرمایا، کہ خدایا تو
گواہ رہ، سو اس بات پر راضی ہو گئیں اور عہد لے لیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق ان کا خرچ

دے کے باقی کو فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کو دیدیا کریں تھے فقط۔
 سنئے کہ حضرت ابو بکر صدیق کا یہ غدر کرنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
 اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس لئے آپ کے حوالہ کرنے میں مغذور ہوں، اور
 پھر حضرت فاطمہ کا اس میں کچھ انکار نہ کرنا، بلکہ یو فرمانا کہ اچھا بونہی کئے جاؤ۔ اور پھر اس
 پر خوشی سے راضی ہو جانا، صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تادم باز سپیں رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قبض و تصرف تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا قبضہ
 نہیں ہوا تھا۔

پس حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دعوے بہہ میں
 تکذیب نہیں کی۔ تصدیق ہی کی، لیکن قانون شرعی کے موافق عمل کیا، تاکہ آپ ناحق دینے
 کے وبال سے، اور حضرت فاطمہ ناحق لینے کے عذاب و نکال سے محفوظ رہیں، اور یا انہم
 جو گواہ طلب کئے۔ تو اسی لئے طلب کئے ہوں، کہ اگر گواہوں سے یہ بات ثابت ہو جائے
 کہ واقعی فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بہہ کر دیا
 تو گو بسبب عدم قبض کے اب تک ان کی ملک میں نہیں آیا۔ لیکن پھر اولے ہی ہے، کہ
 حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کیا جائے، پر اس کو کیا کیجئے کہ شہادت اپنے
 نصاب کو نہ پہنچی، اور بحمد دعوے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جو ان کے حوالہ نہ کیا
 تو اسکی وجہ ان شاء اللہ آگے مذکور کی جائے گی، امیدوار باید بود۔

مگر شاید کسی شیعہ مذہب کو یہ غلجہان ہو کہ ابو بکر صدیق کی یہ احتیاط کہ حضرت
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہہ میں بھی (اور بہہ بھی حضرت فاطمہ کے لئے) وہی
 شرط قبض و تصرف ملحوظ رہی، کچھ دل کو نہیں لگتی، بلکہ از قبیل دغا و فریب معلوم ہوتی ہے
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو اشارہ بھی کافی تھا، آپ کا اشارہ اور اوروں کا فعل تام
 بھی برابر نہیں ہو سکتا، سو اس وہم کو خدا ہی دل سے کھوئے تو کھوئے، یہ اسی قسم کا وہم
 ہے جو ہنود اور یہود اور نصاریٰ اور مجوس کے دل میں بہ نسبت رسول اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم اور خوارج کو بہ نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کھٹکتا ہے، ان مردودوں کو

بھی یہی گمان ہے کہ یہ دعوے رسالت اور امامت جو ان دونوں صاحبوں سے منقول ہے۔ ایک دنیا طلبی کا ڈھنگ تھا، کچھ دل کو نہیں لگتا۔ بلکہ از قبیل دغا و فریب معلوم ہوتا ہے۔ ع۔ بدگماں و ہم کی دار و نہیں لقمان کے پاس۔

دوستو! اہل عقل اور اہل انصاف سے بات کہے ہر کسی کا دل شاد ہوتا ہے، پر جاہل نادان نا انصاف دریدہ دہان دراز زبان سے بات کہہ کے بجز اس کے کہ اپنا مغز خالی ہو، اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، ان کا علاج تو ذرہ ہے، یہاں حدیث و قرآن اور دلائل عقلیہ کا بیان نہیں چلتا، پیروں سمجھ کر کہ جہاں چار نادان ہوتے ہیں وہاں ایک عاقل بھی ہوتا ہے۔ مولوی صاحب سے امید فہم نہیں تو کیا سارے علماء شیعہ ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں؟ اپنا مافی الضمیر عرض کرتا ہوں۔

مسئلہ شہادت اور شاہدین کی تعداد پر محققانہ بحث۔

طرح ہو جس طرح شیعہ گاتے پھرتے ہیں۔ اور بفرض محال حضرت ابو بکر صدیق نے گواہ طلب کئے ہی، تو اولیٰ تو اس کی وجہ کہ کیوں گواہ طلب کئے؟ مذکور بھی ہوئی ہے۔ دوم انشاء اللہ اور وجہ بھی معلوم ہو جائے گی، لیکن در صورتیکہ یہ مقدمہ کسی وجہ سے ہو۔ گواہ طلب کرنے کے قابل ہو، تو بلا شبہ پھر گواہ گواہوں ہی کی طرح چاہیے۔ نہیں تو مفت کا درد سہر تھا۔ سو علماء شیعہ ہی فرمادیں کہ گواہوں کی کیا مقدار کلام اللہ میں بیان فرمائی ہے؟ اور اس میں پھر کسی کی کچھ تخصیص بھی ہے کہ فلانی قسم کے آدمی ہوں؟ تو پھر کچھ اس عدد اور اس کیفیت کی ضرورت نہیں، معہذا صدق نیت حضرت ابو بکر صدیق پر یہ بات گواہ ہے۔ کہ ان کی خلافت میں جو حضرت عثمان نے ان سے یہ بات کہی، کہ میں نے مرض و وفات میں سرور کائنات علیہ افضل الصلوات و اکمل التحیات حکم کے بلوالینے کی اجازت لے لی ہے، تو انہوں نے ان سے بھی گواہ طلب کیا۔ اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ کچھ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بزرگ شیعہ کاوش بھی تھی تو حضرت عثمان سے تو بزرگ شیعہ و سنی محبت اور موافقت اور دوستی ہی تھی، پھر کچھ

دنیا بھی نہیں پڑتا تھا۔ شیعہ مذہب نہ تھے جو تفتیہ کا احتمال ہو، پھر جو حضرت عثمان سے انھوں نے گواہ طلب کئے تو کیوں کئے؟ یہ باتیں کمال دیانت اور استقامت پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن شیعہ اپنی عداوت سے ناچار نہیں۔ کینہ بیجانے ان کا قلب تیرہ و تار کر دیا ہے، حق و باطل کی تمیز نہیں رہی، اچھی باتوں کو بُرا اور بری باتوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سو اس کا جواب تو ہماری طرف سے چھ سو برس پہلے شیخ سعدی کہہ گئے ہیں۔
سے چشم بداندیش کہ برکنده باد ❖ عیب نماید ہنرش در نظر۔

باقی یوں کہنا کہ گواہ ثبوت و دعوائے کے لئے ہوتے ہیں۔ اور جب مدعی کی طرف سے خاطر جمع ہو کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ گواہ طلب کئے جائیں، تو اس کی جوابدہی خدا کے ذمہ ہے۔ کیونکہ خدا ہی نے علی الاطلاق یہ حکم دیدیا ہے کہ بڑوں کو گواہ اعتبار نہ کیا کرو، یہ قانون سینوں نے نہیں گھڑ لیا۔ بہر حال خداوند کریم نے اہل بیت یا اصحاب یا کسی ولی یا صالح کا استثناء نہیں کیا۔ سینوں کو تو خدا کے اتباع سے کام ہی شیعہ بھی اگر اتباع خداوندی کریں تو فہما نہیں اپنا سر کھائیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو سنی یہ حکم کا ہے کو مانتے۔ کہ ابر کے دن اگر کوئی شخص چاند دیکھے اور اس کی گواہی بسبب تنہائی یا اتہام فسق و فجور قاضی قبول نہ کرے تو لازم ہے کہ وہ سب کے شریک حال ہے۔ اور روزہ رکھے، یا گردوغبار میں محاق کے دوروز کے اعتبار سے اگر کبھی انتیسویں کا چاند ہوتا تو انتیسویں کو افطار کر لیا کرتے، علیٰ ہذا القیاس صلحا اور علما یا صالحات عورتوں کی گواہی میں یہ قید لغو ہو جاتی بلکہ جن کفار کا صدقِ مقال تجربہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے نام کے مسلمانوں سے زیادہ سچے نکلتے ہیں ان کا کہنا خواہ ایک ہو یا زیادہ قبول ہوا کرتا، بالجمہ اس بات میں اپنے اطمینان کا اعتبار نہیں، پابندی قوانین مدنیہ نظر ہے، تاکہ امتحان عبودیت اور خود مختاری ہو جائے۔

ہاں حکمت اور مصلحت اس قانون میں البتہ یہی ہے کہ ثبوت حق ہو جایا کر

سو اگر رائے پر حکام وقت کے چھوڑ جائے، تو اول تو اندیشہ رو و رعایت، دوسرے ہر کسی کو یہ دعوے ہو سکتا ہے کہ میری بات قابل اطمینان ہے۔ پس جس صلح اور انتظام کے لئے حکام مقرر کئے جاتے ہیں، وہ صلح اور انتظام تو درکنار؟ البتہ فساد اور جنگ و جدال کی توقع ہے۔ اس لئے قانون کلی مقرر کر دیا جس میں اکثر مصلحت مذکور پائی جائے، سو برخلاف اس کے اگر کسی صورت میں کبھی مصلحت مذکورہ نہ بھی پائی جائے گی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

الغرض یہ وہم و گم کہ حضرت فاطمہ کے صدق مقال کے بالاتفاق شیعہ و سنی قائل ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہوئی کہ گواہ طلب کئے گئے؟ اس مطالبہ گواہان سے حضرت فاطمہ کی طرف سے بدگمانی ٹپکتی ہے، یا نادھندی کی بو آتی ہے، بسبب کوتاہ فہمی کے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں فہم والوں سے کلام ہے: نادانوں سے کام نہیں۔

سید تو ضابطہ شہادت کی معین اسب جانتے ہیں کہ مدار بزرگی اطاعت خداوندی پر بہت زیادہ پابند ہوں گی ہے چنانچہ کلام اللہ میں خود فرماتے ہیں اِنَّ اَمْرَ مَكَّةَ عِنْدَ اللّٰهِ اَقْفٰكُمۡ یعنی بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ تنظیم تکریم اسی کی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، تو اس صورت میں لازم پڑا کہ ان قوانین کی رعایت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ تر ہو اور جو ان قوانین کی رعایت کرے وہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ محبوب اور اسی آپ کے دل میں زیادہ جگہ ہو۔ سو حضرت ابوبکر صدیق کا گواہوں کا طلب کرنا بقرنیہ آیت مذکورہ موجب نشاط خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہوا ہوگا۔ پھر نہ معلوم کہ شیعہ کیوں لڑے مرتے ہیں۔ یہ وہی مثل ہر کہ مدعی اور مدعا علیہ تو راضی ہو گئے۔ پر قاضی؟ راضی نہیں ہوتے۔

اور اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ گواہوں کا جھوٹا جاننا کچھ اور ہے اور ان کی گواہی کے موافق حکم نہ دینا کچھ اور ہے؟ جب تک کہ شہادت اپنی مقدار کو نہ پہنچے، یعنی دو مرد عاقل بالغ یا ایک مرد اور دو عورتیں باہم نصف موصوف نہ ہوں تب تک حاکم کو جائز نہیں، کہ ان کے کہے کے موافق مدعی کی ڈگری کر دے۔ اگرچہ کیسے ہی معتبر کیوں نہ ہوں۔ اور ان کے کہنے سے کتنی ہی تسلی کیوں نہ ہو جائے

سو اس حکم نہ دینے اور ڈگری نہ کرنے کو کوئی نادان ہی یوں سمجھے تو سمجھے۔ کہ گواہوں کی تکذیب کی، ہاں در صورتیکہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ایک مقدمہ میں موافق مدعی کے متفق اللفظ ایک بات کہیں، تو پھر بجز عدم اعتبار گواہان کے کوئی صورت ڈگری نہ کرنے اور مدعا علیہ سے قسم لینے اور مدعی کے دعوے کے نہ سننے کی نہیں۔ سوشیعوں کے کہے موافق اگر اس روایت کو ہم تسلیم بھی کر لیں تب ظاہر ہے کہ حضرت علی اور حضرت ام ایمن کی گواہی نصاب مذکور کو نہیں پہنچتی بلکہ حضرت حسنین کی گواہی مل کر بھی دجیسا کہ جناب دروغ مآب مولوی عمار علی صاحب پتھر لگاتے ہیں، مقدار مذکور اور حد مسطور کو نہیں پہنچتی کیونکہ دونوں صاحبزادے اس زمانہ تک نابالغ تھے۔

سو اس گواہی کے موافق حکم نہ کرنے میں یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اور ان کے گواہوں یعنی حضرت علی اور حضرت ام ایمن اور حسنین کو جھوٹا جانا، ہاں ان کی استقامت، شریعت اور سنت پر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن نقصان فہم کا کچھ علاج نہیں، بیوقوفوں کی اصلاح انبیاء سے بھی نہیں ہوتی، ہم تو کس شمار میں ہیں۔ شاہد اس کا یہ ہے کہ امام غزالی کی بعض کتابوں میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ ایک بار حضرت علیؑ السلام کو ہمار کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ کسی نے عرض کی، آپ ایسے افتان خیزان اس طرف کیوں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک نادان آتا ہے، اس نے عرض کی کہ پھر آپ کو کیا اندیشہ؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیوقوفی کا کچھ علاج نہیں وہ کسی کے فیض صحبت یا برکت نصیحت سے زائل نہیں ہوتی، الٹے اسی کا اثر پڑ جائے، تو پڑ جائے فقط، اور کسی نے سچ کہا ہے کہ

لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ يُسْتَنْطَبُ بِهِ إِلَّا الْحَاقَةَ دَاءٌ لَا دَوَاءَ لَهَا

یعنی ہر بیماری کا کچھ نہ کچھ علاج ہے جس سے اس کے زائل ہونے کی تدبیر کی جاتی ہے پر حماقت ایسی بیماری ہے کہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں۔

منہج الکرامت کی روایت کے مطابق حضرت | اور اگر بایں ہمہ بیان واضح شیعہ کی دل کی گنجھٹ
صدیق نے فدک سیدہ کو دے دیا تھا۔ نہ کھلے، اور حضرت صدیق جیسے صادق کی طرف
گمان فاسد ہی رہے، تو لیجئے اب تو زبان کو لگام دیجئے اور اپنا کام کیجئے، یہ روایت
کتاب منہج الکرامت میں جو شیخ ابن مطہر علی کی تصنیف ہے۔ موجود ہے۔ انہوں نے
سنیوں کی طرف سے جواب شافی و کافی لکھ رکھا ہے۔ القصہ اہل سنت کو تحفیف تصدیح
ہوئی۔ اور انہیں کی لاکھٹی انہیں کاسر۔

وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا وَهَذِهِ رِوَايَةُ يَهُدَى
لَسَاءَ وَعَظَتْ فَاطِمَةُ أَبَا بَكْرٍ فِي فِدْكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّ عَلَيْهِمَا
یعنی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق کو دربارہ فدک وعظرو
پندر کیا، تو ابو بکر صدیق نے فدک کی جاگیر کا کاغذ حضرت فاطمہ کے نام لکھ کر فدک انہیں کو
ہٹا دیا فقط، در صورتیکہ یہ روایت صحیح شیعہ کی ایسی معتبر کتاب میں جس کا نام منہج الکرامت
اور پھر تصنیف ایسے علامہ کی جس کا نام ابن مطہر علی ہو پائی جائے تو پھر سنیوں سے کیوں
الجبھتے پھرتے ہیں؟ اس روایت کے قریب جانیئے۔ اس روایت نے تو شیعوں کو تین پانچ
کے قابل نہیں رکھا، اب تک مولوی صاحب نے ہمہ اور میراث ہی کا دعوائے کیا تھا۔
وصیت یا بیع یا کسی عمل کی اجرت کا احتمال باقی ہے۔ سو ہماری طرف سے اس کی بھی
اجازت ہے کہ لکھتا تھا ان وجوہ سے بھی طعن کر لیں کسرنہ چھوڑیں۔ سنیوں کا کچھ لحاظ
نہ کریں، اول تو ان کو یہ روایت مل گئی ہے، دوسرے ان کی پشتی پر خدا ہی، جہاں اس
روایت کا پتہ لگایا، آگے بھی وہ کام چلا دے گا۔

اب سنتے کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہر بات میں اپنی کتابوں سے جھوٹے ہوتے
جاتے ہیں، اور سنیوں کی کتابوں سے مات کھاتے جاتے ہیں، یہاں تک تو ناظرین کو معلوم
ہی ہو گیا، اور آگے اور انشاء اللہ معلوم ہو جائے گا۔ سو سخنہائے گزشتہ کے دروغ ہونے
سے علاوہ اب جس بات کا جملہ نامہ نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اول تو مولوی صاحب کا یہ طوفان
دیجئے کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی کا بیان لکھتے لکھتے یہ جولاہیوں پر آئے کہ حضرات

حنین کو بھی ساتھ سان لیا۔ یہ نہ شرمائے کہ الزام خصم کے لئے ضرور ہے کہ وہ بات لکھئے جو اس کے نزدیک بھی مسلم ہو۔ سو مسلم ہونا تو معلوم ہے جو روایت کہ سنیوں کے نام لگا رکھی ہے حضرات حنین کا نام تو اس میں بھی نہیں۔ اور اگر اپنے بہتالوں اور اپنے کتب خانوں کے بھروسے سنیوں کو الزام دیتے ہیں، تو یہ الزام تو مثل فوارہ انہیں کے سر پر پڑے گا، ورنہ یوں تو پھر ہر بات ہر شخص سے ہارینگے۔

حضرت عمرؓ پر عمار علی کا بہتان | دوسرے مولوی صاحب کالیوں رقم فرمانا کہ ابو بکر صدیق نے تو جاگیر نامہ حضرت زہرا کے نام لکھ دیا تھا، پر حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا، مولوی صاحب نے کیا سمجھ کر لکھا ہے؟ یا بے سمجھے ہی لڑنے کو دوڑتے ہیں، سنیوں کی کتابوں سے اگر لکھتے ہیں تو سنیوں کی کتابوں میں تو اس بات کا پتہ بھی نہیں۔ اور اگر اپنی کتابوں کے بھروسے پر زبان درازیاں ہیں تو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ جواب جاہلاں باشد خموشی۔ سبحان اللہ ایسا مناظرہ کسی نے نہ سنا ہوگا، کہ اپنی کتابوں کے کیا۔ بلکہ اپنے خوابوں کے بھروسے دوسروں کو الزام کا ارادہ رکھیں، دوسرے منہج الکرامت کو نسی سنیوں کی کتاب،؟ اور شیخ ابن مطہر حلی کون سے سنی؟ یا حضرت عمر اور حضرت ابو بکر کی خلا کے بیٹے تھے؟ جو اتنا جملہ زائدہ یعنی پھاڑ ڈالنے کا قصہ ہضم کر گئے۔؟

مولوی صاحب تو نئے ہی مفتری ہیں شیخ ابن مطہر حلی ان کے بھی پیشوا اور استا ہیں، اور متقدمین سابقین میں سے ہیں، جو بات مولوی صاحب میں ماسہ بھر ہوگی۔ وہ ان میں من بھر سمجھنی چاہیئے، اگر اس بات کا جھوٹا سچا کچھ بھی پتہ ہوتا، تو وہ تو سوئی کو بھالاکر دکھاتے، ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ بہت سے شاگرد رشید استاد سے بڑھ جاتے ہیں، شیخ مطہر حلی میں ایک بڑا قصور رہ گیا تھا، وہ مایہ عقل تو رکھتے تھے، پر چشم بد دور مولوی صاحب اس قصور سے بھی متبرا ہیں۔

حضرت صدیق کے حضرت جابر کو بغیر | اب مولوی صاحب کی یہ شکایت باقی رہی، کہ ابو بکر صدیق شہادت کے مال دینے کے وجہ | نے حضرت جابرؓ کی بات تو بے گواہوں کے مان لی، پر ستم تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا کی بات باوجود ایسے معتبر گواہوں کے بھی نہ مانی، سو اس کا

اول جواب تو یہی ہے کہ یہ روایت اگر سنیوں کی کتابوں میں ہوتی تو البتہ اس شکایت کا کم فہموں کے نزدیک محل اور موقع تھا ہو اس روایت کاسنیوں کی کتابوں میں ہونا نہ ہونا اور اس کا موضوع ہونا نہ ہونا دیکھنے والوں پر انشاء اللہ بخوبی واضح ہو جائے گا۔ اور بے اس کے کہ سنیوں کی کتابوں میں یہ روایت پائی جائے یہ شکایت کرنی اپنی فہم و فراست کی خوبی بیان کرنی ہے۔

اگر یہی الزام ہوا تو کل کو سنی پڑتوں کی پوچھیوں اور سکھوں کی گرتھ اور یہود و نصاریٰ کی تورات و انجیل محرف کے لکھے ہوئے سے ملزم ہو جائیں گے؟ اور ان کتابوں کی باتیں مان جائیں گے، اور شیعوں کو تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا سب طرف لیکھا ہے۔ ہندو یا سکھ بن جاتے ہیں انہیں کچھ نقصان نہیں، اور یہود و نصاریٰ کے ہم مذہب ہو جاتے ہیں، تو انہیں کچھ زیاں نہیں، اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا۔ تو بتلا دیتا کہ شیعوں کو ان سب کے ساتھ ایسی نسبت ہے، جیسے حیوان مشہور مسمی بہ اشتر کا و پلنگ کو اونٹ اور بیل اور چیتے سب کے ساتھ نسبت مشابہت ہے۔

اور سلمنا کہ یہ روایت سنیوں کی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب دیتے ہیں کسی ایک دو نسخہ میں ہے بھی؟ تو اول تو وہ کتابیں غیر مشہور اور غیر معتبر، دوسرے وہ بھی شیعوں کا الحاق ہے، چنانچہ تحقیقات مسطورہ بالا کو دیکھ کر ناظرین کو انشاء اللہ شبہ نہ رہے گا۔ اور باایں ہمہ پھر وجہ طلب گواہاں معلوم ہو چکی ہے، اس کے ملاحظہ سے آپ واضح ہو جائے گا کہ حضرت جابر کا قصہ (یعنی ایسے مال کا بے شاہد دے دینا جو ایسوں ہی کے دینے کے لئے ہے۔ اور قسم کا ہی اعتبار کر لینا، اس کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ جس میں بے حقیق دیدینے میں اندیشہ حق تلفی فقر او مساکین و ابن سبیل تھا) کچھ نسبت نہیں جو اس کو اس پر قیاس کیا جائے۔ معہذا گواہوں کا طلب کرنا قضیۂ نقد میں ہو سکتا ہے کہ بوجہ خیر خواہی حضرت فاطمہ زہرا ہو۔

تفصیل اس اجمال کی ہر خید معلوم ہو چکی، پر نا انصافوں سے کام پڑا ہے۔ اس لئے مکرر عرض ہے، کہ باتفاق شیعہ و سنی اس میں تو کلام ہی نہیں کہ تادم باز ہیں

فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں رہا، پھر جب ابو بکر صدیق کو یہ بات معلوم ہو چکی ہو کہ متروکہ انبیاء وقف ہو جاتا ہے۔ اور یہ بے قبض مفید ملک نہیں ہوتا۔ تو اس میں تو کلام ہی نہ تھا کہ یہ چیز حضرت فاطمہ زہرا کی ملک تو نہیں، پھر جو گواہ طلب کئے جائیں تو اس لئے تو ہنسی نہیں سکتا کہ تحقیق ملکیت مد نظر تھی جو کسی نادان کو یہ شبہ پڑے کہ بائے افسوس حضرت فاطمہ کی بات تو گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو، اور جابر کی خبر بے گواہوں کے سنی جائے۔ اور بے تکرار مسلم ہو۔ بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں کہ شاید گواہوں کی تقریر سے کوئی اشارہ بنوی اس جانب پایا جائے، کہ فدک کو حضرت زہرا ہی کو دیدینا چاہیے۔ اب کوئی عاقل غور کر کے فرمائیں کہ یہ بات حضرت فاطمہ کی دوستی اور خیر خواہی کی بات ہے یا دشمنی اور بدخواہی کی۔

حضرت جابر کو نہ دینے میں خلاف وعدہ | مگر مولوی صاحب کی عقل تو حاشیہ نشین لے اڑے
کا احتمال آنحضرت کی طرف عاید ہوتا ہے | ہیں، وہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق کو حضرت فاطمہ زہرا کا اعتبار نہ ہوا، اور حضرت جابر کا اعتبار ہوا، مہند حضرت جابر کے نہ دینے میں یہ احتمال تھا کہ ہر خبر جھوٹی تو ہوتی ہی نہیں۔ اگر واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ اور پھر ان کو اس وعدہ کے موافق نہ دیا جائے گا تو ایک گونہ خلاف وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عاید ہوگا۔ اور یہ خلاف وعدگی ہر چند مجبوری تھی کیونکہ تا دم آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال بحرین نہ آیا۔ لیکن شان نبوت بہت رفیع ہے اور پھر نبوت بھی کس کی نبوت؟ اس مرتبہ رفیع پر اتنا قصور بھی نازیبا ہے جسٹھا جب یہ لحاظ کیا جائے کہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم روضہ مبارک میں زندہ، اور حضرت ابو بکر بمنزلہ داروغہ آپ کے کارکن، اور مال بحرین موجود، اگر واقع میں وعدہ وقوع میں آیا ہے۔ اور در صورت طلب گواہان حضرت جابر کے پاس گواہ نہ نکلے؟ کیونکہ کچھ ضروری نہیں کہ کسی کے سامنے ہی وعدہ کیا ہو، تو اس صورت میں لاریب عاقلوں کے نزدیک اختلاف وعدہ بجانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاید ہوگا۔

القصر مقتضائے احتیاط ایسے امر میں یہی تھا کہ بے طلب گواہان ان کا مطالبہ

پورا کیا جائے۔ اگر وعدہ واقعی تھا تو فیہا۔ ورنہ کچھ نقصان نہیں، آخر وہ مال صحابہ ہی پر تقسیم ہوا، بخلاف فداک کے کہ اس کے دینے میں لاریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نظر آتی تھی، بسبب قبضہ مستمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ تا دم آخر فداک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اور جب آپ کی وفات ہوئی۔ تو وہ بمقتضائے حدیث مَا تَرَكَ نَاهُ صَدَقَةٌ کے جس کی تحقیق کا ہم وعدہ کرتے چلے آتے ہیں، اور اب انشاء اللہ تعالیٰ بہت ہی قریب اس کا ذکر آتا ہے، وہ وقف ہو چکا تھا کسی بیٹا بیٹی یا بھائی برادر بیوی باندی کا اس میں حق نہ تھا۔ پھر اس کو کسی کے دعوے کے باعث دے دینا۔ اس حدیث کے موافق عمل نہ کرنا ہے۔ مگر مولوی صاحب کے مذہب میں جو ارشادات نبوی پر چلے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایفاء وعدہ اور اداء قرض کا بے وصیت خیال رکھے۔ اس سے برا کوئی نہیں۔ آپ عمل نہیں کرتے۔ پھر جو عمل کرے گا، وہ آپ برا لگے گا۔

اہل انصاف کے نزدیک تو اتنی بات بھی (کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو بکر صدیق خلیفہ ہوئے۔ اور مال بحرین آیا، تو انہوں نے یہ منادی کر دی کہ اگر کسی کا کچھ قرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ وعدہ کیا ہو تو وہ ہمارے پاس آئے ہم اسکو بھگتا دیں گے اور پھر بے دسواؤں بے گواہ دنیا شروع کیا۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے اسی منادی کے باعث پندرہ سو کما لئے۔ اس بات کے لئے دلیل کامل ہے کہ ابو بکر صدیق کو حق تلفی اہلبیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خطرہ بھی نہیں گذرا، چہ جائیکہ کوئی چیز و بالیں کسی عاقل کے تصور میں آسکتا ہے کہ جو شخص فقط اس خیال پر کہ مبادا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کسی کا قرض رہ جائے یا آپ کی بات میں فرق آجائے۔ بے تحقیق تھیلیوں کا منہ کھول دے۔ ایسا کھلا ہوا حق پھر وہ بھی جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح سے دبا بیٹھے۔

علاوہ بریں نہ آپ کھایا نہ اپنوں کو کھلایا، بلکہ بدستور قدیم اہل بیت اور مصارف مقررہ میں صرف کیا۔ اور مفت دنیا کی ملائمتیں اور بار عذاب آخرت سر پر لیا، کوئی حضرات

شیعہ سے پوچھے، کہ ابو بکر جیسے ہوشیار کو کہ جس کی ہوشیاری کی قسم کھائی جائے غضب کرنا بھی نہ آتا تھا اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ایسا فرق لیجئے کہ اہل عقل حضرات ابو بکر کی فہم و عقل پر آفرین اور علماء شیعہ کی کجی عقل اور بلاد طبع پر نفرین کریں۔ وہ فرق یہ ہے کہ دعوتے ہبہ فدک جو حضرت زہراؑ سے ہر غم شیعہ ظہور میں آیا، تو سنیوں کے طور پر تو منشاء حدیث صحیح مائترکنا صدقہ کے جس کا عنقریب انشاء اللہ ذکر آتا ہے۔ معارض اور مخالف تھا، اور شیعوں کے طور پر استحقاق ورثہ نبوی کے مناقض اور دعوتے جابر کے کوئی استحقاق یا کوئی حدیث معارض اور مخالف نہ تھی۔ کیونکہ جس مال میں سے انکو دیا گیا۔ وہ مال کسی کے ترک کا نہ تھا، اور نہ کوئی حدیث اور نہ آیت اس کے بیان تصرف کے لئے نازل یا وارد ہوئی تھی، بلکہ وہ مال یا خمس یا عشر یا خراج کی قسم کا تھا۔ سو حضرت جابر بہر طور اس کا استحقاق رکھتے تھے۔

اور یہ بھی اہل عقل پر ظاہر و باہر ہے کہ گواہ تعارض کے رفع کے لئے ہوتے ہیں۔ اور ایک جانب راجح کر دیتے ہیں۔ اسی واسطے دو متخاصمین کے رفع محاصمت کے لئے گواہوں کی ضرورت پڑی، اور در صورتیکہ کوئی خبر یا دعویٰ بلامزاحم عقلی یا نقلی، یا خبری یا عیانی کے پایا جائے۔ اور خبر اور مدعی بھی مومن مسلمان ہو، تو پھر حکم نبوی یہ ہے کہ ظنُّوا الْمُؤْمِنِينَ خَيْرًا اب التماس یہ ہے کہ حضرات شیعہ اگر دو چار گھڑی کے لئے کسی سے عقل مستعار لے کر اس فرق میں غور فرمائیں، تو اس فرق کے مان جانے میں کچھ کلام نہیں، ورنہ ایسے ہی عقل کے دشمنوں کے لئے کلام اللہ میں أَفَلَا تَعْقِلُونَ آیا ہے۔ اگر بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے یہ خطاب کان تک نہیں پہنچا۔ تو یہ سفارت ہمیں کرتے ہیں۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی، تو اب یہ اور التماس ہے، کہ دقیقہ سنجان معافی رس پر تقریر سے واضح ہو گیا ہوگا، کہ حضرت جابر سے گواہوں کا طلب نہ کرنا، چنانچہ روایات صحاح میں موجود ہے۔ اور نیز حضرت فاطمہ زہراؑ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا، اگر بالفرض و تقدیر بغرض محال جیسے حضرات شیعہ فرماتے ہیں، واقع میں وقوع میں آیا ہو؟ تو

حضرت ابو بکر صدیق کی کمال فہم، اور نہایت اطاعت و اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا ہے، اگر یہ دونوں باتیں معیوب ہیں، تو مولوی صاحب ابو بکر صدیق پر بایں وجہ طعن کرنے میں معذور ہیں، اور لاجرم طاعنان ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مصیب بصواب اور ماحور ہیں لیکن اس صورت میں بڑی تعریف کی بات یہ ہو گی کہ فلانا بڑا گدھا ہے اور سہرا پا بیوقوف، ہی فستق و فجور میں بیکٹائے روزگار، دروغ و بیداعی میں مشہور ہر کوچہ بازار۔

سو اس صورت میں ہم کو مولوی صاحب کی تعریف کرنی لازم ہے مگر نظم تو سیر دست بن نہیں پڑتی، ملازمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ آپ عنایت فرما کے یہ قدر قلیل نثر ہی قبوں فرمائیں۔ سبحان اللہ اس فہم و فراست پر اصحاب کبار پر یہ زبان درازیاں؟ پھر اس پر یہ دھوکے بازیاں؟ کہ عوام کو ایک بار تو یہی یقین ہو جائے کہ مولوی صاحب کی بات سراسر بجا و درست۔ اعنی آپ میرزا در علی صاحب کو رقم فرماتے ہیں ”اب فرمائیے یہ غصہ نہیں تو کیا ہے۔ سو اس کے اور غصہ کس کو کہتے ہیں۔ اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور عروت اور رعایت حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رعایت نہ کی، آپ نے لکھا تھا۔ مجھے غصہ فردک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی۔ اب آپ کو چاہیے کہ میری صحت علما اہلسنت سے کرائیے، اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بھجوائیے، کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو سچا جانا اور فاطمہ کو جھوٹا سمجھا؟ اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی روکیا انتہی بلفظہ، سو منصفان نہمیدہ اور نہیمان سنجیدہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی صاحب کو میرے لکھے ہوئے جواب سمجھا کر یہ سمجھا دیں کہ دیکھو یوں جواب لکھا کرتے ہیں۔ لیکن اس کا کچھ علاج نہیں، کہ مولوی صاحب کی یہ درخواست ہے کہ میری صحت علما و سنت سے کرائیے۔ مولوی صاحب تو سہرا پا غلط ہیں۔ غلط کا صحیح کرنا اور صحیح کہنا سنیوں کو نہیں آتا، ہاں غلط کی جگہ صحیح بنا سکتے ہیں۔ اس لئے آتنا ہو سکتا ہے، کہ ملازمان مولوی صاحب سے یہ کہا جاوے

کہ مولوی صاحب غلط ہیں، جب ہی تو اپنی صحت کراتے ہیں: ظاہر و باطن سے صحیح علماء اہل سنت ہیں۔ اگر ہدایت منظور ہے تو غنیمت سمجھو

خیر یہ قصہ تو بہت دور دراز ہے۔ مولوی صاحب کی ہدیانات بے معنی کا جواب چاہیے۔ اور ان کی حقیقت الامر کھول کر دکھلائیے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ مولوی صاحب اپنے ہوش میں نہیں۔ اس بیداری میں جو اوروں کے خواب سے بدتر ہے۔ مولوی صاحب پڑے بڑاتے ہیں، ورنہ عقل کا کام نہیں، کہ باوجود ایسے ایسے دلائل واضحہ کے جن کا مذکور ہو چکا۔ پھر بھی غصہ فدک کا ان کے دل میں خیال آئے، ابو بکر صدیق جیسے عادل متقی اور مطیع خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ظالم ٹھہرائے، ابو بکر صدیق کے پاس اگر اور فضائل گونا گوں نہ ہوتے تو یہی حکایت ان کی فضیلت کے لئے بہت تھی، کیونکہ عاقل سمجھتے ہیں کہ ملامت دنیا خاص کر اہل عزت سے بے سبب نہیں اٹھائی جاتی۔ دیندار دین کی عزت اور دنیا دار دنیا کی عزت کو جان و مال سے عزت سمجھتے ہیں، اور عزت بھی عزت نہ ہو تو کھیز کونسی چیز عزت نہ ہوگی، اسی کا عزت نہ ہونا ہے، کہ عورتیں باوجودیکہ مرد نہیں نامرد ہیں بغیرت کے پتے جان کو تلف کر دیتی ہیں، اور ڈوب مرنے ہیں، یا زہر کھا لیتی ہیں، مردوں کا تو کیا ذکر؟

ابو بکر صدیق کا جان بوجھ کر ہدف تیر مائے ملامت ناکسان ہونا کیونکہ ایسے مواقع میں ہر کوئی جانتا ہے کہ یہی انجام ہوتا ہے۔ بجز اس کے نہیں ہو سکتا ہے، کہ پاسبندی خداوند علیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجبور تھے، ورنہ جو شخص نہ خود کھائے نہ اپنوں کو کھلائے۔ کاہے کے لئے کسی کی چیز دبائے؟ ایسا شخص اگر ایسے موقع میں ایسے شخصوں سے تو گواہ طلب کرے۔ اور حضرت جابرؓ سے طلب کرے۔ قطع نظر و جوہ مذکورہ بالا کے بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہو سکتا۔ کہ انصاف اور اہل انصاف کو لازم ہی ہے کہ رورعایت کے موقع میں زیادہ تشدد اور سخت گیری سے پیش آیا کریں۔ اور غیروں سے بہ نسبت اپنوں کے نرم رخصا کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے اقربا کی رورعایت نہ کرنے میں بوجہ محبت فقط اپنا دل

ہی دکھا کرتا ہے۔ کچھ اندیشہ ملامت نہیں ہوتا۔ بلکہ امید کلمت الخیر ہوتی ہے اور اپنے پیر زادوں اور بزرگ زادوں کی رو رعایت نہ کرنے میں مریدان جان نثار کا بوجہ محبت دل جدا دکھا کرتا ہے۔ اور بوجہ اندیشہ ملامت جان پر جدا ہی بنا کرتی ہے۔

سو جب اپنے قرابتیوں کی رو رعایت نہ کرنی اور غیروں سے نرمی برتنی محمود خلایق ہوئی، تو پیر زادوں کی رو رعایت نہ کرنی اور بھی زیادہ سمجھنی چاہیے۔ اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی پیرزادی ہو، کہ نہ اس رتبہ کا کوئی پیرزادہ ہوا ہے، نہ ہو، اور ابو بکر صدیق جیسا مرید ہو جس کی صدق و وفا اور جان نثاری اور الفت اور محبت اور خدمت گزاری کے کلام اللہ اور اقوال عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چنانچہ گذرا، دو گواہ عادل کیا۔ بلکہ اس بات کے گواہ ہوں کہ ایسا یا روفادار نہ کوئی ہوا ہے۔ نہ ہو۔ کیونکہ ایسے رتبہ والے ایسے ویسے کی ایسی تعریف نہیں کیا کرتے۔ تو اس صورت میں حکم خداوندی پر قائم رہنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے مرد کا کام ہے، نہ وہ ہوں نہ اتنی دشواری۔ اور اس قدر ملامت عوام کا لالہ انعام اور دشنام ہائے جمیشان نافر جام اپنے سر پر اٹھا میں، پر زوف ہے شیعوں کی عقل پر کہ ان کو خوبیاں بھی برائی ہی نظر آتی ہیں۔

چشم بد اندیش کہ برکتہ باد ۛ عیب نماید ہنرش در نظر
مطیعان خدا پر طعن اور تشنیع کرتے ہیں ۛ سمجھتے ہی نہیں یہ رافضی انکو خدا سمجھے
شیعوں کی اہلبیت سے اور نصاریٰ کی طرفہ تماشا ہے کہ بیدین دینداروں پر بے دینی کی
حضرت عیسیٰ سے ایک جیسی محبت ہے ۛ تہمت لگائیں، اور مخلصانِ قدر شناس کو
مقتدیانِ عبداللہ بن سبا یہودی دشمن اہل بیت بتائیں۔ اگر قدر شناسوں سے حد
سے گذر جانے والے۔۔۔ بڑھ جایا کریں، اور قدر شناس دشمن سمجھے جایا کریں؟
تو نصاریٰ حضرت عیسیٰ کے محب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت حضرت
عیسیٰ کی دشمن ہونے چاہئیں۔ غور کر کے اگر دیکھیں مفرط فی المحبت اس کا محب نہیں جس

کی محبت کا مدعی ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی خیالی تصویر کا محب ہوتا ہے، نصاریٰ جو دعویٰ محبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے ہیں، تو حقیقت میں ان سے محبت نہیں کرتے۔ کیونکہ دار و مدار ان کی محبت کا خدا کے بیٹا ہونے پر ہے۔ سو یہ بات حضرت عیسیٰ میں تو معلوم؛ البتہ ان کے خیال میں بھی۔ اپنی تصویر خیالی کو پوجتے ہیں۔ اور اسی سے محبت رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کو خداوند کریم نے ان کی واسطہ داری سے برطرف رکھا ہے۔

ایسے ہی شیعہ بھی اپنی خیالی تصویر سے محبت کرتے ہیں، ان کے اہلبیت سے محبت نہیں کرتے، اس محبت پر مجاہدانہ قدر شناس کو دشمن اہلبیت سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا نصاریٰ بزعیم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو دشمن عیسے سمجھتے ہیں، دشمنی اہل بیت تو اسے کہتے ہیں کہ حضرت زقیہ اور حضرت ام کلثوم و خیران مطہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آپ کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ کلام اللہ اور احادیث کلینی وغیرہ اور اقوال حضرت امیر اس بات پر شاہد ہیں۔ اور حضرت عائشہ محبوبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ ممدوحہ جناب کبریا کو جن کی طہارت اور بزرگی میں سورہ نور میں آبات متعدّدہ موجود ہیں، اور سوا ان کے اور بیٹیوں کو جو بشہادت آیہ کریمہ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ تمام مومنین کی مائیں ہیں اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ علم بزرگوار سید الابرار صلی اللہ علیہ وعلی آلہ الجبار القہار کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جو سوا اس کے اور بھی ناتے رکھتے ہیں، اور حضرت سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ عنہ کے داماد مصدب، بن زبیر اور حضرت عمر فاروق داماد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت زید شہید فرزند سعید حضرت امام ہمام زین العابدین رضی اللہ عنہ اور سوا ان کے اور اقربا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولاد امجاد ائمہ اطہار کو جو بشہادت لفظ عمرت اور اہل بیت میں داخل ہیں۔ شیعہ کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور دشنام بائے نافرجام دیتے ہیں۔

چنانچہ کچھ کچھ اوپر گزرا، پھر ان بے حیاؤں کو غیرت نہیں آتی کہ صحابہ کو دشمن اہلبیت بتاتے ہیں، اگر ابو بکر صدیق کو حضرت فاطمہ سے عداوت ہوتی تو اہل سنت میں سیالو بکر

صدیق کا کوئی نام بھی نہ لیتا یا مثل خوارج کوئی حضرت فاطمہ کو تعظیم یا دہی نہ کرتا بلکہ الٹی
 نحوذباللہ جیسے شیعہ اصحاب کبار پر تبرا کرتے ہیں، تبرا کیا کرتے، اب مولوی صاحب کی خدمت
 میں یہ عرض ہو کہ آپ کا یہ کہنا کہ وائے بردینداری اہلسنت الحنہ انصاف فرمائے صحیح ہے یا ہمارا یہ کہنا کہ وائے بردینداری
 وعقل ہوشیاری شیعہ خصوصاً مولوی عماد علی صاحب کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کی بھی رعایت نہ کی، بلکہ خدا کی شہادت اور ائمہ اطہار کی گواہی کو رد کیا۔ اہل بیت رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم میں جس کو یوں سمجھا کہ اس کا گوشہ عاطفت صحابہ کی طرف مائل ہو
 اسی کو کافر اور مرتد جو چاہا سو کہا۔

اگر عذر نامعقول تقیہ نہ ہوتا تو حضرت علی اور حسنین اور امام زین العابدین
 اور امام محمد باقر اور امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم وعلی آلہم واتباعہم اجمعین کی بھی
 خیر نہ تھی۔ کیونکہ ان بزرگواروں نے اصحاب کبار کی تعریف میں کیا کمی کی ہے؟
 خصوصاً حضرت علی اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہم کہ ہمیشہ مدد اور معاون اور ہم نوا رہے
 پیالہ اصحاب کبار خصوصاً اصحاب ثلثہ رہے۔ پھر ہم سے تو اس بات کا فرق پوچھتے ہیں کہ
 فاطمہ سے تو گواہ طلب کئے اور جابر سے کیوں نہ طلب کئے۔ اب ان سے کوئی پوچھے کیا
 سبب ہے کہ حضرت علیؑ اور دیگر بعض ائمہ کی تعریفوں اور معاونتوں اور موافقتوں کو تو
 تقیہ پر محمول کرتے ہیں حضرت عمر اور حضرت عباس وغیرہم کی ابو بکر صدیق کے ساتھ
 موافقتوں اور ان کے حق میں ان کی تعریفوں کو تقیہ پر کیوں نہیں محمول کرتے؟ یا مثل
 حضرت عباس اور حضرت عمر اور حضرت زید شہید حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ اطہار کے
 اقوال اور احوال کو نفاق اور ریا سے خالی کیوں نہیں سمجھتے؟

اگر ائمہ امین اور حضرت علیؑ کی گواہی اتنی اہم ہے تو خدا اور اور نیز کوئی ان سے یہ سوال کرے کہ
 رسول قرآن و ائمہ اہلبیت کی گواہی صحابہ کے بابے میں کیوں نہ ہوگی؟ ہم نے مانا حضرت ابو بکر نے حضرت
 علیؑ اور حضرت ام ایمن وغیرہما کی گواہی کے موافق عمل نہ کیا۔ لیکن وہ حکم خداوندی
 سے مجبور تھے، خداوند کریم کا حکم یہی ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی
 چاہئیں حضرات شیعہ جو خدا کی اس شہادت کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ایک

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی نہ تھی بلکہ آپ کی کئی بیٹیاں تھیں تسلیم نہیں کرتے اور علیٰ ہذا القیاس
حضرت علی کا اسی تعدد دینات میں ہم صغیر خداوندی ہونا جو شیعوں کے نزدیک سچا نہ ہوا اور
ان کا کہا مقبول نہ پڑا تو کیا بلا پیش آئی؟ یہاں تو یہ عذر بھی نہ تھا خدا تعالیٰ اور حضرت
علی دواذن مل کر تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں سے زیادہ ہی ہیں۔ پھر کیا وجہ
ہے کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی تو قابل سند ہو اور حضرت علی اور جناب
پاک کبریائی کی قابل سند نہ ہو؟

اور اگر مولوی صاحب کی خاطر سے اس طوفان ہی کو تسلیم کریں کہ حضرت علی
اور حضرت ام ایمن اور حسنین رضی اللہ عنہم نے گواہی دی تھی؟ تب قطع نظر اس کے
کہ اب بھی مقدار مقررہ شہادت کو یہ شہادت نہیں پہنچی۔ اور شیعوں کو جائے
دم زدن نہیں شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ مدائح صحابہ سے کلام اللہ تو
مشحون تھا ہی۔ اقوال عترت طاہرہ اور ملفوظات ائمہ اطہار بھی ان کی صفت
و ثنا سے مملو ہیں۔ اور اماموں میں سے بھی ایک آدھا نہیں بلکہ تین چار کے قول
تو اس احقر نے بھی اس رسالہ میں نقل کئے ہیں۔ پھر باوجودیکہ اس گواہی میں
عدد ائمہ اطہار ہی دو سے بڑھ گیا خدا تو درکنار؟ پھر کیوں اعتبار نہیں کرتے
اب رد شہادت اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ وائے بردینداری۔
شیعہ کہ صحابہ کی عداوت میں نہ خدا کا اعتبار کیا نہ ائمہ اطہار کا نہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا خیال کیا نہ بزرگواران مذکور کے افعال حمیدہ
اور احوال پسندیدہ پر دھیان دیا۔ پھر اُلٹے چور کو تو ال کو پکڑیں اور اُلٹے
نکٹے ناک والوں کو ہنسیں؟ مولوی عمار علی اور ان کے ہم مذہب ابو بکر صدیق
پر طعن کریں جن کی بزرگی کا خدا بھی گواہ ہو۔ اور ائمہ اطہار بھی اقرار کریں۔ کفر اسے
نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ اور دشمنی اہلبیت یہ نہیں تو اور کیا ہے؟

تفصیل ان امور کی اور سندیں ان روایات کی سب اس رسالہ میں مندرج ہو چکی
ہیں اس لئے ان کی تکرار میں تقصیر کی۔ ناظرین رسالہ ہذا بے دماغی نہ فرمائیں بلکہ پلٹ کر دیکھیں

کیا ستم ہے؟ کہ اگر ایک روایت موضوع بے سند میں جس کا اعتبار کسی طرح نہیں ہو سکتا اور نہ اہل سنت کی کسی معتبر کتاب میں اس کا نشان ہے۔ یہ دیکھ لیا ہے کہ ابو بکر صدیق نے حضرت فاطمہ سے گواہ طلب کئے اور ان کی بات بے گواہوں کے نہ مانی۔ اور پھر گواہوں پر بھی ان کے دعویٰ کو مسترد کیا۔ تو ان سب خواں الشیاطین کا وظیفہ ہی یہ ہو گیا کہ ابو بکر صدیق نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی اور حضرت ام ایمن کو جھوٹا جانا۔ حالانکہ اس روایت میں تکذیب اور سوزن کی بو تک نہیں آتی۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسبب پابندی قانون خداوندی حکم موافق مرضی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نہ دے سکے۔ اور اپنے آپ آیات قرآنی اور شہادت ائمہ ربانی کو جو بطرق متواترہ یا اسانید معتبرہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور کسی طرح لائق اعراض و انکار نہیں بہر طور قابل اعتبار ہیں مضمک کئے بیٹھے ہیں۔ اور زبان تک نہیں لاتے حالانکہ اعتبار احادیث و آثار کے لئے باتفاق ایک زن معتبر بھی کفایت کرتی ہے نہ اب شہادت کی حاجت نہیں چہ جائیکہ تواتر اور تکاثر ہو۔ چونکہ یہ قضیہ بہت دور جا پڑا اور جس قدر لکھا گیا گو قلیل ہے لیکن اہل فہم کیلئے کثیر ہے۔ اس لئے عرض رہا ہوں کہ اگر بالفرض بفرض محال روایت یہہ اور قضیہ طلب گواہان صحیح بھی ہو تب بھی دامن حال صدیق اکبر لوٹ خطا اور آلودگی جفا سے صاف مصفٰی ہے۔ معنذا روایت منہج الکرامۃ ابن مطہر علی سے یہ بات تو صاف ہی معلوم ہو گئی کہ گستاہ حق تلقی فدک تو حضرت ابو بکر صدیق اپنے سر نہیں لے گئے۔ باقی رہا ان سے گواہوں کا مانگنا اور حضرت جابر سے گواہوں کا نہ مانگنا۔ تو اول تو وجوہ متعدد وہ اس کے مرقوم ہو چکیں۔ اہل فہم سمجھتے ہیں کہ وہ وجوہ کیسی بر حسبہ اور ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہیں۔

سیدہ سے گواہی طلب کرنا خطا | علاوہ بریں ابو بکر صدیق کچھ معصوم نہ تھے ایک امام مجتہد اجتہادی تھی جو باعث قدح نہیں تھے۔ اور مجتہد سے اہل سنت کے نزدیک خطا بھی ہو جاتی ہے۔ بلکہ مجتہد تو مجتہد انبیاء سے اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات شیعوں کو بھی چار ناچار ماننی پڑے گی کیونکہ سورۃ انبیاء میں رکوع وَنُوحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلِ الْوَعْدِ

ہی میں ایک کھیتی کے تنازع میں جو مقدمہ حضرت داؤد کے دربار میں پیش ہوا تھا مذکور ہے
 سو اس قصہ میں جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی رائے مختلف ہوئی اور خدا نے حضرت
 سلیمان کی رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَفَقَهَّمْنَاهَا سُلَيْمٰنَ (یعنی ہم نے سمجھا دیا وہ
 فیصلہ سلیمان کو) تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد سے جو بالالتفاق نبی ہیں اور معصوم
 ہیں اجتہاد میں غلطی ہوئی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ اگر ابو بکر صدیق کہ بعد از غلطی اجتہاد
 معذور رکھیں۔ اور یوں سمجھیں کہ ابو بکر صدیق نے یا حضرت جابر سے گواہوں کے نہ طلب
 کرنے میں غلطی کی۔ یا حضرت فاطمہ سے گواہوں کے طلب کرنے میں غلطی کھائی تو کیا نقصان
 ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ جس کی خدا اور ائمہ تعریف کریں اس کے بُرا کہنے سے بچ گئے
 اور اگر یوں بھی ناک سیدھی نہیں ہوتی تو نہ سہی۔ حضرت ابو بکر صدیق کی نحو ذی اللہ
 اول مرتبہ میں نیت بد ہی تھی؟ اور اس سبب سے ٹالتے تھے کہیں گواہ طلب کئے کہیں
 جھوٹے خدا کہنے والوں کو پکڑے بنالے تھے۔ لیکن روایت منہج الکرامت ابن مطہر علی
 اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وعظ و پند سے انھوں نے
 فکر حضرت فاطمہ کے حوالہ کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس گناہ سے توبہ
 کی کیونکہ وعظ کے سبب جو کوئی کسی گناہ سے باز آئے تو وہ توبہ ہی ہوتی ہے۔
 توبہ کے اور کچھ سرسینگ نہیں۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ الذَّنْبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ
 لَا ذَنْبَ لَهُ یعنی توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے گناہ کا نہ کرنے والا یعنی جیسے وہ
 عذاب خداوندی سے ناجی ہے ایسے ہی یہ بھی ناجی ہے۔

حضرت سجاد اگر باوجود ابلیس کے گلی | معہذا اگر توبہ نہ کرتے جب کچھ اندیشہ نہ تھا کیونکہ بشاد
 تصرف کے موہم ہیں۔ تو ابو بکر صدیق اولیٰ ہیں | آیات مذکورۃ الصدق کے ساتھ خداوند صادق لقول
 نے وعدہ مغفرت گناہان کر لیا ہے۔ سو سنیوں کو یہاں تک کچھ نہیں کیونکہ ان کی اصطلاح کے
 موافق ابو بکر صدیق ولی ہیں نبی نہیں۔ جو معصوم ہونا ضروری ہو۔ پر مشکل تو شیعوں کو ہے۔
 شیعہ اور ادخوان جس نے صحیفہ کاملہ حضرت سجاد بن العباد دیکھا ہے یا سنا ہے۔ وہ جانتا ہے
 کہ حضرت سجاد جو موافق عقیدہ شیعہ معصوم ہیں۔ اور دست برو شیطان سے مطمئن۔ اپنے حق میں

کیا فرماتے ہیں کہ قَدْ مَلَكَ الشَّيْطَانُ عَنَّا فِي سُوءِ الظَّنِّ وَضَعْفِ الْيَقِينِ دَلَالَتِي
أَشْكُو سُوءَ مَجَادِرَتِهِ لِي وَطَاعَةِ نَفْسِي لَهُ يَعْنِي شَيْطَانُ لَمْ يَمِرْ بِكَرْهِي
بدگمانی اور ضعف یقین میں اور مجھے شکایت ہے اُس کے بُرے پڑوس اور اپنے نفس
کے مطیع شیطان ہو جانے کی فقط

اب التماس یہ ہے کہ امام کی بات جھوٹی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ خاص کر شیعوں کے نزدیک
نہیں تو کافر ہو جائیں۔ پھر جو شیطان کی حضرت زین العباد پر چسپاں دستی ہے تو اس کا کیا خوا
ان کے لئے تو کلام اللہ میں کوئی ایسا وعدہ بھی نہیں جس کو سنکر ان کے جنتی ہونے کا قطعی
یقین ہو جائے۔ اور کسی طرح کا احتمال باقی نہ رہے۔ گو شیعہ ان کو بجائے خود معصوم
و مغفور اور ہم محفوظ و مغفور سمجھتے ہیں۔

معہذا لفظ سورن اور ضعف یقین اور طاعت نفس ایسے الفاظ ہیں کہ خطائی الاجتناب
پر بھی منطبق نہیں سکتے علیٰ ہذا القیاس نہج البلاغۃ میں جو مجموعہ خطب حضرت امیر المؤمنین
رضی اللہ عنہ ہے اس میں بھی ایسے ایسے مضامین مندرج ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر یہ ہے
کہ کلام اللہ میں بہت سے انبیاء کی نسبت تذکرہ خطا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت
یونس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ سو ان سب کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر صدیق سے
فقط ارادہ غصب بہت ہی تھوڑا ہے کیونکہ وہ معصوم نہ تھے۔ اے پروردگار بے نیاز
اس سراپا نیاز و احلاص کی جان لے لو آگاہ ہے کہ کس قدر میرے دل میں بہ نسبت حضرت
زین العباد و دیگر ائمہ اطہار و انبیاء کبار اخلاص اور اعتقاد اور محبت اور نیاز ہے۔
یہ جو کچھ لکھا جاتا ہے بایں نظر ثقل کفر کفر نباشد حضرات شیعہ کی کفریات کے مقابلہ میں
لکھا جاتا ہے

فصل

حدیث ماثورۃ صلیۃ کی تحقیق اینق | اب آگے سنئے مولوی حنا کیا فرماتے ہیں۔ مولوی حنا لکھتے ہیں

اب اور سننا چاہئے کہ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جانا کہ ابوبکر نے مجھے ہمہ فدک میں

جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعوتِ وراثت کا کیا۔ اور ابوبکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا

صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہوں مجھے اُن حضرات کا مال ارث میں پہنچتا ہے۔ اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دیدے اس وقت ابو بکر نے ایک جمہوری روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال رب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔

اول تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں نہ بیٹی سے نہ اپنی بیٹیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے ان کو نہیں پہنچتا تم دعویٰ نہ کرنا۔ اور حکم خدا کا جو ان کے واسطے تھا اس کو ان سے چھپا رکھا۔ اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔ انتہی بلفظ

مولوی صاحب تو فرما چکے۔ اب ہماری بھی سنئے قدما فریب بازان شیعہ بوجہ وراثت فدک کے نہ دینے میں ابو بکر صدیق پر طعن کیا کرتے تھے۔ جب اہل سنت سے جوابات معقول اس اعتراض کے ان مامعقولوں نے سنے۔ اور مجال دم زدن باقی نہ رہی تو ان کے لواحق نے روایات ہبہ تراش کر برنگ دیگر طعن شروع کیا۔ اور اس دعوئے کے ثبوت تک پہنچانے کے بہت سے چلے کئے۔ یہاں تک کہ بعض کتب غیر مشہورہ اہل سنت میں بھی الحاق کیا۔ اور سنی بن کر طالب علمان اہل سنت کو دھوکا دیا اور اس روایت کو روایت کیا۔ لیکن یہ فریب بھی نہ چلا اور بہ سبب وضوح امارات کذب روایات مذکورہ۔ اور کھل جانے جعلی روایان روایت۔ اور غیر معتبرہ اور غیر مشہور ہونے ان کتب کے۔ جن میں یہ روایت پائی جاتی ہے۔ اول تو یہ روایت پایہ اعتبار سے ساقط ہو گئی۔ دوم خدا ساز دروغ و اصفان روایت کام آیا۔ اور بمقتضائے مثل مشہور "در ونگورا حافظہ نیا شد" روایت تو بنائی پر بنائی نہ آئی۔ یہ بھول گئے کہ ہبہ بے قبض موبہوب لہ مفید ملک نہیں۔ اور نیز ایک مرد اور ایک عورت یا دو لڑکوں سے مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔

گواہوں کی شرعی تعداد اور آنحضرت کا نام آخر قبضہ فدک صدیق کی صفائی کا مضبوط سامان ہے | بہر حال انہوں نے اپنی

طرف سے کمی نہیں کی لیکن قربان جانیے خداوند عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر شناسی اور طرفداری کے کہ ابو بکر صدیق کے طعن سے بری کرنے کی پہلے ہی وہ تدبیریں کر گئے جس کے سبب شیعوں کو طعن کر کے بحر غوغا سگانہ اور شور غرابانہ اور کچھ حاصل نہ ہو۔ خداوند کریم نے تو گواہی کے اعتبار کے لئے دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی قید لگا دی۔ اور جناب سرکار کائنات علیہ السلام افضل الصلوٰات واکمل التحیات والتسلیمات نے تادم آخر اپنا تصرف رکھا اس لئے ناچار ہو کر شیعہ خراب طینت کو مکر راہی عاقبت کے خراب کرنے کا فکر ہوا۔ وصیت کی روایت تراشی مگر پھر وہی بات ہے کہ جھوٹی بات کے پانوں نہیں چلتے یہ نہ سمجھے کہ وصیت تو اسی مال میں جاری ہو سکتی ہے جس میں میراث جاری ہو۔ جب میراث جاری ہی نہیں تو وصیت کے کیا معنی۔

القصد جب اس طرف سے بھی قافیہ تنگ ہوا تو علماء شیعہ کو سخت دشواری پیش آئی کہ نہ طعن کئے بن پڑے اور نہ چپ رہے سے کام چلے ہے۔ اگر طعن کریں تو کس منہ سے کریں؟ اور خاموش بیٹھیں اور مذہب سے دست بردار ہوں تو عوام شیعہ کو کیا منہ دکھلائیں؟ اور نذر و نیاز کس سے لیں؟ اور اموال اموات کو کیونکر ہضم کریں؟ تو باقیماندگان شیعہ نے اپنے متقدمین کے انہیں گورڈائے شتر مذکورۃ الصدور کو کمی بیشی کر کے زبان پر رکھا اور پھر زبان درازیاں شروع کیں سو مولوی عمار علی صاحب نے بھی اپنے رقیہ کریمہ اسمیٰ میرنا در علی صاحب میں ایسا ہی کیا۔ لیکن حکم مثل مشہور ”عیب کرنے کو ہنر چاہئے“ ان کا یہ حوصلہ نظر نہیں آتا کہ مصناہین مندرجہ رقیہ کو جو فی الجملہ بطرہ جدید ہیں۔ اپنے آپ تراشے ہوں۔ یہ بات کہہیں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ کی پھر لگائی کہیں حضرت علی اور حضرت ام المین کی گواہی کے ساتھ حنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی گواہی بڑھائی کہیں ہبہ اور میراث دونوں کی نسبت بہ ترتیب مذکور دعویٰ کرنے کا دعویٰ کیا کہیں حضرت عمر کے کاغذ پھاڑ ڈالنے کا بیزعم خود الزام دیا

کسی بڑے مکار کیتائے روزگار کی چالاکی نظر آتی ہے۔ پر مولوی صاحب حکم میلان طبیعت حیلہ دوست اور نیز بغرض فروغ مذہب سراسر دروغ ان بہتانوں کو نقل کر کے تنہائی میں جامہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آج تک کسی سنی واقف کار کی کوئی بات نہیں سنی۔ تو یہ سب پوچھک بھول جاتے انھوں نے شاید یہ سمجھا ہو کہ بہت سی چھینا چھٹی میں فدک میں سے کچھ تو ہاتھ آئے گا اور بہت سے جھوٹ ملکر ایک سچ کے برابر ہو جائیں گے۔

لیکن بفضلہ تعالیٰ مذہب اہل سنت میں یہ قوت ہے اور کیوں نہ ہو۔ سچی بات بکتی ہی ہوتی ہے۔ کہ علماء تو ایک طرف امثال احقر پیچدان بھی جو اب بات دندان شکن سے شیعوں کے دانت توڑنے کو بہت ہیں۔ چنانچہ اعتراض سابق کا جو کچھ خاکہ اڑا ہے وہ تو ناظرین کو معلوم ہی ہو چکا۔ اسی پر اس اعتراض کو بھی قیاس کر لیجئے۔ ع قیاس کن رگستان من بہار مرا : اور اگر بے جواب کے اس اعتراض کا دل سے کھٹکا نہیں جاتا تو لیجئے مولوی صاحب یوں رقم فرماتے ہیں۔

”کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا، اور حضرت ابو بکر صدیق

نے ایک جھوٹی حدیث خلاف کلام اللہ کے بنا کر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ

عنہا کی بات کو رلا دیا۔

مخدوم من سچا آدمی سچی بات کو مان لیا کرتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا۔ اگر ہم کو ہٹ دھرمی مد نظر ہوتی تو اس روایت کو کتابوں میں سے بھی حذف کر دیتے۔ فقط انکار تو درکنار کوئی موضوع روایت تو تھی ہی نہیں جو بعد از عدم اعتبار سمجھا چھڑا لیتے۔ اور اتنی ہی بات منصفوں کے نزدیک ہمارے اس دعوے کے معتبر ہونے کو کہ روایت ہبہ غیر معتبر ہی کفایت کرتی ہے۔ پر خداوند کریم ہم کو مولوی غمار علی صاحب کے ہمرنگ نہ کرے کہ نہج البلاغہ اور کافی کلینی جیسی معتبر کتابوں میں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہونا ثابت اور متحقق ہو۔ اور پھر ان کی بیٹیاں

ہونے سے انکار کر جائیں اور الٹی الٹی محبتیں لائیں چنانچہ مذکور ہوا۔

حدیث مذکور کلام اللہ کے عین مطابق ہے | مگر مولوی صاحب کا یہ فسر مانا کہ "حدیث

خلاف کلام اللہ کے بنائی" خلاف واقع ہے۔ واقف کار تو اتنی بات سے سمجھ گئے

ہوں گے کہ شیعوں کو کلام اللہ سے کیا سروکار؟ جس قوم میں کلام اللہ کا چرچا ہی

نہ ہو وہ کلام اللہ کو کیا سمجھیں جو سمجھیں کہ فلاںی بات کلام اللہ کے موافق ہے فلاںی

مخالف۔ مگر علم الیقین عین الیقین کے برابر نہیں ہوتا اس لئے اتنی گزارش کرنی پڑی

کہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی صاحب اپنے قصور فہم سے ناچار ہیں۔ ورنہ کلام اللہ

اور حدیث معلوم جس کی تحقیق کا ہم نے اوپر بھی وعدہ کیا ہے باہم مخالف نہیں بلکہ

موافق کیا متعلق ہیں۔ مزید توضیح کے لئے اول سے تقریر مخالفت ایسی طرح بیان

کیجئے جس سے شیعہ اور علماء شیعہ بھی ممنون احسان ہوں۔ بعد ازاں اثبات موافقت

سے ان کو یہ شرمائے کہ سرگرمیاں ہوں۔ مخدوم من ظاہر ا مولوی صاحب دڑوں

کے تیروں کے بھروسے لڑتے پھرتے ہیں جس قدر کہیں سے سن لی وہی کہدی۔

ورنہ خیر و عافیت ہے جو یہ طرز نامعقول اختیار کیا کہ جو باتیں ان کے مفید مطلب تھیں

وہی منہ پر مہر لگا کر بیٹھ رہے۔ ان کو لازم تھا کہ اول اثبات مخالفت کرتے جب کہ

کسی سے خواستگار جواب ہوتے۔ یہ کس نامعقول نے ان کو طرز مناظرہ سکھایا کہ دعوے

بے دلیل پیش کرتے ہیں۔

انصاف کی رو سے تو اس کے جواب میں ہم کو فقط لانسلم کفایت کرتا ہے۔

یعنی اتنا بہت ہے کہ ہم یوں کہیں کہ ہم نہیں مانتے اور اگر ہم بھی بے دلیل ایسے ہی

دعوے کرنے لگیں۔ بلکہ تمام عقائد اہل سنت کو یوں ہی بے دلیل پیش کرنے لگیں تو کوئی

پوچھے مولوی صاحب کے پاس کیا جواب ہے۔ معہذا ہم تو نہیں کہہ سکتے پر اگر کوئی

ناموسی یا خارجی بہ نسبت ان روایات کے جو فضائل ائمہ اور استحقاق امامت

وغیرہ خصوصیات مذہب شیعہ حضرات شیعہ اماموں سے نقل کرتے ہیں۔ یوں

کہنے لگے کہ اپنے مطلب کے لئے اماموں نے یا شیعوں نے خلاف قرآن یہ دیتیں

گھر طیس۔ تو پھر بجز اس کے کہ مولوی صاحب اپنی زبان کو منہ میں سمیٹ کر بیٹھ رہیں اور کیا کر سکیں گے لیکن ہمارے احسان کو دیکھئے کہ اول بمقدار رسائی ذہن شیعہ ہی بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر تقریر مخالفت تحریر میں لاتے ہیں۔

اہل شیعہ کا حدیث ما ترکناہ صدقۃ پر اعتراض واضح رہے کہ نہایت کوشش

کر کے علماء شیعہ نے یہ بات نکالی ہے کہ حدیث ابو بکر صدیق جس کا یہ مقمور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ ہماری انبیاء کی عت کا کوئی وارث ہی نہیں۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ وقف ہے۔ باوجودیکہ اس کے راوی فقط ابو بکر صدیق ہی ہیں کلام اللہ کے مخالف ہے۔ اور جو حدیث کلام اللہ کے مخالف ہو اگر بالفرض اس کے راوی بہت سے بھی ہوں تب بھی غلط ہے۔ چہ جائیکہ ایک راوی۔ بالخصوص اہل سنت و جماعت کے نزدیک کہ ان کے نزدیک کلام اللہ میرزاں صحت و ضعف و معیار صدق و کذب اخبار ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول تو حدیث مذکور اس آیت کے مخالف ہے یُوَصِّیْکُمُ اللّٰهُ فِیْ اَوْکَادِکُمْ لِلَّذِیْکُمْ مِثْلُ حَظِّ الْاُنثٰیْنِ جس سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا نکلتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو پہلے سے کہے دیتا ہے کہ تمہاری اولاد میں لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر ملا کرے۔ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اور احکام صوم صلوٰۃ حج زکوٰۃ میں شریک ہیں ایسے ہی اس حکم میں بھی امت کے شریک رہیں گے۔ معہذا اس آیت میں بنی غنوی کی کچھ تخصیص نہیں۔ پھر یوں کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی وارث نہیں۔ اس آیت کی تکذیب کرنا ہی دوسری اور آیت وَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَرْثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَوَرِثَ دَاوُدُ سُلَیْمٰنُ کے (جیسے اور انبیاء کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا بھی نکلتا ہے) مخالف اور مناقض ہے۔ کیونکہ دوسری کا ترجمہ تو یہ ہے کہ وارث ہونے حضرت سلیمان حضرت داؤد کے۔ اور پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زکریا

علیہ السلام جناب باری تعالیٰ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ الہی مجھ کو اپنے پاس سے ایک ولیعہد عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور اولاد یعقوب کا بھی وارث ہو فقط۔“

سودوسری آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام جو نبی تھے ان کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی۔ اور پہلی آیت سے گو یہ بات بتصریح نہیں نکلتی لیکن اول تو حضرت زکریا علیہ السلام سے جو مشہور نبی ہیں ایسے قدیمی حکم کے خلاف طلب کرنا مستبعد ہے۔ تصویر میں نہیں آتا کہ جو حکم حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لیکر ان کے زمانہ تک برابر معمول رہا ہو ان کو بڑھاپے تک معلوم نہ ہوا اور نہ اس باب میں کوئی وحی آئی۔ حالانکہ زمانہ پیری موت کا مقدمہ ہوتا ہے ایسے وقت میں لازم ہے کہ جو موت نبی کے متعلق مسائل ضروری ہوں ان کی اطلاع کی جائے تاکہ اس کے موافق وصیت کر جائے۔ ورنہ جو بات نبی ہی کو معلوم نہ ہو تو پھر امتیوں کے معلوم ہونے کی کیا امید ہے۔

بائیں ہمہ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی نجات کی دعا کے جواب میں بطور تنبیہ و عتاب رَاٰنِیْ اَعْظَمْتَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِیْنَ فرمایا اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ دعا خلاف مرضی جناب باری تعالیٰ تھی۔ حضرت زکریا کی اس التجا کے جواب میں بشارت قبول دعا پہنچائی گئی۔ کچھ تنبیہ و عتاب نہیں کیا۔ اس بات کا وہم جاتا کہ یہ عتاب اسی سبب سے ہوا کہ حضرت زکریا نے وراثت کا کیوں نام لیا۔ بہر حال ان آیات سے اتنا ثابت ہوا کہ انبیاء کے مال میں بھی میراث جاری ہوتی ہے۔

پھر یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی العموم سب انبیاء کو شاہل کر کے فرماتے ہیں کہ ہمارے گروہ کے گروہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا کیونکہ صحیح ہو بلکہ ان دونوں آیتوں سے تو یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ جو بعض روایات حدیث مذکور میں لفظ لَا نَرِثُ بھی آیا ہے یعنی ہم بھی کسی کے وارث نہیں ہوتے یہ بھی

غلط ہے کیونکہ حضرت یحییٰ اور حضرت سلیمان علیہما السلام بھی بالاتفاق نبی ہیں۔ جب وہ دونوں اپنے اپنے والد کے وارث ہوئے تو یہ بات کہ کوئی نبی کسی کا وارث ہی نہیں ہوتا سراسر غلط فہمی ہے۔ تقریر مخالف کلام اللہ و حدیث مذکور۔ اس سے بہتر شاید شیعہ بھی تقریر نہ کر سکیں۔

اعتراض کا جواب | اب ہماری بھی تحقیق صحیح اور تنقیح فصیح کے ترانہ عقل آشیانہ کی طرف متوجہ

ہو جائے۔ کہ ما شاء اللہ کیا دلکشا اور راحت افزا ہے جس سے کان میں بڑھتے ہی اطمینان ہو جائے۔ ظاہر کی مخالفت کا فلجان انشاء اللہ تعالیٰ ایسی طرح دور ہو کہ پھر بھی بھی دہیان نہ آئے۔ بہ ترتیب آیات موافقت کی بات تحریر میں آتی ہے۔ لیکن چونکہ باریک مضامین بے تمہید کے ادا نہیں ہو سکتے اس لئے اول یہ گزارش ہے کہ ہر چند کلام اللہ من اولہ الی آخرہ حرفاً حرفاً خدا ہی کا تصنیف ہے اور اسی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہتے ہیں۔ لیکن مراسلات اور خطوط بنی آدم کلام ربانی بھی دو قسم پر ہے۔ ایک تو جیسے کوئی نثر اپنی طرف سے کسی کو خط لکھے یا کوئی شخص کسی قاصد کو پیام دے کر بھیجے۔ تو اس صورت میں وہ عبارت بھی اسی نثری اور اسی شخص کی ہوتی ہے۔ اور وہ خط اور وہ پیام بھی اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ خط رساں اور پیام برفقط مثل ہوا ہوتے ہیں۔ کہ ایک کے منہ کی آواز دوسرے کے کان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی قسم کا تو اکثر کلام اللہ ہے مثلاً کے لکھنے کی کچھ حاجت نہیں یعنی جیسے خدا کا تصنیف ہے ویسے ہی خدا کی طرف سے امت کو۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا دونوں کو یا کسی خاص قوم کو خطاب ہے سو اکثر لو عبارت ایسی ہی ہیں نشان دہی اور تحریر مثال کی کچھ ضرورت نہیں۔

پھر شاید شیعہ بے لکھے نہ سمجھیں اس لئے یہ ایک دو مثال کافی و وافی مرقوم ہیں۔

يَا عِبَادِ قَاتِلُوا بَنِي إِسْرَءِيلَ أَذْكَرُوا نِعْمَتِي الَّتِي يَأْتِيهَا الرَّسُولُ الْخَلْقُ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ الْخَلْقُ پہلی آیت میں بے تخصیص کسی نیک و بد کے سب بندوں کو یہ حکم ہے کہ اے میرے بند مجھے ڈرو۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل کو سنایا جاتا ہے کہ اے گروہ بنی اسرائیل میری فلائی نعمت یاد کرو۔ اور دو آیتیں باقی ان میں خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب ہے بہر حال جیسے یہ عبارات خدا کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ ایسے ہی ان کے مضامین بھی

خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ کسی اور کا پیام سلام نقل نہیں فرماتے۔

دوسری یہ صورت ہے کہ جیسے لکھنا پڑھنا جاننے والے کسی ایسے جاہل کا خط جسے فارسی نہ آتی ہو فارسی میں لکھ دیا کرتے ہیں۔ تو عبارت گو اس منشی ہی کی ہوتی ہے کوئی نادان بھی یوں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عبارت اس مرد جاہل کی ہے پر مضمون اس جاہل ہی کا ہوتا ہے۔ اور خط بھی اسی کا لگنا جاتا ہے۔ یا جیسے کسی کو کوئی شخص کچھ تلقین کرے کہ تو اپنے قلانے مطلب کے لئے قلانے سے یوں کہیو۔ جیسے مختاروں اور وکیلوں سے لوگ مسودہ کرا لیا کرتے ہیں، تو گو عبارت تلقین کرنے والے ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہے پر اس کا مضمون کہنے والے یا عرضی والے ہی کا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی کلام اللہ میں بعض بعض عبارات ایسی ہیں کہ گو وہ بھی خدا ہی کی بنائی ہوئی ہیں لیکن ان کے مضامین بندوں کی طرف سے سمجھے جاتے ہیں جیسے قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ اور قُلْ هُوَ اللَّهُ اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ اور سوا اس کے جہاں لفظ قل یا قولوا اول میں ہے۔ اور پھر بعد میں ایسے الفاظ ہیں کہ جس کے ملاحظہ سے یوں معلوم ہو کہ متکلم مخاطب ہیں۔ مثلاً قل اعوذ کے یہ معنی ہیں کہ کہہ اے محمد میں پناہ مانگتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متکلم جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو بعد قل کے جتنی عبارت ہے اس سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے سمجھنی چاہئے۔

لیکن جیسے زبانی تلقین میں تو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تلقین کرنے والوں کہے کہ تو یوں کہیو۔ عرض کے مسودہ میں اس کی ضرورت نہیں۔ کہ اس کے اول میں یوں لکھ دیں کہ تو یوں کہیو بلکہ مسودہ کر کے یوں ہی حوالہ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی کلام پاک خداوند کریم میں بھی بعضی عبارتیں ایسی ہیں کہ وہ بندوں کی طرف سے علی العموم فقط۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہیں۔ لیکن اس کے اول میں قل یا قولوا نہیں بلکہ بمنزلہ مسودہ و کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا سب کی طرف سے تصنیف کر کے ان کے حوالہ کر دیا ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ اسی قسم کی ہے

خاص کر ایاک نعبد سے لیکر آخر تک۔ جس کا یہ مضمون ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ہمیں سیدھی راہ چلا الخ۔ ظاہر ہے کہ یہ عبارت خداوند کریم نے بندوں کی طرف سے بنا کر ان کے حوالہ کر دی ہے۔ تاکہ وقت حضور دربار خداوندی یعنی وقت نماز کے اس طور پر خداوند کریم سے عرض معروض کیا کریں۔ ورنہ اگر خدا کی طرف سے کہئے تو خداوند تعالیٰ شانہ سے زیادہ کون ہے جو خداوند کریم اس کی عبادت کیسے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو؟ اور پھر کون سے جناب باری تعالیٰ بے راہی پر ہیں جو سیدھی راہ کی تمنا اور آرزو ہے؟

يُوحِيكُمْ اللَّهُ سَے آنحضرت مستثنیٰ ہیں اس کے دلائل | جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب متوجہ ہو کر سنئے کہ آیت یوحیکم اللہ بلکہ ابتداء سورہ نساء سے لیکر یہاں تک۔ بلکہ عجب نہیں تمام سورۃ کی سورۃ بمنزلہ سورۃ فاتحہ جناب باری تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرمادی ہے تاکہ آپ بجائے خود لوگوں کو اس طرح سے سمجھا دیں۔ دلیل اس بات کی کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کی گئی ہے خدا کی طرف سے نہیں ہے کہ یوحیکم اللہ فرمایا اور یاعباد اذہنکم مثلاً نہ فرمایا اگر خدا ہی کی طرف سے بندوں کے خطاب میں یہ آیت ہوتی تو لازم تھا کہ یاعباد اذہنکم مثلاً فرماتے۔ یہ عبارت جواب موجود ہے صاف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ مکمل اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مخاطب امتی۔ آپ اپنی طرف سے ان الفاظ کے پیرایہ میں خداوند کریم کا حوالہ دے کر احکام میراث تعلیم فرماتے ہیں۔ کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ پہلے سے تمہیں خدا تعالیٰ نے آگاہی دی ہے کہ تمہاری اولاد میں بیٹوں کو دو بیٹیوں کے برابر بلا کرے۔

یہ ایسی بات ہے کہ جیسے سرشتہ دازج یا کلکٹر کا حکم اہل مقدمہ کے سناتے وقت کہا کرتے ہیں کہ صاحب تمہاری نسبت یہ حکم دیتے ہیں۔ اور اگر حاکم خود کلام کیا کرتا ہے تو اہل مقدمہ کو اس کے نام یا لقب سے جیسے چودھری یا شیخ جی مثلاً پکار کر کہا کرتا ہے کہ ہم تمہیں یوں حکم دیتے ہیں۔ یا ہمارا تمہارے لئے یہ حکم ہے مثلاً۔ نہ یہ کہ اپنا نام لیکر

یوں کہیں کہ تمہیں فلاں شخص یوں کہتا ہے۔ پس در صورتیکہ یَا عِبَادِ اَوْصِيكُمْ فَرِيًّا جَسًا
یہ مطلب ہوتا کہ اے میرے بندو میں تمہیں کہے دیتا ہوں بلکہ یوں ارشاد ہوا کہ اللہ تمہیں
یوں کہتا ہے تو بالیقین معلوم ہو گیا کہ جیسے سورہ فاتحہ سب کی طرف سے بنادی
ہے ایسے ہی یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بنادی ہے۔ تاکہ ہمت
اس طرح سے باتیں کریں۔ اور ظاہر ہے کہ جب سرشتہ دار کسی اہل مقدمہ کو کوئی حکم
سنایا کرتا ہے تو اس حکم سے اپنے آپ خارج ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سوا سرشتہ دار
جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں اگر اُس وقت موجود ہوں۔ اور یہ بھی سبھی کہ یوں کہے
کہ حاکم تمہارے لئے یوں فرماتے ہیں۔ تب بھی اُس وقت کی گفتگو سے کوئی یوں
نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سرشتہ دار بھی اس حکم میں داخل ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جو اس حکم کے سنائے میں
احکم الحاکمین کے سامنے بہ نسبت ہمارے بمنزلہ سرشتہ دار کے ہیں اس حکم سے خارج
سمجھنا چاہیے۔ اور یوں سمجھنا چاہیے کہ حکم فقط امتیوں ہی کے لئے ہے۔ اور حدیث
لَا تُورَثُ مَا تَرَكَنَا وَصَدَقَتْ اِس دقیقہ مخفی کے سمجھا دینے کے لئے۔ اس آیت
کی تفسیر ہے۔ پر شیعوں بسبب اپنی کم فہمی اور نہایت کچی طبیعت کے باعث تفسیر کو تبدیل
اور تغیر سمجھتے ہیں۔ اور حدیث و آیت میں تخالف جانتے ہیں۔ قصور تو اپنا اور طعن
ابوبکر صدیق کے ذمہ۔ اس تقریر کے بعد تو یقین یوں ہے شیعہ اپنے دل میں
پشیمان ہو کر مومن خاں کا یہ مصرع پڑھیں۔ ع میں الزام انکو دیتا تھا قصو اپنا نکل آیا
الغرض ذرہ برا۔ ہر حدیث مذکور اور آیت معلوم میں تخالف نہیں۔ بلکہ حدیث
مذکور آیت معلوم کی تفسیر ہے۔ اور سنیوں کی سب حدیثیں کلام اللہ کی تفسیر ہیں۔
اہل فہم سمجھتے ہیں اور کم فہم نہ سمجھیں تو اپنا سر کھائیں۔ اور اس حکم سے اور سوا اس کے
جو حکم کہ ایسی ہی عبارات میں مندرج ہیں۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خارج
ہیں جیسے کبھی سرشتہ دار اہل مقدمہ یا رعیت حاکم کو حاکم کا کوئی حکم سناتا ہے اور
حاکم کے دل میں سرشتہ دار کی نسبت بھی وہی حکم مکنون خاطر ہوتا ہے۔ تو آگے

پہچے اس کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ تمہارے لئے بھی یہی حکم ہے مثلاً کسی صلح میں کوئی کلکٹر ہوا اور اسی صلح کا رہنے والا کوئی مالگزار اس کی پچھری کا سررشتہ دار ہو۔ اور نسبت مالگزاروں کے کوئی حکم صادر ہو۔ اور وہ سررشتہ دار مالگزاروں کو یوں حکم سنائے کہ تمہارے لئے یہ حکم ہوا ہے۔ تو گو ان الفاظ سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ سررشتہ دار کے لئے بھی یہی حکم ہے لیکن بایں وجہ کہ سابقاً خلوة جلوة میں اس کو یہ بات متحقق ہو چکی کہ نسب مالگزاروں کے لئے ایک ہی حکم ہے۔ وہ سررشتہ دار بھی وقت تعمیل حکم اسی حکم کا پابند رہے گا۔

سو اگر بعض احکام میں مثل صوم، صلوٰۃ رجب، زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نزدیک ہوں۔ اور پھر بالفرض وہ بھی ایسے ہی الفاظ سے کلام الشیخ وارد ہوئے ہیں کہ موافق تقریر مسطور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے خارج ہونے چاہئیں۔ تو کسی اور قرینہ یا خطا پہنچانی سے آپ کو اپنا شمول اس حکم میں ثابت ہوا ہو۔ مگر چونکہ اس حکم میں یہ متحقق ہو گیا ہو کہ میں اس میراث سے خارج ہوں۔ بلکہ بالخصوص اس بات میں میرے لئے اور حکم ہے۔ تو بایں نظر کہ مبادا صوم و صلوٰۃ کا اشتراک دیکھ کر باقیماندگان یہ سمجھ جائیں کہ گو اس آیت سے آپ کا شمول اس حکم میں معلوم نہیں ہوتا لیکن کیا عجب کہ مثل صوم و صلوٰۃ اس حکم میں بھی کبھی وحی جدید کے باعث آپ شریک ہو گئے ہوں۔ اور یہ سمجھ کر اموال ترقہ کو جو بضرورت اخراجات روزمرہ کسی کو دیا نہیں گیا تھا تقسیم کر لیں۔ اور تصرف غیر حرجی سے انجام کار دین و دنیا کی خرابی اٹھائیں لَا تُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃً فرمایا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے | اور تخصیص کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مال بعد وفات میراث میں نہیں آ سکتا کچھ نئی تخصیص نہیں۔ بہت سے حکم ایسے ہیں جس استثناء کی دیگر نظیریں۔

میں امت کے لئے کچھ حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ اور حکم تھا۔ بشہادت شروع سورہ مزمل اور آیت دَمِنَ اللَّیْلِ فَتَخَجَّذْ بِہَا نَافِلَۃً لَّکَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باتفاق اکثر آپ پر فرض تھا۔ اور باقی تمام امت پر فرض نہیں، صوم وصال آپ کے حق میں موجب ثواب تھا باقی تمام امت کے لئے ممنوع۔ اگر کوئی عورت

اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبیہ کر دیتی تو آپ کو وہ حلال تھی اور وہ لے لئے حلال نہیں۔ آپ کے ذمہ مہر اور عورتوں کے حق میں عدل یعنی سونے لیٹنے میں برابری نبھانی فرض تھی گو آپ نے تمام عمر عدل ہی سے گزاری اور مہر بھی دیا۔ اور باقی تمام امت پر یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ سب امت کے لئے چار عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ اسی سورت کے شروع میں اس تعداد کا ذکر ہے اور باتفاق امامیہ اثنا عشریہ بلکہ اکثر فرقہائے شیعہ و سنی اس کے یہی معنی ہیں کہ چار تک اجازت ہے آگے نہیں۔ حالانکہ جناب سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوات و اکمل التلیات اس حکم سے خارج ہیں۔ آپ کے حق میں سب جانتے ہیں یہ قید نہ تھی۔

اور اس حکم سے آپ کے خارج ہونے کی وجہ بھی یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نہیں بلکہ بمنزلہ آیت یُؤْهِیْکُمْ اللہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہے۔ جیسے کچھری کے عرضی نویس کسی کو عرضی لکھ دیتے ہیں۔ اور وہ عرضی لکھوائے والے ہی کی سمجھی جاتی ہے عرضی نویس کی کوئی تہیں کہتا۔ ایسے ہی اس حنا سے ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم احکام یعنی عطا پند سمجھنا چاہئے کیونکہ اس تعداد کے ذکر سے کچھ ہی پہلے شروع میں اس سورت کے اس طرح سے خطاب ہے یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم سے پیدا کیا فقط سو یہ کلام اور یہ خطاب ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے تو بندوں کو ہو ہی نہیں سکتا ورنہ یوں فرماتے یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ یعنی اے لوگو! مجھ سے ڈرو اس لئے کہ میں تمہارا وہ رب ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا ایک جان سے فقط۔

اب ہونہ ہو یہ کلام اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ اور مخاطب اس پند کے امتی ہیں۔ تو لاجرم یہ احکام بھی بہ نسبت امتیوں ہی کے ہوں گے تیمار دار جو حکم حکیم حاذق بیمار کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو دوا پی لے اور بد پرہیزی مت کر۔ تو کسی کے نزدیک (نہ بیمار کے نہ غیر کے) یہ لازم نہیں۔ کہ تیمار دار خود بھی دوا پئے

اور پرہیز کرے۔ بلکہ سب کے نزدیک تیمار داران احکام سے خارج ہے۔ ایسے ہی جناب سرور کائنات علیہ السلام جو ہم بیماروں کے لئے بمنزلہ تیمار دار کے ہیں حکیم مطلق یہ احکام مندرجہ ذیل **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِلَى آخِرِ السُّورَةِ** سب امتیوں کو سناتے ہیں۔ تو لاجرم آپ ان احکام سے خارج ہیں۔

اور اگر کسی حکم میں شریک بھی ہیں تو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اس تیمار دار کو بھی حفظ صحت کے یا کسی اور مصلحت کی رعایت کے لئے وہ حکیم کوئی دوا یا کوئی پرہیز ہی بتلا دے جو اس بیمار کے نسخہ اور پرہیز میں داخل ہے اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ خاص کر شروع سے لیکر آخر رکوع **يُوصِيكُمُ اللَّهُ تَكُ جِتْنِ احْكَامُ** مذکور ہیں وہ سب بہ نسبت امتیوں کے صادر ہوئے ہیں۔ اس میں سے اگر کسی حکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک امت ہیں بھی؟ تو کسی اور اشارہ کنایہ وحی وغیرہ کے سبب ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ نہیں تو آخر رکوع مذکور تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے عبارت بنائی گئی ہے۔ بالجمہ جناب سرور کائنات علیہ علی آلہ فصل الصلوات وکمال التحیات اکثر احکام سے مستثنیٰ ہیں۔

اور مردمان فہمیدہ سوارا مثلاً مذکورہ کے دنیا کے کاروبار میں سے اور اس کی بہت سی مثالیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً افسر بہ نسبت عوام ملازموں کے بہت سے احکام میں مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اور بہت سے احکام اسی کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔

پہر سپاہی دیتے ہیں افسروں سے معاف ہوتا ہے پہر بدلانا اور حکم بولنا اور انتظام کرنا اور موجودات یعنی اور امور ضروری کی حکام بالادست کو اطلاع کرنی افسروں کے ذمہ ہوتی ہے۔ الحاصل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مثل حکم تعداد منکوعات اس حکم سے بھی خارج ہیں۔ اور جب خارج ہوئے تو یہ آیت اور وہ حدیث باہم مخالف نہ ہوئی موافق اور متعلق ہی نکلی ہاں بخالفت اسے کہتے ہیں کہ شیعہ اپنے اماموں سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کے بعض وارثوں کو بعض ترکہ کا حصہ نہیں دیا

بلکہ خود اپنے آپ سب نے لیا ہے جیسے شمشیر اور مصحف اور انگشتی اور پوٹاک
بدنی سو جن روایتوں کی سند سے اماموں نے اوروں کو حصہ نہیں دیا اول تو وہ
فقط انھیں کی روایت ہے۔ اور کوئی اس کا راوی نہیں۔ دوسرے یہ بات آیت
یوصیکم اللہ کے ہر طور مخالف ہے تطبیق کی کوئی صورت نہیں۔

اب اگر بالفرض یہ حدیث غلط بھی ہو اور ابو بکر صدیق ہی نے بنالی ہو تب
مضمون صحیح ہی نکلا۔ حکم بہر حال یہی ہے کہ فدک غیرہ متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم میں میراث جاری ہونے کا حکم نہیں۔ اور اس لئے اب ہمیں اس کی ضرورت
نہیں کہ اس حدیث کی صحت کے دلائل جمع کر کے پیش کریں۔ یا کوئی اور وجہ دربارہ
تطبیق حدیث مذکور اور آیت یوصیکم اللہ بیان کریں۔ یا اس حدیث میں اور روایات
باقیہ میں موافقت ثابت کر کے شبہ تخالف کو دور کریں۔ کیونکہ کلام فدک میں میراث
جاری ہونے میں تھی۔ سو اس کی طرف سے اطمینان ہی ہو گیا لیکن تاہم بائیں نظر
کہ اولیائے کرام اور مقربان درگاہ خداوندی کی طرف داری اور ان کے بدگویوں کی
دندان شکنی میں امید نظر عنایت خداوند تعالیٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور توقع دعا
و شفاعت اولیاء و مقربان خدا ہے جس میں سے خاص ابو بکر صدیق کہ سراسر مقربان اور
سر لشکر اولیاء ہیں۔ اس لئے اس آیت سے مطابقت کی بھی ایک اور وجہ مرقوم
ہے۔ اور تطبیق آیات باقیہ بھی معروض خدمت اہل انصاف ہے۔ ازاں بعد بطور شیعہ
دستی کچھ بیان صحت و علامات صحت حدیث مذکور بھی انشاء اللہ کیا جائے گا۔

حدیث معاشر الانبیاء، محض اسوۃ اولیٰ آیت یوصیکم اللہ کے ساتھ مطابقت کی ایک
آیہ توریث ہے۔ ذکہ معارض اور وجہ لیجئے۔ اگر بطور مذکور جس سے جناب سرور عالم صلی اللہ
علیہ وسلم کا مستثنیٰ ہونا اس حکم سے معلوم ہو جائے یہ حکم بیان نہ ہوتا۔ بلکہ ایسے الفاظ
ہوتے کہ جن سے باعتبار الفاظ عموم خطاب ہی سمجھا جاتا۔ یا کوئی عقل کا اندھا نہیں
الفاظ کو یوں کہنے لگے کہ عموم پر دلالت کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اس حکم میں بہر نہج شامل ہی ہیں۔ تب بر تقدیر صحت حدیث مذکور کوئی دشواری ہی نہیں

بہت سے بہت ہو گا تو آیت مذکور کی تخصیص لازم آئے گی مخالفت پھر بھی نہیں۔
مخالفت تو تعارض اور تناقض کو کہتے ہیں تخصیص کی صورت میں استثناء کی صورت
ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ میرے پاس سب آئے مگر زید نہیں آیا تو اس کلام
کے اول اور آخر میں کوئی نادان بھی تعارض نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یوں کہنا کہ سب آئے
اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زید بھی آیا۔ یہ کہنا کہ زید نہیں آیا اس کے مخالفت ہے
سو اس کی بلم ہی ہے کہ آخر کا کلام اول کا مخصص ہو گیا۔

باقی کوئی یوں کہے کہ اس مثال پر توجب قیاس کیا جائے کہ جیسے اس کلام
میں حیلہ مخصصہ ساتھ لگا ہوا ہے ایسے ہی مضمون حدیث کا کوئی لفظ اس آیت
کے متصل آگے پیچھے لگا ہوتا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مخصص کا لفظوں میں متصل
ہی ہونا کچھ ضرور نہیں۔ اسی کلام میں کہ سب آئے مگر زید نہیں آیا ایک زید کی تخصیص
تو لفظی ہے۔ باقی اور جولا کھوں تخصیص اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ لفظوں میں
کہاں ہیں؟ تو ضیح اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے کلام کا سمجھنا کو اتفاق پڑتا ہے۔
اور با ایں ہمہ تمام مخلوقات بلکہ سب بنی آدم اور سارے روئے زمین کے رہنے
والوں کا آنا بھی مثلاً مقصود نہیں ہوتا۔ ایک بستی کے یا ایک گروہ کے یا ایک
ذیل خاص کے آدمی مراد ہوتے ہیں۔ سو یہ تخصیص کو جسے لفظ سے نکل آئی اور
اس پر تسکین نہ ہو تو اب کے ایسی مثال لیجئے کہ پھر کسی کو مجال دم زون نہ رہے۔
جیسے آنحضرت فَاَنْكَحُوْا مَا طَابَ | اول میں اسی سورت کے یہ حکم ہے فَاَنْكَحُوْا مَا طَابَ
سے مستثنیٰ ہوا پس یہاں یوحیکم اللہ میں | لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبَاعَ یعنی نکاح

کرو عورتوں سے جس قدر تمہاری مرضی ہو دو دو۔ تین تین۔ چار چار فقط۔ اعرض
یہ ہے کہ باتفاق سنی و شیعہ خصوصاً امامی و اثنا عشری اس کے معنی یہی ہیں کہ چار نہایت
درجہ ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ سو اگر یوحیکم اللہ عام ہے اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر کو سب کو شامل ہے تو فَاَنْكَحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ
بھی عام ہے اور سب کو شامل ہے۔ کوئی لفظ ایسا جس سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا اس سے مستثنیٰ ہونا ثابت ہو اس کے پس و پیش میں نہیں۔ پھر جیسے کسی کلام مفصل سے اس آیت کو تخصیص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کر لیا ہے ایسے ہی حدیث مذکور سے آیت جو صلی اللہ کو مخصوص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کر لیا۔

اور اگر یوں کہئے کہ آیت فانکحوا کی تخصیص تو دوسری آیت ہی سے کی گئی سورۃ احزاب کی یہ آیت یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ تک اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے کیونکہ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔

کہ اے نبی ہم نے حلال رکھیں تیرے لئے تیری عورتیں جن کے تو مہر دے چکا اور جو باندیاں تیری ملک میں آگئی ہیں اس لوٹ میں جو اللہ نے دلوادی ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری بھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے وطن چھوڑ دیا تیرے ساتھ ہیں۔ اور جو کوئی عورت ہو مسلمان اگر بخشنے اپنی جان نبی کو اور نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لے آئے نری تجھی کو سوار اور مسلمانوں کے فقط۔“

سو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی تو اتنی کیوں گنا دیتے سو جیسے آیت فانکحوا کی تخصیص اس آیت سے ہو گئی ایسے ہی کوئی آیت بتلاؤ جو آیت جو صلی اللہ کو تخصیص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے پر دلالت کرے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم بجا کس سے روا ہو گیا۔؟ کہ کلام مختص بھی ہو تو آیت ہی ہو؟ عقل سلیم کو آیت اور غیر آیت اس بات میں دونوں یکساں نظر آتے ہیں اور عقل کے سلیم نہ ہونے کے عذر سے یہ جواب مسلم نہیں۔ تو ہم کہتے کہ اول تو آیت فانکحوا کا مخصوص ہونا آیت انا احللنا سے مسلم نہیں ہے۔ کیونکہ مقام دعویٰ میں لازم ہے کہ ایسی دلیل پیش کی جائے جس میں خلاف دعویٰ کا احتمال نہ ہو۔ اور

اس آیت میں احتمال ہے کہ بمنزلہ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ اس امر کے بیان کے واسطے نازل ہوئی ہو کہ تمہارے لئے اس قسم کی عورتیں حلال ہیں۔ نہ یہ کہ جتنی چاہو نکاح کر لو۔ جیسے وَاُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ کے یہ معنی ہیں کہ تمہارے لئے سوا محرمات مذکورہ کے سب قسم کی عورتیں حلال ہیں۔ بشرطیکہ مہروں سے ان کے ساتھ نکاح کر لو۔ سو اس سے یہ نہیں نکلتا کہ سوا محرمات مذکورہ جس قدر چاہو ان سے نکاح کر لو۔ اور مؤید اس احتمال کی یہ بات ہے کہ سورۃ احزاب سورۃ نساء سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

چنانچہ تفسیر القان میں نوع اول میں ترتیب نزول سورہائے قرآنی میں ایک حدیث متصل نقل کی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے۔ سوا اب تک آیت فَاَنْكَحُوا نازل ہوئی ہی نہ تھی جو آیت اَنَا اَحْلَلْنَا نازل ہوئی۔ اور جب تک آیت فَاَنْكَحُوا نازل نہیں ہوئی تھی تب تک نکاح کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص؟ کسی کو بھی کوئی قید عدد نہ تھی۔ پھر کیا ضرورت تھی جو اس آیت کو نازل کر کے یہ اطلاع کی گئی کہ تمہارے لئے جتنے نکاح کرو درست ہیں؟ اس صورت میں لاجرم یوں ہی کہا جائے گا کہ آیت فَاَنْكَحُوا کی تخصیص کسی اور ہی وجہ سے ہوئی اور اگر یوں کہئے کہ ترتیب مذکور باعتبار فَوَاحِشِ سُوْرَہِہُو۔ یہ کیا لازم ہے کہ سورۃ احزاب کی تمام آیتیں سورۃ نساء کی تمام آیتوں سے پہلے ہی نازل ہوئیں؟ چنانچہ حدیث مشارالیه سے کچھ ایسا ہی واضح ہوتا ہے۔ سو ہر چند یہ احتمال ہمیں ساکت نہیں کر سکتا اسی لئے کہ مدافعت ان احتمالات کی ہمارے ذمہ نہیں۔ ہم کس بات کے مدعی ہیں جو احتمالات مخالفت کو رفع کریں؟ ہاں اس احتمال کا دفعیہ کہ شاید ساری ہی احزاب یا فقط آیت اَنَا اَحْلَلْنَا۔ ساری سورۃ نساء یا فقط آیت فَاَنْكَحُوا اس سے پہلے نازل ہوئی ہو۔ ان کو ضروری ہے تاکہ ان کا دعویٰ تخصیص ثابت ہو۔

یوصیکم اللہ کی مفصص | معہذا ہمارے چشم پوشی دیکھئے کہ ہم اس سے بھی درگزر کر دوسری آیت بھی ہے۔ آیت یوصیکم اللہ کی مفصص بھی آیت ہی بتلاتے ہیں۔ سورۃ

حشر جو بشارۃ حدیث مشار الیہ سورۃ نسا سے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں یہ آیت موجود ہے مَا فَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْلًا يَكُونُ دَوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ مطلب یہ ہے کہ جو مال بطور فی کے خداوند کریم نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دلوادیا۔ یتیموں والوں سے۔ (یعنی بے لڑے بصلح فتح ہو گئی) تو وہ اللہ کے واسطے اور رسول کے اور نالتے والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے لئے ہے۔ تاکہ نہ آدے لینے دینے میں دو لہتمندوں کے تم میں سو فقط

اب علماء اہل سنت اور منصفان علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مال فی کی تقسیم جناب باری تعالیٰ نے چھ حصوں پر کی بعض علماء کا تو یہی قول ہے کہ چھ حصوں پر تقسیم کر کے خدا کا حصہ بیت اللہ اور مساجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے۔ پر اکثر اہل مذہب یہ ہے کہ مال فی کے پانچ ہی حصہ ہیں لیکن چونکہ عبارت فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ الخ جو یہاں ہو بہو وہی عبارت ہے جو پارہ دہم کے شروع میں مصرف خمس کے بیان کے لئے وارد ہوئی ہے۔ اور شیعوں کا اس جگہ پانچ حصوں پر تقسیم کرنا بالیقین معلوم ہے۔ تو بالیقین معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں کے نزدیک وہی تقسیم ہوگی۔ سو اس مذہب کے موافق ذکر خدا کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جو چیز خداوند کریم کے ارشاد کے باعث اس کی رضا کے موافق خرچ کی جاتی ہے تو اس کو خدا کے ساتھ اور نیز ان کے ساتھ جو موافق ارشاد خداوندی اس کے مقرر مقرر ہوئے ہیں ایک نسبت حائل ہو جاتی ہے۔

خدا کے ساتھ تو یہ نسبت کہ اس کی راہ میں خرچ ہوئی۔ اور اہل مصرف کے ساتھ یہ نسبت کہ ان کے لئے مقرر ہوئی۔ تو اس کو خدا کے واسطے بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ عرف ہی یہ ہو گیا ہے کہ جو چیز بنیت ثواب دیا کرتے ہیں اس کو خدا کے واسطے کہا کرتے ہیں۔ اور اہل مصرف کے واسطے بھی۔ چنانچہ عرف میں ان کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں اور بولا کرتے کہ فلا فی چیز فقروں کے یا مسکینوں کے

واسطے ہے مثلاً۔ تو اس صورت میں حاصل یہ ہوا کہ مال فی خدا کے واسطے ہے اور فلانی
فلانی قسم کے آدمیوں کے واسطے یعنی خدا کی رضا مندی کے لئے اُن کو دیا جائے۔
اور ضرورت اس کہنے کی یہ ہوئی کہ مال فی تو اسے کہتے ہیں کہ جو کفار کے پنجوں میں سے
بے لڑے بھڑے بسبب رعب لشکر اسلام کے یا بطور صلح اہل اسلام کے قبضہ میں آجائے
سو یہ مال حقیقت میں تو جناب باری تعالیٰ نے اپنے فضل سے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں داخل کر دیا۔

لیکن چونکہ بظاہر اس کا باعث رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا ہے۔ اور
رعب میں فی الجملہ جمعیت لشکر کو مدخلت ہے۔ تو لشکریوں کو اس میں طمع ہو سکتی تھی
اس لئے یوں ارشاد ہوا کہ جو مال بے لڑے بھڑے ہم نے اپنے رسول کو دلوادیا ہے
اس میں تمہیں جانفشانی کی نوبت نہیں آئی کہ کسی قسم کی مشقت تم پر نہیں پڑی۔ سو
مناسب یوں ہے کہ اس کو خدا کے واسطے چھوڑ دو۔ تاکہ مصارف مذکورہ میں صرف
ہو وے لیکن پہلی آیت میں جو یہ جملہ ہے فَمَا أَوْجَفْتُمْ سے لے کر قَدْ آتَا تِلْكَ اس
جملہ کے مناسب یوں ہے کہ یوں کہیے کہ جب خداوند کریم نے تمہاری بے سعی و
کوشش کے یہ مال اپنے رسول کو دلوادیا تو اس میں تمہارا کچھ حق نہیں۔ جیسا مال
غنیمت بسبب اس کے کہ بظاہر تمہاری جانفشانیوں کے باعث رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آیا تھا تم پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جو مال فقط خدا کی
عنایت سے ہاتھ آئے وہ خدا کا ہونا چاہئے۔ اور جو لوگ اللہ والے ہیں اور
خدا کے نام پر بیٹھے ہیں یہ خدا کے نام کا مال اُن کو ملنا چاہئے۔

آنحضرت فدک کے | بہر حال لفظ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض
مالک نہ تھے متولی تھے | و تصرف ثابت ہوا لیکن جیسا لفظ علی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا ویسا ہی لفظ فلانہ سے یہ بھی ثابت
ہوا کہ وہ قبض و تصرف مالکانہ نہیں بلکہ متولیانہ ہے یعنی آپ خازن اور امین ہیں
مالک نہیں۔ ورنہ اس مصرف کے مقرر کرنے کے کیا معنی؟ مالک کو اپنی چیز کا اختیار

ہوتا ہے؟ اور اگر بالفرض والتقدیر مال فی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو اور ایک قدر معین کے لئے ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل کو مقرر کروینا ایسا ہی ہو جیسا زکوٰۃ کے لئے (جو ایک حصہ معین ہے) فقراء اور مساکین وغیرہ کو مقرر کر دیا ہے۔ تو قطع نظر اس کے کہ یہ بات بشہادت عبارت آیۃ ظاہر البطلان ہے اس کے معنی ہوئے کہ نعوذ باللہ سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوٰت والتسلیمات جو باتفاق سراسر معصوم ہیں۔ اس جہان سے بار حقوق مندرجہ آیت اپنے سر پر لگے سوا اس کے قایل ہونے کی جرات شیعوں ہی میں نظر آتی ہے اہل سنت کو ایسی بات کہہ کے اپنا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

باقی رہائی کے اندر نئی کامصالح مذکورہ میں خرچ کرنا۔ سوا اس صورت میں اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ لفظ افاء اللہ اس صورت میں صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ وغیرہ کو اصل زمین بانٹ کر دینی چاہئے۔ الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پھر معلوم کہ کس وجہ سے روایت ہے فدک کو علمائے شیعہ صحیح سمجھتے ہیں یا فدک کو تمام حق وارثان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم؟ بلکہ فقط حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق خاص قرار دے کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بلکہ تمام اکابر صحابہ خصوصاً خلفائے ثلاثہ پر زبان طعن دراز کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ اگر پہلے سے عذر جہل تھا تو البتہ یہ عذر معقول ہے۔ لیکن بعد استماع ان کلمات طیبات اور مضمون آیۃ سراسر ہدایت کے تو یہ واستغفار میں کیا توقف ہے؟

ہاں اگر قریہ فدک بطور فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں نہ آیا ہوتا یا بعد اوائے قدر ما وجب منجملہ اراضی وسیعہ اور قریات کثیرہ قریہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ جاتا تو البتہ در صورت احتمال مفروض فی الجملہ جائے گرفت تھی لیکن شیعہ ہی فرماتے ہیں کہ فدک کافے ہونا اور پھر غیر مقسوم ہونا اس کے نزدیک مسلم نہیں؟ بلکہ انصاف سے دیکھئے تو اس قسم کی تقسیم بھی مفید مطلب شیعہ نہیں

کیونکہ اگر بالفرض قریات تقسیم ہوئی تھیں تو ہر ہر قریہ والوں سے جدا جدا صلح واقع ہوئی تھی کسی ایک کی سلطنت ہی نہ تھی جو فقط اسی سے صلح کرنی کافی اور مکفی ہو جاتی سو اس صورت میں لازم تھا کہ ہر قریہ میں سے تقسیم کر کے حقوق واجبہ کو ادا کرتے۔ کیونکہ لفظ ما جو اناء اللہ میں ہے عموم اور شمول افراد پر دلالت کرتا ہے مثل غنیمت ہر فے کو جدا گانہ تقسیم کرنا چاہئے تھا۔

اور اگر کوئی عقل کا اندھا اور تعصب کا پورا سنیوں سے دامن چھڑانے کے لئے فدک کو کسی غنیمت کا حصہ خمس کہہ کے سنیوں کے سامنے آنکھیں کرنے کا ارادہ کرے تب بھی موافق مثل مشہور صریح بہر کجا کہ رسیدیم آسمان پیدا است : وہی خرابی کی خرابی برسر ہے گی۔ کیونکہ جن الفاظ اور جس عبارت سے مال فے میں سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصناف اربعہ ذی القربی وغیرہ کے حقوق کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔ وہی الفاظ بعینہا خمس کے مصرف کے بیان کے لئے جناب باری تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ اگر علماء شیعہ کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے حکم المرء یقیس علی نفسه اس گفتار میں میری طرف دروغ کا احتمال ہو تو کلام اللہ تو ہر جا موجود ہے بیسیاں دہم کی پہلی آیت کو مطالعہ کر دیکھیں۔

معہد خمس تو مال غنیمت میں سے ملتا ہے۔ سو اگر بالفرض فدک جنگ و جدال سے فتح ہوا ہوتا تو چار خمس تو پھر بھی غائبین کے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس سوائے اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اگر کہئے تو جو حال اور مجاہدین کا ہے وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ سو کسی طرح سارے فدک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی احتمال نہیں کہ فدک کسی قریہ کے اس حصہ معین کا نام ہے جو بعد اداائے حقوق واجبہ رہ گیا تھا۔ کیونکہ بالاتفاق اہل لغت صاحب قاموس وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ فدک ایک قریہ کا نام ہے علماء شیعہ کو بھی اس میں کلام نہیں۔ اور جاہلوں سے اپنی کلام نہیں۔ بہر حال قبل اس بات کے کہ بعد تقسیم اراضی کثیرہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہ گیا تھا۔

یہ احتمال باطل ہے کہ اراضی فی بلکہ اراضی خمس بھی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں، مثل خیال محال مجاہدین پریشان ہی رہے گا۔

آیت کے ہر لفظ فدک کا مملوک نہ ہونا ظاہر ہے مگر شاید کسی عقل کے دشمن کو اس احتمال کے بطلان کی حقیقت میں غلجان رہے۔ اس لئے ہم کو بھی لازم ہے کہ اس احتمال کے بطلان کے وجوہ جن سے مال فی بھی ثابت ہو جائے۔ بیان کر کے ابو بکر صدیق کی برادرۃ بلکہ حقانیت اور علماء شیعہ کی خوش فہمی کو آشکارا کر دکھلائیں۔ سوا اول تو اس احتمال کے بطلان کے لئے کہ فدک جو منجملہ اراضی فی ہے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا راوران مصارف معلومہ کا مقرر کردینا بعینہ ایسا ہے جیسا اموال مملوکہ میں قدر زکوٰۃ کے لئے فقرار اور مساکین وغیرہم کو مقرر فرما دیا ہے قطع نظر اس کے کہ ادنیٰ سے عربی داں کو بھی یہ وہم نہیں گذر سکتا۔ چنانچہ ظاہر ہے یہی ایک لفظ فللہ کافی ہے کیونکہ مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اموال فی کا اس لفظ سے ظاہر و باہر ہے۔ چنانچہ مطالعہ کثان تقریر مسطور بالا پر انشاء اللہ مخفی نہ رہے گا۔

دوسرے اگر لفظ مَا آفَاءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهِ تملیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا تو پھر فَلِلّٰہِ سُوْلٍ کہنے کی کیا حاجت تھی؟ بلکہ مثل وَاعْلَمُوْا اَنْمَّا غَنِمْتُمْ مِّنْ نَّبِیٍّ فَاِنَّ لِلّٰہِ خُمُسَهُ وَاَلِلّٰہِ سُوْلٍ الخ یہاں بھی جس قدر خداوند کرم کو مد نظر ہوتا کہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کی تعیین فرما کر فللہ کے بعد وَلِیِّ الْقُرْبٰی وَالْیَتٰی الخ فرمادیتے فَلِلّٰہِ سُوْلٍ نہ فرماتے۔ اور اگر یوں کہنے کہ لفظ مَا آفَاءَ اللّٰہُ سے تو تملیک نہیں ثابت ہوتی پر فَلِلّٰہِ سُوْلٍ تملیک پر دلالت کرتا ہے تو البتہ یہ بات نادانوں کے نزدیک داناؤں کی سی بات ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اگر فَلِلّٰہِ سُوْلٍ میں لام تملیک کے لئے ہو تو لاجرم فللہ وَلِیِّ الْقُرْبٰی کا لام بھی تملیک ہی کے لئے ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ اس جگہ تملیک بے اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ جس جس کی ملک کیا گیا ہے پہلے سے اس کی ملک میں نہ ہو۔ بلکہ بعد افاء یعنی مسلط کر دینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اصناف مندرجہ آیت مال فی کے

مالک ہوئے ہوں۔

کیونکہ اول تو بات ظاہر قبیحہ افارۃ اموال فی میں کفار کے سب تصرفات مثل بیع غنم ارہبہ وغیرہ کے سب کے نزدیک صحیح ہیں۔ معہذا اگر وہ قبل افارۃ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ قبول کر لیں تو بہ نسبت اموال کوئی ان کا مزاحم حال نہ ہو۔ یعنی اس سے معلوم ہوا کہ قبل افارۃ کفار ہی مالک تھے۔

لام تملیک کے لئے ہو۔ تو اموال | دوسرے فار تعقیب خود اس بات پر شاہد ہے کہ اگر فی غیر مملوکہ خدا ہوں گے | لام للرسول وغیرہ سے ملکیت ثابت ہوتی تب اس کا

خداوند مالک الملک خالق ارض و سما کا پہلے سے مالک ہونا شیعوں ہی کے نزدیک ہو سکے تو ہو سکے؟ کیونکہ پہلے سے مالک نہ ہونے کی وجہ اگر ہو تو یہ ہو کہ اموال فی قبل اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قابض ہوں۔ کفار کے مملوک تھے۔ اور ایک شے کے تمامہا ایک وقت میں دو مالک نہیں ہو سکتے۔ پھر خداوند کریم کو بھی کس طرح مالک کہہ دیجئے لیکن یہ استبعاد جب ہی ہو سکے ہے کہ ملک خداوند کریم ہم پر ملک کفار ہو سو شیعہ بزرگ معتزلہ جیسے بندہ مخلوق کو کہ افعال اختیار یہ کا خالق قرار دیکر خالق حقیقی کے برابر سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی اگر ملک میں بھی خالق اور مخلوق کو برابر سمجھنے لگیں تو کون روکتا ہے، عقیدہ غلط سے بجز عقل کے اور کوئی نہیں روک سکتا۔ سو وہ پہلے ہی نصیب شمنان ہوئی۔ اور اہل سنت جو بندوں کے ملک کو مالک الملک کے ملک کے سامنے بمنزلہ قبضہ خراجی بلکہ مستعیر مالک اصلی کے ملک کے سامنے سمجھتے ہیں تو اُن کو مالک الملک کے ملک اور بندوں کے (خصوصاً کفار کے) ملک کے اجتماع میں کوئی محال نظر نہیں آتا۔

آیت کا مقصد بیان تملیک نہیں ہے | اور ملنا کہ تملیک بمعنی مذکور نہ ہو بلکہ مقصود فقط بیان ملک ہوا اور موافق عقیدہ اہل سنت فللہ وللا رسول کے یہ معنی ہوں کہ مالک حقیقی خداوند مالک الملک ہے اور مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن لذلٰی القرٰبی الخ کے لام سے جو ذی القرٰبی ویتامی وغیرہ کی ملکیت ثابت ہوتی ہے

اس کا کیا جواب ؟

معہذا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذی القربی وغیرہ ہر ایک ہر ایک کو مثل خداوند مالک الملک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام تمام اموال فی مالک کہے۔ چنانچہ بظاہر للرسول اور لذی القربی کا عطف اللہ ہی پر ہے اور وہ اسی بات کو مقتضی ہے تب تو اس کے محال ہونے میں کلام ہی نہیں۔ اور اگر یوں کہے کہ الذی القربی کا عطف للرسول پر ہے۔ اور یہ دونوں معطوف علیہ مل کر اللہ پر معطوف ہیں تب اس سے بھی کیا کم کہے کہ اموال فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں اور خدا میں مشترک ہوں۔ سو یہ بات اول تو یوں کسی مسلمان کے دھیان میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس صورت میں لازم تھا کہ جیسے غنیمت غانمین پر تقسیم کیجاتی تھی اموال فی اصناف معلومہ پر تقسیم کئے جاتے تاکہ ہر کوئی اپنے حسب دلخواہ اس میں تصرف کرتا۔ ضرورت ہوتی تو کسی کے ہاتھ بیچ دیتا نہیں تو آپ رکھتا یا کسی کو دے دیتا۔ سو یہ وبال کس کی گردن پر رہا کہ مالکان اشیاء کو دخل نہ ملا۔ سو اہل سنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار ان کے خدام کی طرف بھی یہ وہم نہیں آسکتا۔ کہ ایسے علم عظیم کے مرتکب ہوئے ہوں۔ ہاں شیعہ کہیں تو اُن سے کچھ دور بھی نہیں۔ اُن کی اور خرافات کو اگر ٹھوٹے تو اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ دوسرے اگر تقسیم بھی وقوع میں آتی تب یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ شرکاء غیر معین میں ایک چیز مشترک ہو۔ غانمین کی تو ایک تعداد معین ہوتی ہے ان کو غنیمت میں شریک کہئے تو زیبا ہے۔ ذی القربی اور یتامی وغیرہ کا کوئی عدد معین کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا اور معلوم بھی ہو تو سب کو ان کا حق پہچانا بندوں سے محال ہے۔ معہذا اصل زمین کا دینا تو ایک طرف اراضی فی کی آمدنی بھی تمام ذی القربی اور تمام جہان کے یتامی اور مساکین اور ابن سبیل کو نہیں پہنچی۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے۔ اور اگر ان اصناف اربعہ کو اہل اسلام ہی میں منحصر رکھ کے کلام کیجئے تب بھی شیعوں کا قافیہ تنگ ہی رہے گا۔

اور اگر بالفرض بفرض محال مقصود جناب باری تعالیٰ خلتہ سے تو یہ ہو کہ مالک حقیقی جناب باری تعالیٰ ہے اور خلتہ رسول سے یہ مطلب ہو کہ مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور لذی القربی الخ بیان مصرف کے لئے ہو تو اہل سنت کو سوائے اس کے کہ اس صورت میں خدا کی طرف حرف عائد ہو گا چنانچہ معلوم ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک جو اس صورت میں فقط برائے نام ہی ہوگی اگر بالفرض بطور وراثت وارثوں کی طرف منتقل بھی ہو جائے گی۔ تو استحقاق اصناف باقیہ تو کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں کی طرف منتقل ہو ہی نہیں سکتا جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل کا یا آمدنی کا خرچ کرنا ضروری تھا، بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بدستور رہے گا۔

اور اگر بفرض محال منتقل بھی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اصناف اربعہ کے وارثوں کی طرف منتقل ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں سے کچھ تعلق نہیں۔ سو ابوبکر صدیق نے جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تو لہم اُس کی یہی ہے کہ ان کی طلب گاری سے یہی بات سیکتی تھی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کو جو بطور فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں آیا تھا مثل اور املاک ہر قسم کے تصرف فی قابل سمجھ کر فقط اپنی گذران کیلئے طلب کرتی تھیں بطور تولیت نہیں مانگتی تھیں۔ ورنہ دعویٰ ہبہ اور دعویٰ میراث کے کیا معنی؟ معہذا روایت مجاہد الساکین جس کا ترجمہ تو مذکور ہو چکا اور عبارت بھی انشاء اللہ قریب ہی مذکور ہوگی اس دعویٰ کے لئے دلیل کامل ہے۔ اہل فہم اس روایت سے آپ سمجھ جائیں گے کہ ابوبکر صدیق کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کو اپنے صرف کے لئے طلب فرماتی تھیں۔ ورنہ اگر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بھی اس لئے طلب فرماتیں کہ مصرف مذکور میں صرف کریں تو ابوبکر صدیق یوں کیوں عذر کرتے کہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مصرف میں صرف کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مگر چونکہ اہل حق بعد ظہور حق کے مان لیا کرتے ہیں جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی فہم مبارک میں حضرت ابو بکر صدیق کی بات آگئی اور صدیق اکبر کو اسم با اسمی صدیق صادق پایا، یہ گمان خود پہلے سے نہ تھا کہ ابو بکر صدیق آپ خورد برد کریں گے اس کام کے اپنے سر رکھنے میں غلبان دیکھا۔ تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ابو بکر صدیق کا عذر قبول فرمایا اور ان کا قول مستم رکھا۔ اور فدک کی آمدنی کے صرف کا انتظام اور اہتمام ابو بکر صدیق ہی کے سر ڈالا اور راضی ہو گئیں۔ چنانچہ ناظران روایت مذکور پر مخفی نہ رہے گا۔ اس پر بھی شیعہ نہ مانیں تو اور کیا کہا جائے کہ ان نااہلوں کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اتباع سے غرض نہیں۔ صحابہ کی عداوت کے لئے اہل بیت کے نام کو آڑ کر رکھا ہے۔

آیت میں لام کے مختلف الحاصل اگر بفرض محال فلتہ سے تو یہ مراد ہو کہ مالک معنی مراد لینے پر مفاسد حقیقی خداوند کریم ہے اور فلتہ رسول کا یہ مطلب کہ مالک

مجاہدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لذی القربی الخ کے معنی ہوں کہ ان مصارف میں صرف کیا جائے تو اہل سنت کو تو اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں مالک فدک بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی سہی لیکن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ کی طرف سے خرچ کرنے کے داروغہ تھے۔ برضائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کی آمدنی کو مصارف معلومہ میں صرف کرتے تھے۔ پرستیوں کی اس طفل نسلی سے شیعوں کے کیا ہاتھ آئے گا۔ اٹا بیس طرح کی خرابیاں اور جو ابی بدی سر دھرنی پڑیگی۔

اول تو نعوذ باللہ یہ لازم آئے گا کہ خداوند کریم نے باایں ہمہ عنایت اس تملیک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقرب اور محبوب کے ساتھ وہ معاملہ کیا جیسے کہا کرتے ہیں ”گھر باہر سب تیرا ہے پر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا“ سبحان اللہ جو بات مخلوق کے حق میں بھی معیوب ہو وہ شیعوں کو اس صورت

میں جناب باری تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنی پڑے گی۔ دوسرے یہ کہ قرآن شریف کے اعجاز کا شہرہ اور بوجہ فصاحت و بلاغت اور خوبی عبارت و مضامین جناب باری تعالیٰ کے کایوں دعوے کرنا *فَاَوْفُوا بَوَدِّهِ مِثْلَ* یعنی ایسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ زیادہ نہیں تو *اِنَّا اَعْطَيْنَا هِيَ* کے برابر ہی۔ اس صورت میں محض بے جا اور بے موقع ہو جائے گا مضمون ایسا کچھ کہ مالک تو کر دیا پیر اختیار ذرہ برابر نہ دیا۔ اور عبارت ایسی کچھ کہ معنی مقصود سے کچھ لگاؤ نہیں۔ اگر اس وجہ سے اس موقع میں یوں کہا جائے کہ *"المعنى في بطن الشاعر"* تو بے موقع نہ ہو۔

بلکہ انصاف سے دیکھئے تو خلاف مقصود پیر البتہ دلالت موجود ہے قرینہ عطف سے *لِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ* سے ایک طرح کا استحقاق ثابت ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی اور قرینہ اس سے اقویٰ اس کے معارض ہو جاتا جیسے *لِللَّهِ* میں موجود ہے تو کچھ مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لئے سوا اس کے کہ بطور احوال میری زبان پر آگیا آج تک کسی نے اس کا یہ مطلب ہی نہ سمجھا۔ اور بالابین ہمہ قرآن قرآن میں بھی رہا۔ تیسرے *لِللَّهِ* کے لام کو اگر تملیک کے لئے اس لئے نہیں کہہ سکتے۔ کہ تملیک وہاں ہوا کرتی ہے جہاں پہلے سے ملک نہ ہو تو یہ مسلم لیکن *لِذِي الْقُرْبَىٰ* الخ کے لام کے یہ معنی کیوں نہیں؟ *ذِي الْقُرْبَىٰ* وغیرہ تو کچھ ہم پائیہ خدا اور شریک موجودات نہیں جو مالک حقیقی اور مالک قدیمی ان کو کہا جائے؟ اور تملیک بمعنی مذکور کے گنجائش نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک مثل ملک جملہ بنی آدم ہے اور آپ اس قسم کی ملک کے قابل ہیں۔ تو قرینہ عطف یوں تقاضا کرتا ہے کہ جو بات *لِلرَّسُولِ* کے لام سے ثابت ہو وہی *لِذِي الْقُرْبَىٰ* کے لام سے ثابت ہو ورنہ ترجیح بلا مرجح ہے۔ اور اگر مثل ملک خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک بھی عوام کی ملک سے ممتاز ہے اور ایک نوع جداگانہ ہے۔ تو ہم

یوں کہتے ہیں کہ جیسے باری تعالیٰ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں بھی وراثت جاری نہیں ہو سکتی۔

آپ کی ملک میں وراثت جاری | اور یہ بات دو وجہ سے قرین قیاس بھی ہے۔ اول نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ زندہ ہیں | تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء باقیین قبر میں زندہ ہیں۔ تو اس صورت میں آپ کی ملک زایل ہونے ہی نہیں پائی جو اولاد کی ملک اس کے قائم مقام ہو۔ بلکہ جیسے ہم تم کہیں چلے جائیں یا چندے کسی گوشہ میں بیٹھ رہیں۔ اور ہمارے لواحق وغیرہ ہماری اشیاء کو برتیں تو اس سے ہماری ملک زائل نہیں ہوتی، اور برتنے والے وارث مالک نہیں ہو جاتے۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گوشہ قبر میں پنہاں ہو گئے ہیں۔ اور آپ بدستور اپنی اشیاء اموال کے مالک ہیں کوئی اور مالک نہیں ہو گیا۔ اور حدیث لَا تُورِثُ مَا تَرَكْنَا ۚ صَدَقَ ۖ جَوَابُ بَكْرِ صَدِيقِ ۚ صَنِیُّ اللّٰہِ عَنْہُ سے مروی ہے۔ اس حدیث کی کج فہم بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اب تک بقید حیات ہیں۔ پر شیعہ نہ سمجھیں تو کیا کیجئے؟

خدا کی مالکادہ شان آپ کو اتنی مشاہد تھی | اور اگر شیعہ یا کوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ ہونے کو نہ مانے تو دوسری وجہ کہ اپنی ہر چیز کو عاریت لفظین کرتے تھے یہ ہے کہ انبیاء خاصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسبب کمال درجہ کی حقیقت شناسی کے ہر دم و ہر لحظہ خداوند کریم مالک الملک کی ملکیت کو دیکھتے ہیں۔ اور اس کا مالک ہونا ہر وقت ان کے پیش نظر ہے۔ اس لئے اپنی ملک کو ملک ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ جیسے کوئی کسی کے گھر دعوت کھانے جاتا ہے اور اس کے کھانے کو بمنزلہ اور اثاث البیت کھانا کھلانے والے ہی کی ملک سمجھتا ہے۔ پر خاص اس کھانے کی نسبت جو اس کے سامنے رکھا جاتا ہے فقط کھالینے کی اجازت سمجھتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنا سمجھ کر کسی کو دیدے یا بیچ ڈالے یا اپنے لواحق کے لئے لیجائے۔ بلکہ اپنے لئے لیجانا بھی ممنوع جانتا ہے۔ نہیں تو عرف و شرع میں اس بات کو کوئی معصوب

نہ سمجھتا۔

ایسا ہی انبیاء بھی ان اشیاء کو جو ان کے قبضہ میں بطور ملک ظاہر کے آجاتی ہیں اپنی ملک نہیں سمجھتے۔ بلکہ ملک مالک الملک سمجھ کر بمنزلہ مہمان یا دعوتی کہ جو کچھ اُس سے کھایا گیا کھایا گیا باقی مالک خانہ کا ہے۔ جو کچھ اپنے کام آیا اپنے کام میں لائے باقی کو خدا کی ملک سمجھ کر اس دار دنیا سے اوجھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر جب ان کے نزدیک اُن کا ترکہ ان کی چیز ہی نہ ہوئی تو یہ قبض حین حیات اور استعمال بمنزلہ قبض طعام دعوت اور استعمال مال مستعار ہوگا۔ اور ان کے عندیہ میں وارثوں کو اُس میں سے کچھ حق نہ پہونچے گا۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہو۔ کائنات ما ترکناہ صدقہ۔

ایک شبہ کا ازالہ | اور یہ بات کہ اگر انبیاء کا مقبوضہ ان کی ملک ہی نہیں تو اُن کی بیع و شرا بھی چاہئے کہ نافذ نہ ہو اگرے۔ کسی نادان ہی کے دل میں کھٹکے تو کھٹکے؟ کیونکہ جسے محبت ہوتی ہے بسا اوقات اہل دنیا بھی اُن کو اس بات کی اجازت دیدیا کرتے ہیں۔ کہ وقت ضرورت ہماری چیز کو بیچ لینا خداوند کریم تو درکنار بلکہ یا ران بے تکلف تو اجازت کے بھی محتاج نہیں ہوتے۔ دوستوں کی چیز میں اجازت ہی سمجھتے ہیں لیکن اس اجازت کو موجب ملک کوئی نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ اُس کے وراث بھی اُس کے مستحق ہو جائیں۔ الحاصل انبیاء کی حقیقت شناسی اسی بات کو مقتضی ہے کہ اپنے مقبوضہ کی نسبت اپنے آپ کو مالک نہ سمجھیں۔ ہاں اُس کو من جانب اللہ وقف سمجھ کر اور ملک خداوند کریم جانکر حسب ضرورت اپنے کام میں لاتے رہیں۔

باقی رہے عوام اور سوائے انبیاء کے اور لوگ ہر پند کتنے ہی باکمال کیوں نہ ہوں بمنزلہ عوام ہی کے ہیں سوائے انبیاء کے مقابلہ میں بمنزلہ اطفال اور مجاہدین کے بڑوں بڑوں عقلندوں کے مقابلہ میں سمجھنا چاہئے یعنی جیسے اطفال بے تمیز اور مجنونان اطفال سیرت دعوت یا غیر کی کسی قسم کی چیز کو اگر اُن کے پتے پڑ جائے۔ اپنی سمجھ کر اگر مالک بھی اُن سے لینے لگے تو غل چا دیتے ہیں۔ اور رونے دھونے لگتے ہیں۔ اور مالکان سیرتیم

چشم پوشی کر کے چپ ہو رہتے ہیں اور اُس کھانے کو انھیں کو لیجانے دیتے ہیں۔ اور اُن انبیاء کو انھیں کے پاس چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی عوام بھی اس متاع دنیا کو جو حقیقت میں ملک ملک الملک۔ مالک حقیقی کی ہے اُن کے پاس مستعار ہے۔ گو زبان سے خدا کی کہے جائیں پر دل سے اپنی ہی سمجھتے ہیں۔ اور اگر کسی ایک آدمی نے اُس کو دل سے بھی خدا ہی کی سمجھا۔ تو اول تو پورا پورا سمجھنا کہاں؟ دوسرے کسی کو کیا معلوم؟ دل کی بات سوا خدا کے کون جانتا ہے؟ جو اُن کے مال میں وراثت جاری نہ کی جاوے۔ مثل نبوت اگر ان کے اندر بھی اس کی کوئی علامت ہوتی تو یوں بھی ہوتا۔ اس لئے خداوند اکرم الاکرمین نے براہ چشم پوشی اُن کے متروکہ کو انھیں کی ملک قرار دے کر بقدر مناسب اُن کے پس ماندوں کو تقسیم کر دیا۔

القصة ان وجہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملک انبیاء بزرگ ملک خدا قابل وراثت نہیں۔ اور اگر براہ تعصب ان وجہ کو کوئی تعصب سمجھے۔ تو یہ احتمال تو کہیں نہیں جانے گا۔ کہ ملک انبیاء شاید قابل وراثت نہ ہو۔ یہ وجہ غلط ہیں تو ہو اگر یہ شاید کوئی اور ہی وجہ ہو۔ مدعیان وراثت کو جب بھی مشکل ہی رہے گی۔ القصة للرسول سے ایسی ملک کو ثابت کرنا جو برائے نام ہوا اہل سنت کو تو کچھ مضر نہیں۔ پر شیعہ اتنا تو سمجھ لیں کہ کوئی اجنبی ایسی نامعقول باتوں پر کیا کہے گا؟ القصة اہل دانش و فہم کے نزدیک لام للرسول ولذی القربی سے ملکیت اور استحقاق اصناف مندرجہ آیت مثل لام للذکر مثل حظ الاثین یا لام لکمرؤس اموالکم جو پہلا ملکیت اور دوسرا استحقاق پر دلالت کرتا ہے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔

آیت میں لام بیان مصارف کے لئے ہے | ہاں اگر مثل لام انہا الصدقات للفقراء و المساکین الخ بیان مصروف کے لئے کہا جائے تو البتہ قرین عقل اور شیعوں کے نزدیک بھی واجب التسليم معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو اس میں کچھ خرابی نہیں۔ بے غل و غش عقل اسے مسلم رکھتی ہے۔ اور بوجہ بے عقلی اگر عقل کی بات کے تسلیم کرنے میں شیعوں کو

کچھ غدر رہو تو آیۃ و اعلموا انما غنمتم من شیء فان الله خمسہ میں جو بعینہا آیۃ
ما افاء الله کے مطابق ہے۔ اتفاقات سے شیعوں کے نزدیک بھی لام بیان مصرف ہی
کے لئے ہے۔ چنانچہ ابو القاسم صاحب شرائع الاحکام نے جو ملقب بحقق ہے اور
سوا اُس کے اور علماء امامیہ نے اس بات کو تصریح کہا ہے۔ بلکہ اس مذہب کے
اماموں سے بھی یہ سند بیان کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی چیز کا مصرف
ہوتا ہے اگر مالک مال اُس کو نہ دے تو اہل مصرف اس کے دادخواہ نہیں ہو سکتے۔
بالجملہ اہل مصرف قبل عطاء مالک نہیں ہوتے۔ اس لئے فقرار وغیرہ کو رکوعہ او
صدقات کا قبل از عطا کوئی مالک نہیں سمجھتا تو اس صورت میں اس آیت میں بھی لام
ملکیت اور استحقاق پر دلالت نہ کرے گا۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک وغیرہ اراضی فیہ کا تقسیم کرنا ضروری نہ سمجھا۔ بلکہ آمدنی کو
ہمیشہ تقسیم فرماتے رہے۔ اگر لام للرسول وغیرہ ملکیت اور استحقاق پر دلالت
کرتے تو قرینہ لفظ افاء اللہ کا اس بات کو مقتضی تھا کہ اصل زمین کو بانٹ کر مستحقوں
کو حوالہ فرماتے۔ کیونکہ اصل زمین مصداق ما افاء اللہ ہو سکتی ہے نہ کہ آمدنی چنانچہ
ظاہر ہے۔

<p>اہل شیعہ کا اعتراض کہ ما افاء اللہ کا مقتضی زمین کی تقسیم تھا اور آپ آمدنی تقسیم فرماتے رہے؟</p>	<p>یہاں اگر شاید کسی عقل کے دشمن کو یہ شبہ حیران کرے کہ ہم نے مانا یہاں مصرف سے ملکیت</p>
---	---

اور استحقاق ثابت نہیں ہوتا تا وقتیکہ اہل مصرف کو کچھ عطا نہ کیا جائے۔ ان کی
ملک میں نہیں آتا۔ لیکن لفظ ما افاء اللہ اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ اصناف
مندرجہ آیت مصرف اہل زمین ہوں۔ تو اس صورت میں لازم تھا کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اصل زمین کو تقسیم فرماتے۔ آمدنی کا تقسیم کرنا بظاہر خلاف آیت
ہے۔ سو اس خاکپائے علماء کی گزارش یہ ہے کہ اس قسم کے شبہ کا جواب اہل سنت
توانشاء اللہ بطور معقول دے نکلیں گے۔ لیکن شیعہ اتنا تو سمجھیں کہ یہ اعتراض اہل
سنت پر نہیں بلکہ صاحب سنت سرور کائنات خلاصہ موجودات علیہ و علی آلہ افضل

الصلوات والتسلیمات پر ہے۔ سو اس صورت میں اپنے مذہب کی بھی خیر نہیں
 ایسے شبہ کا جواب ہماری طرف سے تو وہی شعر مشہور بہت ہے۔ ۵
 شام کہ از رقیبان دامن کشاں گزشتی ؛ گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ شد
 با این ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدک کو تقسیم کر کے دینا ہمیں تو ایمان
 کے لئے کچھ اور افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم نہیں۔ ہم تو بے دلیل اس کو
 صحیح سمجھتے ہیں لیکن در صورتیکہ ابو بکر صدیق وغیر اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کی
 طرفداری میں ہم کو اتنا بکھیرنا پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرفداری اقدحاً
 کیونکر نہ کریں گے اگر شیعوں کو خلفاء کے بغض اور حسد کے باعث رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم پر بھی اس بات کا طعن ہے۔ کہ آیت سے تو آمدنی کا مصارف مندرجہ آیت
 میں صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اہل مصرف کا دینا اس آیت سے نکلتا بھی ہے
 تو اصل زمین کا نکلتا ہے۔ پھر آپ نے اصل زمین ہی کیوں نہ تقسیم فرمائی؟ تاکہ سب
 نہیں تو کچھ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ پر آتا۔ اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ
 عنہا کا بہ نسبت فدک دعویٰ وراثت صحیح ہو جاتا۔ اور یہ طعن جو ابو بکر صدیق پر
 راجع نہ دینے میراث کے) ہم کرتے تھے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا پر حسب
 مزعوم شیعہ پلٹ کر نہ آتا کیونکہ وہ معصوم تھیں۔ اور معصوم سے یہ بات کہ جو اپنے
 مورث کی چیز ہی نہ ہو اس میں دعویٰ وراثت کا کرے اس اہتمام سے کہ شیعوں
 سے سب ہی نے سنا ہوگا) ہرگز تصور میں نہیں آسکتا۔

اور ایک شے اگر مالک اہل مصرف میں سے کسی ایک کو اس غرض سے عطا
 کرے کہ اس قدر اوروں کو دے کر باقی جو بچے اس کو اپنے آپ رکھ لے۔ تو او
 دینا لینا تا وقتیکہ جس کو وسیل تقسیم بنایا ہے تقسیم نہ کرے، اس قدر میں کہ جس قدر
 بعد تقسیم اس کے پاس باقی رہ جائے گا اس کے لئے موجب ملک نہیں ہو سکتا، اور
 وجہ اس کی ظاہر ہے۔ کیونکہ ہر شیاے مشترکہ میں باتفاق فریقین بے قبض
 موجب ملک نہیں ہو سکتا۔ اور قبض بے تقسیم متصور نہیں۔ تو اس صورت میں یوں

بھی نہیں کہہ سکتے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابض تو تھے ہی۔ اگر اور کوئی اصناف مندرجہ آیت میں سے بایں وجہ مالک نہیں ہو سکتا کہ اہل مصرف قبل عطاء اور قبل قبض مالک نہیں ہوا کرتے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب ہی پر قابض تھے اپنا حصہ بھی اس میں آگیا۔

بہر حال کوئی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مالک ہونے کی نہیں نکلتی جو دعویٰ وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صحیح ہو۔ بالجملة ان مقامات میں تصدق اور انفاق ہے اور موصوف بتصدق اور انفاق (یعنی اموال) کا لحاظ شیعوں کے اطوار سے یوں ٹپکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تقسیم نہ کرنے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دو وجہ سے حرج ہو۔

ایک تو یہ کہ بظاہر خلاف آیت کیا۔ دوسرے اس تقسیم نہ کرنے کی بدولت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی معصومیت بالکل ہی تھامنی شکل پڑ گئی۔ اس لئے ہمیں بھی اپنا مافی الضمیر ضرور عرض کرنا پڑتا کہ سبب طرف داری جناب رسالت مآب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دامن رحمت خداوندی میں ہمیں بھی جگہ ملے۔ اور شیعی جواب دندان شکن سنکر اپنے کردار کو پہنچیں۔

اعتراض کا جواب کہ اموال فتنے جناب من شیعوں کا ایسے مقامات میں لڑنا قطع نظر اس کے وقف ہیں نہ کہ ملکیت کہ اہل سنت پر کیا اعتراض کرتے ہیں اپنے مذہب پر

کرتے ہیں اس مثل مشہور کا مصداق ہو جانا ہے سخن شناس دلبر اخطا اینجا ست کیونکہ ما افاض اللہ الخ جملہ اسمیہ ہے، اور جملہ اسمیہ کلام بلغار اور فصحا میں موجب دوام و ثبوت ہوتا ہے۔ اور کوئی بشر بمقتضائے بشریت اس قاعدہ کی رعایت میں چوک جائے تو چوک جائے۔ خداوندیکم چوک نہیں سکتا۔ مگر اس صورت میں لازم ہے کہ اللہ اور للرسول اور لذی القربی ہونے کی صفت ما افاض اللہ سے رائل اور منفک نہ ہو۔ اور بایں صفت موصوف ہونے سے اس کی ذات میں کچھ انکار نہ ہو سو یہ بات جھبی بن پڑتی ہے کہ اموال فتنے کو چنانچہ مرقوم ہو چکا وقف کہا جائے۔

کیونکہ وقف کو دائماً اللہ بھی کہہ سکتے ہیں اور اہل مصرف کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں
 فی اور صدقات کا | باقی رہا جملہ انما الصدقات للفقراء الخ ہر چند وہ بھی
 ایک لطیف فرق | جملہ اسمیہ ہی ہے لیکن اہل دانش و فہم پر مخفی نہ ہوگا کہ صدقہ
 ہونا کسی چیز کا خود ایک آنی بات ہے یعنی کبھی آن واحد کے لئے اس صفت کو
 اپنے موصوف سے ارتباط پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر مثل حرکات کہ سریع الزوال ہوتی
 ہیں اپنے موصوف سے جدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس صفت کے وجود کے یہی معنی ہیں
 کہ قدر مقرر اس کی کسی کو دیدہ بجے۔ ورنہ قبل دینے کے صدقہ نہیں۔ والا تمام احکام
 صدقات مثل اداء فرض اور حصول ثواب اور اطفا غضب رب وغیرہ بے دیئے
 اس پر مرتب ہوا کریں۔ اور جب دے چکے جب ہی وہ صفت صدقہ ہونے کی اس
 سے رائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی محتاج فقیر مسکین مال زکوٰۃ کسی اہل نصاب کے
 لیکر اپنی طرف سے کسی غنی یا ہاشمی وغیرہ کو دینے لگے تو کچھ ممنوع نہیں۔ بالجملہ صدقہ ہونے
 کی صفت کا وقت فقط عطاء اور قبض ہی ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ یہ ایک آن کی بات ہے
 سو اُس آن تک اس کا للفقراء ہونا کہیں نہیں گیا۔ بعد میں اگر فقرار وغیرہ اُس کو
 کسی کو یہ کر دیں یا بیچ ڈالیں تو وہ صدقہ ہی نہیں۔ جو پھر بھی فقرار کا استحقاق باقی
 رہے۔

القصة یہ قضیہ بھی دوام ہی پر دلالت کرتا ہے۔ اور اُس کے دائم ہونے سے
 ہمیں کیا انکار ہے۔ پر اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ دوام کے یہ معنی ہیں کہ محمول وقت
 و جو موضوع حقیقی تک اس کے ساتھ مربوط رہے۔ مگر موضوع حقیقی کا پہچانا کسی
 کا کام نہیں۔ ان باتوں کے لئے حقائق شناس معانی سنچ چاہئے جس کو خداوند علیم
 اس قدر بصیرت عنایت فرمائے کہ منابط حکم اور مدار ارتباط موضوع و محمول اور سیاق
 کلام کو دریافت کر سکے۔ اُس کا یہ کام ہے۔ سو جملہ ما افاء اللہ میں موضوع حقیقی مصداق
 ما ہے اور اس سے مراد خود اراضی فنی ہیں۔ اور صفت افارۃ فقط تعین اور تفہیم
 اور رفع ابہام کے لئے ہے۔ اس لئے اللہ وغیرہ ہونا جو مضمون خبر ہے اُس کی ذات

کے ساتھ دائم رہے گا۔ اور موافق اصطلاح اہل منطق یہ قضیہ دائم ہوگا۔

اور جملہ انباء الصدقات وغیرہ میں موضوع حقیقی صفت تصدیق ہے ذات اموال نہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ یہ جملے اگرچہ خبر یہ ہیں اہل فہم کے نزدیک الثانیہ ہیں۔ مطمح نظر ان مقامات میں تصدیق اور اتفاق ہے۔ اور موصوف بتصدیق اور اتفاق (یعنی اموال کا لحاظ) فقط اس لئے ہے کہ یہ صفت بغیر اس موصوف کے متحقق نہیں ہو سکتی۔ سو اس جملہ میں دوام محمول تا دوام وصف تصدیق چاہئے اور موافق اصطلاح اہل منطق اس کو عرفیہ عامہ سمجھئے اور قضیہ ما افاض اللہ اگرچہ الثانیہ ہے پر اس قضیہ میں صفت افاضۃ مطمح نظر نہیں۔ ورنہ جیسے جملہ انباء الصدقات یا جملہ ما انفقتم حاصل تصدقوا اور انفقوا ہے اس جملہ کا خلاصہ افیئوا ہوتا۔ اس تقریر کو سنکر اہل فہم کو تامل نہ رہے گا کہ فعل جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات وکمل التحیات میں مطابق آیت ہے۔

معصوم سے خطا سرزد ہونا محال نہیں

باقی رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا معصوم ہو کر ایسی غلطی کرنا سوا اول تو اہل سنت کے نزدیک

سوائے انبیاء کسی کی معصومیت مسلم ہی نہیں۔ دوسرے کسی مقدمہ خاص میں معصوم سے غلطی فہم ہونا اور غیر معصوم سے نہ ہونا کچھ محال نہیں چنانچہ مضامین متعلقہ آیت محمد رسول اللہ کی تفسیر میں اس کی تحقیق گذر چکی ہے۔ اور بیسیوں نظریوں میں اس کی کلام اللہ اور احادیث میں موجود ہیں منجملہ اس کے کھیتی کے قضیہ میں حضرت اود کا غلطی کھانا حالانکہ نبی ہو چکے تھے۔ اور حضرت سلیمان کا حتی بات کا سمجھ جانا حالانکہ جب تک نہ نبی ہوئے تھے۔ نہ موافق اصطلاح شیعہ امام تھے اس نعوے کے لئے دلیل کافی ہے مگر شیعوں کو کلام الشریادہ نہ ہو یا معنی فَفَرَقْنَاهَا سُلَيْمَانَ کا فہم نہ ہو تو اہل سنت کا کیا قصور؟ اس جگہ سے ہر کوئی سمجھ گیا ہوگا کہ شیعوں کا اہل سنت پر یہ طعن کرنا کہ وہ ایسے اماموں کی تقلید اور اتباع کرتے ہیں جو انھیں کے اقرار موافق غلطی کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہے جیسا اندھا آفتاب کو بے نور بتلائے۔

اور جیسے اندھا آفتاب کو بے نور نہیں کہتا اپنی آنکھوں کو بے نور کہتا ہے شیعہ بھی اہل سنت کا قصور نہیں بتلاتے اپنی عقل کے قصور کی گواہی دیتے ہیں۔

اموال نے آپ کی ملک | اب تیسری دلیل بھی اس احتمال کے بطلان کی کہ اموال نے نہ تھے اس کی تیسری دلیل | مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے۔ اور یہ مصارف

معلومہ کا مقرر کرنا ایسا ہی ہے جیسا زکوٰۃ کے لئے فقراء و مساکین وغیرہ کا مصرف بنادینا۔ پھر دلیل بھی ایسی کچھ کہ احتمال مذکور تو باطل ہو ہی جائے یہ شبہ بھی مرتفع ہو جائے کہ ما افاء اللہ تو تقسیم اصل زمین کو مقتضی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل کی جائے آمدنی کو کیوں تقسیم کیا۔؟ صورت اس کی یہ ہے کہ زمین باغ کی آمدنی بھی اثمار اور کھیتی کی پیداوار ہے۔ لیکن بسبب اس کے کہ پھل اور کھیتی اشجار اور اور زمین کے توابع اور لوازم میں سے ہیں۔ تو پھل کے توڑنے سے پہلے مجموعہ درخت اور پھل کو درخت۔ اور کھیتی کاٹنے سے اول کھیتی سمیت زمین کو زمین کہا کرتے ہیں اس وجہ سے آمدنی بھی ما افاء اللہ ہی میں داخل ہے لیکن جیسے کھیتی میں جو مجموعہ اناج اور بھس کا ہوتا ہے آدمی اور گائے بیل حسب لیاقت شریک ہیں۔ اناج آدمی کے لئے اور بھس گائے بیل کے لئے تو ایسے ہی اس شرکت خدا اور بندگان خدا میں بھی جو فللہ وللرسول ولذی القربی الخ میں مذکور ہے خدائے تعالیٰ اور بندگان خدائے تعالیٰ کو حسب لیاقت وقابلت شریک سمجھنا چاہئے۔

مصارف مندرجہ آیت کی تعین | لیکن خداوند کریم خور و نوش سے غنی ہے اور بندے واستحقاق کی باریک حکمت | خور و نوش اور نان و نفقہ کے محتاج۔ یہاں تک کہ ان کے شریک کرنے کی وجہ یہی ان کی احتیاج ہوئی ہے۔ چنانچہ لفظ فقر اور مساکین میں اہل فہم کے لئے اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اسی لئے کہ فقیر اور مسکین تو وہی ہوتا ہے جس کے یہاں قوت یعنی رزق نان نفقہ کی کوتاہی اور کمی ہو چنانچہ زبان دانان عربی اور واقفان اقوال علماء فقہ پر مخفی نہ ہوگا۔ بلکہ لفظ رسول بھی اگر غور سے دیکھے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاج اور فقر پر دلالت کرتا ہے

اس لئے اس لفظ سے بے تاثر ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مایحتاج کے ہم پہنچانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کیونکہ جب آپ پیغام رسان خداوندی اور قاصد جناب باری ٹھہرے۔ تو تا وقتیکہ آپ اس مشغلہ میں مشغول رہیں اور کار کی فرصت کہاں۔ بلکہ مثل قاصدان پیغام رسانان دنیاوی کہ تا وقتیکہ پیغام پہنچا کر اپنے گھر پر نہیں پہنچ لیتے۔ اپنے کاروبار نہیں سنبھال سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تا وقتیکہ پیغام خداوندی سے فارغ نہ ہو لیں۔ اپنے کاروبار کی طرف متوجہ نہ ہو سکتے تھے۔ مگر جب فارغ ہو لئے تو وطن اہلی کو تشریف لے گئے۔ اس وطن کے کاروبار ہی نہ رہے جو بطور خود کچھ کھانے پینے کا فکر کرتے۔

مصارف فنی کی ترتیب | غرض بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سرو سامانی خود لفظی کی حکیمانہ تشریح | اس لفظ رسول ہی سے ظاہر ہے۔ اتنا فرق ہے کہ اور اصناف مندرجہ آیت کی بے سرو سامانی کسی وجہ دنیاوی کے باعث۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سرو سامانی بہ سبب مشغولی کار خداوندی ہو۔ اسی لئے آپ کو مقدم رکھا۔ غرض ان الفاظ سے خود اہل فہم پر واضح ہے کہ خداوند کریم نے جو ان اصناف کو امیال فنی میں شریک کیا ہے۔ تو بوجہ احتیاج اصناف مذکورہ شریک کیلئے تو اس صورت میں شرکت اور تقسیم حسب لیاقت یوں ہو سکتی ہے کہ مجموعہ اشجار و اثمار اور مجموعہ زمین اور پیداوار میں جو بہیت مجموعی عرف میں اور دیکھنے میں ایک شے واحد گنی جاتی ہے اور ایک نظر آتی ہے۔ اور مجموعہ کو ما فاء اللہ کہہ سکتے ہیں بلکیت جو ملزوم غنی ہے خدا کے لئے رہے۔ اور پیداوار جو رفع احتیاج کے لئے ہے بندوں کے واسطے تجویز کی جائے۔

اب دیکھئے کہ اس تقریر سے وہ احتمال بھی باطل ہو گیا کہ مال فنی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا اور مصرف بطور مصرف زکوٰۃ ہو۔ اور وہ شبہ بھی مرتفع ہو گیا کہ چاہئے تھا اصل زمین کا تقسیم کرنا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تقسیم نہ کیا اور آمدنی کو تقسیم فرمایا۔

اموال فے کے آنحضرتؐ کی | اب چوتھی دلیل کے سننے کے لئے بھی تیار ہونا چاہئے۔
 ملک نہ ہونے کی چوتھی دلیل | تاکہ کثرت دلائل کے زور سے احتمال مذکور دل سے بالکل
 محو ہو جائے۔ جناب من فبر پر خاء کے دخل ہونے کے قرینہ سے اور نیز بشہادت
 وجدان صاف ظاہر ہے کہ مبتدایہ یعنی ما افا اللہ متضمن معنی شرط ہے تو اس صورت میں
 اللہ وغیرہ ہونے کا ترتیب اور توقف افارۃ اور تسلیط پر ضروری ہے اور در صورتیکہ
 اراضی فے کو مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہئے تو یہ ترتیب اور توقف تو درکنہ
 وجود خبر بھی اپنی ذات سے ضروری نہ ہوگا۔ گو بوجہ معصومیت رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم ان امور میں جن کے آپ مامور تھے تصور ممکن نہ ہو۔ ہاں اگر مصرف کہئے تو
 پھر یہ ترتیب اور توقف اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ توجیہات ذکر اللہ سے جو مذکور ہو چکی
 ہیں آپ عیاں ہے۔

معہذا اگر مقصود شائع یہی ہوتا کہ اراضی فے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم ہیں اور لذی القربی بایں غرض فرمایا ہے کہ خدا کے واسطے ذی القربی
 وغیرہ کو دینا چاہئے تو لا جرم فلا رسول واللہ ولذی القربی الخ فرماتے اس صورت
 میں گو یہ آیت مصداق ”المعنی فی بطن الشاع“ تو رہتی لیکن بلا سے یہ ترتیب اور توقف
 توجہ مدلول فاء ہے درست ہو جاتا۔ اور معنی گو کسی کی سمجھ میں نہ آتے فی حد ذاتہ تو صحیح
 ہو جاتے۔ فصاحت و بلاغت بلکہ باعتبار قواعد زبان دانی صحت عبارت بھی نہ ہی
 لیکن اتنی غلطی تو نہ ہوتی کہ عبارت برعکس معنی مقصود دلالت کرے۔

اموال فے کے غیر مملوک | پانچویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ ضمیر کیلا کیون
 ہونے کی پانچویں دلیل | دولت بجانب ما افا اللہ راجح ہے اور کیلا کیون علمہ تعین
 مصرف مذکور ہے سو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ یہ مصرف اس اندیشہ کے لئے
 مقرر کیا گیا ہے کہ مبادا اراضی فے تحت تصرف اغنیاء آجائیں۔ مگر اس اندیشہ سے
 جب ہی تک بچاؤ ہو سکتا ہے کہ اراضی فے کو نہ صرف اصفاف معلومہ کہا جائے
 ورنہ اگر مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا مملوک کس دیگر ہوں تو ایک نہ ایک روز

یہ خرابی بالضرور پیش آئے گی۔ اصناف مندرجہ آیت اگر خود اغنیاء نہیں تو خداوند
بے نیاز کی بھی عادت یہ ہے کہ دولت و فقر کو فقط ایک ہی خاندان میں دائم و قائم
نہیں رہنے دیتا۔ بسا اوقات اولاد اغنیاء فقیر اور پس ماندگان فقراء امیر ہوجاتے
ہیں۔ سو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پس از انتقال ذوی القربی وغیرہ
اگر حسب مزعوم شیعہ اراضی فے میں وراثت جاری ہوگی۔ تو بیشک اس سلسلہ
میراث میں بہت سے اغنیاء بھی نکلیں گے اور وہ خرابی جس کے بچاؤ کے لئے یہ
مصرف مقرر کیا تھا بحال خود رہے گی۔

اور یوں کہنا کہ اغنیاء سے مراد فقط حکام یا اغنیاء لشکر ہی ہیں محض تعصب
ہے۔ لفظ عام سے بے قرینہ معنی خاص مراد لے لینا عوام کا بھی کام نہیں چہ جائیکہ
علماء جو خواص امت ہیں۔ ہاں اگر قطع طمع اغنیاء لشکر افسران فوج کے لئے یہ آیت
نازل ہوئی ہو۔ یا حکام جاہلیت اس قسم کی اراضی کو خاص اپنے لئے رکھتے ہوں۔
اور اس قانون نامعقول کے موقوف کرنے کے لئے یہ مصرف مقرر فرمایا ہو۔ تو در
صورت فرض و قیوع امور مذکورہ بیش برین نیست کہ حکم عام کے لئے شان نزول
خاص ہو۔ سو یہ بات کچھ اسی جگہ خاص نہیں بیسیوں آیات اور سنکڑوں احادیث
کی شان نزول خاص اور حکم عام ہے۔ اور اس کا عموم بالعموم مسلم ہے۔ خاص کر کتب
علم اصول میں بتصریح صحت و امکان خصوص شان اور عموم احکام مذکور ہے۔
اموال فے کے غیر مملوکہ چھٹی وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ اراضی فے کے
ہونے کی چھٹی دلیل لئے جن اشخاص اور اصناف کو مقرر فرمایا ہے تو ان کو ان کے

اوصاف سے تعبیر فرمایا ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصفۃ رسول اس
جگہ ذکر فرمایا اور یتامی اور مساکین اور ابن سبیل کو بوصف یتیم اور مسکین اور مسافرت
یا دفرمایا۔ اور ان کے حسب و نسب وغیرہ شخصیات اور تعینات کو ذکر نہ کیا۔ اور
پھر اس کے بعد للفقراء المہاجرین الخ اور الذین تبوءوا الدار والخ اور
الذین جاءوا من بعد ہم الخ کو جو لذی القربی والیتامی والمساکین وابن

السبیل سے بدل ہے ماقبل کا ضمیمہ کیا۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان اوصاف کو اراضی فنی کے مصرف ہونے میں دخل اور ان اراضی کا مصرف ہونا ان اوصاف پر موقوف ہے۔ اور چونکہ زمین باغ ملک مثل منافع اکل و شرب مثل روٹی پانی وغیرہ جن سے انتفاع ان کے ہلاک ہونے پر موقوف ہے نہیں ہیں۔ بلکہ وقت انتفاع بدستور بحال قدیم قائم رہتے ہیں۔ تو دائماً الی یوم القيمة اراضی فنی سے انتفاع انہیں اشخاص کو جائز ہوگا جو موصوف باوصاف مذکورہ ہوں۔ ورنہ دوام و ثبوت جو مدلول جملہ اسمیہ ہے باطل ہو جائے گا۔

مگر یہ بات جب ہی بن پڑتی ہے کہ اراضی کو مبنی وقف کہا جائے اور مبنی مذکورہ میں اصل زمین کو تقسیم نہ کریں اور اوصاف مندرجہ کو اس کا مالک نہ کر دیں ورنہ بالفعل نہیں تو بعد انتقال مالکان اول یا بعد بیع و شراء کے غیر مصرف میں اس کا صرف ہونا لازم آئیگا۔ اور لحاظ اوصاف ہی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محققین کے نزدیک اس زمانہ کے خمس اور فنی سے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے خمس اور فنی میں سے بھی سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راقط ہو گیا۔ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف رسالت مثل اوصاف مسکنات اور مسافرت وغیرہ کسی میں باقی نہیں رہا۔ باقی رہی زکوٰۃ اور صدقات واجبہ ان کے مصرف ہونے کے لئے بھی تحقیق اوصاف فقر و مسکنات غیر ہا جس کی طرف آیت انما الصدقات مشیر ہے ضروری ہے مگر چونکہ وصف تصدق کو بجز آن واحد قیام نہیں چنانچہ ابھی مرقوم ہوا ہے۔ تو وقت تصدق تحقیق اور وجود اوصاف معلومہ ضروری ہوا کیونکہ فقر و غیر ہم کو آیت انما الصدقات میں فقط ان اموال کا مصرف مقرر کیا ہے۔ جو موصوف بصدقہ ہوں۔ اس لئے بلفظ صدقات تعبیر فرمایا۔ اور اگر قطع نظر اس وصف کے فقر و غیر ہم کو نفس مال کا مصرف مقرر فرماتے تو مثل انما المخرج من الاموال بنیت الصدقات اس کے اور کوئی ایسی عبارت جس سے مطلق مال کے لئے فقر و غیر ہم کا مصرف ہونا ثابت

ہونا بیان فرماتے۔ الحاصل آیت انما الصدقات میں اسناد کو دونوں طرف میں اوصاف ہی سے ارتباط ہے۔ اور آیت ما افاض اللہ میں ایک طرف ذات اور دوسری طرف اوصاف ہیں۔ اس لئے زکوٰۃ میں دونوں اوصاف کو اور فئے میں فقط ایک جانب میں اوصاف کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

اموال فئے کے غیر مملوک | ساتویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ مالک حقیقی ہونے کی ساتویں دلیل | تمام مخلوقات اور موجودات کا بالاتفاق اور بالبداهت مالک الملک خداوند کریم ہے۔ اور باوجود اس کے پھر ہمارا تمھارا مالک ہونا ایک معنی مجازی ہیں۔ جیسے کوئی شخص اپنے چند مکان چند آدمیوں کو مستعار یا کرایہ پر رہنے کو دے۔ اور وہ چند اشخاص اپنے اپنے رہنے کے مکان کو محاورۃً اپنا گھر کہہ دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ ایسے ہی ہمیں بھی مالک حقیقی نے ہماری اشیاء مقبوضہ کو انتقل کے لئے دے رکھی ہیں۔ اور ہم اُن کو اپنے محاورات میں اپنا کہنے لگے ہیں لیکن جیسے مکانات کا مستعیر یا کرایہ دار ہونا عاریۃً لینے اور کرایہ لینے پر منحصر اور موقوف ہے۔ فقط مالک مکان کی ملکیت کفایت نہیں کرتی۔ بلکہ اگر عقد کرایہ اور عاریت ظہور میں نہ آئے تو پھر مالک اصلی ہی کی طرف آرہے گی۔ ایسے ہی ہمارے مالک ہونے کے لئے بھی اسباب تملیک ظاہری مثل بیع و شراء ہیہ صیت وغیرہ ضروری ہوئے۔ ورنہ تمام موجودات پھر خدا ہی کی طرف مملوک ہونے میں منسوب رہیں گے۔

مگر چونکہ اموال فئے مشار الیہا بلفظ ما افاض اللہ میں ان اسباب میں سے فقط غنیمت ہونے کا توہم ہو سکتا تھا اور اس کو جناب باری نے فیما وجفتہ سے دفع کر دیا تو یہ اموال سوائے خداوند کریم مالک الملک کے اور کسی کی طرف بطور ملکیت منسوب نہیں ہو سکتے۔ پھر اس صورت میں للرسول ولذی القربی کے معنی بجز بیان مصرف اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ سو یہی ہمارا مطلب تھا بالجملہ ان سات وجوہ سے اراضی فئے کا مد و خرچ پنج اقسام معلوم ہونا مثل مد لولات حوا اس ہر کس و

ناکس پر واضح اور لائق ہو گیا۔ اور باوجود خراج ہونے کے وجہ طلب کر لے دھڑ
 خیر النساء فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اول تو یہ ہے کہ جناب سیدۃ النساء
 رضی اللہ عنہا معصوم نہیں۔ اور معصوم بھی ہوں تو معصوم سے غلط فہمی محال نہیں۔
 چنانچہ معلوم ہو چکا اور وجہ غلط فہمی کی یہاں ظاہر بھی ہے۔ کیونکہ جناب سیدۃ النساء
 فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا نے ہمیشہ ارضی فے پر قبض و تصرف حضرت خلاصہ موجودات
 سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوٰۃ و کمال التحیات و التسلیمات کا دیکھا تھا۔ اور
 اس بات کی تحقیق کہ یہ ازرقم غنیمت ہے یا ازجس فے ہے۔ زمان خانہ نشین اور وہ بھی
 ایسی راہدہ کہ سامان دنیا و مافیہا سے کچھ غرض نہ ہو بہت دشوار ہے۔ خاص کر خیبر اور
 قریٰ خیبر کی نسبت کہ فدک بھی انھیں میں سے ہے۔

کیونکہ بعض قریٰ خیبر عنوۃ یعنی بعد جنگ و جدال اور بعض قریٰ جیسے فدک
 صلیٰ مفتوح ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ نسبت خاص خیبر کے مابین علما اختلاف بھی
 ہے۔ کہ آیا خیبر عنوۃ فتح ہوا ہے یا صلیٰ الحال اراضی فے کا مملوک رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اہل انصاف پر روشن ہو گیا۔ اگرچہ اہل فہم کو پہلے بھی اس میں
 تاثر نہ تھا کیونکہ باوجود یقین مصارف معلومہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
 مملوک ہونے کی کوئی صورت بھی تھی تو یہی تھی۔ کہ اُن اوصاف کا مقرر فرمانا ایسا
 جیسا کہ زکوٰۃ اموال مملوکہ اغنیاء کے لئے فقراء و غیرہم کا مقرر کرنا۔ سو یہ بات گو
 فی حد ذاتہ ممکن تھی لیکن قرینہ عطف للرسول اور لذی القربیٰ اس بات کو مقتضی
 تھا کہ جیسے ذوی القربیٰ وغیرہم بالاتفاق مالک ارضی فے نہیں۔ رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم بھی مالک نہیں۔

ذوی القربیٰ کو اگر فے کا مالک | اور اگر قطع نظر اتفاق امت کے ذوی القربیٰ وغیرہم کو
 مائیں تو ذرا بیاں موجود ہیں | مالک کہا جائے تو بہت سے بہت ہوگا تو اراضی فے
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں مشترک ہوں۔ لیکن دو خرابیاں
 اور موجود ہیں۔ ایک تو شرکاء غیر محدود کا شریک ہونا۔ کیونکہ ذوی القربیٰ وغیرہم کا

کوئی حد و پایاں نہیں۔ ہر روز کی پیشی رہتی ہے۔ خاص کر وہ الذین جاؤا من بعد ہونے تو دائرہ اہل مصرف کو اتنا فراخ کر دیا ہے کہ قیامت تک کے منہ پر کو گھیر لیا ہے۔ دوسرے قبل عطا مال غنیمت۔ بلکہ دین بھی ملک میں نہیں آسکتا۔ اراضی فے جو کسی طرح اس کے حصول میں اہل مصرف کی سعی و کوشش یا کسی کے فعل کو دخل نہیں۔ محض فضل خداوندی سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ کیونکہ قبل عطا اور قبل قبض کسی کا مملوک ہو سکے۔

الحاصل اہل عقل پر بادی النظر میں اس عبارت سے اراضی فے کا غیر مملوک ہونا عیاں تھا اور اب سب پر واضح ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیسے اس آیت سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ امکان ملکیت بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا محال ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی لئے مجھ کو بھی اتنی تطویل کی ضرورت پڑی۔ ورنہ عدم ثبوت ملکیت خود ظاہر تھا۔ البتہ بایں نظر کہ کم فہموں سے مقابلہ ہے۔ عدم ثبوت ملکیت میں گفتگو کرنی ضروری تھی۔

مَّا مَلَكَتْ يَمِينُكَ سے مگر اتنی بات باقی رہی کہ لفظ مَا اَفَاءَ اللّٰہُ عام ہے اشیاء منقولہ و غیر منقولہ کو برابر شامل ہے پس اگر مَا اَفَاءَ اللّٰہُ

دعویٰ وقف پر اشکال

بوجہ مذکورہ وقف ہے تو لاجرم اسباب منقولہ بھی وقف ہوں گے۔ سو اس صورت میں دو خرابیاں لازم آئیں گی۔ اول تو یہ کہ خفیوں کے نزدیک اشیاء منقولہ کا وقف ہونا ہی صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ اموال فے میں سے بہ نسبت اموال منقولہ کے وقف ہونا کسی سے منقول اور مروی نہیں۔ بلکہ اگر تعادل سلف و خلف پر نظر کیجئے تو عیاں ہے کہ منجملہ اموال فے اسباب منقولہ میں تصرفات مالکانہ کرتے تھے۔ بیع و شرا وغیرہ آثار ملکیت جو وقف نہ ہونے پر دلیل کارل ہیں برابر بے تکرار اور انکار مروج رہے ہیں۔ چنانچہ بنی النضیر کے ہتھیار وغیرہ اموال منقولہ جو ہاتھ آئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تقسیم فرمادیئے تھے۔ اور صراحتہ نہ کنایۃ یوں نہ فرمایا کہ یہ اشیاء وقف ہیں۔ ان میں تصرفات مالکانہ کیجو۔

اور یہ بھی نہ سہی کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی حجت نہیں کلام اللہ میں خود موجود ہے ما ملکت یمنک ما افاض اللہ علیک مطلب یہ ہے کہ اے نبی ہم نے حلال کیں تیرے لئے وہ باندیاں جن کا تو مالک ہوا ہے اموال فے میں سے“ اس آیت سے صریح ثابت ہے کہ فے کے غلام باندی مملوک ہو سکتے ہیں وقف نہ تھے جب ایک چیز کا بھی اموال فے میں سے مملوک ہونا ثابت ہوا تو فللہ وغیرہ الفاظ آیت ما افاض اللہ اور الفاظ سیاق و سباق آیت مذکورہ کے اور جن کے وسیلہ سے وقف ہونا اراضی فے کا ثابت کیا گیا ہے۔ وہ معنی نہ ہوں گے جو وقف ہونے پر دلالت کریں۔ اور نہ کلیۃً قضیہ ما افاض اللہ اس بات کو مقتضی ہے کہ تمام افراد ما افاض اللہ کا ایک حکم ہو۔ خواہ اسباب منقولہ ہوں خواہ غیر منقول وقف ہوں تو دونوں ہوں۔ وقف نہ ہوں تب دونوں ہوں اشکال مذکور کا جواب اس لئے ہمیں بھی اس غلجان کو رفع کرنا ضرور پڑا۔ سواہل انصاف کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ واقعی امام ابو حنیفہ کے نزدیک اشیاء منقولہ وقف نہیں ہو سکتی لیکن خداوند کریم و علیم و حکیم کچھ امام ابو حنیفہ کا مقلد نہیں جو اس کے ذمہ اتباع رائے ابو حنیفہ ضروری ہو۔ اور اگر اتفاقات سے کوئی بات بظاہر خلاف مذہب حنفی صادر ہو جائے تو اس کی جوابدہی اس کے ذمہ پر لازم ہو۔ پیش برین نیست کہ امام ابو حنیفہ سے خطا ہوئی ہو۔ لیکن شیعہ ہی یہ فرمائیں کہ اہل سنت امام ابو حنیفہ کو معصوم ہی کب سمجھتے ہیں جو یہ خرابی ان کے سر پر پڑے بلکہ اہل سنت کا یہ مقولہ ضرب المثل ہو گیا ہے المجتہد یخطئ ویصیب یعنی مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صحیح بھی کہتا ہے“ ہاں اتنی بات مسلم کہ مرتبہ اجتہاد کو یہ لازم ہے کہ اکثر صحیح کہا کرے۔ سوا اس بات میں ان سے غلطی ہو گئی ہو تو کیا حرج؟ ان کے صاحبین وغیرہ کی رائے تو آخر ہی ہے کہ اشیاء منقولہ بھی وقف ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی اہل سنت ہی کے پیشوا ہیں شیعوں کے نہیں اور اگر شیعہ ان کو اپنا پیشوا بنالیں اور طوسی و رضی و شریف رضی و ابو القاسم محقق وغیرہم کا اتباع چھوڑ دیں

تو ہے نصیب اُن کے۔ پھر کچھ بکرا نہیں منعزایہ آیت کچھ معارض اور مناقض رائے
 ابو حنیفہ نہیں بلکہ موافق ہی ہو تو کچھ عجیب نہیں۔ اگر اس معنی کی شرح مطلوب ہے تو
 کان دھر کر سنئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف مد نظر ہو اور میری پیچیدانی پر نظر نہ ہو
 مابقی اس آیت کا ہوالذی اخرج الذین کفروا من دیارہم سے لیکر لیجوزی
 الفاسقین تک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ما فائلا اللہ سے مراد فقط مکانات
 سکنی اور اراضی صحرائی ہیں تو اب اس صورت میں بجز اموال غیر منقولہ اراضی باغات
 ما فاء اللہ سے مراد نہ ہوں گے۔ اور باعتبار خصوص مابقی کے لفظ ما کا باوجود عموم
 ذاتی کے مخصوص ہو جانا ایسا شائع و ذائع ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ جانتے ہیں
 اطفال کا فیہ خوان بھی سمجھتے ہیں کہ الاسم مادل علی معنی میں ما سے مراد
 کلمہ ہے۔ اس لئے مولانا جامی شرح ملا میں کلمہ ما کی شرح میں کلمہ ہی لکھتے ہیں۔
 القصہ ما فاء اللہ سے علی العموم اموال منقولہ غیر منقولہ سب مراد نہیں فقط اموال غیر منقولہ مراد
 ہیں چنانچہ جملہ کئی لایکون دولت بھی اسی طرف فی الجملہ کھینچتا ہے۔ اس لئے کہ تداول در
 دولت کے تو یہ معنی ہیں کہ ایک شئی بحال خود باقی رہے۔ اور یا اس ہمہ کسی کسی کے
 پاس منتقل ہوتی رہے۔ سو یہ بات بجز اموال غیر منقولہ اور کسی میں بطور کمال متصور
 نہیں۔ اقسام غذا اور اقسام لباس اور اقسام مرکب سب کے سب بسبب استعمال
 فنا ہو جاتے ہیں یا فنا ہونے لگتے ہیں۔ اگر چندے کوئی چیز قائم رہی تو کیا قائم رہی؟
 یوں تو کچھ نہ کچھ سب اشیاء کو قیام ہے روٹی سالن بھی تھوڑی دیر تو ٹھیرے ہی رہتے ہیں
 خاکسراں جگہ اتنے قیام سے کیا کام چلتا ہے۔ یہاں تو بشارات والذین جاؤا من
 بعدہم قیامت تک کا حساب کتاب ہے۔ بہر حال ما فاء اللہ میں اموال غیر منقولہ
 داخل ہی نہیں جو اعتراض معترض واقع ہو۔ اور ہمیں فکر جو ابد ہی ہو۔

وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کیا ہاں اتنی بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ ہم نے مانا اموال
 قابل کوئی چیزیں ہیں؟ منقولہ ما فاء اللہ میں داخل ہی نہیں لیکن اموال
 منقولہ کا جو بطور نے حاصل ہوتے ہیں کیا حکم ہے؟ مثل اموال غیر منقولہ وقف

بمعنی مذکور سمجھنا چاہئے یا مثل غنیمت مملوک ہو سکتے ہیں؟ سو اپنے فہم نارسا میں یوں آتا ہے کہ وہ قابل ملک و عطا ہیں۔ اگر اہل فہم بھی اسی جانب ہوں تو فہما ورنہ ہمارا کیا نقصان ہے؟ ہم اس کے وقف ہونے کو اگر ثابت ہو جائے تو اپنی کہی ہوئی بات یعنی وقف نہونے سے بھی زیادہ خوش ہو کر تسلیم کریں۔ اگر وہ بھی وقف ہو جائے تو کچھ اعتراض ہی باقی نہ رہے۔ خیر اب اپنے خیالات کو عرض کرتا ہوں بگوش ہوش و چشم انصاف غور سے سنئے اور ملاحظہ فرمائیے وقف ایسی چیز ہونی چاہئے کہ بحال خود باقی رہے۔ اور پھر کام آ سکے۔ چنانچہ وقف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اصل مجوس اور موقوف رہے۔ اور منافع مصارف وقف میں صرف کئے جائیں۔

اشیائے منقولہ میں سے | مہذبانے کے وقف یعنی مذکور ہونے میں اس تغایر ذات پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں | اور منافع کی خواہ مخواہ ضرورت ہے۔ کیونکہ اللہ اور للرسول ولذی القربی وغیرہم ہونا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اصل اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور منافع اوروں کے لئے چنانچہ مذکور ہو چکا۔ سو یہ بات وہاں ہو سکتی ہے جہاں وہ چیز اور ہو اُس کے منافع اور۔ ورنہ خود منافع میں یہ قابلیت نہیں سو اموال منقولہ میں اقسام غذا کا تو بوجہ منافع ہونا ظاہر ہی ہے۔ کیونکہ منافع کے معنی اس جگہ فقط اتنے ہی ہیں کہ استعمال کامل کے بعد پھر قابل استعمال باقی نہ رہے۔ بلکہ استعمال ہی میں فنا ہو جائے۔ سو اتمام غذا کا منافع ہونا تو ظاہر ہے ماسوا اس کے اور اسباب منقولہ مثل اقسام لباس سواری وغیرہ اور ضروریات انسانی۔ کہ اگرچہ ایک جہ سے مثل اشیاء غیر منقولہ خود اور ہیں اور ان کے منافع اور کیونکہ گھوڑا اور چیز ہے۔ اور اس کی منفوت اور فائدہ یعنی سواری اور تخفیف مشقت سفر اور شے۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا اور شے ہے۔ اور اس کا فائدہ یعنی پہننا اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچنا۔ اور زیب و زینت اور شے۔

لیکن غور کیجئے تو اس قدر فرق سے کوئی چیز اشیاء ضروریہ انسانی میں سے خالی

نہیں۔ اقسام غذا میں بھی یہ بات موجود ہے کہ روٹی مثلاً اور شے ہے اور اس کے منافع یعنی کھانا اور مزہ آنا اور قوت کا پیدا ہونا اور شے لیکن اس قدر فرق سے قابلیت و کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسے زمین کا وقف ہونا سلم الثبوت ہے اناج غلہ بھی وقف ہوا کرتے۔ حالانکہ اس کے وقف ہونے کے عقل کے نزدیک کوئی معنی نہیں۔ وقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اصل محبوس اور موقوف رہے۔ اور منافع مصرف میں صرف ہوں۔ اور یہاں اصل۔ منافع کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے۔ نقل مشہور ہے ”جیسی اصل ویسی نقل“ بالاین ہمہ اگر غلہ بھی وقف ہونے کے قابل ہے تو اراضی وقف کا غلہ بلاشبہ وقف ہو۔ پھر نہ اہل مصرف کو اس کی بیع درست ہو نہ ہبہ۔ نہ اس میں میراث جاری نہ وصیت۔ حالانکہ جہان میں اس کا کوئی منکر ہی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ غلہ کو من جمیع الوجوہ منافع ہی مقرر رکھا ہے۔ سو منافع وقف اہل مصرف کے حق میں صدقہ ہوتے ہیں۔ اور صدقہ جس کو کر دیا جائے اس کا مملوک ہو جاتا ہے۔ تو اب اس کی بیع و شر او غیرہ میں کچھ دشواری نہ ہوگی۔ اور کسی کے نزدیک غلہ وقف بھی ہو سکے تو ہوا کرے۔ یہاں تو کلام اراضی فے کے غلہ میں ہے جن کو ہم نے وقف خداوند کریم کہا ہے۔ سو اراضی فے کا غلہ باتفاق وقف نہیں ہوتا اسی واسطے مملوک اہل مصرف ہو جاتا ہے۔

سواریاں اور کپڑے بھی بالجلہ پیداوار زمین اور علیٰ ہذا القیاس اثمار و اشجار فے کا وقف وقف کے قابل نہیں۔ نہ ہونا تو ظاہر ہو گیا۔ باقی رہے انواع مرکب اور اقسام لباس وغیرہ ان میں بہ نسبت غذا کے کوئی فرق نکالے تو یہ نکالے۔ کہ غذا استعمال کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے اسی لئے وقف نہیں ہو سکتی۔ بخلاف سواری۔ لباس کے یہ چڑھنے پہننے وغیرہ سے فنا نہیں ہوتی۔ لیکن بعد غور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق بعینہ ایسا ہے کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر کھا لیجے اور باقی کو چھوڑ دیجے۔ سو حاصل اس کا یہ ہوا کہ بعد استعمال فنا ہو گئی۔ سو کپڑے سواری وغیرہ میں بھی یہ بات موجود ہے کیونکہ گھوڑا وغیرہ جو جانور سواری میں رہتے ہیں۔ بہ نسبت ان جانوروں کے جو ان کے

برابر کھائیں پر سواری میں نہ رہیں ڈبلے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

اور اگر چندے بسبب امداد بدل مانتھل باقی بھی معلوم ہوں۔ تو اول تو بدل مانتھل ہی یوں کہے۔ ہے کہ اصل باقی نہیں۔ اور اگر ایسے مواقع میں اسی کو بقائے اصل کہئے تو وہ بقا۔ کہاں؟ جو بے کسی استعمال کے ہو۔ اور یہی دو چیزیں جانور کی (زور اور بدن) استعمال میں آتی ہیں جان استعمال میں نہیں آتی۔ چنانچہ ضعیفی میں جو قابل استعمال نہیں رہتا تو یہی دو باتیں گھٹ جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا بھی استعمال۔ سے پتلا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ بیدار مغزوں پر محقق نہ ہوگا اور اس کے تار کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور انھیں دو چیزوں پر مدار کا استعمال کا تھا۔ اسی واسطے رفتہ رفتہ بہت استعمال کے باعث قابل استعمال نہیں رہتا۔ سو یہاں بھی وہی حاصل نکلا کہ منافع بقدر استعمال فنا ہو گئے۔ غایت مافی الباب کہیں نقصان ایک طرف سے ہوا کہیں چاروں طرف سے کہیں شکل بنی رہی کہیں بگڑ گئی لیکن استعمال ہونے کا مضمون دونوں جا برابر ہے۔ باقی شکل صورت کو لے کر کیا چائے۔ اس کو استعمال میں کچھ دخل ہی نہیں عکس آئینہ میں شکل و صورت موجود ہے مگر چونکہ جسمیت اور زور و طاقت نہیں کوئی صورت استعمال کی نظر نہیں آتی۔

امام ابو حنیفہ کا اشیائے منقولہ بالجملہ جن چیزوں سے منافع کا تعلق ہے وہ چیزیں بقدر کوتاہ قابل وقف کہنے کی وجہ استعمال فنا ہو جاتی ہیں۔ اور جو چیزیں بحال خود باقی ہیں ان سے منافع کو کچھ تعلق نہیں۔ یہ بات اگر ہے تو زمین یا سوائے اس کے اور اشیائے غیر منقولہ ہی میں ہے۔ کہ استعمال میں منافع ہی فنا ہوں اور اصل باقی رہے استعمال کی وجہ سے اصل میں کچھ نقصان نہ آئے۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اشیاء منقولہ کو قابل وقف ہی نہ سمجھا۔ اور صاحبین یا کسی اور نے اگر ملاحظہ بقائے صورت بعض اشیاء منقولہ ان کو قابل وقف سمجھا تو ان کی صورت کو اصل منافع اور بقائے صورت کو بمنزلہ بقائے اصل منافع سمجھ کر اس کے وقف ہونے کے قائل ہو گئے ہیں لیکن بعد اس تحقیق کے اہل حق سے توقع یوں ہے کہ رائے امام ابو حنیفہ

ہی کو ترجیح دیں۔

صاحبین کا ایشائے منقولہ کو | ہاں اس سے قطع نظر کیجئے تو مذہب صاحبین بظاہر حق
قابل وقف کہنے کے وجوہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بایں خیال کہ اول تو منافع

مرکب و لباس وغیرہ اشیاء ضروریہ دنیاوی عرف میں مرکب اور لباس ہی کی طرف
منسوب ہوتے ہیں۔ اور وہ تا وقتیکہ صورت اور جان باقی ہے قوت اور بدن کی طرف
منسوب نہیں ہوتے جو یوں جسے کہ استعمال میں فنا ہوتے جاتے ہیں۔

دوسرے منافع مرکب لباس وغیرہ منافع کلیہ ہیں۔ کہ اوقات مختلفہ میں اُن کے

افراد لہو میں آتے ہیں۔ اور جیسے ہر ہر فرد بشر انسان کا بل ہے جزر انسان نہیں

ایسے ہی منافع اشیاء مذکور بھی جو اوقات مختلفہ میں حاصل ہوتے ہیں منافع تامہ

ہیں۔ اجزائے منافع نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بعض افراد کے فنا ہو جانے سے نوع فنا

نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک ایک فرد بھی باقی ہے تو تمام نوع باقی ہے۔ تو اس صورت

میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کے انتقال سے اصل منافع فنا نہیں ہوتے پھر وقف

کیوں نہ ہو سکے گا؟ کیونکہ بقائے منافع دلیل بقاء اصل ہے۔ بخلاف منافع اقسام

غذائے کہ وہ منافع جزئیہ ہیں۔ جو نفع کہ ایک روٹی سے حاصل ہوتا ہے۔ آدھی سے

اس کا آدھا حاصل ہوتا ہے۔ پورا باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ ہاں اگر اصل

باقی رہتی تو منافع بھی بوجہ کمال باقی رہتے۔ خیر اگر مذہب ابو حنیفہ حق ہے تو اموال

منقولہ کا منجملہ اموال فنی وقف نہ ہونا تو درکنار قابل وقف نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔

صاحبین کی رائے بھی | اور اگر رائے صاحبین صحیح ہے تب بھی مطلب ہاتھ سے نہیں گیا

مقصود کے موافق ہے | وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام ضروریات بشری میں سے احتیاج غذا

منجملہ ضروریات اصلیہ ہے۔ اور باقی اموال منقولہ تمہا ضروریات فرعیہ میں داخل ہیں

اگر غذا کی ضرورت نہ ہوتی تو نوکریوں کی تلاش کے لئے سواری کی ضرورت مثلاً نہ ہوتی

تو معلوم ہوا کہ سواری کی ضرورت غذا کی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر سواری

کی ضرورت سے مثلاً گھانس دانہ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

جہاں تک یہ سلسلہ ضرورتوں کا چلے گا۔ تو مابعد قبل کی فرع ہوگا اور حقیقت میں ضرورت اصلی ایک ضرورت غذا ہی نکلے گی۔ اور باقی اشیاء کی احتیاج گو کہنے کو ان اشیاء کی احتیاج ہے لیکن حقیقت میں غذا کی احتیاج ہے۔ تو اس صورت میں بایں خیال کہ وقف رفع ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں ضرورت اگر ہے تو ضرورت غذا ہی ہے۔ تو مصرف وقف میں اس ضرورت کا ہونا ضروری ہوا۔ اور کسی اور وقف میں نہیں۔ تو وقف فقے میں تو رفع احتیاج غذا ہی مقصود ہے چنانچہ جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بھی لفظ رسول اور مساکین اور فقراء اور ابن السبیل میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس لئے کہ فقیر اور مسکین کے معنوں میں رزق کی کمی اور کوتاہی معتبر ہے۔ بلکہ لفظ رسول یتامی اور ابن السبیل بھی اسی طرف مشیر ہیں۔ چونکہ لفظ رسول تو اس بات کی طرف مشیر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایں وجہ کہ رسول ہیں۔ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے ہیں خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں کہ حسب دلخواہ کمائیں۔ اور فراغت سے سبھ کر کھائیں۔ اور حیب کمانے کی فرصت نہ ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو لاجرم بمقتضائے تدبیر شناسی خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نان نفقہ بھی خدا ہی کے ذمہ ہونا چاہئے۔ اس کی بہتر صورت اس سے کیا ہوگی کہ جو مال خاص خدا کا ہوا اور بے منت غیر حاصل ہوا ہو۔ اس میں سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کیا جائے۔ یتیم اور ابن السبیل کا مورد رحم ہونا بھی تو باعتبار اکثر کے بسبب انقطاع اسباب رزق ہو جاتا ہے۔ اور نہ یہی لفظ فقراء میں تو بیشک قوت کے نہ ہونے پر دلالت ہے۔ سو وہ بوجہ ارتباط بدلیت سب کو شامل ہے۔ اور اسی لئے سب ہی میں فقر کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوا۔ خواہ ذوی القرین ہوں خواہ اقسام باقیہ۔ بالکل مصرف وقف میں احتیاج غذا کا ہونا ضروری ہوا۔

اشیائے منقولہ کا وقف فقراء و مساکین کو مفید ہی نہیں | سو اگر ان کو اموال منقولہ دجائیں

تو دو طرح سے رفع احتیاج مذکور میں کام آ سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بطور مذکور ان کو سلسلہ اسباب تحصیل غذا میں داخل کیا جائے مثلاً سواری پر چڑھ کر نوکری وغیرہ کے لئے سفر کیا جائے تاکہ کچھ کما کر غذا بہم پہنچائے۔ یا مثلاً ہنڈیا رکابی چمچہ کھانے پکانے کے لئے رکھا جاوے۔ تاکہ بایں وسیلہ کھائے پکائے۔ دوسرے یہ کہ اشیائے مذکورہ کو بچکر کھا جائے لیکن اگر اتفاق سے پیٹ کو ایسی لگی ہو کہ جان پرزنی ہوئی ہو۔ تو اس صورت میں بیع کی اجازت نہ دینی جیسا وقف میں ہوتا ہے رفع احتیاج کے بدلے اور احتیاج کا پابند کر دینا۔ اور آسائش کے بدلے جو رفع احتیاج اس کے لئے ہوتی ہے ادونا تکلیف میں ڈال دینا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ اور کیا تکلیف ہوگی کہ چیز پاس ہو اور پھر اس منتفع نہ ہو سکے۔ شعر خرابی دل پر دانہ زریں بترچہ بود کہ شمع را بنمایند و سوختن نہ ہند اور اس قسم کی احتیاج کا ہونا فقراء و مساکین کے تو مفہوم میں داخل ہے۔ یرتیا می اور انبا سبیل میں بھی کثیر الوقوع ہے۔ اور چونکہ سبب اس قسم کی احتیاج کا فقراء اور مساکین اور یرتیا می اور انبا سبیل کے حق میں بے سرو سامانی معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کا ارتفاع بجز اس کے متصور نہیں کہ اور کچھ عطا کیا جائے۔ تاکہ اگر غذا ہو تو خود اس سے در نہ اُسے بچ کر اپنا پیٹ پالیں۔ سو در صورتیکہ عطا میں اُن کو یہ اختیار ہی نہ ہو تو ان کی طرف سے بھاڑ میں پڑے۔ ہاں اگر ان کے منافع مثل پیداوار زمین و اثمار و اشجار اقسام غذا میں سے ہوتے تو پھر اس کا بیچنا تو درست و متولی وقف کو ان کا دنیا ہی کیا ضروری ہوتا۔ بہر حال موال منقولہ کا وقف ہونا فقراء اور مساکین وغیرہم کو مفید نہیں۔ یہ دوسری وجہ ہے جس سے تدبیر امام ابو حنیفہ موجب معلوم ہوتا ہے۔

بعض اشیائے غیر منقولہ جو حاجت برآری نہیں کرتیں۔ مگر ان میں قابلیت ہے باقی رہے چاہ یا مکانات سوان کا وقف ہونا بھی بظاہر رافع احتیاج فقراء اور مساکین وغیرہم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان میں اور اموال منقولہ میں دو فرق ہیں جن کے سبب ان کو اموال

منقولہ پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ ایک تو اموال منقولہ معدن رزق ہی نہیں جو مخرج قوت ہو سکیں۔ بخلاف مکانات کے کہ ان کی زمین بہر حال قابل پیداوار ہے۔ اول چونکہ مدار وقفیت کا اسی قابلیت پر ہے پیداوار کا ہونا کچھ ضرور نہیں۔ دوسرے زمین وقف اگر مزروعہ ہو اور ایک سال یا چند سال کسی سبب سے افتادہ رہے تو اس کی وقفیت باطل ہو جائے یا کرے اس لئے مکانات وقف کی زمین بھی قابل وقف ہی رہے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اگر غرض اصلی کسی شے کی کسی وجہ خارجی کے باعث مسدود و مفقود ہو جائے تو جو حکم اس غرض کی وجہ سے اُس پر متفرع اور مترتب ہوا تھا وہ حکم موقوف نہ ہو جائے گا ویرانوں کی مسجدوں میں گویا لفظ نماز نہیں پڑھی جاتی۔ پر چونکہ قابلیت نماز بدستور باقی ہے تو حکم وقفیت بھی باقی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ گو ضرورت غذا ضرورت اصلی ہے لیکن ضرورت مکان اور ضرورت آب بھی ضرورت اصلی ہے۔ کسی اور ضرورت کی ضرورت سے ان کی ضرورت نہیں چنانچہ ظاہر ہے۔ اور پھر یہ دونوں بھی مثل غذائین سے حاصل ہوتے ہیں تو زمین کے وقف کرنے میں ان تینوں ہی کا لحاظ چاہئے۔ ان تینوں میں سے کوئی شے سہی کچھ غذا ہی کی خصوصیت نہیں پر۔ چونکہ پانی اول تو اکثر بے دام و دم کے میسر آتا ہے۔ دوسرے بیشتر پیاس غذا کے کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے گویا پانی کی ضرورت غذا ہی کی ضرورت پر موقوف ہوئی۔ غایت مافی الباب اور ضرورتیں منجملہ سلسلہ اسباب غذا ہوں اور یہ داخل مسببات غذا تیسرے اکثر غذاؤں کا قیام اور قوام بھی پانی ہی سے ہے تو اس وجہ سے پانی بھی منجملہ اسباب غذا اور مثل اور ضرورات فرعیہ کے فرع غذا ٹھہرا۔

تو پانی کی ضرورت کے ارتفاع کی طرف تو ضرورت نہ ہوئی اس لئے نہ آیت مَا آفَأَتَّهِ فِيهَا مِنْ أَسْ کے صلہ میں اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا۔ مگر ضرورت مکانات من کل الوجہ ضرورت اصلی ہے۔ اور پھر بجز مال کثیر کے اس کے ارتفاع اور اندفاع کی کچھ صورت نہ تھی۔ اس لئے اس کے رفع دفع کی ضرورت پڑی۔

سو میں جانتا ہوں لفظ اخرجوا من دیارھم میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن اموال منقولہ میں سے کسی میں یہ قابلیت نہیں کہ بالذات ان ضرورتوں کو رفع کر سکے۔ البتہ ان ضروریات ثلثہ کی تحصیل کے سامان میں خواہ بطور سببیت کے جیسے ہنڈیا رکابی وغیرہ سے پکانا کھانا۔ اور گھوڑے پر چڑھ کر نوکری کے لئے جانا یا بطور بدلتیت کے یعنی اموال منقولہ کو بیچ کر روٹی مکان پانی بہم پہنچانا لیکن چونکہ ایسی ضرورت جس میں گھوڑے لباس وغیرہما کے بیچنے کی نوبت پہنچے۔ بہ نسبت اُس ضرورت کے کہ یا اس حق میں منجملہ اسباب ہوں شدید ہے۔ اور پھر باایں ہمہ اہل مصرف میں موجود۔ ورنہ مصرف ہی کیوں ہوتے تو اموال منقولہ میں اس کی رعایت کرنی ضرور پڑی یعنی مثل پیداوار زمین اموال منقولہ میں بھی بعد عطا کے اہل مصرف کو اختیار ملے۔ تاکہ بیچ کھوج کر رفع ضرورت کریں۔ بالجملہ اموال منقولہ مثل پیداوار کہ وہ بھی منقولات میں سے ہے۔ ملک میں اہل مصرف کے کر دینے چاہئیں۔

مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ کے لفظی فوائد | اب سب کو معلوم ہو گیا کہ آیت ما مَلَكَتْ يَمِينُكَ مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ کچھ ہمارے مضر نہیں۔ بلکہ الٹی مویہ ہے کیونکہ بظاہر مِنْ جَوْمَتَا میں ہے تبغیضیہ ہے۔ سو اس سورت میں ما مَلَكَتْ يَمِينُكَ سے دو باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اموال فتنے کے مالک نہ تھے۔ دوسرے جس قدر کے مالک ہوئے وہ بجز مسلط ہو جانے کے مالک نہیں ہوئے تھے۔ ورنہ سبھی کے مالک ہوتے کیونکہ سبب ملکیت اس صورت میں تسلط ہی ہوگا سو وہ سبھی میں پایا جاتا ہے۔ تو اب لاجرم کسی اور سبب کے مالک ہوئے ہوں گے۔ اور بظاہر بجز اس کے کہ بقسم آپ کے قبضہ میں آگیا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ لفظ يَمِينُكَ خود قبضہ پر دلالت کرتا ہے ورنہ اگر قبض کی ضرورت نہ ہوتی فقط مَلَكَتْ بصیغہ خطاب فرمائیے لفظ يَمِينُكَ کی کچھ حاجت نہ تھی۔ اموال فتنے میں آنحضرت | باقی کلام رہی اس میں کہ قبل قبض مالک تو نہ تھے۔ پر جیسے کے حصہ کی نوعیت | قرض خواہ مال مدیون میں اور غائین مال غنیمت میں مستحق

ہوتے ہیں۔ اور بوجہ اس استحقاق کے مدعی بن سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مال فائز میں مستحق تھے، یا مثل فقرار و مساکین کہ ان کو مال اغنیاء مالکان زکوٰۃ میں اس قسم کا استحقاق نہیں ہوتا کہ مدعی ہو سکیں۔ بلکہ قابل اعطاء اور مصرف عطا ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقط بمنجملہ مصارف تھے۔ اس لئے اس کی تحقیق بقدر فہم نارسا گذارش ہے۔ جناب من استحقاق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک استحقاق قوی۔ اور اس کو ہم استحقاق فعلی اور استحقاق شخصی اور استحقاق حقیقی بھی کہتے ہیں۔ دوسرا استحقاق ضعیف اور اس کو ہم استحقاق انفعالی اور استحقاق نوعی اور استحقاق مجازی بھی کہتے ہیں، اور وجہ تسمیہ بیان معنی سے انشاء اللہ ظاہر ہو جاوے گی۔ استحقاق قوی میں مستحق کی جانب کوئی امر وجودی ہونا چاہئے جو منشاء استحقاق اور مبداء دعویٰ بن سکے۔ ورنہ مستحق حقیقت میں مستحق نہ ہوگا غیر مزاحم ہوگا۔

سو یہ بات دین کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے۔ غنیمت میں بھی مخفی نہیں کیونکہ جہاد امر وجودی ہے اور یہی لم معلوم ہوتی ہے کہ مال غنیمت کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب فرمایا، اور یوں فرمایا **وَاَعْلَمُوْا اَنْتُمْ غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ** ورنہ حقیقت میں سب چیزیں خدا ہی کی دی ہوئی ہیں۔ اور استحقاق ضعیف میں فقط مفلسی اور ناداری جو امر عدمی ہے کفایت کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ عدم مثبت وجود نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حق جو امر وجودی ہے۔ ناداری سے جو امر عدمی ہے ثابت نہ ہوگا۔ اسی واسطے اگر کوئی کسی مفلس کو کچھ نہ دے تو بہ نسبت اس مفلس کے ظالم نہ گنا جائے گا۔ اور نہ مفلس اس کی نالش و فریاد کر سکے گا۔ ہاں اگر حقوق واجبیہ مفلس کو بھی نہ دے تو عند اللہ گنہگار ہوگا۔ کیونکہ مفلس کا حق نہیں تو خدا کا تو ہے۔ بالجملہ ناداری اور مفلسی مثبت حق نہیں فقط موجب قابلیت ہے۔ اور یہ قابلیت تمام نوع مفلسین میں برابر ہے۔ تو جس کسی کو دے دے گا کام چل جائے گا اسی واسطے محققین کے نزدیک جملہ مصارف مندرجہ آیت **اغنا الصدقات** کا احاطہ اور استیعاب ضروری نہیں یعنی یہ لازم

نہیں کہ سب ہی اصناف کو دے۔ کیونکہ یہاں مدار کا ر امر عدی پر ہے جو ناداری ہے اور وہ سب میں برابر ہے اور یہ مابعد آیت مسلم ہے کہ سب اشخاص اصناف مذکورہ کا دینا لازم نہیں۔

مصارف کے مقرر کرنے کی وجہ | سو اگر بالفرض بوجہ مفلسی دینا ضروری ہوتا تو سب کو دینا اہل مصارف کی ناداری ہے | ضروری ہوتا اور جب سب اشخاص کا دینا ضروری نہیں تو

سب اصناف کا دینا بھی ضروری نہیں۔ اور اس ناداری کی وجہ سے ان مصارف کا مقرر کرنا اکثر اصناف میں تو ظاہری ہے۔ پر عالمین اور مؤلفہ القلوب میں ناداری کا ہونا ہی سرے سے ضروری نہیں۔ مدار استحقاق ہونا تو درکنار؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عالمین کا دینا تو وہ فقرا مساکین وغیرہم ہی کا دینا ہے۔ کیونکہ یہ نہ ہوں تو صدقات کیونکر وصول ہوں؟ تو گویا یہ ان کے نوکر اور اجیر ہیں ان کا دینا فقرا مساکین ہی کے کام میں خرچ کرنا ہے۔ گویا انھیں کیا دیا فقرا مساکین وغیرہم ہی کو دیا، باقی رہے مؤلفہ القلوب سو ان کا دینا بھی موجب تکثیر صدقات تھا کیونکہ زکوٰۃ خوشی طم سے تو کوئی کوئی دیتا ہے۔ البتہ عامل کو اگر سلطان وقت کی پستی ہو تو وصول ہو سکتی ہے سو فتح مکہ سے پہلے بسبب قلت اہل اسلام کے مددگاروں کی حاجت تھی۔ اور وقت فتح مکہ کو بظاہر ایک وجہ سے جماعت کثیر ہو گئی تھی لیکن حقیقت کو دیکھئے تو قصہ بدستور تھا۔ کیونکہ مؤلفہ القلوب بظاہر مسلمان تھے جب تک ایمان دل میں خوب نہ جاتا تھا۔ مگر چونکہ داد و دیش میں اثر ہے کہ دینے والے کی محبت لینے والے کے جی میں پیدا کر دیتی ہے۔ تو اس تدبیر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جو بیخ ایمان ہے اُن کے دل میں جمائی گئی۔

اور چونکہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان بکثرت ہو گئے۔ اس واسطے اب مؤلفہ القلوب کا سہم ہی ساقط ہو گیا۔ الحاصل مؤلفہ القلوب کا دینا بھی ایک وجہ سے فقرا مساکین وغیرہم ہی کا دینا تھا۔ کیونکہ ان کا دینا اُن کے حق میں بمنزلہ تجارت تھا۔ اس واسطے جب اس تجارت میں کچھ نفع نہ رہا اس کو موقوف کر دیا

معہذا اس زمانہ کے فقراء اور مساکین اسلام کے فقر و مسکنت کی وجہ بھی کفار کی مخالفت ہوئی تھی سو ان کو کچھ دے کر اپنا موافق دلی کر لینا گویا فقراء اور مساکین ہی کو دینا ہے۔ کیونکہ داد و دہش سے فقراء کا فقر رفع ہو جاتا ہے سو وہی بات یہاں بھی نکلی۔ ان وجوہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اَللّٰهُ لَغَفَّارٌ کَالَامِ عہد کے لئے ہو الغرض استحقاق ضعیف میں مصرف کی جانب فقط امر عدی ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کی طرف سے دعویٰ اور طلب گاری نہیں ہو سکتی۔ ہاں خدا کی طرف سے حکم جو امر وجودی ہے منشاء استحقاق ہوتا ہے۔ اس لئے خدا کی طرف سے مطالبہ اور مواخذہ رہتا ہے۔ اور زکوٰۃ کو حق خداوندی کہتے ہیں گو فقراء مساکین کی طرف بھی مجازاً منسوب کر دیں۔

جب یہ بات مستحق ہو چکی تو اب سنئے کہ اموال فے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کسی ایسے امر وجودی کا ہونا تو جو منشاء استحقاق ہو سکے ظاہر البطلان ہے۔ قرض آپ کا کفار کی جانب نہ آتا تھا۔ وصیت کی کوئی صورت نہیں۔ ایک غنیمت ہونے کا احتمال تھا سو اس کو بھی جناب باری تعالیٰ نے مٹا دیا و جفتہ فرما کر رفع کر دیا تو اب بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحقاق از قسم استحقاق ضعیف ہو کوئی صورت بن نہیں پڑتی۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خداوند کریم نے مال فے کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا بلکہ لفظ افاۃ اللہ میں اپنی ہی طرف نسبت کیا۔ اور اسی لئے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا سہم ساقط ہو جائے۔ چنانچہ مذہب اکثر اہل حق یہی ہے اور شیعہ جو سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام کے لئے تجویز کرتے ہیں حکم محض ہے۔ آیت میں کوئی دلیل نہیں۔ سو جس صورت میں فقط افاۃ اللہ سے یعنی خداوند کریم کے اس مال کو کفار کے قبضہ سے نکال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینے سے ملکیت ثابت نہ ہوئی چنانچہ بدالائہ ما ملکیت یمینک مذکور ہو چکا اور پھر اذہر کوئی صورت استحقاق کی بھی نہیں۔ تو بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منجمل

مصارف مال فئے ہوں کیا کہئے۔

مِمَّا افَاءَ اللّٰهُ كَے لغوی فوائد | بہر حال آیت ما ملکت یمینک مما افاء اللہ میں اگر افاءۃ فئے یعنی اصطلاحی سے مشتق ہو تو در صورتیکہ مِمَّا میں تبعیضیہ ہو ہمارے مخالف نہیں۔ بلکہ اور موید ہے اور اگر بخلاف ظاہر مِمَّا کو بیان نہ کہئے تو پھر ما مہا میں موصولہ نہ ہوگا جو عموم پر دلالت کرے۔ اور تمام فئے ملوک لے سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ بلکہ موصولہ نہ ہوگا۔ ورنہ لازم آئے کہ مال فئے ما ملکت میں منحصر ہو۔ اور سوار ما ملکت اور کچھ نہ ہو الغرض اگر مِمَّا میں بیان نہ ہو تب بھی ہمارے مخالف نہیں۔ غایت مافی الباب ہمارے لئے دلیل بھی نہ ہو۔ یہ سارا جھگڑا تو اس صورت میں ہے کہ افاءۃ فی بمعنی اصطلاحی سے مشتق ہو۔ اور در صورتیکہ افاءۃ بمعنی اعادت اور رد کے ہو اور حامل یہ ہو کہ خداوند کریم نے اپنے مال کو کفار سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ڈال دیا۔ تو پھر مستدل ملکیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس آیت میں کوئی دستاویز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ معنی غنیمت اور فئے میں دونوں میں بن پڑتے ہیں۔

فئے کے معنی کی تعیین | اور حق دیکھئے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ منشاء اور مبداء اس اصطلاح کا اگر ہے تو آیۃ سورۃ حشر اعنی ما افاء اللہ علی رسولہ ہے مگر سورۃ احزاب جس میں آیۃ ما ملکت یمینک مما افاء اللہ ہے۔ سورۃ حشر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اتقان میں ابن خریس کی روایت جو در باب ترتیب نزول سورہ تہائے قرآنی نقل کی ہے۔ اُس میں یہ ترتیب مصرع مذکور ہے۔ معہذا سورۃ حشر میں بھی خود اقاربت بمعنی اصطلاحی نہیں بلکہ معنی لغوی مراد ہیں۔ کیونکہ شرط فئے بمعنی اصطلاحی کی یہ ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت نہ آئے۔ سو یہ بات کہ بے قتل و قتال اور بے جنگ و جدال مال ہاتھ آ جائے۔ یہ تو فہما و جفتم سے ماخوذ ہے۔ اگر اقاربت کے مفہوم میں یہ بات داخل ہوتی تو فہما و جفتم کی کیا حاجت تھی۔ پر جب یہ لفظ کثیر الاستعمال ہوا ہو تو اختصار کے لئے سائے

جملہ ما افاض اللہ علیہ رسولہ منہم فیما اوجفتہ الخ کے معنی ایک لفظ نے میں بھولے
جیسے جہاد میں تمام جاہد و اباموالہم و انفسہم فی سبیل اللہ کے معنی
داخل کر لئے ہیں۔ الغرض جب آیت سورہ حشر میں جو ماخذ اصطلاح مذکور ہے
خود افاۃ بمعنی لغوی ہو۔ تو جو آیت اس سے پہلے نازل ہو چکی اُس میں افہار
بمعنی اصطلاحی کیونکر ہوگا۔

اب بفضلہ تعالیٰ جملہ مراتب متعلقہ آیت ما افاض اللہ سے فراغت پائی،
اور ہر فہمیدہ غیر فہمیدہ کے نزدیک یہ بات متحقق ہو گئی۔ کہ فدک مملوک رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا نہ اس میں ہبہ کی قابلیت اور نہ اس میں میراث جاری
ہو سکے۔ اور یہ بھی متیقن ہو گیا کہ روایت ہبہ فدک جو شیعوں کے نزدیک
در باب غصب فدک دلیل کامل ہے محض افتراء اور بہتان ہے۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے تصور میں نہیں آسکتا کہ مال غیر مملوک کو دیدہ و دانستہ کسی کو
بطور ہبہ حوالہ کر دیں۔

آنحضرت کے فہم قرآن میں خطا، ممکن | ہاں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ سمجھنے
تھی کیونکہ اصلاح کے لہجہ جاری تھی | کا احتمال ہوتا تو یوں ممکن تھا لیکن رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم ہی کلام اللہ اور کلام اللہ کے دقائق کو نہ سمجھیں تو پھر کون سمجھے؟ ہم
جیسے سچدان تو کلام اللہ کے اشارات سمجھ جائیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ
سمجھیں؟ سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر شیعوں کے نزدیک یہ بات ہو تو ہو۔؟ یا یوں ہوتا
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول نہ ہوتے کوئی امتی ہوتے تو یوں بھی کہہ سکتے۔ کہ
اجتہاد تھا کچھ دجی تو تھی ہی نہیں جو غلطی نہ ہو سکے۔ یہاں تو یہ صورت کہ اگر اجتہاد
بھی ہو تب بھی یہ امر ممکن نہیں کہ آپ غلطی کریں۔ اور پھر متنبہ نہ ہوئے ہوں۔

اس صورت میں اگر بالفرض و التقدير بفرض محال نقل کفر کفر بنا شد آپ کلام
اللہ سے اس اشارہ کو کہ فدک جو منجملہ فہم مملوک نہیں نہ سمجھے ہوتے؟ اور اس
وجہ سے براہ غلطی ہبہ بھی کر دیتے تب لازم تھا کہ وحی ربانی سے اصلاح اور تصحیح ہو جاتی

اور فدک کو مسترد فرماتے۔ سو اگر شیعہ اتنی گبنائش پا کر کہ سنیوں کے نزدیک ممکن ہے کہ بنی سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے باوجود نبوت حکم میں غلطی ہوئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا باوجود بنی ہونے کے صحیح سمجھ جانا چنانچہ سورۃ انبیاء میں آیت داؤد و سلیمان اذ یحکمان فی النحرث الخ میں مذکور ہے اس بات پر شاہد بھی ہے۔ اپنے مذہب سے دست بردار ہو کر حضرت ابو بکر صدیق کی ضد میں یوں کہنے لگیں۔ کہ فدک کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتا بشرہادت کلام اللہ مسلم۔ لیکن ہمیں اس میں بھی شک نہیں کہ فدک کو ہبہ بھی ضروری کیا۔ بہت ہو تو یہ ہو کہ بوجہ غلطی اجتہاد کلام اللہ کا یہ اشارہ نہ سمجھا ہو۔

آیہ ما قال اللہ، یوصیکم کی مخصص ہے | سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اتنی دور جانے اور اس قدر تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے اس سے سہل ترکیب میں بتائے دیتا ہوں جس میں مذہب کو بھی آنچ نہ آئے اور بات کی بات بنی رہے یعنی مناسب یوں ہے کہ یہ بات نحوذ باللہ خدا ہی کے ذمہ لگائیے اور اس بات میں بھی بدستور دیگر اغلاط خداوندی نحوذ باللہ منہا بد کے قائل ہو جائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لوٹ سے بچا لیجئے کیونکہ یہ بزرگی تو اسلاف شیعہ نے خدا ہی کے لئے تجویز کر رکھی ہے۔ اور بایں ہمہ کچھ حاصل بھی نہیں۔ سنیوں کے نزدیک اگر بنی کی نسبت غلط فہمی کا امکان ہے اور ان کے نزدیک کیا وہ بھی خدا ہی کی کہی کہیں ہیں تو وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ وحی سے اُس کی اصلاح ضروری ہے۔

بہر حال فدک کے ہبہ ہونے کی کوئی صورت نہیں جو روایت ہبہ کو مانئے۔ اور اس وجہ سے حضرت فاطمہ زہراؑ کو مالک جلئے۔ غرض ہبہ کا باطل ہونا روشن ہو گیا اور کیونکر روشن نہ ہو ہبہ کے لئے ملک و اہب مقدم ہے۔ سو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نسبت اراضی فئے جس میں سے فدک بھی ہے مالک نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ اور علیؑ ہذہ القیاس فدک میں میراث کا جاری ہو سکتا نہ ہو سکتا

بھی بخوبی واضح ہو گیا۔ اور معلوم ہو گیا کہ اگر آیت یوصیکم اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر شامل ہے۔ اور خطاب عام ہے خاص امت ہی کو نہیں۔ تب بھی بہ نسبت ابو بکر صدیق کوئی حرف عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ آیت ما افاد اللہ منجملہ متروکہ نبوی بہ نسبت فدک وغیرہ اموال فتنے کے مختص ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا۔

یوصیکم اللہ فدک کو شامل ہی نہیں بلکہ غور سے دیکھئے تو تخصیص کے کہنے کی بھی کچھ حاجت نہیں تخصیص ہو تو یہ معنی ہوں کہ آیت یوصیکم اللہ سے بہ نسبت فدک بھی یہی حکم نکلتا تھا۔ لیکن مثل استثناء آیت مذکور یا کسی مختص نے فدک وغیرہ کا استثنا کر دیا۔ سو یہ بات یہاں کوسوں پاس کو نہیں بٹھکتی۔ کیونکہ آیت یوصیکم اللہ اگر متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل بھی ہوگی۔ تو اُس متروکہ کو شامل ہوگی جو مملوک نبوی بھی ہو۔ کیونکہ میراث تو اشیائے مملوک مورث میں جاری ہوتی ہے۔ فدک جب وقف ہوا تو مملوک ہی نہیں۔ تو عموم آیت یوصیکم اللہ میں داخل کیونکر ہو۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو البتہ در صورت تسلیم عموم خطاب اس کی ضرورت پڑتی۔ کہ حدیث مَا تَرَكْنَاكَ صَدَقَةً کو مختص کہے لیکن بعد اللہ اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

یُوصِيكُمُ اللّٰهُ كِي حَيْثُ سَيَّ احَادِثٌ | لیکن تاہم تکثیر سواد وجوہ رفع مخالفت آیت مختصہ ہیں۔ ایسے ہی مَا تَرَكْنَاكَ صَدَقَةً ہے | مذکورہ حدیث مسطور کے لئے ما سوا اس تقریر کے

جو دیر بارہ تخصیص گذر چکی ہے۔ اس قدر اور مرقوم ہے کہ آیت یُوصِيكُمُ اللّٰهُ میں کچھ بھی تخصیص نہیں ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ باتفاق فریقین اور بہت سی تخصیصیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ کافروارث نہیں ہوتا غلام دارث نہیں ہوتا۔ قاتل مورث دارث نہیں۔ بائیں ہمارے تخصیص پر کلام اللہ کا کوئی لفظ آیت مذکور سے متصل ہو یا مفصل دلالت نہیں کرتا۔ بجز اس کے نہیں کہہ سکتے کہ احادیث مختصہ معنی ہوں پھر اسی حدیث مَا تَرَكْنَاكَ صَدَقَةً نے کیا قصور کیا ہے کہ مختص نہ ہو سکی۔ اگر یہ حدیث آیت مذکور کے بائیں معنی مخالف کہتے ہو کہ مختص ہے۔ تو جو حدیثیں اور تخصیصوں پر

دلالة کرتی ہیں بدرجہ اولیٰ مخالف ہوں گی۔ کیونکہ نہ کوئی لفظ اس آیت میں اُن کے مؤید ہے جیسا کہ قرینہ غیبتِ یوحیٰ جو خصوص خطاب کھڑے پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ مذکور ہوا مضمون حدیث مَا تَرَكْنَاہُ کے مؤید ہے۔ اور نہ کوئی اور آیت اُن احادیث کے مساعدتی ہے۔ جیسا کہ آیت مَا أَفَاءَ اللَّهُ حَدِيثِ مذکور کے مساعد ہے۔

الحاصل اگر آیت مَا أَفَاءَ اللَّهُ سے بھی قطع نظر کیجئے اور حدیث مذکور کو بین خطاب اور مفسر مراد حدیث رکھئے تب بھی بیش برین نیست کہ حدیث مذکور آیت مسطور کے مخصوص ہوگی۔ مخالفت کجا؟ اور اگر تخصیص بھی مخالفت کہلاتی ہے تو ایسی لفظ شیعہ سنی سب کے نزدیک درست ہے۔ تکرار کی کیا بات ہے۔

بعض آیات اور روایات | ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ میت کے ماں باپ کے ہوتے شیعہ میں کئی تضاد | اس کی اولاد کی اولاد کو میراث نہ دی جائے جیسے کہ شیعہ

کہتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ حالانکہ اولاد کی اولاد بلاشبہ اولاد ہی میں داخل ہے۔ اور خود جناب باری تعالیٰ ہی فرماتے ہیں یُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمُ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ یعنی اولاد کو میراث دلانے کے باب میں خود جناب باری تعالیٰ وصیت فرماتے ہیں۔ پھر جب اولاد کی اولاد بھی اولاد ہی ہوئی تو ان کی وراثت آپ ثابت ہوگئی۔ اور اگر اولاد اولاد کی اولاد ہوتے ہیں بھی حضرات شیعہ کو سندی کی ضرورت ہے۔ اور بے سند ادبے دلیل ایسے مضامین نہیں سمجھ سکتے۔ تو لیجئے سند بھی موجود کلام اللہ میں اولاد کی اولاد ہی کو آیت مباہلہ یعنی نَزَّلْنَا أَبْنَاءَنَا وَابْنَاتَنَا مِثْلَ ابْنِہَا فرمایا اس لئے کہ باتفاق فریقین ابنائنا سے حضرات حسنین وغیرہ مراد ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں صاحبزادے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ تھے۔ بیٹی کے بیٹے تھے۔

دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو حضرت یعقوب کی اولاد کی اولاد تھی ان کو خداوند کریم بار بار بنی اسرائیل کہتا ہے۔ حالانکہ بنی اسرائیل کے معنی بعینہ اولاد یعقوب ہے۔ اس لئے کہ بنی اسرائیل اور اسرائیل سے مراد حضرت

یعقوب ہیں۔ اور رب جانتے ہیں کہ اس زمانہ کے بنی اسرائیل حضرت یعقوب کے بیٹے تو تھے ہی نہیں اولاد کی اولاد تھے وہ بھی کئی پشتوں بعد۔ علیٰ ہذا القیاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے آدمیوں کو خداوند کریم اس آیت میں یَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ اور نیز آیات میں بنی آدم فرماتا ہے حالانکہ حضرت کا ان میں سے کوئی بھی بیٹا نہ تھا۔ اگر تھے بھی تو کہیں اڑسنگ کے پڑسنگ جا کر اولاد کی اولاد ہوتے تھے۔

دوسرے مخالفت اسے کہتے ہیں کہ بیوی کو زمین اور زمین کی قیمت سے میراث نہیں دیتے اور علیٰ ہذا القیاس برادران اور ہمیشہ گان مادری کو مقتول کی دیت میں سے میراث نہیں دیتے۔ اور دیں تو قاتل کو مقتول کے ترکہ اور دیت میں سے میراث دیں۔ بشرطیکہ خطا سے یا شبہ خطا سے قتل کیا ہو۔ حالانکہ نصوص قرآنی زوجہ اور بہنوں اور بھائیوں کی سب کی تو دیت میں عام ہے۔ زمین کی اور اس کی قیمت اور دیت کی کچھ تخصیص نہیں۔ اور اسی طرح جملہ القاتل لایرث بھی جس سے قاتل کا محروم ہونا ثابت ہوتا ہے عام ہے۔ عدا اور خطا کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

باایں ہمہ اور بھی سب میت کے بڑے فرزند کو شمشیر اور مصحف اور انگوٹھی اور پوشاک (میت کی) بدون عوض دلاتے ہیں۔ اور اس باب میں شیعہ بعض اپنے ائمہ سے بھی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ کے ترکہ میں ان اشیاء میں سے اور وارثوں کو حصہ نہیں دیا۔ بلا عوض سب کا سب آپ ہی رکھا۔ اور پھر اس روایت کا راوی سوائے شیعہ اور کوئی نہیں۔ حالانکہ یہ روایت سراسر مخالف قرآن ہے اگر عذر عصمت ائمہ ہے اور یوں کہے کہ امام معصوم ہوتا ہے اور معصوم سے ظلم و ستم اور خطا نہیں ہوتی جو کچھ انھوں نے کیا صحیح ہی کیا ہوگا۔ ہم نہ سمجھیں تو کیا ہوا؟ تو اول تو اہل سنت کسی کو سوارا بنیاء معصوم ہی نہیں سمجھتے جو ان کے سامنے یہ عذر چل سکے۔

قول قابل اتباع ہے اور | اور ملنا کہ فعل معصوم میں خطا نہیں ہو سکتی لیکن بالاتفاق قول معصوم فعل میں خصوصیت کے احتمال ہیں | اتباع اور اقتداء میں فعل معصوم سے مقدم ہے کیونکہ افعال میں تو یہ

بھی احتمال ہے کہ خاص اس کے لئے ہو آخر بیسیوں احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھے۔ منجملہ ان کے دربارہ نکلح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں چاہے کی قید نہ ہونی معلوم ہی ہو چکی صوم وصال کا آپ کے لئے جائز ہونا اوروں کے لئے نہ ہونا سب کو معلوم۔ علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے امور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص تھے اور کچھ کچھ ان کا مذکور بھی ہو چکا اور قول میں یہ احتمال نہیں ہوتا اگر اس میں کسی وجہ سے کوئی تخصیص بھی ہوتی ہے تو کسی ایک آدھ ہی کی ہوتی ہے۔

بہر حال جب قول بعض ائمہ کہ وہ اگر بالفرض معصوم بھی ہیں تو کہیں اتنے ہیں؟ جتنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابل اقتدار و اتباع ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک علی العموم یہ حکم جاری ہے۔ کہ ہر سونا کس کو یہ مقام حاصل ہے کہ مصحف انگشتی وغیرہ ترکہ پداری میں سے بدون عوض لے لے۔ تو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی لَا تُؤْثِرُ مَا تَرَكَنَا مِنْ صَدَقَةٍ بَدْرَجَةٍ اُولٰٓئِكَ اَتَّبَعُوا۔ اور جب ان امور کو بھی لحاظ کیجئے کہ ائمہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں۔ اور ابو بکر صدیق نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی اور آجکل کے شیعہ جو روایت مذکور پر عمل کرتے ہیں انھیں سنتا تو کہاں نصیب ان کی زیارت بھی میسر نہیں آئی۔

حدیث کا نورث مفسر و متین آیت | معہذا حدیث لا تُؤْثِرُ مَا تَرَكَنَا مِنْ صَدَقَةٍ ایک ہے اور روایت شیعہ مخالف | وجہ سے مبین خطاب بھی ہو سکتی ہے اس کا مخصوص ہونا

ایسا ظاہر نہیں کہ اس کے سوا احتمال ہی نہ ہو۔ بلکہ قرین عقل بعد غور کے مفسر و مبین ہونا ہی ہے بخلاف روایت شیعہ کے کہ وہ مخصوص کیا مخالف ہے کیونکہ تخصیص کے لئے کوئی وجہ تو چاہئے یہاں بجز دھینگا دھینگے کے اور کچھ نہیں۔ غرض ان امور کے لحاظ سے روایت شیعہ روایت ابو بکر صدیق کے پاس تک بھی نہیں ہو سکتی۔ معہذا ہم پوچھتے ہیں کہ سند ائمہ دربارہ تخصیص کیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل قول ہے تو ابو بکر صدیق نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قول سے تخصیص کی تھی کہ فدک دیا تو کچھ چنگیز خاں اور قاتلون انگریزی کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ ہاں ابو بکر صدیق کی جانب البتہ

اتنا قصور ہے کہ انھوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کوئی راوی
بیچ میں نہ تھا۔

ائمہ نے روایت فدک اگر بلا علقہ اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ علقہ
آنحضرت بیان کی ہو تو دو خرابیاں لازم آئیں نہیں تو دو خرابیاں لازم آئیں گی اول تو معصوم ہو کر

کلام اللہ کے مخالف کیا معصوم کے معنی تو یہی ہیں کہ احکام خداوندی کے خلاف اس
سے نہ ہو سکے دوسرے اس پر بھی اکتفا نہ کیا امت کے لئے بھی یہی حکم مخالف رہا
اور یہ دونوں خرابیاں پہلی شق پر بھی برابر وارد ہیں۔ کیونکہ کلام اس صورت پر
ہے کہ تخصیص کو مخالف کہئے۔ سو اس صورت میں مخالفت کہیں نہیں گئی۔ اس میں
کوئی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یا کوئی اور۔ کلام اللہ کے مخالف
تو کسی کی بات کیوں نہ ہو قابل شنوائی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور تخصیصات مسطورہ
کو جو بحوالہ مذہب شیعہ مرقوم ہوئی ہیں اور واقع میں تخصیصات نہیں مخالفت ہیں
چنانچہ ظاہر ہے۔ ایک طرف دھریئے اور حدیث ابو بکر کو ایک طرف رکھئے اور بوجہ
عقل اور نقل آیت یٰٰصِبْکُمْ اللہ سے اس کی چسپیدگی اور مخالفت شیعہ کی منافرت کو
ملحوظ کر کے دونوں کو تولئے۔ اور پھر بولئے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے ؟

الحاصل ہر ہر سخن سے شیعوں کی سخن فہمی اور ہر ہر قدم پر ان بزرگواروں کی عقل و
نقل سے مناسبت معلوم ہوتی جاتی ہے۔ ہر ہر بات پر گرفت کرنے میں بھی تھکا جاتا
ہوں۔ اور نیز شرم آتی ہے کہ ان بیحیاؤں کو الزام دے کر کہاں تک شرمائیے۔ اس لئے
باقی امور کا جواب لکھنے سے جی رکتا ہے۔ اور یوں خیال آتا ہے کہ جب اس فرقہ کی
خوش فہمی ہر ہر سطر پر معلوم ہو گئی تو اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے کہ اور بھی ایسے
ہی گل کھلائے ہوں گے۔ لیکن یقین سے اطمینان کا رتبہ زیادہ ہوتا ہے۔ گواہی تقریر
سے جو مرقوم ہو چکیں۔ مولوی عمار علی صاحب کے خط معلوم کے امور باقیہ کا غلط ہونا
بھی متیقن اور محقق ہو گیا۔ لیکن شایقین کو یہ تردد ہو گا کہ دیکھئے ان کے غلط ہونے
کے کیا کیا وجوہ ہوں ؟ اس لئے باوجود قلت فرصت اور کثرت ضروریات اور بھی

حرکت کرتی پڑی۔ اس لئے بقدر مناسب دربارہ مخالفت حدیث لا نُؤْثِرُ مَا
تَرَكْنَا مِنْهُ صِدْقَةٌ اور آیت وَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا یَرْشِنِی وَیَرِثُ مِنْ
اِلَیْ یَعْقُوبَ اور آیت وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوُدَ کے اپنے مافی الضمیر کو قلم کے نیچے
کھینچتا ہوں۔

اول قابل لحاظ یہ بات ہے کہ جب آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ میں خطاب مخصوص امت
کے لئے ہوا تو اس حدیث ہی کی اہل سنت کو کچھ ضرورت نہ رہی۔ اور کسی کے مال میں میراث
جاری ہو کہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں تو وراثت جاری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں داخل ہی نہیں۔ باایں ہمہ جب آیت مَا اِذَا اللّٰہُ
سے فدک کا غیر مملوک ہونا ثابت ہو گیا۔ تو جھگڑا ہی تمام ہو گیا۔ اب اگر کوئی کہیں
سے خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا ثابت بھی کرے
تب بھی فدک میں تو میراث جاری ہو ہی نہیں سکتی۔

حدیث معاشر الانبیاء اگر غلط | القصد اگر لوجہ مخالفت ظاہری جو حدیث مذکورہ اور آیات باقیہ
بھی ہو تو بھی فدک ہاتھ نہیں آتا | میں ظاہرینوں کو معلوم ہوتی ہے۔ حدیث مذکورہ اگر غلط بھی
ہو جائے تب بھی کچھ حرج نہیں۔ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشارہ آیت یُوْصِیْکُمُ
اللّٰہُ ہی اس آیت سے مستثنیٰ ہیں۔ پھر اگر اور انبیاء کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی بھی تو
ہو کرے۔ کلام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں ہے غایت مافی الباب حد
مذکور غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے فدک نہیں مل سکتا ہاں آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ
اگر غلط ہو جائے تو البتہ شیعوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔

دوسرے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں بھی میراث جاری ہو؟ تب
جس چیز میں تنازع ہے یعنی فدک میں بشہادت آیت مَا اِذَا اللّٰہُ میراث جاری نہیں
ہو سکتی۔ اب اگر مخالفت مابین حدیث و آیات کے ثابت بھی ہو گئی تو حدیث ہی غلط
ہو جاوے۔ پر شیعوں کا مطلب تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر آیت مَا اِذَا اللّٰہُ پر شیعہ
خط لا کھینچ کر ایمان پر خط کھینچ جائیں تو کیوں نہیں؟ بہر حال بغرض اثبات برائت

حضرت صدیق اکبر یعنی بایں غرض کہ فدک کا نہ دنیا موافق حکم نبوی تھا۔ ہمیں اس میں اس کی ضرورت نہیں کہ حدیث مذکور اور آیات مذکورہ میں موافقت ثابت کریں۔ اور مخالفت جو بظاہر نظر آتی ہے اس کو باطل کر کے حدیث مذکور ثابت کریں۔ اس باب میں اشارہ یوحیکم اللہ اور دلالتہ ما فاء اللہ کافی ہے۔

فصل

در اثنت انبیاء پر بحث کہ وہ مالی ہے | پر لغرض اثبات صدق صدیق اکبر اس باب میں یا علمی؟ اور مالی مراد لینے پر خرابیاں | بھی گفتگو کرنی ضروری ہوئی اس لئے نظر پر تقدم

وتاخر آیات اول در باب مخالفت حدیث اور آیت وَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ الْحَيٰ وَ گفتگو چھیڑتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ بغور سنئے اگر وراثت سے اس آیت میں وراثت مالی مراد ہے۔ اور اس وجہ سے حدیث کو اس آیت کے مخالف کہتے ہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ آل یعقوب سے یا تو خود ذات با برکات حضرت یعقوب علیہ السلام مجازاً مراد ہو چنانچہ محاورات عرب میں اکثر پایا جاتا ہے کہ آل فلاں بولتے ہیں اور اس سے خود وہی شخص مراد ہوتا ہے۔ یا حقیقی معنی مقصود ہوں۔ یعنی آل یعقوب سے اولاد یعقوب مراد ہو۔ سوال صورت میں تو لازم آئے گا کہ تادم دعا مذکور مال حضرت یعقوب جن کے انتقال کو دو ہزار برس سے زیادہ ہو چکے تھے بجز غیر منقسم رکھا ہوا ہو۔ اور آگے حضرت زکریا کو یقین ہو کہ میری وفات سے پہلے بھی تقسیم ہو لیا تھا۔

یا بعد اس دعا کے قبل وفات حضرت زکریا کے تقسیم ہو جاتا تو پھر جملہ یَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوب کے زیادہ کرانے کی کیا حاجت تھی؟ لفظ یَرِثُ بھی کافی تھا کیونکہ اس صورت میں وہ مال حضرت زکریا کا ہو چکا۔ اب حضرت یعقوب کا نہ عرفاً رہا نہ شرعاً۔ حضرت یحییٰ وارث ہوں تو ہر طرح سے حضرت زکریا ہی کے وارث کہلائیں حضرت یعقوب کے وارث نہ کہلائیں گے۔ اس صورت میں لاجرم جملہ یَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوب غلط ہو جائے گا۔ اور پھر لغو جدار ہے گا کیونکہ حضرت زکریا کی نسبت تو وراثت پر دلالت یَرِثُ میں موجود تھی یَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوب کی کیا ضرورت تھی؟

بہر حال اس صورت میں اس وجہ سے یوں کہنا پڑے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرا اور باایں ہمہ حضرت یعقوب کا مال غیر منقسم ہی رہا۔ سو ایسی بات دیوانوں کے سننے کی ہے۔ عاقلوں کے کانوں میں تو ایسی نامعقول باتوں کی سمائی نہیں۔ کون کہہ دے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ ایک شخص خاص کا مال باوجود اس کثرت اولاد کے کہ شاید کسی کی نہ ہوئی ہو غیر منقسم رکھا رہا ہو۔ اور اگر آل یعقوب سے معنی حقیقی مقصود ہوں اور اولاد یعقوب مراد ہو۔ تو معنی ہوں کہ حضرت یحییٰ تمام بنی اسرائیل کے وارث ہوں۔ جو تعداد میں لکھو کھا سے متجاوز ہوں گے۔ اور پھر باایں ہمہ حضرت یحییٰ تمام احیاء و اموات سے ایسا رشتہ و قرابت رکھتے ہوں جو موجب وراثت ہو سکے۔

معہذا یہ بھی ضرور ہو کہ اس زمانہ کے بنی اسرائیل میں جو جو زندہ ہوں وہ لاجرم حضرت یحییٰ کے سامنے مرتبی جائیں۔ تاکہ وارث جو حضرت زکریا ہیں اور یرث من آل یعقوب اس پر دلالت کرتا ہے ظہور میں آئے۔ سو یہ بات پہلی بات سے بھی کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ بجز اس کے کہ ان عبارات کے ایسے معنی لے لے کر زبردستی اور بے ہودہ کہئے اور کیا کہئے؟ عالم و عاقل کے تو تصور میں یہ بات نہیں آسکتی کہ ایسے امور و چوڑ میں آئیں۔ اور پھر کوئی نادان ہی ایسی نامعقول تمنائیں کرے۔ چہ جائیکہ حضرت زکریا انبیاء کی تیرہٹی ذہن اور سلامت عقل سب جانتے ہیں اور پھر باایں ہمہ کیا زبیا تھا کہ جناب باری تعالیٰ ایسی چر پوز باتوں کو اپنے ایسے کلام پاک میں نقل فرماتا کہ جس کی بلاغت و متانت کا شہرہ آسمان سے زمین تک پہنچا۔

غایت مافی السباب کوئی بات کو بنائے تو یوں بنائے کہ من کل واحد من آل یعقوب اگر فرماتے تو یہ اعتراض ہو سکتا۔ اور فقط من آل یعقوب سے تو سب بنی اسرائیل کے مال کی وراثت لازم نہیں آتی۔ مگر اہل انصاف سمجھتے ہیں کہ اگر یہ معنی ہوں کہ بنی اسرائیل میں سے ہر فرد بشر کی وراثت مراد لینا ضروری نہیں۔ ایک دو کی وراثت بھی کافی ہے۔ تو اتنی بات تو یرشنی میں موجود تھی۔ اس قدر عبارت بڑھانے سے کیا حاصل ہوا؟ معہذا ایسے مواقع میں بحکم محاورہ تمام افراد ہی

مراد ہوتے ہیں۔

القسمہ شیعوں کا اس آیت کو وراثت پانے پر محمول کر کے بوجہ مخالفیت حدیث ماترکناہ صدقہ حضرت ابوبکر صدیق اور پیروان حضرت صدیق طعن کرنا بعینہ ایسا قصہ ہے۔ جیسے نکتہ ناک والوں پر ہنسی جس فرقہ کے علماء کی فہم و فراست اور خوش فہمی اس درجہ کو ہو تو جاہلوں کو تو کچھ نہ پوچھئے۔ ان کی عقل سے تو بیشک بھینس ہی بڑی ہوگی۔ معہذا حضرت زکریا نے مقام دعائیں دو لفظ فرمائے ہیں ایک تو وَلِیتاً دوسرے یَرِثُنِی اگر دلی سے فرزند مطلوب ہے تب یَرِثُنِی بیکارا اور لغو گفتار ہے بیٹا آپ وارث ہوا کرتا ہے۔ ایسا کوئی فرزند ہوتا ہے جو قافلہ وراثت نہ رکھتا ہو۔ اور اگر یَرِثُ کی قید سے یہ غرض ہو کہ ایسے اوصاف اس میں پیدا نہ ہوں جو مانع وراثت ہوں مثلاً کافر نہ ہو۔ یا میرا قاتل نہ ہو۔ کیونکہ کافر اور قاتل میت کے وارث نہیں ہوتے تب بھی اس کی کچھ حاجت نہ تھی اس لئے کہ وَاجْعَلْ سَرِیّاً رَضِیّاً آگے موجود ہے۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ دلی بھی دے تو ایسا دے جو تیری مرضی کے موافق ہو۔

باقی رہا یہ احتمال کہ یَرِثُنِی کی قید اس لئے بڑھائی کہ مبادا فرزند تو عطا ہو لیکن سامنے ہی مر جائے۔ تو یہ احتمال اسی کو رد ہے جو نحوذ باللہ خداوند علیم کو ہیمنہ سمجھے۔ اسی دعائیں یہ الفاظ موجود ہیں اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیْ مِنْ وَرَآئِیْ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجھے اپنے بعد کا اندیشہ ہے اُس اندیشہ کے سبب دلی طلب کرتا ہوں۔ سواب اس دعائیں یہ بات صاف موجود ہے کہ دلی ملے تو ایسا ملے جو بعد تک زندہ رہے۔ معہذا لفظ دلی تو اُسے ہی کہیں گے جو دلی عہد اور خلیفہ ہو۔ اس مضمون کو حضرت زکریا کے بعد تک زندہ رہنا آپ لازم ہے۔

اور ان سب خرابیوں سے قطع نظر کیجئے۔ وراثت مالی کے نہونے کی ایک یہی وجہ بہت ہے۔ کہ اس صورت میں حضرت زکریا کے منصب نبوت کو بٹا لگتا ہے۔ مال کا اتنا خیال کہ جیتے جی تو تھا ہی۔ مرنے کے بعد کا بھی ابھی سے بند و بست ہے۔ اور وہ بھی اس قدر کہ خدا سے بھی کچھ شرم نہیں۔ یہاں تک کہ خود جناب باری ہی سے یہ التجا ہے۔

کہ اس کے برتنے کے لئے فرزند عنایت کر۔ پرلے درجہ کے دنیا داروں اور محبانِ دنیا کا کام ہے نہ کہ انبیاء کا۔ اور ان میں سے بھی حضرت زکریا کا جو آزادی اور وارستگی میں مشہور تھے۔ استغفر اللہ شیعم بھی کس قدر بیہودہ ہیں۔ کہ حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑتے۔ انبیاء کی یہ لوگ کیا قدر جانیں؟ ان کی ہمت بلند کے سامنے تو تمام متاع دنیا مینگنی کے برابر ہے۔ پھر ان میں سے حضرت زکریا جیسے بے تعلق۔ وہ ایک قدر قلیل متاع دنیا کے لئے کیا اس قدر بند و بست کرتے؟ اور وہ بھی اتنا کچھ کہ خدا تک نوبت پہنچی۔ اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ اول تمام مراتب اپنے استحقاق کے جس سے خواجہ خواہ دعا قبول ہی کرنی پڑے۔ بیان کئے جائیں۔

کیونکہ بعد تمہید مطلب ہے، تو یہ ہے افی خفت الموالی جس سے اپنی کمال بقراری اور بے تابی اور ضرورت فرزند ثابت ہو جائے۔ تاکہ کچھ توقف نہ ہو۔ سبحان اللہ نبی نہ ہوئے دنیا دار ہوئے۔ اتنی دور کی تو انھیں بھی نہیں سوچھتی جن کی رگ و پے میں محبت دنیا رچی ہوئی ہے۔ اور شب و روز اسی دہیان گیان میں رہتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر حضرت زکریا کو یہ اندیشہ تھا۔ کہ ان کے بنی اعمام ان کے مال کو ان کے بعد بجا اور بے موقع صرف نہ کریں۔ تو اول تو یہ اندیشہ ہی بجا۔ کیونکہ نقل مشہور ہے آپ ہوئے جگ پر لوں مرے کے بعد کوئی سیاہ کرے یا سفید مردہ کو کیا اندیشہ؟ بعد مردن کوئی مواخذہ کی صورت ہی نہیں۔ اور اس پر خدا سے عرض کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اندیشہ کی تدبیر اور تدبیر بھی وہ عمدہ کہ در صورت قبولیت دعا وہ بات ہرگز نہیں۔ خود ان کے ہاتھ میں موجود تھی۔ یعنی اپنے ہاتھ سے تمام اموال خدا کی راہ میں لٹا جاتے۔ جو اس خوف سے بھی نجات ہو جاتی اور ذریعہ مزید ترقی درجات آخرت بھی میسر آتا۔ فرزند اگر نیک بھی ہوا اور اس نے مال کو خدا کی راہ میں صرف بھی کیا تو مردہ کو کیا؟ وہ مال اب فرزند کا ہو گیا ثواب دینے والے کا اس کو اختیار ہو باقی رہی یہ بات کہ ایک دفعہ مال کے لٹا دینے میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر بعد اتفاق حیات طویل باقی نکلی تو پھر اپنا گزارا مشکل ہے۔ سو اس کی یہ صورت ہے کہ اگر ایسی

ہی بے صبری اور اس بات کی پابندی تھی۔ اور باوجود نبوت توکل دشوار تھا تو انبیاء کو ان کی موت کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ وقت اطلاع موت سب سے دلا جاتا اور وارثان بد وضع کے لئے کوڑی نہ چھوڑتے۔ القصہ نظر بر وجہ مذکورہ وھب فی من لدنک سے وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ مِیں | علیٰ ہذا القیاس آیت وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ میں بھی حکم قرآن وراثت مالی مراد نہیں

عقلیہ ارادہ وراثت مالی ممنوع ہے۔ مگر شاید شیعوں کو یہ یہ عذر ہو کہ یہاں عقل ہی ندارد ہے۔ تو البتہ یہ عذر محقول۔ خیر اگر شیعہ انصاف کہیں تو اس قدر اور معروض ہے کہ باتفاق مؤرخین اور جماع اہل توارث حضرت داؤد کے انیس بیٹے تھے۔ ایک حضرت سلیمان اور اٹھارہ دوسرے۔ پس اگر وارث ہوتے تو سب ہی ہوتے۔ حالانکہ بطور خصوصیت جناب باری تعالیٰ کا یوں فرمانا کہ حضرت داؤد کے حضرت سلیمان وارث ہوئے اس بات کو مقتضی ہے۔ کہ حضرت داؤد کے وارث فقط حضرت سلیمان ہی تھے۔ اور بھائیوں کی شرکت نہ تھی۔ اور نیز یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ سب بیٹے باپ کے مال کے وارث ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس بات کے بیان کرنے سے کیا حاصل نکلا۔ جو جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو یاد فرمایا۔ ایسی لغو بیہودہ باتیں خداوند متین کے کلام میں نہیں ہو سکتیں۔

علاوہ بریں ایسی بات کے بیان کرنے میں جس میں تمام عالم نیک و بد شریک ہوں کیا بزرگی نکلی جو خداوند کریم نے حضرت سلیمان کے فضائل و مناقب میں اس کو درج فرمایا۔ اور مقام تعریف میں چنانچہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے ذکر کیا۔ القصہ بوجہ مذکورہ یہاں بھی وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔ جب بدلائل واضح اس سے اطمینان ہوا کہ ہر صحیح بادا بد وراثت مالی تو مراد نہیں۔ تو یہ تردد ہوا کہ پھر اور کون سی وراثت مراد ہوگی؟ اس بات کے اطمینان کے لئے اول تو حضرات ائمہ کی طرف رجوع کیا اور ہر سے یہ جواب ملا اِنَّ سُلَيْمَانَ وَرِثَ دَاوُدَ وَ اِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمُ وَرِثَ سُلَيْمَانَ یعنی بیشک حضرت سلیمان حضرت داؤد کے وارث ہوئے۔ اور حضرت

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان کے وارث ہوئے۔

وراثت سے مراد علم دین (بروایت ائمہ شیعہ) چنانچہ یہ روایت حضرت امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے امام المحدثین شیعہ حضرت کلینی نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔ سنیوں کی کتابوں میں ایسی ویسی باتیں ہوتیں تو شیعوں کے لئے گنجائش انکار بھی تھی۔ بہر حال اس روایت سے عیاں ہے کہ آیت دودث سلیمان میں تو وراثت علمی و وراثت منصب نبوت مراد ہے۔ وراثت مالی مراد نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان سے کیا قرابت تھی؟ کہ اس کے وسیلہ سے جو مال حضرت سلیمان کو حضرت داؤد کے ترکہ میں سے ملا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میراث میں ملتا۔ مہذا مال بلا تو کب بلا؟ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایسی میراث جو حضرت داؤد سے حضرت سلیمان کو پہنچی۔ اور حضرت سلیمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی بجز میراث نبوت اور میراث علم کے اور کچھ نہیں۔

سیاق و سباق آیت سے علاوہ ازیں خود کلام ربانی میں کلام سابق اور کلام لاحق دونوں بھی وراثت علمی ظاہر ہیں۔ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ جملہ وراثت سے میراث علمی

مراد ہے میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ حافظان عربی داں پر پوشیدہ نہیں۔ بالیں ہمہ بند بھی ماقبل مابعد دونوں کو لکھ کر اطمینان کئے دیتا ہے۔ کلام سابق تو یہ ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَ الْاِحْمَدُ لِلّٰهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ جس کے جملہ وراثت سلیمان سے مل کر یہ معنی ہوئے۔ کہ بیشک دیا ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم۔ اور کہا ان دونوں نے شکر اس اللہ کا جس نے فضیلت دی ہم کو اپنے بہت بندوں ایمان والوں پر۔ اور وراثت ہوئے سلیمان داؤد کے اور کلام لاحق یہ ہے وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مَن مَّطَّقَ الطَّيْرَ الْوَحْشَ اور مجموعہ کے مل کر یہ معنی ہوئے کہ وراثت ہوئے سلیمان داؤد کے۔ اور بولے وہ۔ لوگو ہم کو سکھائی ہے یعنی خدا نے گفتگو پرندوں کی فقط۔

اب دیکھئے کہ جب جملہ وراثت جملہ وَلَقَدْ آتَيْنَا ہر معطوف ہوا اور جملہ وَقَالَ وراثت، ہر معطوف ہوا اور پھر ان دونوں تینوں معطوف اور معطوف علیہ کے ایک دوسرے

پر معطوف ہونے کو لحاظ کریں۔ تو در صورتیکہ جملہ وقال جملہ ورت پر معطوف ہو تو اس ارتباط سے اب یہ بات نکلتی ہے کہ ورت میں وراثت علمی مراد ہے۔ ورنہ بے علاقہ دو جملوں میں عطف کے کیا معنی؟ جس نے مختصر معانی اور مطول کی بحث فصل وصل کو دیکھا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اگر وراثت سے وراثت علمی مراد نہ ہو بلکہ مالی ہو۔ تو پھر عطف کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ چہ جائیکہ موجب فصاحت و بلاغت ہو۔ اور ظاہر بھی تو ہے اس صورت میں ان دونوں تینوں جملوں میں عطف کا ہونا بعینہ ایسا ہے جیسا زاغ کے ساتھ طوطی کو ایک قفس میں بند کر دیجئے۔

اور جملہ ورت جو مابین اپنے قبل اور مابعد کے داخل ہے اس کی یہ صورت ہوگی۔ جیسے کہا کرتے ہیں بیاہ میں بیچ کا لیکھا۔ ایسی غیر مربوط کلام دیوانوں کی ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ شانہ کی شانِ رفیع سے یہ بات محال ہے۔ کہ ایسی ناموزوں گفتگو کرے۔ ہاں اگر ایسے مواقع میں محاورات عرب میں لفظ وراثت نہ بولا کرے تو البتہ فی الجملہ جائے تاثر تھی۔ خیر شیعوں کو شاید خبر نہ ہو۔ پر حافظان کلام ربانی کو معلوم ہے کہ محاورات ساکنان عرب تو درکنار خود کلام ربانی میں جو ارباب فصاحت و بلاغت کے نزدیک عربی زبان میں کوئی کتاب یا کوئی عبارت اُس کے ہم سنگ تو کیا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتی۔ بہت مواقع میں وراثت سے وراثت علمی مراد ہے یہاں تک کہ وراثت مالی کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔

کلام اللہ میں وراثت کو صرف ایک جا فرماتے ہیں ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ علم کے لئے کثرت سے استعمال کیا اَصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا جس کا یہ مطلب ہے کہ پھر ہم نے وارث کیا کتاب کا اپنے بندوں میں سے اُن لوگوں کو جن کو چھانٹ لیا۔ دوسری جا ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ اس سے بھی وہی وراثت کتاب یعنی علم کتاب مراد ہے۔ مگر شاید خوش فہمان شیعہ کو یہاں یہ احتمال ہو کہ کتاب بھی تو مال ہے اور شاید وراثت مال ہی یہاں بھی مراد ہو۔ تو گو اس احتمال کے دفع کے لئے کاغذ کے سیاہ کرنے میں اپنی ہمتی کا اندیشہ ہے۔ مگر

بمحافظہ فہم شیعہ ناچار کچھ اشارہ ضروری ہوا۔

اس لئے معروض ہے کہ اول آیت میں تو بعد عبادنا کے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ
الخ ہے اور دوسری آیت میں بعد کتاب کے يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الَّذِي هُوَ
تَفْرِجٌ فَمِنْهُمْ سَعَىٰ تَوَلَّىٰ ظَاهِرٌ هُوَ كَمَا عَطَا كِتَابَ كَيْ يَبْعَثَ عَلَيْهِمْ
تَيْنِ حَالِ هُوَ كَيْ كَوْنِ ظَالِمٌ رَّهًا كَوْنِ مُقْتَصِدٍ كَوْنِ سَابِقٍ سَوْعِلَ عِلْمٍ مُّتَفَرِّعٍ هُوَ
ہے نہ کہ اوراق اور جلد کتاب پر اور يَأْخُذُونَ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو کتاب کیا ملی
ہی کمانے لگے۔ یعنی رشوت لیکر امراء کی مرضی کے موافق مسئلے غلط بتانے لگے۔ چنانچہ
قَرِينَ الْمَذْيُوثِ خَذَ عَلَيْهِمْ مِثْقَاتُ الْكِتَابِ اَنْ لَا يَقُولُوا عَلٰى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
اس بات پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ رشوت لیکر غلط مسائل بتانے بے علم کے نہیں
ہو سکتے۔ بہر حال اکثر مواقع میں لفظ وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔ سو اس
استبعاد کی بھی گنجائش نہیں کہ میراث کو علم سے کیا علاقہ؟

کلام اللہ میں وارث بمعنی

قائم مقام

ہاں شاید کسی عربی خواں عمامہ بندی کے جی میں یہ کھٹکے
کہ وراثت علمی وراثت مجازی ہے اور وراثت مالی وراثت

حقیقی۔ پس وراثت کے معنی حقیقی چھوڑ کر بے ضرورت معنی مجازی لینے درست نہیں
البتہ اگر ضرورت ہوتی تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ گزارش یہ ہے کہ معنی معروف
وراثت کے معنی حقیقی ہونا اور علم میں مجاز استعمال ہونا ہی اول تو مسلم نہیں۔ علم میں بھی
مثل مالی وراثت! اپنے معنی حقیقی پر ہی رہتی ہے۔ الغرض وراثت کے معنی حقیقی
دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس کے معنی قائم مقام ہونے کے قریب قریب ہیں بلکہ
اگر بمعنی جادی اور مسلط ہو جانے کے کہئے تو اور بھی النسب اور اولیٰ ہے۔ چنانچہ
ظاہر ہو جائے گا۔ پر سبب کثرت استعمال کے عرف فقہاء میں معنی معروف میں خاص
ہو گیا ہے۔ ورنہ حقیقت وراثت کا اطلاق وراثت علمی اور وراثت منصب دونوں پر
ولیا ہی صحیح اور درست ہے جیسا کہ وراثت مالی پر۔

اور دلیل اس بات کی کہ معنی خاص یعنی وراثت مال میں یہ لفظ معروف ہو گیا ہے

اور اصلی معنی قریب غریب قائم مقام ہونے یا حاوی اور مسلط ہو جانے کے ہیں۔ عام ہے کہ بطور معروف ہو یا بطور دیگر ایہ ہے کہ بعض ایسے موقع میں کلام اللہ میں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے کہ وہاں وراثت علمی ہو سکے۔ کیونکہ جو چیز میراث میں آتی ہے وہ مال ہے۔ اور نہ میراث بطور معروف ہو سکے اس لئے کہ جن سے میراث پہنچی ان سے رشتہ داری تو کیا قرابت دینی بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ مسلمان تو وہ کافر جن سے میراث بطور معروف پہنچتی بھی نہ پہنچے۔ ہاں اگر بمعنی قائم مقام ہونے اور نیابت منصب کے کہا جائے تو البتہ معنی بن جائے دیکھے فرماتے ہیں وَ أَوْزَنَّا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا جِسْمَ كَيْفَ يَكُونُ اس کے معنی یہ ہیں۔ اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور تھے مشرق اور مغرب میں اس زمین کا جس میں ہم نے برکت رکھی فقط اب سنئے اس قصہ میں جن کو زمین دلائی وہ بنی اسرائیل تھے۔ اور جن سے دلائی وہ فرعون اور قوم فرعون تھی۔ ان میں قرابت نسبی تو کیا رشتہ داری اسلام و ایمان بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ مسلمان تھے تو وہ کافر اگر بالفرض آپس میں ایسی رشتہ داری بھی ہوتی تب ظاہر یہ ہے کہ اس شریعت میں بھی مسلمانوں کو کافروں کی میراث نہ پہنچتی ہوگی۔ بجز اس کے کہ میراث سے مراد قائم مقام ہونا۔ اور وراثت منصب مراد ہو۔ اور کوئی صورت نہیں۔ سو اس صورت میں نہ وراثت علمی ہے جو معنی مجازی کہئے اور یوں کہئے کہ معنی حقیقی وراثت مالی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وراثت میں جو چیز بڑی وہ زمین ہے جو مال ہے اور نہ یوں کہئے بنے ہے کہ وراثت بمعنی معروف ہے۔

عَلَىٰ هَذَا الْقِيَاسِ أَنَّ الْأَرْضَ مِلْكُ اللَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ میں بھی جس کے معنی ہیں کہ بیشک زمین اللہ کی ہے وراثت کر دے ہے جسے چاہے اپنے بندوں میں سے۔ اور آخر نبی خدا نے والوں ہی کا ہے؟ وہی وراثت بمعنی قائم مقام ہونے کے ہے۔

وارث بمعنی حاوی و مسلط | الغرض ان مواقع میں تو وراثت ظاہر میں بمعنی قائم مقام

ہونے کے ہے۔ اور غور سے دیکھئے تو حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہے۔
 کیونکہ آیت وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا میں
 جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ وہ جنت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اس کو
 جو پرہیزگار ہوگا فقط۔ بجز حاوی اور مسلط ہو جانے کے اور معنی مراد نہیں ہو سکتے
 کیونکہ یہاں قائم مقام ہونے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ جنت پہلے کسی اور
 کے قبضہ میں کب تھی۔ جو پرہیزگاروں کو ان کے قائم مقام کیا؟ اور جنت کو ان سے
 چھین لیا۔

اور مجازاً میراث حضرت آدم علیہ السلام کہئے تو قطع نظر اس کے کہ جب تک حقیقی
 معنی بن سکیں مجازی کیوں لیجئے؟ اس کا کیا جواب ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام تو
 خود جنت میں موجود ہوں گے۔ سو باپ کے ہوتے اولاد کے وارث ہونے کے
 کیا معنی؟ بہر حال ایسے معنی عام جو تمام مواقع میں برابر صحیح ہو جائیں یہی معنی معلوم
 ہوتے ہیں کہ وراثت سے حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہو۔ اور جب ایک
 معنی عام حقیقی بن سکیں جو سب مواقع میں صحیح ہو جائیں۔ تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ
 اس کے قائل ہوں کہ بعض مواقع میں معنی حقیقی کہئے اور بعض مواقع میں معنی مجازی؟
 کیونکہ جیسے ضرورت معنی حقیقی چھوڑ کر معنی مجازی مراد لینے درست نہیں۔ لیساً
 ہی بے ضرورت اس کا قائل ہونا کب درست ہے کہ ایک جامع معنی حقیقی لیں اور
 ایک جامع معنی مجازی؟

ہاں اگر معنی عام کے حقیقی ہونے کی کوئی صورت نہ ہو تو یوں بھی ہوتا۔ معہذا قانون
 میراث لاریب قدیم سے قانون شریعت ہے۔ کیونکہ ہر نبی کی شریعت میں کچھ کچھ
 اس کے قواعد ہیں۔ اگر یہ بات رسوم دنیا میں سے ہوتی تو یہ بات نہ ہوتی۔ لہذا
 اس صورت میں میراث مالی معنی شرعی ہوئے اور وضع لغت اصطلاح شریعت
 سے ہر قرن میں مقدم سمجھی جاتی ہے۔ خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہو
 خواہ کسی اور نبی کا اور ظاہر ہے کہ اصطلاحات اقوام معنی حقیقی میں سے نہیں ہوتیں

بلکہ اقسام منقولات میں سے ہوتی ہیں۔ تو لاجرم معنی حقیقی اور ہی ہوں گے۔ سو اگر وہی ہوں جو میں نے عرض کئے تو نہ ہا ورنہ جو کچھ ہوں وہی ہی۔ ہمارا تو ارتنا مطلب ہے کہ وراثت بمعنی معروف معنی حقیقی نہیں یعنی اصطلاحی ہے۔

اب سنئے کہ باوجود اصطلاح کے پھر اصطلاح بھی ایسی غالب نہیں کہ معنی حقیقی پر ترجیح ہو۔ کیونکہ کلام الشیخ اکثر مواقع میں معنی اصطلاحی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا بہت ہی کم ایسے مواقع ہیں کہ بظاہر وہاں معنی اصطلاحی کا احتمال ہو۔ اور تلاش کیجئے تو بجز ان آیتوں کے جو متمسک شیعہ ہیں اور کوئی آیت نہ نکلے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں بھی احتمال ہی احتمال ہے۔ اور پھر احتمال بھی ایسا کہ غور سے دیکھئے تو وہ احتمال ہی محال ہے۔ چنانچہ بخوبی واضح ہو چکا۔ پھر کون سی ضرورت ہے کہ معنی حقیقی کو چھوڑ کر معنی منقول مراد لیجئے؟ ہاں اگر خدا تعالیٰ کی خود اصطلاح مقرر کی ہوئی ہوتی۔ اور مثل صوم و صلوٰۃ معنی اصلی مراد ہی نہ ہو کرتے تو ایک بات بھی تھی۔ اس تقریر اخیر سے متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی اور وراثت بمعنی معروف دونوں معنی مجازی ہیں یعنی معنی غیر حقیقی ہے۔

وراثت علمی اگر معنی مجازی	اور ملنا کہ وراثت بمعنی معروف وراثت حقیقی ہے اور وراثت
ہی ہو تو مجاز متعارف ہے	علمی وراثت مجازی لیکن مجاز متعارف اور مجاز مشہور ہے

خصوصاً استعمالات قرآن میں یہاں تک کہ حقیقت اور معنی حقیقی کی برابری کرتا ہے۔ چنانچہ دو آیتیں اس بات کی شاہد مذکور بھی ہو چکی ہیں ایک تو ثَوَّادَ ثَنَّا الْكِتَابَ الَّذِينَ الْخِ دُوسری فُخْلَفَ مِنْ بَعْدِ هُمْ خُلَفَ وَدِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَنْ حَضِّ هَذَا إِلَّا ذُنِي اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں وراثت علمی پر بے تکلف دلالت کرتی ہیں۔ کچھ تامل اور توقف کی نوبت نہیں پیش آتی۔ اور یہی مجاز متعارف کے معنی ہیں کہ ایسا مجاز حقیقت سے کم نہیں ہوتا۔ جو یوں کہا جائے کہ بے ضرورت معنی مجازی مراد لینے درست نہیں۔ اور ان سب سے قطع نظر کیجئے تب بھی بات ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔ اس لئے کہ اس میں تو کسی کو کلام نہیں

باوجود قرائن کے معنی مجازی کے مراد لینے میں کچھ دشواری نہیں بلکہ وقت قرائن الہ
معنی حقیقی کا چھوڑ دینا اور معنی مجازی کا مراد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ نہیں تو پھر معنی
مجازی کے استعمال کی کوئی صورت نہ ہو۔

سوا اول تو حدیث کلینی سے بڑھ کر اور کونسی دلیل معنی حقیقی کے چھوڑنے اور معنی
مجازی کے مراد لینے کی ہوگی علاوہ بریں اور بھی قرائن عقلیہ اور نقلیہ مذکور ہوئے
پھر اب بھی اگر معنی مجازی ضروری نہ ہوں تو پھر کب ہوں گے ؟

کلینی کی ایک روایت جس میں | اور با این ہمہ اور ایک ایسی دلیل ہے جس سے وراثت
وراثت علمی کی صراحت ہے | الی کا آیت وراثت میں بلکہ آیت وَهَبْ لِي الْخَيْرَ مِنْهَا
مراد نہ ہونا اور وراثت علمی کا دونوں آیتوں میں مراد ہونا بتصریح ثابت ہو جائے
اور شیعوں کو بھی اس کے انکار میں مجال دم زدن نہ ہو۔ ہمارے پاس موجود ہے
اعنی سوائے آیت مذکور کے۔ ایک دوسری روایت کلینی ہی کی جس کو شیعوں
کو بھی برسرِ چشم ہی رکھنا پڑے۔ اور درباب مطلب مذکور روایت سابق سے
زیادہ کافی و روانی ہے۔ اپنے پیش نظر ہے بغرض دندان شکنی شیعہ اس روایت کو
زیب اوراق کرتا ہوں۔

روی محمد بن یعقوب الرازی فی الکافی عن ابی عبد اللہ جعفر
ابن محمد الصادق علیہ السلام اَنْ سَمِعَ اَنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ
الْانْبِيَاءِ وَذُلِكَ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرِكُوْا وَاَوْفَى تَسْمِيَةِ لَمْ يُوْرِكُوْا
وَرَثَةً وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا وَلَا دِيْنًا
فَمَنْ اَخَذَ بِشَيْءٍ مِنْهَا فَقَدْ اَخَذَ بِمِحْطٍ وَافٍ۔

مطلب یہ ہے کہ محمد بن یعقوب رازی اعنی علامہ کلینی کافی میں ابوالخضر کے
ذاسطے سے امام جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں۔ کہ اٹھوں نے فرمایا کہ بیشک
علماء انبیاء کے وارث ہیں اور یہ اس سبب سے کہ انبیاء نے میراث میں نہیں چھوڑا
اور ایک نسخہ میں یوں ہے کہ میراث میں نہیں پایہ کوئی درہم اور نہ کوئی دینار انھوں نے

جو میراث میں چھوڑا ہے تو چند باتیں ہی اپنی باتوں میں سے چھوڑ آئے ہیں۔ سو جس نے کچھ باتوں میں سے لیا تو اس نے بڑا ہی کابل حصہ لیا فقط۔

اس روایت سے بتصریح معلوم ہو گیا کہ انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا ان کے علم کے البتہ علماء وارث ہوتے ہیں۔ سو بعینہ ہی مطلب اس حدیث کا ہے جو اہل سنت حضرت ابو بکر صدیق سے روایت کرتے ہیں۔ اگر اس روایت کو مولوی عمار علی صاحب اور دیگر علماء شیعہ چھوٹا بتلاتے ہیں تو یہ روایت بدرجہ اولیٰ جھوٹی ہے مگر بایں لحاظ کہ وہ روایت صدیق ہے تو یہ روایت صادق ہے۔ اور جھوٹوں کو سچوں کی بات کب پسند آتی ہے؟ اس روایت کو بھی جھوٹا بتلانے لگیں تو کیا عجب؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ حضرت امام جعفر صادق سے بھی برگشتہ ہو جائیں اور کلینی کو بھی تبرک کر کے اُن کے کردار کو پہنچائیں۔ لیکن اس بات میں ان کو جب مشکل ہو کہ دین سے غرض ہو اگر دین سے غرض ہوتی تو صدیق اکبر ہی سے کیوں بگاڑتے؟ بہر حال وہ تسلیم کریں یا نہ کریں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق کا قول ہمارے نزدیک صادق ہے۔ اور ان کی بات ہمارے سر آنکھوں پر۔

الحاصل بشہادت کلمہ اثباتاً جو باقر الشیعہ بھی مفید حصہ ہے۔ چنانچہ آیت اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ سے بزمِ علم خود اسی بھروسے لڑتے ہیں یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاء نے سوائے علم اور احادیث کے کوئی چیز میراث میں نہیں چھوڑی۔ تو اس صورت میں لاجرم دونوں آیتوں میں میراث علمی ہی مراد ہوگی۔ باقی اس بات کا شیعوں کو اختیار ہے کہ اسے معنی حقیقی کہہ کے تعبیر کریں یا معنی مجازی اس کا نام رکھیں۔ اگر معنی حقیقی کہیں تو فہماور نہ مجاز کہیں اور مجاز بھی مجاز متعارف۔ تب بھی انھیں مرجحاً اولاً اگر ہماری ضد میں مجاز غیر مشہور و غیر متعارف کے قائل ہوں تب بھی کچھ اندیشہ نہیں چشمِ مارو شن دل ما شاد۔ اس لئے کہ باوجود اس قدر و نجوم قرائن صارفہ کے جو درباب مراد نہ ہونے وراثت مالی کے مذکور ہوئے۔ اور باوصف اس قدر کثرت وجوہ ارادہ وراثت علمی کے جو مسطور ہوئیں۔ اگر وراثت علمی مراد ہو تو گو وہ وراثت مجازی ہی ہے

تب بھی عین حق و عذاب ہے۔

بلکہ اگر بالعکس ہو تو خطا فاحش اور غلط ہے اور قواعد دلالت کی رو سے غیر جائز بہر حال آیت و وراثت میں جیسے بقرائن و دلائل سابقہ وراثت مالی کا مراد نہ ہونا ثابت اور متحقق ہو گیا تھا۔ ویسے ہی اب بوجہ و دلائل مذکورہ یہ بھی متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی مراد ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے قرائن و دلائل مسطورہ بالا سے تیسقین ہو گیا تھا کہ آیت وَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا بِرَشْنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اِلِیْ عَقُوْ میں وراثت مالی مراد نہیں۔ اب بشہادت روایت ثانی کلینی یہ تو ثابت ہوا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وراثت علمی مراد ہے چنانچہ ظاہر ہے۔ اور بعد ادا شہادت اس روایت کے اس کی حاجت نہ رہی کہ کچھ قرائن اس بات کے بھی کر کے جاویں کہ یہ آیت وھب لی میں بھی بدستور آیت و وراثت علمی ہی مراد ہے کیونکہ روایت مذکور سے بڑھ کر شیعوں کے حق میں اور کوئی دلیل دندان شکن ہوگی اس روایت کے ذکر کرنے میں شیعوں کی وہی مثل ہو گئی جیسے کہا کرتے ہیں۔ انھیں کی جوتی انھیں کا سر۔

سورہ مریم میں حضرت زکریا
صرف خلیفہ نیک چاہتے تھے

مگر بنظر مزید تحقیق و غرضودئی اہل سنت و پشیمانی شیعہ
کچھ قدرے قلیل اور بھی چھپر چھاڑ سہی اس لئے عرض ہے

اگر لفظ ولی اور جملہ وَرَایْ خَفْتُ الْمَوَالِیْ مِنْ وَرَایْ وَ کَانَتْ اَمْرًا اَتٰی عَاقِبًا
کو جو آیت فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا سے متصل ہی پہلے واقع ہے بنظر غور دیکھا
جائے تو عیاں ہو جائے کہ مقصود حضرت زکریا علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام
فقط طلب گاری جانشین اور خواستگاری خلیفہ نیک آئین تھی۔ اس دعل کے وقت
جس کا اس سورہ مریم میں قصہ مذکور ہے۔ تمنائے عطائے فرزند نہ تھی گو کسی اوقت
میں یہ بھی دعا مانگی ہو۔ اس لئے کہ لفظ وَلِیْ باتفاق اہل لغت بمعنی فرزند ہرگز
نہیں آتا۔ البتہ بمعنی ولیہما درجاشین آتا ہے۔ اور اس پر لفظ مَوَالِیْ مِنْ وَرَایْ
کا قرینہ خود اسی پر دلالت کرتا ہے۔ کہ گو لفظ وَلِیْ مثل لفظ مَوَالِیْ بمعنی متعدّد

آتا ہو۔ لیکن یہاں یہی معنی مراد نہیں۔ کیونکہ موالی کے ساتھ لفظ من ذرا بی جو لگا ہوا ہے۔ وہ بے اس کے کہ موالی سے معنی مذکور ہی مراد ہوں صحیح نہیں ہو سکتا۔ طبعاً کے لئے ترجمہ مرقوم ہے۔

اعنی اپنے بنی اعمام اور اقربا سے اندیشہ ہے یعنی یہ ڈر ہے کہ وہ لوگ منصب خلافت نبوت کے لائق نہیں، اگر وہ لوگ میرے جانشین ہوئے تو ان سے حایت احکام خلافت

تو معلوم۔ الٹی تبدیل اور تحریف کا کھٹکا ہے اور اپنی اولاد ہونے کی توقع نہیں۔ جو یہی امید ہو کہ شاید کوئی فرزند لائق فائق پیدا ہو جائے۔ کیونکہ میری عورت بائجہ ہے۔

اس لئے یہ عرض ہے کہ مجھے ایک ایسا جانشین عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ اور اس کو اپنی مرضی کے موافق کر دے فقط

ظاہر ہے کہ سیاق میں موالی کے معنی بجز قائمان مقام اور خلفاء کے اور کچھ نہیں ہو سکتے تو لاجرم دلی بھی جو اُسی مادہ سے مشتق ہے بمعنی ولیعبدالرحمن جانشین ہی گا۔ اور اگر بفرض محال دلی بمعنی فرزند بھی ہو تو موالی بھی بمعنی فرزند ان ہی ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا کے اول تو کوئی فرزند تھا ہی نہیں۔ دوسرے اگر تھا بھی تو پھر تمنا فرزند پس لئے تھی۔ وراثت کے قابل سب ہی فرزند ہوتے ہیں نیک ہوں یا بد۔

باقی رہا مضمین پسندیدہ الہی ہونے کا۔ اگر بالفرض بفرض محال کوئی فرزند پیدا طوار ہی تھا؟ اور اسی لئے دوسرے فرزند نیک کی طلب گاری تھی۔ تو اُسی کے حق میں یہ دعا کیوں نہ فرمائی؟ اور موالی کے لئے جو دعا نہ فرمائی تو یہ وجہ ہے کہ تمام برادری بلکہ تمام کنبہ کے ساتھ آدمی کو ایسی محبت نہیں ہوتی جو ان کے لئے خواجواہ دعا ایسے تہ دل سے نکلتے۔ یہ معاملہ اگر ہوتا ہے تو اپنی ہی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے کہ اگر اُس کو بد اطوار دیکھے تو خواجواہ جی ترپ جلتے۔ اور اصلاح کی دعا بے اختیار دل سے نکلے لیکن شیعوں کو بھی اتنا تو یقیناً معلوم ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی استدعا کے وقت تک کوئی فرزند نہ تھا نیک نہ بد تو معلوم ہوا کہ موالی سے وہی لوگ مراد ہیں کہ بظاہر ان کے جانشین ہونے کا

دھیان تھا کیونکہ یہ جملہ بظاہر غیر ہی کی طلب گاری کی علت ہے۔ کیونکہ حاصل معنی بظاہر یہ ہیں کہ میرے تو فرزند ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کوئی جانشین ہی سہی۔ اور جب جانشین کوئی غیر ہو تو پھر وراثت مندرجہ آیت بجز وراثت علمی اور وراثت منصبی کے صحیح نہ ہوگی۔

اور یہ بھی نہ ہی جب ولی معنی جانشین ہوا تو وراثت سے وراثت علمی ہی مراد ہوگی وہ اپنا ہو یا بیگانہ۔ اور یہ دعا کچھ مستبعد نہیں کیونکہ جیسے محبان دنیا اور اہل دنیا فرزند اور خلف الرشید کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ارباب علم و فضل اور مرشدان صاحب کمال کو خلیفہ راشد اور جانشین کامل کی تمنا ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں سے تمنائے فرزند البتہ مستبعد ہے۔ اور یہ جو بعضے اور مواقع میں حضرت زکریا سے دعائیں بجائے ولی لفظ ذرّیۃ جو بالفاق معنی اولاد ہے کلام اللہ میں منقول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں کہ سورہ مریم میں بھی اس دعا سے اولاد ہی مطلوب ہو۔ اس لئے کہ مکرر یہ دعا کا اتفاق ہوا ہو۔ سورہ مریم میں جس دعا کا ذکر ہے اس دعا کے وقت تک بسبب اس کے کہ اولاد کی طرف سے مایوس تھے۔ جانشین ہی کی تمنا ہو۔ مگر کچھ تو اس سبب سے کہ مایوس کو اسی چیز کی تمنا ہوتی ہے جس کی طرف سے مایوس ہو۔ نہیں تو مایوس ہی کیوں ہو۔ خداوند کریم ارحم الراحمین قاضی الحاجات مجیب الدعوات نے بوجہ خاطر دعا کی حضرت زکریا ساری تمنا پوری کر دی۔ کچھ اس وجہ سے مد نظر رحمت و قدرت خداوند عطاے فرزند ہوا ہو۔ کہ اس دعا کے بعد قبولیت جب حضرت مریم کو دیکھا ہو کہ بے موسم میوے خداوند کریم ان کو پہنچاتا ہے۔ تو ان کو بھی امید ہوئی ہو کہ مجھے بھی بے موسم فرزند عنایت ہو جائے۔ تو ایسے ارحم الراحمین قدیر کی رحمت اور قدرت سے کیا بعید ہے؟ اس لئے اس وقت خاص فرزند ہی کی دعا کی ہو۔ اور خداوند مجیب الدعوات نے قبول فرمائی ہو۔ بہر حال مکرر دعاؤں کا اتفاق ہوا ہو۔ اول بسبب نہ ہونے سامان تولد کے، فقط جانشین ہی کی دعا کی ہو۔ بعد میں یوں سمجھ کر کہ سامان کی خدا

کو ضرورت نہیں اس بات کی دعا کی ہو کہ جائین بھی ملے تو فرزند ہی ملے۔

لیکن جس آیت میں کلام ہے اُس آیت میں ہم تسلیم نہیں کرتے کہ دعا فرزند ہی اس میں مقصود ہے۔ اور با این ہمہ جس جگہ لفظ ذریت کو ہاں بھی اگر اولاد معنوی یعنی خلیفہ راشد اور مرید کامل اور شاگرد درشید مراد ہو تو کیا قباحت ہے؟ آخر شاگردوں اور مریدوں کو فرزند بول ہی دیا کرتے ہیں۔ اور فرزندنا خلف کو کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارا بیٹا نہیں۔ بلکہ خود خداوند کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو بوجہ ناخلفی یوں کہا کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں۔ اور وجہ ایسی بیان فرمائی یعنی بد اطوار ہونا جس سے یوں معلوم ہو جائے کہ جو نیک اطوار ہیں سو وہ سب بمنزلہ برادر اور فرزند ہیں۔ بلکہ سورہ ہود میں جو حضرت نوح کا قصہ مذکور ہے تو اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب تبعان نوح علیہ السلام کو اہل نوح فرمایا۔ جس سے ایک نفع تو یوں سمجھ میں آئی کہ حضرت نوح کے کنبہ کے لوگ مراد ہیں۔ اس لئے کہ حضرت نوح کو یہ حکم ہوا تھا کہ جب طوفان کی آمد ہو تو تم کشتی میں سب قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا چڑھا لیجو۔ اور اپنے اہل کو چڑھا لیجو۔

اب ظاہر ہے کہ جانوروں کے اور اہل و عیال کے چڑھانے کو تو فرمایا۔ اور سوا ان کے اور مسلمانوں کے چڑھانے کو نہ فرمایا۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ خداوند کریم سے منجملہ محالات ہے کہ جانوروں کے بچاؤ کی تدبیر تو کی جائے اور مسلمانوں کے بچاؤ کا سامان نہ کیا جائے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب مسلمانوں کو اہل و عیال نوح علیہ السلام ہی میں شمار کر لیا ہے۔ القصہ جب متبع اور مرید داخل اہل و عیال ہوئے اور فرزندنا خلف اہل و عیال سے خارج ہوئے۔ تو ہو سکے ہے کہ ذریت سے مرید اور متبع ہی مراد ہو۔ چنانچہ عربیت کے محاورات میں اپنے زمرہ کے لوگوں کو آل اور ذریت کہہ دیا کرتے ہیں۔ مگر انصاف یوں ہی ہے کہ سورہ آل عمران میں جو دعا ذکر کیا علیہ السلام میں لفظ ذریت واقع ہے۔ تو وہاں اولاد ہی مراد ہے۔ پر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سورہ مریم میں بھی لفظ ولی سے اولاد ہی

مراد ہو۔ ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سوائے ایک بار کے اس باب میں حضرات
ذکر یا علیہ السلام نے دعا ہی نہیں کی۔ تو البتہ ٹھکانے کی بات ہے۔

پرمغائرۃ الفاظ یعنی یہاں اور الفاظ کا ہونا اور وہاں اور اس بات پر
شاہد ہے کہ چند بار دعا کا اتفاق ہوا۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ولی کو فرزند پر
معمول کیجئے۔ البتہ اگر بچہ فرزند کے مراد لینے کے معنی صحیح نہ ہو سکیں تو ایک بات بھی ہے
لیکن یہاں تو معاملہ بالعکس ہے۔ فرزند کے مراد لینے میں صحت معنی زائل ہو جائے۔
تو عجب نہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا کہ جملہ کانت امراتی عاقراً اسی طرف مشیر
ہے، اور اگر یوں کہئے کہ اس سیاق سے حضرت ذکر یا علیہ السلام کی یہ غرض تھی
کہ وجہ دعا معلوم ہو جائے اور اس بات کی باز پرس کا اندیشہ نہ رہے کہ اولاد منور
فتنہ ہے۔ اس جلالت قدر پر کیا مناسب تھا کہ ایسی تمنائے نازیبا کو زبان پر لائے
دویم جملہ کانت امراتی عاقراً سے مثل جملہ واشتعل الرأس شیباً جو اپنے بڑھاپے
پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اپنا عجز اور بے سرو سامانی ثابت ہو جائے۔ تاکہ باعث
جوش رحمت اور موجب حرکت قدرت ہو۔ نہ یہ کہ بوجہ بے سرو سامانی قطع امید
مقصود ہے۔ تو قطع نظر اس کے کہ ہم نے جو معنی بیان کئے ان معنی سے عمدہ نہیں تو
کم تو کسی طرح نہیں۔ اور ہم کو لانسلو کہنے کی اس سبب سے پھر بھی گنجائش ہے۔ اس سے
تو بات ہاری ہی نہیں کہ ولی معنی فرزند تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ اس کا مصداق فرزند
ہی کیوں نہ ہو۔

غرض بہر حال یہ لفظ بمعنی ولیعہد اور جانشین ہے۔ اور جب بمعنی ولیعہد اور
جانشین ہوا تو وراثت سے وہی وراثت مقصود ہوگی جو ولیعہد اور جانشین کو
سراوار ہے۔ تاکہ لفظ ولی کے اختیار کرنے کا بھی فائدہ معلوم ہو۔ اور وہ ظاہر
ہے کہ یہی وراثت منصب دورافت علم ہے۔ نہ وراثت مالی بطور معروف۔ جیسے
بدلائل وقرائن مرقوم بالا آیت فہب لی الخ میں وراثت مالی کا مراد نہ ہونا معلوم
ہو چکا تھا۔ اب بشہادت روایت کلینی وقرائن مذکورہ یہی متحقق ہو گیا کہ وراثت

علمی اور وراثت منصب ہی مقصود ہے۔ اور وہ ظہان جو دربارہ مخالف ہر دو
آیت مشار الیہما و حدیث ما ترکنا صدقہ قضا ہر بیان حدیث و کلام اللہ کے دل
میں کھٹکتا تھا پنج و بنیاد سے اکھر گیا۔ اور بہر پنج اطمینان کامل ہو گیا کہ حدیث
مذکورہ کسی آیت کے مخالف ہی نہیں۔ جو اس وجہ سے اس کو غلط کہا جائے۔ اور دشمنان
صدیق اکبر کی بات بنے جو در صورت غلط ہونے حدیث مذکور کے بھی شیعوں کا اہل
سنت پر کچھ دباؤ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بحوالہ اشارہ آیت یوصیکم اللہ اور ہدایت
آیت ما افاء اللہ مرقوم ہو چکا۔ بلکہ اہل شیعوں کو اپنے دن نظر آئے کہ اس حدیث
کے مصدق ان کی حدیثیں بھی نکلیں۔

حدیث لا ثورث حضرت صدیق اور نیز اب اس کی کسی طرح حاجت نہیں کہ جیسے
کے لئے متواتر سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس حدیث کا مخالف نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ ویسے

ہی قطع نظر مخالف ہونے کے) فی حد ذاتہ اس کا صحیح ہونا بھی صحیح ہو جائے۔ مگر
بنظر اثبات و اظہار صدق صدیق اکبر کچھ اس بات میں بھی رقم طرازی ضروری ہے
اس لئے اول تو یہ معروض ہے کہ اس جگہ یہ عذر ہی بیجا ہے کہ اس حدیث کا راوی
ایک ہی شخص ہے۔ کیونکہ یہ بات تو وہاں دیکھی جاتی ہے کہ جہاں خود نہ سنا ہو۔ اور
در صورتیکہ کوئی شخص اپنے کانوں سے کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
سُن لے۔ تو اس کے لئے وہ ایک اپنا سنا لاکھوں کی خبر دینے سے زیادہ ہوگا
کیونکہ راویوں کی کثرت کی جو روایات میں ضرورت ہوتی ہے تو اس لئے ہوتی
ہے کہ جھوٹ ہونے کا وہم جاتا رہے۔ اور جب اپنے کانوں سے سُن لیا تو پھر
جھوٹ کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ جو اس کے رفع دفع کی ضرورت ہو۔

بلکہ لاکھوں کے بیان سے گو یقین حاصل ہو جائے۔ پر ایسی تسلی اور اس قدر
اطمینان نہیں ہوتا جس قدر دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کلکتہ، دلی، لندن، مکہ مدینہ
کے ہونے میں گو ہمیں اس وجہ سے شبہ نہیں کہ ہزاروں لاکھوں بیان کرتے
ہیں لیکن دیکھنے میں جو بات ہے وہ سننے میں نہیں۔ اس لئے مثل مشہور ہے کہ

صحنہ فتنہ کے بودمانند دیدہ

جب دیکھنے کی چیزوں میں یہ حال ہے کہ اوروں کا کہا اگرچہ لکھو کھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے دیکھنے کے برابر نہیں تو سننے کی باتوں میں بھی سمجھنا چاہئے کہ اوروں کی خبر اور روایت اگرچہ لکھو کھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے کان کے سننے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اظہر من الشمس ہے۔ پھر حب حضرت ابوبکر صدیق اپنے کان سے ایک حکم سن چکے ہوں۔ تو ان پر یہ اعتراض کرنا کہ جس روایت پر انھوں نے عمل کیا بجز ان کے اس کا اور کوئی راوی نہیں۔ علماء شیعہ کی کمال سلامت عقل اور خوبی فہم پر دلالت کرتا ہے۔ اتنی بات تو ہر ادنیٰ علی جانتا ہے کہ حدیث نبوی اُس شخص کے حق میں جس نے بلا واسطہ اپنے آپ سنی ہو یقین بلکہ عین یقین ہے۔ اُس کو اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے کسی دوسرے سے سُننے یا نہ سُننے۔

روایت کے درجات ان کے لئے ہیں | اس لئے اجماع اصولیین شیعہ سنی اس بات پر ہے
جنہیں آنحضرت کے سماع و روایت مائل نہیں | کہ خبر کا متواتر اور غیر متواتر اور واحد اور مشہور وغیرہ

ہونا بہ نسبت انھیں لوگوں کے ہے جنہوں نے نبی کو نہ دیکھا نہ اپنے آپ اُن کی بات سنی بلکہ اوروں کے واسطے اُن کی باتیں سنیں۔ نہ کہ اُن کے حق میں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحشم خود دیکھا اور بگوشش خود اُن کے کلام سُنے۔ ایسے لوگوں کے حق میں جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اپنے کانوں سُن لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات حدیث متواتر سے بڑھ کر ہے۔ سو ابوبکر صدیق نے اپنے سننے کے موافق آپ عمل کیا تھا کسی دوسرے کی گردن پر تو چھری نہیں رکھی۔ غرض یہ اعتراض تو بہر حال بے جا۔ ہاں بے اعتقادی کی وجہ سے اُن کی بات کا اعتبار نہ کرو تو یہ دوسری بات ہے۔ اُس کو اس اعتراض سے کیا علاقہ۔

روایت لا نورث کے | مسند ابی حکم کلّموا الناس علی قَدَرِ عَقُولِهِمْ۔ ہم بھی اُسی راہ
راوی دس بار معافی ہیں | چلتے ہیں جس راہ شیعہ چلیں۔ اگر راویوں کی کثرت ہی سے حدیث
صحیح ہوتی ہے۔ اپنے سننے سے نہیں ہوتی۔ تو سننے جیسے روایات کے غلط ہونے

کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے راوی کذاب و مفتری ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس کے معنی مخالف عقل یا معارض نقل صحیح ہوں۔ ایسے ہی صحت روایات کی بھی دو ہی صورتیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے راوی صادق ثقہ دیندار ہوں دوسرے یہ کہ قرآن یا احادیث صحیحہ اس کے معنوں کی موید ہوں۔ اور عقل اس کے مدلول کے مساعد ہو۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے راویوں کی قلت اور روایات صحیحہ کی مخالفت سے بقدر مخالفت اعتبار کی بھی قلت ہوتی ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں ایسے ہی کثرت رواۃ و ناقلان اخبار اور موافقت اخبار و روایات صحیحہ سے بقدر موافقت اعتبار کو بھی ترقی اور زیادتی ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں قسم کے وجوہ صحت اول و دونوں قسم کے وجوہ اعتبار کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

راویوں کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ ایک ابو بکر صدیق ہی اس کے راوی نہیں۔ کوئی دس بارہ راوی ہیں۔ اور وہ بھی ایسے ایسے کہ اُن کے ثانی آسمان و زمین نے بھی کمتر دیکھے سُنے ہوں گے۔ اور یہ جو علماء شیعہ فرماتے ہیں اور مولوی عمار علی صاحب بھی اُسے ہی گاتے ہیں: کہ ابو بکر صدیق نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک سے فقط ایسی روایت کوٹنا کہ جواب بتلایا۔ کہ اس کا راوی ایک آدمی کے سوا یعنی اپنے آپ کے اور کوئی نہ تھا۔ دروغ محض اور سراسر بہتان ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت کی کتابوں میں یہ حدیث بروایت زبیر بن العوام و حذیفہ بن الیمان و ابو دردار و ابو ہریرہ و عباس و علی و عثمان و عبد الرحمن بن عوف۔ و سعد بن ابی وقاص و عائشہ ام المؤمنین و عمر بن الخطاب و ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم جمیع صحیح و ثابت ہوئی ہے۔

اہل شیعہ کے نزدیک حضرات | اگر حضرت عائشہ اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان کا اس باب میں شیعوں کو اعتبار نہ تھا۔ تو حضرت علی اور حضرت حذیفہ کا اعتبار لازمی ہے؟ جو ان کا بھی اعتبار جاتا رہا مگر شیعوں کے نزدیک اس سے زیادہ اور کیا خطا ہوگی کہ حق کہہ گزرے۔ اور وہ بھی ایسے مقدم

میں کہ جس میں کہنے سے مدعیان محبت شیعہ سراپا عداوت کی بات پھسکی پڑی ہے۔ مگر منظر
خیر خواہی شیعہ باتباع آیت کلا نمدا ہوا لاء علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے
کہ سنیوں کی بدگنی کے لئے اپنی ناک اپنے ہاتھ سے کیوں کاٹتے ہو۔ یہ بھی خبر ہے کہ
معصوم کے قول کے نہ ماننے سے شیعہ بھی شیعہ نہیں رہتا بزرگم خود کا فر ہو جاتا ہے۔
در صورتیکہ حضرت علی کا اس روایت میں نام آگیا پھر توجی چاہے یا نہ چاہے
ماننا ہی چاہئے۔

علی ہذا القیاس حضرت حذیفہ کی بات سمجھئے۔ کیونکہ اگر وہ معصوم نہ تھے تو در
باب روایت معصوم ہی تھے۔ اس لئے کہ ملا عبداللہ شہیدی نے اظہار الحق میں
انھیں حضرت حذیفہ کے حق میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی
ہے۔ مَا حَدَّثَكُمْ بِهِ حَدِيثٌ قَصِدْتُ قُوَّةَ يَعْنِيْ جَوْ كَچھ حذیفہ تم سے کہا کرے اُسے
سچ ہی سمجھو اور سچ ہی کہو۔

بخاری شریف میں حدیث اور اگر کسی کو یہ تاثر ہو کہ اور ہوں تو ہوں حضرت علی
لانورث بروایت حضرت امیر اس کے راوی نہ ہوں گے۔ تو اپنی تصدیق کے لئے
اصح الکتاب اہل سنت نے وہ حدیث ناظرین کے پیش نظر کرتا ہوں جس کے بالخصوص
حضرت علی کا نسبت اس حدیث کے راوی ہونا ثابت ہو جائے۔

اخرج البخاری عن مالك بن اوس بن الحداث النصرى ان عمر بن
الخطاب قال يمحضهم من الصحابة فيهم علي والعباس عثمان
وعبد الرحمن بن عوف وزبير بن العوام وسعد بن ابى وقاص
الشهداء كما بالله الذي ياديه تقوم السماء والارض تعلمون
ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا توريث ما تركناه
صدقة قالوا اللهم نعم ثم اتبل علي والعباس فقال
الشهداء كما بالله هل تعلمان ان رسول الله صلى الله عليه
وسلم قال ذلك قالوا اللهم نعم۔

حاصل یہ ہے کہ امام بخاری نے مالک بن ادس بن الحدثان النصری کے واسطے روایت کیا ہے کہ تحقیق حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مجمع میں جس حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عثمان اور عبد الرحمن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تھے یوں فرمایا کہ میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں۔ اور اس خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں۔ کیا تم اس بات کو جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ مقدس ہے۔ اُن سب نے کہا ہم خدا کے رسول کو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔ پھر حضرت عمر حضرت علی اور حضرت عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ کہا کہ میں تم دونوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے؟ اُن دونوں صاحبوں نے فرمایا کہ ہم خدا کے رسول کو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے فقط۔

القسمہ اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت علی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اور وہ بھی یوں نہیں بقسم روایت کیا ہے۔ سو اگر اس روایت کی تسلیم میں یہ عذر تھا کہ اس حدیث کے ایک ہی راوی ہیں خود ابو بکر صدیق۔ اور جس حدیث کا کل ایک ہی راوی ہو اور تفسیر کلام اللہ کی بھی مخالف ہو تو اس پر عمل کرنا ہرگز درست نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ابو بکر صدیق نے کلام اللہ کو چھوڑ کر ایک اپنی ہی روایت عمل کیا۔ تو قطع نظر اس کے کہ جہاں علماء شیعہ مخالفت سمجھتے ہیں وہاں مخالفت نہیں موافقت ہے۔ فقط اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو چکا اور پھر قطع نظر اس سے کہ یہ ایک کی روایت اور زیادہ کی روایت کا فرق وہاں ہے۔ جہاں اس روایت کو مروی عنہ سے اپنے کانوں سے نہ سنا ہو۔ اور دوسری کہ اپنے کانوں سے نہ سنا ہو۔ تو گو یہ سننے والا ایک ہی ہو پر لاکھوں کے بیان سے

زیادہ ہے۔

بفضلہ تعالیٰ یہ عذر بھی مرتفع ہو گیا کیونکہ اس روایت کے اس قدر راوی ہیں کہ کمتر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر ان میں بھی اکثر وہ لوگ جو مبشر با فحنت ہیں اور پھر ان میں سے بھی ایک حضرت علیؑ تو ایسے ہیں کہ اُن اکیلوں کی روایت لاکھوں کے برابر ہے خصوصاً شیعوں کے نزدیک۔ کہ اُن کے نزدیک اُن کی روایت کا غلط ہونا محال ہے۔ چہ جائیکہ موکہ بالقسم ہو۔

بہر حال شیعوں کے طور پر تو اس روایت کی صحت اور اس روایت کا اعتبار کلام اللہ کی صحت اور اعتبار سے کم نہیں۔ پھر ابو بکر صدیق سے کب ہو سکے کہ ایسی روایت پر عمل نہ کریں؟ اور اس کا اعتبار نہ کریں۔ اور اہل سنت کے طور پر خود ظاہر ہی ہے کہ اس کے سب راوی بڑے بڑے حلیل القدر صحابی ہیں۔ ایک کا کہنا بھی ہزاروں کے کہنے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روایت بھی اس درجہ کی صحیح اور معتبر ہے کہ قطعیت میں کلام اللہ کی برابری کرتی ہے۔

کیونکہ یہ جماعت کی جماعت جن کا مذکور ہوا قطع نظر اس کے کہ ایک جماعت کثیر ہے۔ ان میں ایک ایک ایسا ہے کہ اس کا کہا مفید یقین اور خیر متواتر کی برابری کرتا ہے۔ چہ جائیکہ جس کے مجموعہ کو لحاظ کیجئے۔ القصہ بوجہ کثرت روادۃ صدق و دیانت راویان تو صحت و اعتبار حدیث ما تو کناہ صدقہ کا یہ حال ہے۔ کہ اول تو اس روایت کے اس قدر راوی ہیں۔ کہ کمتر روایات کے اس قدر راوی ہوں؟ اور پھر وہ بھی ایسے ایسے حلیل القدر صحابی۔ اور اگر بوجہ موافقت آیات و احادیث دیکھئے۔ تو آیات کا تو یہ حال ہے کہ خود آیت یوحیٰ کو اللہ ہی جس کی مخالفت کے بھروسے علمائے شیعہ بہت کودتے تھے۔ اس کے موافق ہے مخالف نہیں۔ چنانچہ اس طرح سے مرقوم ہو چکا کہ ناظرین کو انشاء اللہ شبہ نہ رہے گا۔

احادیث و آیات میں کوئی تخالف | اور اگر کسی کو اس پر بھی مخالفت معلوم ہوگی تو ایسے نہیں بے عقل سے کہیں وہم ہو جاتا | عقل کے اندھوں سے یہ ڈر ہے کہ جن احادیث سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ اور صدقات کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے اُن اُقتاد کو بدرجہ اولیٰ آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین کے مخالف سمجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا طعن کرنے لگیں کہ نعوذ باللہ خلاف کلام اللہ عمل کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر و فاقہ مشہور و معروف ہے۔ اور تنہا یہ دعا کرنا کہ الہی مجھ کو جیتے جی اور مرتے دم تک مسکین ہی رکھ۔ اور قیامت کو زمرہ مسکین ہی میں اٹھائیو۔ سب کو معلوم ہے۔ اور جب آپ فقیر و مسکین بلکہ فخر الفقراء و المساکین ہوئے تو آپ کو زکوٰۃ و صدقات کا لینا بدرجہ اولیٰ درست ہوا۔ اول یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت انما الصدقات میں کوئی اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کا نہیں پایا جاتا۔ بخلاف آیت یوصیہ اللہ کے کہ اس میں خطاب کا امت کے ساتھ مخصوص ہونا جو بقرینہ غیبت صیغہ یوصی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے مخصوص ہونے پر شاہد کامل ہے۔

اور جب باتفاق فریقین وہ احادیث جو زکوٰۃ و صدقات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ آیت انما الصدقات کی مخالف نہ ہوئیں۔ بلکہ موافق ہوئیں تو حدیث ما ترکناہ صدقۃ بدرجہ اولیٰ موافق ہوگی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم میراث سے مخصوص ہونا یا سورۃ اعنی شروع سورت سے تو معلوم ہوتا ہی تھا چنانچہ مرقوم ہو چکا ہے۔ خود آیت یوصیہ اللہ سے بھی مفہوم و معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف آیت انما الصدقات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے حکم سے مخصوص ہونا اگر معلوم ہو تو تکلف و منہوم من یتلک فی الصدقات سے جو انما الصدقات سے بغا ملہ چند آیت مقدم ہے معلوم ہو کیونکہ حاصل اس کا یہ ہے۔ ”کہ بعض منافقین میں سے وہ لوگ ہیں کہ اسے پیغمبر تجھ پر زکوٰۃ یا نسطے میں طعن کرتے ہیں۔ اگر انھیں بھی مل جائے تو راضی ہو جائیں اور نہ ملے تو غصہ میں بھر جائیں“ سو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا منصب تقسیم زکوٰۃ تھا۔ پھر جو انہما الصدقات فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ حق فقرار و مساکین ہے۔ منافقین کے باپ کا اس میں اجارہ نہیں۔

القصة جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب تقسیم اور فقرار اور مساکین کے مصرف ہونے اور منافقین کے مستحق نہ ہونے کو لحاظ کیا جائے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے خارج ہیں اور یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص کسی مسکین کو کچھ دے کر یوں کہے کہ اس کو مساکین پر تقسیم کر دینا اغنیا کو نہ دینا تو گو وہ مسکین بھی جس کو وکیل تقسیم کیا ہے مسکین ہے لیکن بحکم شہادت ہم عرف وہ شخص اس حکم سے خارج ہے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت و اعلموا انہما غنمتم من ثمنی میں اور آیت ما فاء اللہ میں فللرسول شمول کہنے کی ضرورت ہوئی القصہ آیت انما الصدقات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہونا فقط ایک آیت و منہم من یلزمک فی الصدقات سے جو جملہ منفصل اور قرینہ خارجی ہے بدقت اور بتکلف سمجھ میں آتا ہے۔ اور آیت یوصیکم اللہ سے آپ کا مخصوص ہونا بتکلف قرینہ داخلی خارجی دونوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تو اگر وہ احادیث جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے آیت انما الصدقات کے مخالف نہیں موافق ہیں۔ تو حدیث ما ترکناہ صدقة آیت یوصیکم اللہ سے زیادہ تر موافق ہوگی۔ علی ہذا القیاس آیت وورث سلیمان داؤد اور آیت فہب لی من لدنک سے بھی حدیث لا نخت ما ترکناہ صدقة مخالف نہیں موافق ہے۔ کیوں کہ ان آیات میں میراث علمی و میراث منصبی مراد ہے میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ بدلائل واضح واضح ہو گیا اور حدیث ما ترکناہ صدقة میں میراث مالی مراد ہے میراث علمی مراد نہیں۔ باقی یہی احادیث سے موافقت ہو اس کا حال یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک تو یہ حدیث ما ترکناہ صدقة اس درجہ کو صحیح ہے کہ اس کی صحت کے دریافت کرنے کے لئے کسی اور حدیث صحیح کی موافقت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اور حدیثوں کے صحت کی میزان اور معیار

اس کو کہئے تو زیبا ہے۔ باایں ہمہ یہی حدیث کئی طریقوں سے یعنی سندوں سے مروی ہے۔ اور وہ سب کی سب صحیح ہیں۔ اور یہی معنی ہیں احادیث صحیحہ کے موافق ہونے کے۔

کیونکہ حدیث کی صحت باعتبار سند صحت کے ہوتی ہے اور حدیث کا تعدد باعتبار تعدد سند کے ہوتا ہے۔ اگر متن یعنی ایک عبارت کئی سندوں سے مروی ہو تو اس حدیث کو پھر ایک حدیث نہیں کہتے ہیں۔ اُس کی تعداد بمقدار تعداد اسانید ہوگی۔ اور جب وہ ایک حدیث نہ ہوئی بلکہ متعدد ہوئیں تو باایں وجہ کہ متن ایک ہے ایک دوسرے کے موافق ہوگی۔ اور چونکہ حدیث ما ترکناہ صدقہ کا یہی حال ہے بلکہ بعض بعض الفاظ متن میں بھی فرق ہے گو معنی باہم موافق ہی ہوں۔ تو بیشک اُن کو ایسی چند حدیثیں کہیں گے کہ ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ اور پھر جب سب سندیں صحیح ہوئیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث احادیث صحیحہ اہل سنت کے موافق ہے۔

ردایات شیعہ سے لا نورت کی تائید | مگر اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس کی صحت میں اگر

شک ہو تو شیعوں کو ہو۔ اس لئے لازم یوں ہے کہ احادیث صحیحہ اور روایات معتبرہ شیعہ اس کی صحت پر شاہد لائے۔ لہذا معروض خدمت علمائے شیعہ بلکہ عوام و خواص امامیہ یہ عرض ہے۔ کہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک کتاب کافی کلینی سے بڑھ کر کتب احادیث میں کوئی کتاب معتبر نہیں۔ سو وہ علامہ کلینی ہی کی روایت تھی جو بروایت ابوالبحری امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہوا ہے۔

إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَذَلِكَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُورَثُوا وَفِي تَسَخُّفٍ لَمْ يَرِثُوا دُرُهَا وَلَا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا أَوْ رِثُوا أَحَادِيثَ مِنْ أَحَادِيثِهِمْ فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِنْهَا فَقَدْ أَخَذَ بِمَحْظُوفٍ وَأَفْرَ.

اور چونکہ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا ہے تو مکرر ترجمہ کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پر اتنا لکھنا ضروری ہے۔ کہ اس روایت میں بنسبت روایت صدیق کے کوئی بات کم نہیں بلکہ اتنی بات زیادہ ہے کہ اس روایت میں حضرت امام ہمام امام جعفر صادقؑ نے

کے صرف میں آتی تھی۔ ہم کو تو ان معنی کے کہنے میں فقط تصدیق حدیث حضرت امام جعفر صادق مد نظر ہے۔

سواگر آیت وَقَدْ نَفِیْتُ تَحْتَکَ کے وہ معنی نہیں جو ہم نے عرض کئے تو شیعوں ہی کو دشواری ہے۔ ہمیں کیا غرض؟ مکانات بھی وقت وفات آپ کے نہ تھے۔ ہاں البتہ کباس اور مرکب کے باب میں کھٹکا باقی رہا۔ مگر قوت ایمان کی بات تو یوں ہے کہ حضرت امام کے اس حصر کو کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ چھوڑا ہی نہیں، صحیح سمجھ کر ہرگز متاثر نہ ہو جائے اور یوں سمجھے کہ گو بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء مذکورہ کو دنیا میں چھوڑا۔ لیکن شاید کسی کو اپنے جیتے جی دے گئے ہوں۔ اور پھر جو ان کے پاس موجود تھیں تو بوجہ عاریت ہوں۔

انقصہ اپنی سمجھ میں نہ آنے کے باعث حضرت امام کی بات کی تکذیب نہ کیجئے، ہاں اپنی سمجھ اور عقل کی تغلیط کیجئے۔ لیکن اطمینان قلب مومنین کے لئے یہ اشارہ مرقوم ہے کہ کثر یورثوا کے یہ معنی نہیں کہ آپ دنیا میں کچھ چھوڑ ہی کر نہیں گئے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ میراث میں نہیں چھوڑ گئے۔ سو اس صورت میں بجز اس کے نہیں بن پڑتی کہ یہ روایت جس کے مادی حضرت ابو بکر صدیق ہیں، یعنی حدیث لَا نُورِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَہُ صحیح ہو اور حضرت امام نے بوجہ واقفیت اس وصیت کو حصر کر کے یہ فرما دیا ہو، کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ نہیں چھوڑا۔ بہر حال روایت حضرت امام، امام جعفر صادق روایت حضرت صدیق اکبر سے اس بات میں کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا کچھ کم نہیں، بلکہ بہر نہج زیادہ ہے۔ اول تو آپ نے بطور حصر یوں فرما دیا کہ انبیاء نے بجز احادیث میراث کے لئے کچھ چھوڑا ہی نہیں،

صادق اور صدیق کی روایت کا فرق | حدیث ابو بکر صدیق میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت امام کے حصر سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول تو یہ کہ یا تو انبیاء علیہم السلام نے کچھ چھوڑا ہی نہیں یا چھوڑا ہے تو وہ میراث کے قابل نہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے میراث میں احادیث کو چھوڑا ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق کی روایت سے فقط اشاری معلوم ہوتا ہے کہ

اموال متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں۔ معہذا حضرت ابو بکر صدیق کی حدیث میں اس دعوے کے ساتھ کہ متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں کوئی دلیل نہیں۔ اور حضرت امام نے اس کی دلیل بھی فرمادی ہے اور اپنے دعویٰ کو موحہ کر دیا۔ سو سنیوں کی طرف تو آپ کو اطمینان ہی تھا۔ اس وجہ کا طرہ جو ساتھ لگایا، تو اسی وجہ سے لگایا ہو گا کہ حضرات شیعہ کی طرف سے آپ کی خاطر جمع نہ تھی، ان کے نفاق سے عیاں تھا کہ میری بات سیدھی انگلیوں حضرت شیعہ ماننے والے معلوم نہیں ہوتے اس لئے اپنے دعوے کو موحہ کر کے بیان فرما دیا تھا۔

لیکن آفرین ہے شیعوں کو کہ حضرت امام کی بات کے نہ ماننے سے گواہی مان ہی خاک میں مل گیا۔ مگر کیا امکان جو اپنیوں سے باز آجائیں، اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جلتے ہیں۔ خیر خداوند کریم ہی ان کو سمجھے کہ یہ پیر کے ز فقیر کے، نہ اصحاب کے نہ اماموں کے۔۔۔ بالجمہ جائے شرم ہے کہ جن کی آڑ میں یہ اصحاب کرام پر طعن کرتے تھے۔ وہ خود بمصیفاً اصحاب ہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست۔۔۔ وائے بر حال شیعہ کہ اصحاب کو برا کہہ کے تو نور ایمان ہی کھویا تھا۔ پرائمہ کی بات نہ ماننے سے ایمان ہی کھو دیا۔ کیونکہ بزعم شیعہ منکر قول ائمہ کا کافر ہے خصوصاً جب کہ ایسی معتبر کتابوں کے واسطے سے معلوم ہو جائے، جن کا نام کافی کلینی، القصہ حدیث ماتر کناہ بشہادت حدیث کلینی مذکور جو صحیح ہے اصح ہے۔

(کلینی کی دوسری مؤید حدیث) معہذا ایک اور حدیث کلینی ہی اس کے مؤید ہے چنانچہ وہ بھی مرقوم ہو چکی۔ لیکن بنظر احتیاط اسے بھی مکرر لکھے دیتا ہوں۔ مَدَوِی الْکَلِّیْنِ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ إِنَّ سُلَيْمَانَ وَرِثَ دَاوُدَ وَأَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِثَ سُلَيْمَانَ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا، اس لئے یہاں اسی قدر مرقوم ہونا مناسب ہے کہ اس سے اتنی بات معلوم ہوئی ہے کہ انبیاء کی میراث، میراث علم ہے، باقی رہا دلائل عقلیہ اور قرائن عقلیہ سے حدیث مذکور کا صحیح ہونا سو اس کا بیان بھی ادب ہو چکا ہے، مگر بطور یاد دہانی فقط اشارتاً یہ بات مرقوم ہے کہ اول تو انبیاء اپنی قبور میں زندہ موجود ہیں اور زندہ کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی، ہاں اگر وہ اشیاء ان کے کارآمد نہ رہیں اور اس لئے

وہ ان اشیاء کو کسی موقع میں صرف کرنے کو کہیں۔ تو ان کے خدام کو لازم ہے کہ ان اشیاء کو اسی طرح صرف کر دیں۔ سو در صورتیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو باتفاق حیات اپنی ہیں گوشہ قبر میں زندہ موجود ہوں۔

اور پھر دلائل بھی اس پر شاہد ہوں۔ چنانچہ اوراق سابقہ میں مذکور ہوئے۔ تو میراث تو آپ کے متروکہ میں جاری نہ ہوگی۔ لیکن آپ کے خلیفہ کے ذمہ جو بمنزلہ کارکن نبوی ہے کیونکہ خلیفہ اُسے ہی کہتے ہیں، یہ بات لازم ہوگی کہ درباب اموال نبوی جو یاے اشارات نبوی سے سوچو نہ اشارہ نبوی حضرت ابوبکر صدیق کو جو خلیفہ راشد تھے۔ اس باب میں بایں طور معلوم ہوا کہ فاتر کتاہ صدقہ ہو تو ان کے ذمہ اُس کی تکمیل لازم پڑی، اور کوئی ناقد شناس باوجود دلائل مسطورہ سابقہ حیات نبوی کو نہ مانے تو ان کے لئے دوسری ہدایت عقلی موجود ہے، اگر ہدایت پر آنا ان کو منظور ہو، وہ یہ ہے کہ انبیاء خدا کے سامنے اپنے آپ کو مالک نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کیونکر نہ کہیں کہ ہمارے متروکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ ہماری ملک ہی نہیں، خدا کی ملک ہے۔ ہمارے پاس فقط مستعار تھا۔ جب ہم ہی نہ رہے تو عاریت کہاں رہی؟ اب لازم یوں ہے کہ جیسے یہ خدا کا مال ہے۔ خدا ہی کی راہ میں صرف ہونا چاہیے۔

مگر چونکہ یہ بات سابق میں مشروحاً بیان ہو چکی ہے تو یہاں اس قدر بھی بہت ہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فدرک نہ دینا یا بوجہ ظلم و عناد ہو یا بوجہ حقانیت، مگر چونکہ حضرت صدیق اکبر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس سے کچھ نہیں دیا اور علیٰ ہذا القیاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی نہیں دیا۔ حالانکہ موافق قانون میراث یہ دونوں بیبیاں بھی وارث تھیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات میں سے تھیں، بلکہ ان سب میں معزز اور ممتاز، تو معلوم ہوا کہ یہ نہ دینا محض اتباع امر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ بوجہ عناد و ظلم و فساد نہ تھا، ورنہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا پر ظلم کرتے تو کرتے اپنی بیٹیوں پر نہ کرتے۔

بارک الدنیا اور زائد غاصب نہیں ہو سکتا | معہذا جو لوگ غضب کرنے والے ہوتے ہیں وہ لوگ بندہ ہواؤ ہوس ہوتے ہیں تبارک الدنیا اور زائد نہیں ہوتے جو لوگوں کے اموال چھین تو لیں پر بوجہ زہد و تقویٰ و ترک دنیا اپنی خواہشات نفسانی کو مار کر بیٹھ رہیں، اور اسے ہاتھ نہ لگائیں، پھر جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک کو نہ چھڑا، اسے ہاتھ نہ لگایا، نہ اپنے خرچ میں لائے، نہ اولاد کو نہ اہل و عیال کو دیا، تو کیا وجہ پیش آئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فدک کا نہ دنیا فقط اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے باب میں ایک حکم ناطق سن چکے تھے۔ اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ابو بکر صدیق کی نسبت تو شاید شیعیان فریب باز حکم المثل یقیس علی نفسہ فریب کا بھی احتمال کریں۔؟

ترکہ نبوی میں تمام اہلیت کا عمل | حضرات ائمہ اور اہل بیت کی طرف تو یہ گمان نہ ہو گا۔ سوان کا حال سنئے کہ حضرت امیر المومنین علیؑ سے لے کر آخر تک سب اس بات میں شریک ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ جب ان کے ہاتھوں پڑا تو حضرت عباس اور ان کی اولاد کو اس میں دخل نہ دیا، ان سب کو نکال باہر کیا۔ اور ازواج مطہرات کا بھی حصہ نہ دیا۔ حالانکہ نصف ترکہ کے یہ دونوں فریق مالک ہوتے تھے۔ پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی تھی۔ تو بزرگان اہلیت کیوں ابو بکر صدیق کی راہ ہو لئے؟ ابو بکر صدیق اگر مرتکب ظلم شیعہ اور جور قبیح ہوئے تھے تو چند ان مستعبدہ تھے۔ لیکن ان بزرگواروں کو جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور اہلسنت کے نزدیک محفوظ ہیں کیا بلا پیش آئی کہ سب کے سب لئے ظلم عظیم کے روادار ہوئے۔

اس لئے کہ باجماع اہل سیر و تواریخ و باتفاق علماء حدیث ثابت اور محقق ہے کہ متروکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر اور فدک وغیرہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت علیؑ اور حضرت عباس کے قبضہ میں تھا۔ لیکن حضرت علیؑ نے انجام کار حضرت عباس کا قبضہ اٹھا دیا، فقط انہیں کا قبضہ رہا، پھر حضرت علیؑ مرتضیٰ کے بعد حضرت امام حسنؑ کے قبضہ میں رہا، ان کے بعد حضرت امام حسینؑ کے قبضہ میں رہا، بعد ازاں حضرت امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن کے تحت تصرف رہا۔ دونوں اسے لیتے دیتے تھے۔

کیا۔ آئندہ سوائے مردمان فہیدہ اور عاقلان سنجیدہ کے کسی سے کلمہ خیر کی توقع نہ تھی، بلکہ انہی
عقل کے دشمنوں سے یہ اندیشہ تھا کہ یوں کہیں گے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی وفات کے ہوتے ہی یہ آنکھیں بدل لیں کہ حضرت فاطمہ کا بھی لحاظ نہ کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ
کا ترکہ وہاں بیٹھے۔ چنانچہ بلا کم و کاست ہی طہور میں آیا غرض کہ کسی طرح کی منفعت کی امید تھی
اگر تھی تو تمام عمر کی سوختگی کی امید تھی۔

القصد گو حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی وارثان نبوی کو متروکہ بنوی بوجہ تعمیل
ایمان نبوی نہیں دیا۔ اور ائمہ اہلبیت نے بھی بوجہ مذکور متروکہ بنوی وارثان نبوی کو
نہیں دیا۔ لیکن ابوبکر صدیقؓ کا نہ دینا ایک مجاہدہ عظیم تھا۔ اور ائمہ اہلبیت کا نہ دینا فقط نہ
دینا ہی تھا۔ خصوصاً جب کہ نیاز مندی و اخلاص و محبت صدیق اکبرؓ اور حقوق اہلبیت
خصوصاً حضرت فاطمہؓ زہراؓ کو لحاظ کیجئے۔ اور پھر اس پر حضرت فاطمہؓ کے ایک دفعہ بمقتضائے
بشریت ناخوش ہو جانے کو دیکھئے تو رموز شناسان طریقہ پر واضح ہو جائے گا کہ ایسے وقت
میں پابند حکم نبوی رہنا ایسے ہی کامل الایمان مستقیم العقل سرایا اتباع نبوی کا کام ہی جیسے
ابوبکر صدیقؓ رضی اللہ عنہ، لیکن شیعوں کی عقل کی آنکھ پھوٹ گئی ہے حق و باطل کی تمیز کیونکر کریں گے
مگر اس میں ابوبکر صدیقؓ کا کیا قصور؟

گر نہ بیند برفد شیر چشم ۛ چشمہ آفتاب را چہ گناہ
جیسے اندھے کو اندھیرا تو اندھیرا تو بھی اندھیرا ہی نظر آتا ہے، ایسے ہی شیعوں کو بسبب
عداوت کے اندھے ہو جانے کے باعث خوبیاں بھی برا ٹھہرائی نظر آتی ہیں۔
چشم بداندیش کہ بر کندہ ہاد ۛ عیب نماید نہرش در نظر
الحاصل بقرائن عقلیہ واضح و لاری ہو گیا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا نہ دینا فقط بوجہ
اتباع امر نبوی تھا، اور یہ حدیث اعلیٰ لا تخریث ما تروکناہ صدقۃً صحیح بلا غبار ہے۔
سوائے اتباع نبوی اور پیروی حدیث مذکور کسی قسم کا احتمال ان کی جانب نہیں ہو سکتا
اور سابقاً بجمہت کثرت رواۃ اور صدق و دیانت جملہ راویان و نجوم قرائن نقلیہ اس حدیث
کا اعتبار اور اس کی صحت معلوم ہو چکی تھی۔ تو اب کسی کو دربارہ صحت حدیث مذکور کسی وجہ سے مجال

دم زدن باقی نہ رہی۔ اگر کسی کو کچھ حوصلہ ہو تو بسم اللہ اور یہ بھی مستحق ہو گیا کہ مولوی عمار علی صاحب کا در باب صحت حدیث مذکور یوں رقم نہ مانا کہ۔

»اول تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیٹیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو

نہیں پہنچتا۔ تم دعوائے نہ کرنا۔ اور جو خدا کا حکم ان کے واسطے تھا۔ اس کو ان سے چھپا

رکھا۔ اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا۔ اس

کے کان میں کہ کیا، اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا»

ایک سخن ابلہ فریب یا گفتگوئے ابلہانہ ہے۔ کیونکہ جسے وہ خلاف قرآن کہتے ہیں وہ

حقیقت میں موافق قرآن ہے۔ چنانچہ مفصل معلوم ہو چکا ہے سمجھ نہ ہو تو کسی کا کیا تصور؟

مصرع۔ سخن شناس نہ دہلے برا خطا اینجا است

اور جہاں وہ یوں کہتے ہیں کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا» وہاں دس بارہ

سے تو روایت موجود ہے، منجملہ رواۃ حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ

بھی ہیں، اور خدا جانے اور کتنوں نے سنا ہو گا؟ کہ ان کو روایت کا اتفاق ہی نہ ہوا لیکن

مولوی صاحب کو خبر نہ ہو تو یہ ہمارا ذمہ نہیں کہ انہیں خبر کیوں نہ ہوئی، وہ یوں ہی بے خبری میں

پڑے ہیں۔ یادیدہ و دانستہ فریب کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا، اگر بسبب بے خبری کے لکھا ہے۔ تب تو قابل تنبیہ ہے

کہ کسی چیز کی اگر کسی کو خبر نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ وہ چیز واقع میں نہ ہو اگرے،

مولوی صاحب کو موجودات اور واقعات میں سے کس کس کی خبر ہے خصوصاً موجودات

عالم غیب اور واقعات قرون گذشتہ کی ہرگز کچھ اطلاع نہیں، پر اس وجہ سے کہ وہ معلوم

نہیں۔ غیر واقع نہیں کہلائی جائیں۔

ہاں مولوی صاحب کے ذہن و ذکاوت سے البتہ امید ہے کہ دم کلا و جود الا ماً

شاهدت بھراٹھیں» اور نشہ کی ترنگ میں یہ ترائے زیب زبان و نقش و قرطاس ہوا ہے

تو اس کا جواب دکان مے فروشان پر ملے گا، ہاں اگر حضرت عباس اور حضرت عائشہ

وارث نہ ہوتے تو یوں بھی کہنا جائز تھا کہ اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا، اور حضرت علی ہر چند وارث نہ تھے۔ لیکن اول تو وارثوں سے زیادہ مقرب تھے دوسرے وہ حضرت فاطمہ کے جو وارث تھیں وارث تھے یعنی ان کے خبر گیران اور ان کی طرف سے لینے دینے والے ہی تھے۔ سو بہ نسبت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سنانے کے ان کا سناؤنا اور ان کا کہنا زیادہ تر مفید تھا، علاوہ بریں اس قسم کے مضمون جو موت کی خبر دیں اقربا کے حق میں موجب رنج ہوتے ہیں خصوصاً بیٹی کہ اس کو بہ نسبت فرزند اور اکثر اقربا کے والدین کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے، تو اگر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم موافق رائے ناقص مولوی عمار علی صاحب حضرت فاطمہ زہراؓ سے یہ مضمون فرماتے، کہ تمہارے لئے حکم خداوندی یوں ہے کہ میری وفات کے بعد میرے ترکہ میں سے کچھ نہ لینا، تو کچھ فائدہ تو ہرگز نہ تھا۔

اس لئے کہ جو کچھ ان کے کہنے سے کام چلتا۔ اس سے زیادہ حضرت علی کے کہنے سے کام چلتا نظر آتا تھا، اور ان سے کہہ ہی چکے تھے مگر چونکہ یہ مضمون متضمن خبر وحشت اثر وفات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھا تو مفت موجب آزد و گی خاطر مبارک حضرت زہراؓ ہوتا۔ سو ایسا کونسا حضرت زہراؓ کا آزد و کردہ کرنا ثواب کھایا جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہراؓ کے دشمن تھے کہ بے وجہ اور بے سبب ان کو سب سے پہلے رنج و غم میں ڈال دیتے، آپ خود جانتے تھے کہ اگر بالفرض والتقدیر میری وفات کے بعد حضرت زہراؓ بے اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ صلیق سے، جو آپ کے نزدیک بالیقین خلیفہ ہونے والے تھے، طالب میراث ہوں گی اول تو ابو بکر صدیقؓ دین میں ایسے سست نہیں کہ کسی کے پاس لحاظ سے حق بات زبان پر نہ لائیں، اور پھر حضرت زہراؓ ایسی ناحق پرست نہیں کہ باوجود زبان صدیق صادق سے حدیث نبوی سن لینے کے ہٹ دھرمی کریں اور طلب میراث سے باز نہ آئیں

اور اگر بمقتضائے بشری جیسے حضرت مولائے حضرت بارونؓ پر بے خطا بوجہ غلط فہمی معترض ہوئے تھے۔ اور ان کو تصور وار سمجھا تھا، مقدمہ میراث میں حضرت زہراؓ کو

حضرت صدیق اکبرؓ پر کچھ اعتراض ہوگا؟ اور ان کا یہ عذر کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ لَّا تُؤْخِذُ فَا تَرْكَاهُ صَدَقَہُ بوجہ غلط نہیں جو مرتبہ بشریت کو لازم ہے، اور انبیاء بھی اس سے چھوٹے ہوئے نہیں پایہ اعتبار سے ساقط ہوگا۔ تو حضرت علیؓ موجود ہیں وہ اس حدیث کو سنا دینگے، القصد مولوی صاحب کا یہ گانا، کہ کسی سے اپنے وارثوں میں سے نہ کہا، سر اسر دروغ و بہتان ہے۔

آنحضرت نے سیدہ کو یہ حدیث نہ بتائی۔ کیونکہ اور یہ جو اپنے نزدیک اس نہ کہنے کو خدا کے وہ بزرگ شیعہ علم غیب جانتی تھیں، حکم کا چھپانا سمجھتے ہیں۔۔۔

اس کو بجز اس کے کہ دیوانوں کی بجو اس کہیے اور کیا کہیے؟ اول تو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بظاہر چھپانے کی کوئی صورت ہی نہیں، اس لئے کہ وہ امہ اہلبیت سے کسی بات میں کم نہیں، جب امہ کو علم ماکان و علم مایکون ہو تو حضرت فاطمہؓ کو بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ کیونکہ ان کا رتبہ اکثر امہ سے زیادہ ہے۔ کم نہیں۔ بلکہ یوں کہیے تو زیبا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہنے کی حاجت ہی نہ دیکھی، کہیے تو اس سے جسے بے کہے معلوم نہ ہو سکے اور اگر ماکان و مایکون میں سے احکام کو مستثنیٰ رکھے یا حضرت فاطمہؓ زہراؓ کو دربارہ علم امہ سے کم کہیے۔ تو اسے چھپانا نہیں کہتے، کہ ایک گروہ میں سے دو چار کو بتلادیا اور مایکون کو نہ بتلایا، سب جانتے ہیں کہ جب بات دو چار کے کانوں میں پڑتی ہے۔ پھر چھپی نہیں رہتی۔ نقل مشہور ہے۔

ع۔ نہاں کے مانناں رازے کز و سازند محفلِ حَا

خاص کر علم دین کی باتیں کیونکہ در باب درس و تدریس و تبلیغ علم و احکام جو کچھ فضائل اور تاکیدیں منقول ہیں۔ سب کو معلوم ہیں۔ پھر کیا امکان جو ایسی بات چھپی رہے؟ آخر جو احکام خداوندی نازل ہوتے تھے۔ سرور کائنات علیہ افضل الصلوات و علی آلہ کون سے خانہ بخانہ ہر فرد بشر کے کان میں کہتے پھرتے تھے؟ یہی ہوتا تھا کہ ایک دو سے آپ نے کہا۔ انہوں نے اور دوں سے، اسی طرح آگے پیچھے سب کو خبر ہو جاتی تھی اور اب تک یو نہی تدریج اتنیوں کو خبر ہوتی جاتی ہے۔

ہاں اگر آپ سب کچھ دیتے کہ دیکھو خبردار اور کسی کو اطلاع نہ ہو، تو البتہ یوں کہہ سکتے کہ حکم خداوندی چھپا رکھا۔ علاوہ بریں عقل کی جوابات تھی، وہ آپ کو گزریے، یعنی حضرت صدیق اکبر سے جو کارکنِ خلافت تھے یہ بات واشگاف فرمادی اور ظاہر ہے کہ دنیا لینا دونوں ہی کا کام ہے، دینے والے کا بھی اور لینے والے کا بھی۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام سے ہٹ بیٹھے تو دوسرے سے کیا ہو سکتا ہے۔ دینے والا اگر دے نہیں تو لینے والا کیوں کر لے۔ اور لینے والا اگر لے نہیں تو دینے والا کس طرح دے۔ پھر لینے دینے والوں میں سے اگر ایک کو بھی روک دے تو جس چیز کا بدستور رکھنا منظور ہو وہ بدستور رہے گی، سو فقط ابوجبر صدیق کے دینے سے روک دینے میں مطلب حاصل تھا اس لئے حضرت فاطمہ سے کہنے کی کچھ ضرورت نہ ہوئی۔

صرف صدیق سے حدیث بیان کرنے کی حکمتیں [ہاں ہی رہی یہ بات کہ مطلب یوں بھی حاصل ہو سکتا تھا کہ حضرت فاطمہ زہراؑ ہی کو یہ حدیث سنا دیتے اور حضرت صدیق اکبر سے یہ بات نہ فرماتے۔ بلکہ حصول مقصود اس صورت میں بوجہ احسن ہوتا کیونکہ اتنا جھگڑا ہی (جواب ہوا) نہ ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی حصول مقصود کی ایک یہ بھی صورت تھی لیکن اس صورت میں جواب ظہور میں آئی چند مصلحتیں ایسی ساتھ لگی ہوئی تھیں، کہ درجہ مرقومہ ہرگز نہ تھیں۔

پہلی حکمت [تفصیل اس کی یہ ہے کہ اول تو ایسی وصیتوں کے صدیق اکبر سے فرمانے میں صحت خلافت صدیق اکبر کی طرف اشارہ مد نظر تھا تا کہ حاضرین محفل سمجھ جائیں کہ یہ وصیتیں جو صدیق اکبر کو کی جاتی ہیں، تو انہیں اپنا جانشین کرنا اپنے مد نظر ہے۔ کسی مصلحت سے تبصریح نہیں فرماتے تو کیا ہوا، اور یہ کچھ نیا ہی اشارہ نہیں ایسے ایسے بلکہ اس سے بڑھ کر اور بہت سے اشارے حضرت صدیق اکبر کی خلافت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلکہ خود کلام ربانی میں پائے جاتے ہیں۔

اور اس سے مولوی عمار علی صاحب کے اس سخن نامعقول کا بھی جواب نکال آیا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنبی شخص سے کہ لے کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم کی وراثت میں کچھ دخل نہ تھا۔ یہ فرمایا، کہ لا خورث ما ترکنا صدقۃ۔ اور حاصل جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ میرے بعد سررشتہ اختیار صدیق اکبر کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس لئے جو امور ضروریہ خلافت قابل وصیت ہیں۔ وہ انہیں سے کہنے چاہئیں، تاکہ اس کے موافق کار بند ہو کر انداز خلافت کو ہم رنگ نبوت کریم دوسرے ایسی صورت میں فقط لینے والے کو منع کرنے میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ مبادا بطمع نفسانی حکم خداوندی کو چھپالے، گو بوجہ محفوظیت یا معصومیت حضرت زہراؑ سے اس موقع خاص میں یہ ڈرنہ ہو۔ مگر قواعد کلیہ شرعیہ میں خاص خاص امور کا اعتبار نہیں ہوتا اسی واسطے اگر کسی قضیہ میں کوئی ولی کامل کہ اس کی ولایت اور صدق و دیانت پر تمام عالم متفق ہو، تنہا ثبوت دعوائے مدعی کی گواہی دے، تو گویہ یقین کامل ہے کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بولتا۔ ہرگز قبول نہ ہوگی۔

اور اگر ایسے دو آدمی کہ بظاہر پیرایہ عدالت رکھتے ہوں گو قاضی کے نزدیک بھی وہ دونوں مل کر صدق میں اس ایک کے برابر نہوں، بلاتا مل مقبول ہوگی، وجہ اس کی یہی ہے کہ قواعد کلیہ شرعیہ کو بایں وجہ کہ جو ان قواعد کے لحاظ سے مقصود ہے۔ کسی خاص موقع میں ان کے لحاظ نہ کرنے میں وہ مقصود بوجہ احسن اور بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے نہیں چھوڑ سکتے۔ الحاصل گو حضرت فاطمہ کو حدیث مذکور کے سنادینے میں برعم شیعہ مقصود اصلی بہ نسبت اس کے زیادہ تراجمی طرح سے حاصل ہو جاتا کہ صدیق اکبر سے فقط کہہ دیا لیکن قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ ایسے موقع میں دینے والے کو روکا جائے نہ لینے والے کو۔ اور بایں ہمت کہنا ہی غلط ہے۔ کہ اگر حضرت فاطمہ کو یہ حدیث سنا دیتے تو جھگڑا نہ ہوتا۔ اور مقصود بوجہ احسن حاصل ہو جاتا۔ کیونکہ اول تو جھگڑے کا ہونا ہی مسلم نہیں۔ چنانچہ انشاء اللہ معلوم ہو جائے گا، یہ نقطہ شیعوں کی شرارت ہے کہ افسانہ ہائے بے اصل کو کوچہ و بازار میں گاتے پھرتے ہیں۔ عاقلانہ کلام جویوں ہوا ہو۔ دوسری حکمت دوسرے اگر کسی قسم کی فی الجملہ انبیاء میں شکر رنجی دو چار روز کے لئے ہو بھی گئی۔ تو اسے جھگڑا نہیں کہتے۔ ایسے ایسے امور میں ہو ہی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ

اور حضرت ہارون کا قصہ کس کس نے نہیں سنا، معہذا جورج کہ قریب ہی مبدل مصل ہو جائے۔ اس کے ہونے کا کچھ اعتبار نہیں۔ اس کو عرف میں کان لثم یکن سمجھتے ہیں، ایسے رنجوں کا اگر کھٹکا بھی ہوتا ہے۔ تو پیش بندی نہیں کیا کرتے۔ سوہا میں لحاظ گو نہ صدیق اکبر ایسے نا قدر شناس ہیں کہ حضرت زہرا کے سامنے عذر معذرت نہ کریں گے، نہ حضرت زہرا ایسی کج طبع ہیں کہ ہرگز سیدھی ہی نہ ہوں گی۔ اس کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لحاظ نہ کیا ہو مگر الحمد للہ کہ اسی طرح ظہور میں آیا۔ چنانچہ روایت مجاہد السالکین جو انشاء اللہ اب قریب ہی مذکور ہوتی ہے۔ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت صدیق اکبر نے عذر کئے۔ اور حضرت زہرا نے قبول فرمائے، اور بدل و جان ان سے پھر بمنزل اشیر و شکر مل گئیں۔

تیسری حکمت تیسرے یوں کہنا کہ حضرت فاطمہ سے کہہ دیتے تو جھگڑا نہ ہوتا۔ جب زیبا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب بھی ہوتے۔ بیسویں آیات اس بات کی گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام موجودات میں سے کسی کو علم غیب نہیں، قُلْ لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَاسْتَكُنْتُ مِنَ الْخَيْرِ۔ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ اُولَ آیت سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم الغیب نہ ہونا، اور دوسری سے بالعموم ملائکہ اور انبیاء اور جن و بشر کا عالم الغیب نہ ہونا ثابت ہے۔ جسے شک ہو ترجمہ کے کلام اللہ بہت موجود نہیں، نویں سپارہ کے نصف و ثلث کے مابین اور بیسویں سپارہ کے اول رکوع میں آیت مذکورہ کو تلاش کر کے اپنی تسلی کرے۔

اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے امور کا دھیان گمان بھی بسا اوقات نہیں آیا کرتا جو یوں کہئے کہ عقل سے معلوم کر کے پیش بندی کرنی تھی۔ ہاں جو نسبی مصلحتیں بیان کیں اور انشاء اللہ تعالیٰ کروں گا۔ وہ البتہ لحاظ عقلی کے قابل ہیں۔ چنانچہ عاقل سمجھتے ہیں اور جو لا یعقل نہ سمجھیں تو کیا کیجئے۔

چوتھی حکمت چوتھی مصلحت یہ ہے کہ جب یوں سمجھ کر کہ جنہا دونوں کے کہنے سے کام چلتا تھا

اتنا ہی ایک کے بھی، ایک ہی کے سنا دینے کی تجویز ٹھہری تو پھر مناسب یوں ہے کہ ابو بکر صدیق ہی کو روکے کیونکہ فعل عطا انہیں سے ظہور میں آتا۔ باقی حضرت فاطمہؑ لینے والی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ دنیا لینے کی فرع ہے اور دنیا اصل ہے اور اصل کے اکھاڑ دینے میں جو کچھ قلع و قمع فساد ہوتا ہے۔ وہ فرع اور شاخ کے قطع کرنے میں نہیں ہوتا۔ الحاصل جس فساد کی پیش بندی کے لئے اس حدیث کا سنا دینا مد نظر تھا اور صدیق اکبر کے کہنے میں تو اس کی پیچ و بنیاد کا اکھاڑ دینا تھا۔ اور حضرت فاطمہؑ کے کہہ دینے میں گویا شاخ کو قطع کر دیا، یا یوں کہیے کہ پھل نہ لگا۔ سوائے اس کے اگر حسب گفتار سر اپنا معقول شیعہ کوئی اور فادح میں اتفاق سے کھڑا ہوتا نظر آئے تو اس کی مدافعت کے لئے اس کی مدافعت کو نہیں چھوڑا جاتا۔ یعنی اس بات کا لحاظ مقدم ہے کہ مملوکہ بنوی دست برد و ارشاد نہ ہو جائے۔ اس میں ملے کسی قسم کا تنازع ہی کیوں نہ پیش آجائے۔

بہر حال قطع نظر اس کے کہ حضرت فاطمہؑ ذہرا کے کہنے میں سر دست آزار خاطر مبارک حضرت ذہراؑ نظر آتا تھا۔ اور مطلب ان کے نہ کہنے میں بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ اقتضای اصل بھی یہی تھا کہ حضرت فاطمہؑ سے نہ کہیں۔ اور حضرت صدیق اکبرؑ کے گوش گزار کر دیجئے کیونکہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو پھر سر رشته اختیار انہیں کے ہاتھ ہو گا۔ جب وہ متروکہ بنوی وارثوں کو نہ دیں گے۔ تو حضرت فاطمہؑ یا اور کسی وارث کے پاس آپ نہ جائے گا۔ جو وہ اس کو اپنا مملوک سمجھ کر تصرف ناجائز کر بیٹھیں، اور اس وجہ سے ان کو اطلاع کرنے کی ضرورت ہوتی۔

باقی رہی فقط طلب گاری تو اس میں تا وقتیکہ اس بات کی اطلاع نہ ہو کہ ہمارا حق نہیں کچھ گناہ نہیں جو اس پیش بندی کی ضرورت ہو، معہذا حضرت عباسؑ اور حضرت عائشہؑ سے کہہ دینا کفایت کرتا تھا۔ اس لئے کہ اگر میراث تقسیم ہوتی تو یہ دونوں صاحب بھی کچھ کم نصف کے مالک ہوتے۔ سو اگر میراث تقسیم ہوتی تو سب ہی کو برابر تقسیم ہوتی۔ پس لاجرم ان کو بھی اطلاع ہوتی۔ سو اگر حضرت فاطمہؑ کو پہلے سے معلوم نہ ہوتا۔ اور نہ

ابو بکر صدیق کو خبر ہوئی، تب بھی ان دونوں کا سننا کافی تھا۔ وقت ضرورت بیشک حال معلوم ہو جاتا۔ اور ان سب کو جانے دو۔ نہ ابو بکر صدیق کا ذکر کرو اور نہ حضرت عائشہ اور حضرت عباس کے معلوم ہونے کا کچھ خیال کرو، فقط حضرت علی سے فرما دینا ایسا ہی تھا۔ جیسا حضرت فاطمہ سے فرما دیا۔ کیونکہ ان کی طرف سے کارکن اور خبرگیران جب تک وہی تھے۔ دونوں صاحبزادے جب تک صغیر السن ہی تھے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اول تو میراث کا لینا کچھ کھیا میں گٹ پھوڑنا نہیں ہے۔ جو چپ چپاتے ہو جائے۔ پھر وہ بھی اس قدر مخفی کہ حضرت فاطمہ کے میراث لینے کی حضرت علی کو بھی خبر نہ ہو۔ بلکہ صدیق اکبر سے اگر بالفرض کچھ لیا بھی جائے گا۔ تو گو مطالبہ کرنے والی حضرت فاطمہ زہرا ہوں گی۔ پر لینے والے اور قبضہ کرنے والے حضرت علی ہی ہوں گے اور حضرت عباس بھی بہ نسبت حضرت فاطمہ کے کوئی غیر نہ تھے۔ ایک بجائے والدہ دوسرا بجائے دادا، اور ظاہر ہے کہ ایسی قرابتوں میں بیشتر اتفاق ملاقات رہتا ہے اور اس سبب سے ایک دوسرے کو اس کے نفع و نقصان کی اگر کچھ اطلاع ہوتی ہے تو اطلاع کر دیتا ہے خصوصاً امر دینی کے نفع و نقصان کی باتیں۔ اور وہ بھی ایسے لوگوں سے جو دنیا کو طلاق دیئے بیٹھے ہوں۔ ایسے مواقع میں تو اگر بمقتضائے بشری کوئی رنج بھی فی مابین واقع ہو جاتا ہے۔ تب بھی اس کے نفع و نقصان کی اطلاع کر دیا کرتے ہیں۔

کیونکہ ایسے مواقع اگر کچھ رنج بھی ہو جاتا ہے تو بوجہ محبت ہوتا ہے بوجہ عناد و بغض نہیں ہوتا۔ جو دوسرے کے نقصان کا روادار ہو۔ چونکہ رنج کے دو طرح کے ہونے کی تحقیق آیت محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء کے ذیل میں گزر چکی۔ اس لئے فقط اسی پر اکتفا کر کے معروض کرتا ہوں۔ کہ حضرت عائشہ اور حضرت عباس کے سنا دینے میں بھی یہ نظر آتا تھا۔ کہ لاجرم ان کے وسیلہ سے فاطمہ اور نیز امیر وارثوں کو یعنی ازواج باقیہ کو اطلاع ہو جائے گی۔ شروع میں نہیں تو وقت طلب یا وقت قبض و تصرف تو ضروری ہے۔ بات معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ ایسی باتیں کچھ راز کی تو ہیں ہی نہیں۔ جو کسی کو اطلاع نہ ہو

الحاصل اسے چھپانا نہیں کہتے کہ دس بارہ بلکہ شاید زیادہ کے سامنے ایک بات فرمادیں اور وہ بات بھی اس قسم کی کہ اس کی تعمیل اگر ہو سکے تو جب تک طشت از بام افتادہ کا قصہ نہ ہو تب تک نہ ہو سکے۔ منجملہ اسرار کے نہیں جو چھپائی جائے۔ خاص کر حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ سے کہ دو توان میں سے وارث ہیں اور ایک وارث کے وارث۔ یعنی ان کے جبرگیران پھر یوں کہنا کہ حکم خدا کو جو بہ نسبت وارثان نبوی تھا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وارثوں سے چھپا رکھا۔ جھک مارنا ہے کہ نہیں۔

حسب روایت شیعہ خدا کا حکم چھپانے کی ایک مثال | ہاں چھپا رکھنا اسے کہتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین نے حسب روایات کاذبہ شیعہ فرزند ارجمند خویش حضرت زید شہید حکم امامت امام محمد باقرؑ چھپا رکھا، اور پھر حریف ہے کہ حکم بھی ایسا کہ جیسا اس کے نہ جاننے سے کفر عائد ہوتا ہے ویسا ہی اس کے نہ جاننے سے آدمی کافر رہتا ہے جتنا نجم ہر ستارے حدیث من لہ یغریف امام شرا ملکہ فقد مات میتة جاهلیة شیعوں کا یہی عقیدہ ہے۔ اس لئے کہ اس کے مفسر شیعوں کے طور پر یہی ہو سکتے ہیں کہ جو امام وقت کو رازداری ائمہ میں سے نہ جانے، یعنی اس کی امامت کی اسے خبر نہ ہو، تو وہ جاہلیت کا امام نام رکھا جائے گا۔ یعنی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے پہلے اکثر جزیرہ عرب کے لوگ بسبب جہالت کے عقائد باطلہ اس جہان سے لے گئے اور اس سبب سے جہنم رسید ہوئے۔ ایسے ہی امامت امام وقت سے جو جاہل رہے گا۔ وہ بھی اسی شمار قطار میں داخل ہو گا، الحاصل حضرت امام زین العابدین نے حضرت زید شہید سے ایسا مسئلہ جو رکن دین و ایمان تھا۔ چھپا رکھا تھا، سو چھپانا اسے کہتے ہیں نہ کہ اس کو کہ ہر وارث کے کان میں کاخوشت فائز کناہ صدقہ کہلا اور اگر سند مطلوب ہے تو لیجئے کلینی کی روایت موجود ہے۔ کسی ایسے ویسے رند بازاری کی نہیں۔

رَوَى الْكَلْبِيُّ عَنْ إِبْنِ أَبِي نَجْرٍ قَالَ أَخْبَرَنِي الْأَخْوَلُ أَنَّ زَيْدَ بْنَ عَسَى بَعَثَ إِلَيْهِ وَهُوَ مُخْتَفٍ قَالَ فَأَتَيْتُهُ فَقَالَ يَا أَبَا جَعْفَرٍ مَا تَقُولُ إِنَّ طَرَفَكَ طَائِرٌ مِّنَّا أَخْبَرُ جُ مَعَهُ قَالَ فَقُلْتُ لَهُ إِنَّكَ كَأَنَّكَ مَوَالِكُ

أَوْ أَخَالَكَ خَرَجْتُ مَعَهُ فَقَالَ لِي أَسْرَيْدُ أَنْ أَخْرُجَ فَلَجَّاهِدْهُ هُوَ كَلَامُ
الْقَوْمِ فَأَخْرَجَ مَعِيَ فَقُلْتُ لَا أَفْعَلُ جَعَلْتُ فِدَاكَ فَقَالَ أَتَزْعُمُ
بِنَفْسِكَ عَنْ نَفْسِي فَقُلْتُ إِنَّمَا هِيَ نَفْسٌ وَاحِدَةٌ فَإِنْ كَانَ لِلَّهِ
فِي الْأَرْضِ مِنْ حُجَّةٍ مَا فَالْمُخْتَلِفُ عَنْكَ وَالْخَارِجُ مَعَكَ سَوَاءٌ فَقَالَ يَا أَبَا
جَعْفَرٍ كُنْتُ أَجْلِسُ مَعَ أَبِي فِي الْخَوَانِ فَيُلْقِيَنِ الْبِضْعَةَ السَّمِينَةَ وَيَبْرُدُ
لِي اللَّقْمَةُ حَتَّى تَبْرُدَ شَفَقَةً عَلَيَّ وَلَمْ يَشْفُقْ عَلَيَّ حَرَّ النَّارِ إِذَا أَخْبَرْتُكَ
وَلَمْ يُخْبِرْنِي قَالَ فَقُلْتُ خَافَ عَلَيْكَ أَنْ لَا تُقْبَلَ فَتَدْخُلَ النَّارَ
وَأَخْبِرَنِي فَإِنْ قَبِلْتُ نَجَوْتُ وَإِنْ لَمْ أَقْبَلْ لَمْ يُيَالِ أَنْ أَدْخُلَ النَّارَ

حاصل روایت یہ ہے کہ علامہ کلینی ابان سے یوں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیا
کیا کہ احوال نے مجھ سے یوں نقل کیا کہ حضرت زید بن امام زین العابدین نے جس وقت کہ وہ
مخفی تھے کسی کو میرے پاس بلانے کو بھیجا، تو انہوں نے کہا، اے ابو جعفر (یہ لقب ہے احوال کا)
تیری اس میں کیا رائے ہے؟ اگر ہماری طرف سے اچانک کوئی بلانے والا تیرے پاس آئے۔
(یعنی ہم اپنی مدد کے لئے تجھے بلوائیں) تو اس کے ساتھ بارے بلوائے سے ہو بھی لے گا کہ نہیں۔
احوال نے کہا میں نے حضرت سے یوں عرض کیا کہ بلوانے والے تمہارے باپ یا تمہارا بھائی
(یعنی امام محمد باقر) ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ میں بھی ساتھ ہو لیتا، انہوں نے پھر فرمایا میرا
ارادہ یوں ہے کہ میں سکھوں، اور ان لوگوں سے یعنی مروانیوں سے جہاد کروں، سو تو بھی میرے
ساتھ چل۔ میں نے عرض کی کہ میں آپ کے قربان جاؤں۔ مجھ سے ہرگز یہ کام نہ ہو گا۔ انہوں نے
فرمایا کیا تو اپنے آپ کو ہم سے علیحدہ ہو کر بچتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اور تم تو ایک ہی ہیں، ہر
در صورت کہ رونے زمین پر کوئی خدا کی طرف سے حجت یعنی امام موجود ہو تو تمہارے ساتھ سے
رہ جانے والا اور تمہارے ساتھ جانے والا دونوں برابر ہیں۔ یعنی امام کے ہوتے ہوئے
تمہارے ساتھ جہاد میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں، انہوں نے کہا اے ابو جعفر میں اپنے باپ کے
ساتھ خوان پر بیٹھا کرتا تھا وہ مجھے پھانٹ پھانٹ کے گوشت کی موٹی موٹی بوٹیاں دیتے تھے
اور میرے لئے لقمے ٹھنڈے کرتے تھے یہاں تک کہ خوب ٹھنڈا کھانے کے قابل ہو جائے،

یہ سب قصہ محبت کے سبب سے تھا۔ سو بڑے تعجب اور کمال حیف کی بات ہے کہ
یہاں کی آگ کا تو شفقت کرنے میں لحاظ کیا۔ اور دوزخ کی آگ سے بچانے میں انہیں
مجھ پر کچھ محبت نہ آئی جو مجھے امام محمد باقر کی امامت کی خبر کر دی اور مجھے بالکل خبر نہ کی، احوال
کہتا ہے میں نے کہا تم سے یہ خوف ہوا کہ مبادا تم نہ مانو اور اس سبب دوزخ میں جاؤ
اور مجھے یوں سمجھ کے خبر کر دی کہ اگر میں نے قبول کیا تو قہراً۔ نجات پائی نہیں تو ان کی ہلاکت
دوزخ میں جاؤں گا تو میں جاؤں گا۔ انتہی۔

بہرحال اس روایت سے بہت سے مضمون مفید مطلب اہلسنت برآمد ہوتے ہیں
لیکن اول تو اس مقام میں ان سب کا ذکر کرنا بے موقع ہے۔ دوسرے فرصت اتنی کہاں
اس لئے فقط اتنی گزارش ہے کہ اس روایت سے تبصرہ معلوم ہوا کہ حضرت امام زین العابدین
نے دیدہ و دانستہ اپنے فرزند ارجمند زید شہید سے امامت حضرت امام محمد باقر کو چھپا لیا
حالانکہ اس کا جاننا منجملہ ارکان ایمان تھا۔ چنانچہ اس روایت سے بھی ظاہر ہے، اب اہل
انصاف سے یہ عرض ہے، کہ مذکورہ منجملہ متلعذیب دنیوی تھا امامت امام وقت کے برابر
رکھے، جس کا جاننا منجملہ ارکان ایمان ہے۔ اور پھر حضرت امام زین العابدین کے دیدہ و
دانستہ چھپا لینے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس بارہ آدمیوں کے سامنے بغرض
تبلیغ کھدینے کے مقابل کیجئے۔ اور پھر اس کا لحاظ کیجئے کہ بایں ہمہ حضرت امام زین العابدین
نے جو حضرت امام محمد باقرؑ کی امامت کی حضرت زید شہید کو اطلاع نہ کی۔ تو اس میں
کیا نقصان نکلا؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت فاطمہ زہراؑ سے یا کسی اور وارث سے
حدیث لاخوڑا حاکم کا حدیث قہ نہ کہا۔ اور بزعم شیعہ فقط صدیق اکبرؑ سے کہا تو کیا
ضرر پیش آیا؟ ظاہر ہے کہ بہ نسبت امامت امام محمد باقرؑ حضرت امام زین العابدین کے
لب کشانہ ہونے میں انجام یہ نکلا کہ لعوذ باللہ لقل کفر کفر نباشد حضرت زید شہید
بوجہ جہل رکن ایمان اعمی امامت امام وقت چنانچہ روایت مسطورہ سے ظاہر ہے، مستوجب
دوام عذاب اور داخل زمرہ کفار ہوئے۔ اگر بذات خود امام زین العابدین فرزند ارجمند

سے یہ بات فرمادیتے تو امید قوی تھی کہ حضرت زیدؑ تسلیم ہی کر لیتے۔ اشتباہ دروغ
احول دروغ کو جو فی الحال رہن ایمان ہوا، اس صورت میں بیچ میں سے اٹھ جانا، اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط ابو بکر صدیق ہی سے حدیث مذکور کو کہا تو کچھ خرابی نہ
نکلی۔ کیونکہ جو کچھ مقصود تھا، وہ حاصل ہی ہو گیا۔ ترک نبوی صدقہ ہی رہا۔ بہر حال اس میں
میراث جاری نہ ہونے پائی۔ بلکہ اگر بالفرض والتقدیر سرور کائنات علیہ و آلہ افضل الصلوات
واکمل التحیات اس حدیث کو بوجہ فراموشی مثلاً کسی سے نہ فرماتے، نہ صدیق اکبر سے نہ
کسی اور سے تب بھی بیش برس نیست نہ تادانتگی میں وارثان نبوی ترکہ نبوی کو جو
فی الحقیقت وقف تھا خود دہر فرماتے سیم ہم علماء شیعہ ہی سے استفتا کرتے ہیں کہ اگر کوئی
نادانتگی میں مال وقف کو اپنا مال سمجھ کر کھالے تو اس کے ذمہ کیا گناہ؟ بہر حال حضرت
امام زین العابدین کے حکم خداوندی کے چھپا لینے سے جو کچھ نقصان نکلا، اس کو ایک طرف
رکھئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نہ جاننے سے جو مطلب کے حصول میں کچھ
خرچ نہ ہوا اور در صورت اخفاء کلی جو کسی طرح کا وارثوں کا نقصان دینی یا دنیوی نہ
تھا، اس کو دوسری طرف دھریئے، القصہ ادھر کے تمام لوازم کو ادھر کے تمام
لوازم سے تولئے، اور پھر بولئے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟ اور اخفاء حکم کس طرف
ہے۔ اور کس طرف نہیں؟

بہر حال ہر کس و نا کس پر ان تقریروں سے واضح ہو گیا کہ کسی طرح رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اخفاء حکم نہیں ہوا، اور بزرگ شیعہ قطعاً اور یقیناً حضرت
امام زین العابدین نے اخفاء حکم خداوندی کیا لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کی فہم
و فراست پر، کہ اسے تو اخفاء سمجھتے ہیں اور اسے نہیں سمجھتے، بار خدا یا انہیں کس نے کہا
تھا کہ تم بھی دین مذہب کی باتوں میں دخل دیجو۔ اتنی عقل و فہم پر اہلسنت سے الجھتے
ہیں۔ کوئی مولوی صاحب سے پوچھے۔ آپ نے کیوں اہلسنت سے دست و گریباں
ہونے کا ارادہ کیا؟ شعر

الجھنے کو بلا ہیں آپ تو کچھ خیر ہے صاحب : لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلف پر لٹیاں کو

علماء اہلسنت تو درکنار عوام اہلسنت بھی بمنزلہ دلاوران عالی نظر میدان
مناظرہ میں ایسی سمجھ والوں کو بمنزلہ زنان بے ہتھیار سمجھ کر کچھ معترض نہیں ہوا کرتے
ہیں۔ ہاں در صورتیکہ گریبان گیر ہی ہو جائیں۔ تب بضرورت و ناچار ہی ان کے ہاتھ
پاؤں کی خبر لیتے ہیں۔

اس لئے اس پیچیدان نے بھی جو کچھ کیا سو کیا۔ بہر حال معاف کیجئے گا۔ لیکن سچ تو یوں
ہے آپ کو بری تو لگے گی۔ جیسی آپ کی باتیں ہیں۔ ایسے سخنہائے بے معنی سے تو
گوزشتہ بے ہمارے ہی بہتر ہے، وہ اگر اتفاق سے ناک تھک پہنچ بھی جائے تو بیش بریں
نیست ناک ہی جلے گی۔ دل تو کسی عاقل کا نہ جلے گا۔ پر آپ کے حرف بے معنی اور سخن
نامعقول ہیں طرفہ ستم یہ ہیں کہ بحکم مصرع۔ جواب جا ہلاں باشد خموشی حقیقت
میں قابل جواب تو ہوتے ہیں جو جواب دیا جائے۔ البتہ خاموش ہو کر جی جلانا پڑتا ہے
پر اس پیچیدان نے جب جانا کہ جاہلوں کے جواب میں عالم البتہ نہیں بولا کرتے، مجھے اس
پیچیدانی پر کیا ہوا جو خاموش ہو کر بیٹھ رہوں، معہذا اب سر پرانی

دو چیز تیرہ عقل است دم فرو بستن : بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

اس لئے اس قدر اوراق کو سیاہ کیا۔ اور آگے اور کرنے پڑے

سو منصفان بے روی و ریا اور بھی سنیں، کہ بعد ازیں مولوی عمار علی صاحب
کچھ ایسا رقم فرماتے ہیں جس سے حضرت فاطمہ زہرا کا مکر صدیق اکبر کے پاس جا کر میراث
کا طلب کرنا، اور ان کا فدک کو حضرت فاطمہ کے نام لکھ دینا اور پھر اتفاق سے حضرت عمر کا
آجانا، اور ان کا اس کاغذ کو پھاڑ ڈالنا نکلتا ہے۔ سو اس کا جواب بحکم مثل مشہور
ع۔ دروغ را جزا باشد دروغ : موافق نقل ہندی "گوہ کی دار و سوت"

یوں چاہیے تھا کہ حضرت فاطمہ ایک بار بھی میراث کی طلب کے لئے صدیق اکبر تک
نہیں گئیں، چہ جائیکہ دوبارہ مطالبہ کی نوبت آئی ہو، اور حضرت صدیق اکبر نے ان
کے ان کے نام جاگیر کا کاغذ لکھ دیا ہو۔ اور حضرت عمر نے اسے پھاڑ ڈالا ہو، وہ شروع
سے لب کشا ہی نہیں ہوئی تھیں، مگر چونکہ چھوٹ پھر چھوٹ ہے۔ ابتدا ہو یا دروغ کی

جزائیں، معہذا خداوند کریم جھوٹوں کو سینکڑوں طرح شرماتا ہے چنانچہ ابھی اشارۃً
تعالیٰ معلوم ہوا جاتا ہے، پس ہی بولنا مناسب اور انسب نظر آیا۔ اس لئے گزارش یہ ہے
یاد رہے کہ یہ محض دروغ بے فروغ ہے۔ طومار بندیوں سے بچوں کو جھوٹا نہیں کیا کرتے
اہلسنت کا قول محکم ایسی پوچ باتوں سے خلل پذیر نہیں ہو سکتا۔

باقی یہ حوالہ دینا کہ سبط بن جوزی نے اس روایت کو اپنی سیرت میں تحریر کیا
اور واقدی محدث اہلسنت نے، اور برہان الدین حلبی شافعی نے اپنی سیرت میں
لکھا ہے، محض ایک سخن ابلہ فریب ہے۔ سادہ لوحان اہلسنت کے گمراہ کرنے کے
لئے (بحکم اتباع پیشوایان خویش) مولوی صاحب بھی یہ چال چلتے ہیں۔ چونکہ درباب
تنقیح روایات مفید مطلب شیعہ ایک بحث طویل مرقوم ہو چکی ہے اور اس کے
مکرر بیان کرنے میں بجز درد سر تازہ کچھ سود نہیں۔ اس لئے مکلف ناظرین ہوں
کہ چند اوراق پلٹ کر اس باب میں اپنی تسلی کر لیں۔

سیدہ کے بھانے پر فدک صدیق نے واپس کر دیا تھا اپرا تنا اشارہ یہاں بھی کئے دیتا ہوں۔ کہ
اول بڑی دلیل اس بات کی کہ حضرت فاطمہ مکرر گئیں اور حضرت صدیق اکبر نے
فدک کا جاگیر نامہ ان کے نام لکھ دیا، اور حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا سر اسے دروغ اور بہتان
بے اصل ہے۔ چنانچہ شیخ ابن مہر علی منہج الکرامت میں یوں رقم فرماتے ہیں لَمَّا
وَعَظَّتْ فَاطِمَةُ أَبَا بَكْرٍ فِي فِدْكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَاسَّ دَهَا عَلَيْهَا۔ یعنی حضرت فاطمہ
نے جب ابو بکر کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و پند کیا تو ابو بکر نے حضرت فاطمہ کے نام
اسے لکھ دیا اور فدک کو ان کے حوالہ کر دیا۔ انتہی،، اور ظاہر ہے کہ شیخ مہر دہمنی
صدیق اکبر میں مولوی صاحب کے بھی افسر ہیں، اور یار غار کی عداوت میں ان سے بھی
اول ہیں، مولوی صاحب نے بھی اگر یہ باتیں سیکھی ہیں تو انہیں بزرگوں کے بہکاتے
سے سیکھی ہیں۔ اگر کچھ بھی اس کی اہل ہوتی۔ وہ سیر کی من کر دیتے۔ اور سوئی
کا بھالا بنا دیتے۔

آخر اتنا بھی تو اسی غرض سے لکھا ہے کہ صدیق اکبر (بوجہ دعا بازی) فدک کو

دبانہ چاہتے تھے۔ پر وعظ و پند کے باعث آخر کار ہاتھ سے چھوڑا، اگر اپنی بات میں سچے ہوتے۔ اور حدیث کا خورد و خوراک نہ کرنا صدقہ صحت پر ہوتی غلط نہ ہوتی۔ تو وعظ و متاثر ہونے کے کیا معنی تھے؟ التاویٰ حضرت فاطمہ کو نصیحت کرتے۔ سو اگر پھاڑ ڈالنے کا قصہ کچھ بھی اصل رکھتا تو وہ کیا کیا زبان درازیاں نہ کرتے۔ بلکہ شیخ ابن مسطہر علی نے تو اہل سنت کے لئے بہت تخفیف تصدیق کر دی۔ یہاں تک کہ اہل انصاف کے نزدیک تو شیعوں کو لازم یوں ہے کہ مثل حمر بن زید ریاحی صدیق اکبر کے بھی بدل و جان مقدر ہو جائیں، کیونکہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ خیر الحمد للہ کہ شیعوں کی یہی روایات سے دروغ (مولوی غمار علی صاحب ثابث ہو گیا و کفی اللہ المؤمنین القتال۔

بہر حال جو باتیں مولوی صاحب نے تراشی ہیں۔ مولوی صاحب کے بڑوں کو بھی نہ سوجھی تھیں۔ یہ تازہ الہام اب مولوی صاحب کو ہوا ہے، معجزہ و اقدی محدثین کے نزدیک منجملہ وضاعین ہی۔ یعنی اس زمرہ میں معدود ہے۔ جو جھوٹی حدیثیں بنا کر بیان کیا کرتے ہیں، اور ابن جوزی کا حوالہ اس بات میں ہماری سر آنکھوں پر، کیونکہ انہوں نے دھوکہ بازوں کے فریب سے بچانے کے لئے امت محمدی کے لئے ایک کتاب خاص اسی فن میں تصنیف کی ہے۔ کہ فلائی فلائی حدیث موضوع ہے۔ تاکہ کوئی دھوکہ نہ کھا، سوان کی اس کتاب سے نقل کرنے میں اہلسنت کی بات کا اور بختہ کرنا ہے اور اگر بالفرض ایسے استدلال بھی مفید مطلب ہوا کریں اور اس پر نظر نہ ہو کہ خود مصنف کتاب اس بات کی نسبت جو اس کے حوالہ سے بیان کی جاتی ہے کیا کہتا ہے؟ تو کل کو ملحدان بے دین کی اس بات کا شیعہ کیا جواب دیں گے؟ کہ کلام اللہ میں ان اللہ فقیر موجود ہے، یعنی خدا محتاج ہے، تو معلوم ہوا کہ خدا محتاج ہے۔

اور اگر یوں کہیے کہ خدا نے یہود کے اس قول کو بطور رد و تمکذیب درج کلام اللہ کیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے، تو یہی جواب سبط بن جوزی کی اس روایت کے درج کرنے کا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اس دغا بازی کا کیا ٹھکانا ہے کہ عوام اہلسنت کے سامنے

یا تو ان کتابوں کا نام لیتے ہیں جو غیر مقبول اور پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ یا بوجہ
شہارت و چالاکی ایسی کتابوں کا حوالہ دے جاتے ہیں، کہ گو وہ کتابیں معتبر ہیں۔ پر اس
روایت کو جس کا حوالہ دیتے ہیں، اس کتاب میں بنظر دفع شر و غابا زان لکھ کر موضوع
لکھ دیا ہے، یہ فرقہ عوام کو دھوکہ دینے کے لئے انہیں روایات کو پیش نظر کر دیتے
ہیں۔ اور اکثر موقع میں اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں۔ کہ ایک بات اپنے جی سے تراش
کر کسی کتاب غیر مشہور کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اول تو یہ
کتابیں کہاں؟ پھر اتنی درد سر کی کس کو ضرورت؟ بہر حال مولوی صاحب کا یہ ارشاد
کہ حضرت فاطمہ مکرر حضرت صدیق اکبر کے پاس طلب میراث کے لئے گئیں، شاید
بایں عرض ہو کہ مکرر سکر جانے میں اور غلطی صحیح غل شور مچانے میں کچھ تو ہوا تھا پلے پڑ
جائے گا۔ پھر مولوی صاحب کی ایک اور بیہودہ گفتار سنئے مولوی صاحب کچھ ایسا
رسم فرماتے ہیں۔

”و کہ حضرت علی وغیرہ صحابہ ابوبکر کو اس بات میں سچا جانتے تھے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وسلم کا ترکہ سب صدقہ ہے تو پھر علی رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ نے خلیفہ
ثانی کی خلافت میں عمر رضی اللہ عنہ سے جا کر کیوں دعوائے کیا؟ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے علیؑ اور
عباس رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم دونوں ابوبکر کو کاذب اور خائن اور فاجر اور آثم جانتے تھے اور مجھے
بھی تم دونوں کاذب اور خائن اور فاجر اور آثم جانتے ہو اور میں وہی کروں گا۔ جو کہ ابوبکر
کرتا تھا یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہوئی ہے۔ اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمانؓ
کی خلافت میں عثمانؓ سے بھی دعوائے کیا تھا پس اگر ابوبکر ان کے نزدیک سچا ہوتا تو
ان کے زمانہ میں دعوائے برگزینہ کرتے معلوم ہوا کہ ابوبکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا۔
ازراہِ عداوت روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا، اور عمر خود علیؑ اور عباس سے اقرار
کرتا ہے کہ تم ابوبکر کو کاذب اور خائن جانتے تھے۔ اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے
ہو، پس جس وقت کہ علیؑ نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی کاذب اور خائن
ان کو جانیں گے۔ یہی مطلب غصب تھا۔“

یہاں تک مولوی صاحب کی خرافات لایعنی ہوئی اس میں کوئی ایک دو لفظ
کافرق ہوگا، پر معنی میں تفاوت نہیں، اب ہماری بھی سینے کہ اس عبارت سے مولوی
صاحب کے دو مطلب ہیں، ایک تو یہ کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس وغیرہم صحابہ کرام
رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سچا جانتے، تو حضرت عمر کی خلافت میں حضرت عمر سے دعویٰ نہ
کرتے، اور علی ہذا القیاس حضرت عثمان کے زمانہ میں دعویٰ نہ کرتے، دوسرا یہ ہے کہ
جب باقر حضرت عمر حضرت علی اور حضرت عباس کا ابو بکر صدیق کو کاذب آثم، غادر،
خائن جاننیک صحیح ہوا تو ہم بھی باتباع مرتضوی ابو بکر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھیں گے
مسلم شریف کے حوالہ کی حقیقت اس سوال اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی
ایک نئی دغا بازی ہے۔ عوام کے بہکانے کے لئے ایسی ابلہ فریبیاں کرتے ہیں پر حقیقت
میں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ جو لوگ اصل روایات صحیح مسلم کو دیکھیں گے، وہ جان
جائیں گے کہ قصہ دگرگوں ہے۔ یعنی حضرت عمر کے زمانہ میں جس محفل میں یہ نوبت
آئی ہے کہ حضرت عمر نے یوں کہا کہ تم ابو بکر صدیق کو کاذب آثم خائن سمجھتے تھے، اس
محفل میں بسبب تولیت تکرار تھا۔ نہ بہ نسبت وراثت۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی
جس کا مضمون کچھ کچھ مولوی صاحب نے درج فرماتے کیا۔ اور ہر دایت
مالک بن اوس مروی ہے۔ اور نیز صحیح مسلم ہی کی اور حدیثوں سے یہ بات عیاں ہے
لیکن مولوی صاحب نے یا تو بوجہ بلاغت و غباوت نہ سمجھا ہو، اور یا باتباع پیشوایان
قدیم دوسروں کے مطلب کی بات ہضم کر کے جس قدر دھوکا دے سکیں مذیب
قرطاس کیا ہے۔

ہر چند جمیوں چاہتا تھا کہ احادیث مشار الیہا کو تماہما لکھئے، لیکن احادیث
مشار الیہا کے تماہما لکھنے میں قصہ بہت دور پہنچتا ہے۔ خصوصاً حدیث بن اوس مذکور
کہ وہ ایک بہت طویل و عریض ہے اور بایں ہمہ اکثر مواقع شرح طلب، اور ادھر
فرصت قلیل، اس میں سب میں سے مختصر قصہ استنباط کر کے اور دو چار جملے بجنسہا لکھ
کر متردوں کا اطمینان کئے دیتا ہوں، حدیث عائشہ سے جو اس حدیث سے کچھ آگے

صحیح مسلم میں موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں منجملہ ترکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فقط اس زمین کا جو مدینہ کے رقبہ میں اور قرب و جوار میں تھی حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو متولی کر دیا تھا خیبر اور فدک کو اپنی تولیت میں رکھا تھا۔ اس حدیث سے جس کا مولوی صاحب نے ذکر فرمایا یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خدا کا واسطہ دیکر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ سے یہ عہد لے لیا تھا کہ اس میں وہی کام کیجئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔

مگر حدیث عائشہ مذکور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کا قبضہ اٹھا دیا، چنانچہ حدیث مذکور کے یہ الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

فَإِمَّا صَدَقَتْهُ بِإِمْدَانِيَّةٍ فَذَكَرَ عُمَرُ إِلَى عَلِيٍّ وَعَبَّاسٍ فَغَلَبَهُ عَلَيْهِمَا عَلِيٌّ

جس کا یہ حاصل ہے کہ مدینہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمد تھا۔ اس کو حضرت عمرؓ نے

حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے حوالے کر دیا، سو حضرت علیؓ نے اس کو آباد کیا اور اپنا قبضہ کر لیا۔

یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ جب حضرت علیؓ اس تمام زمین پر خود دونوں کی تفویض اور سپردگی میں بھی قبضہ ہو گئے تو آپس میں دونوں صاحبوں میں جھگڑا پڑا اس کے رفع داد کے لئے یہ صورت پیش آئی، کہ یہ دونوں صاحب خود حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ کو بھی کچھ پہلے ان کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ بھی کچھ ہمارا لگائیں اور خلیفہ سے کہہ سن کر کچھ کچھ صلح کرادیں، اسی آنے کو مولوی صاحب دعویٰ میراث کے لئے آنا سمجھتے ہیں، اس لئے کہ حضرت عمرؓ کا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو یوں کہنا کہ تم ابو بکرؓ کو کاذب و غیرہ سمجھتے تھے، اسی دفعہ میں پیش آیا ہے۔ چنانچہ ناظران حدیث مذکور پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

الحاصل جب حضرت عمرؓ کے پاس یہ چھیوں صاحب تشریف لائے۔ اور یہ مذکور ہوا تو اول تو حضرت عمرؓ نے ان چھیوں صاحبوں کو قسم دیکر یہ پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ خورث ہا ترکنا

صدقہ اور ان سب صاحبوں نے اقرار کیا کہ بیشک فرمایا ہے، بعد ازاں بہت سی گفتگو کے بعد یہ فرمایا۔

ثُمَّ جِئْتَنِي أَنْتَ وَهَذَا وَاتِّمَّا جَمِيعٌ وَآخِرُكُمْ وَأَحَدٌ فَقُلْتُمَا إِذْ فَعَلَا
إِلْتِمَافُ قُلْتُمْ إِنَّ شَيْئًا دَفَعْتُمَا إِلَيْنَا عَلَى أَنْ عَلَيْكُمَا عَهْدُ اللَّهِ أَنْ
تَعْمَلَا فِيهَا بِالَّذِي كَانَ يَعْمَلُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَأَخَذَ تُمَا هَذَا إِلَيْكَ قَالَ أَكْذَابُكَ؟ قَالَا نَعَمْ قَالَ ثُمَّ جِئْتُمَا نِي
لَا قَضِي بَيْنَكُمَا وَلَا وَاللَّهِ لَا أَقْضِي بَيْنَكُمَا بِغَيْرِ ذَلِكَ حَتَّى
تَقُومَ السَّاعَةُ فَإِنْ عَجَزْتُمَا عَنْهَا فَرَدَّاهَا إِلَيَّ۔

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کی طرف متوجہ ہو کر یہ فرمایا کہ پھر تم ادیبہ دونوں میرے پاس آئے اور تم دونوں باہم متفق تھے، اور تم دونوں کی بات ایک تھی سو تم دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ترک ہمارے حوالہ کر دو، میں نے کہا کہ میں منظور ہوں تو اس شرط پر دیتا ہوں کہ خدا سے عہد کر لو کہ اس میں میں ہی کیجیو۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ سو تم دونوں نے ترک مذکور کو اس شرط پر لیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا یوں ہی بات ہے؟ ان دونوں صاحبوں نے کہا اسی طرح ہے۔ بعد ازاں حضرت عمرؓ نے ان دونوں سے کہا۔ اب پھر تم دونوں میرے پاس آئے سو کہ میں تمہارا فیصلہ کر دوں۔ یعنی زمین کو بانٹ کر تم دونوں کو جدا جدا متولی کر دوں یوں نہیں اللہ کی قسم اس کے سوا قیامت تک میں کچھ اور حکم نہ دوں گا۔ اگر تم سے تولیت کا سرا انجام نہ ہو سکے تو لاؤ مجھے ہٹا دو۔

یہاں تک حاصل مطلب تھا۔ اب غور فرمائیے کہ مولوی صاحب کے فہم کا قصور کیا کسی اور کا؟ اگر مشریح سننا منظور ہے تو سنئے کہ اگر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ حضرت عمرؓ سے طالب میراث ہوئے تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے ان کی طلب کے موافق ترک بنوی کہ ان کے حوالہ کر دیا تو اس کی کیا وجہ ہوئی کہ باوجود معصوم ہونے کے۔۔۔۔۔ حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کا بھی حصہ دیا لیا۔ شیعوں کو یہ اعتقاد ہو گا کہ حضرت علیؓ نے خود باللہ

نقل کفر کفر نباشد ایسے دغا باز ہیں کہ اپنا دیکھیں تھے نہ پرایا۔ جو مل گیا سو فہم کر لیا یا شاید معصوم ہونے کے شیعوں کے نزدیک یہی معنی ہوں کہ کتنا ہی ظلم و ستم کر بیٹھیں انکو سب مباح اور معاف ہے۔

امام کا حضرت عباس کو بے دخل | انصاف سے دیکھئے۔ تو معتقدان مرتضوی کے لئے یہ حضرت کر دینا عدم وراثت پر کھلی دلیل ہو | علی کا قبضہ حضرت عباس سے اٹھا دینا اس بات کے لئے گواہ عادل ہے، کہ اس ترکہ میں کسی کو میراث نہیں پہنچتی تھی، اور وہ ترکہ وقف تھا۔ سو در صورت وقف ہونے کے اگر متولی ہوں اور ایک دوسرے کا قبضہ اٹھا دیا، تو اس پر کچھ ظلم نہیں۔ بلکہ بسا اوقات قرین مصلحت یہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زمین و باغ جب تک کسی ایک طور پر نہیں ہوتے۔ تب تک تردد کامل نہیں ہو سکتا، یعنی ایسی صورت میں اکثر زمین افتادہ پڑی رہتی ہے۔ سو افتادہ پڑے رہنے میں بجز اس کے اور کیا خوبی ہے کہ مساکین وغیرہ اہل مصرف کا حق مارا گیا۔ بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علی کی رائے اور حضرت عباس کی رائے درباب تردد کچھ مخالف ہوئی ہو، حضرت علی نے دیکھا کہ اول تو حضرت عباس کی رائے پر رہیے تو نقصان اہل مصرف ہو۔

مثلاً جس مزارع کو حضرت عباس دینا چاہتے ہوں۔ وہ بہ نسبت اس مزارع کے جسے حضرت علی دینا چاہتے ہوں کم محصول اپنے ذمہ رکھتا ہو، یا نادہند و غایان ہو، دوم اس مخالف رائے میں بند و بست معلوم، اس لئے بطور خود اس ترکہ کو برخلاف رائے حضرت عباس کسی کے حوالہ کر دیا ہو، اور یہ بات حضرت عباس کو گراں گذری ہو۔ اس لئے حضرت عمر سے اس بات کے خواستگار ہوئے ہوں کہ آدھوں آدھ ہاشکریہوں کو جدا جدا زمین کا متولی کر دیں۔ معہذا جو عبارت عربی میں مرقوم ہوئی ہے وہ خود اسی بات پر شاہد ہے کہ یہ جھگڑا فقط تولیت کا تھا، اس لئے کہ اول حضرت عمر کا اس بات پر عہد لے کر دینا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے وہی کیجئے، خود اسی کی دلیل ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس کو متولی کر کے دیا تھا۔ ورنہ اس شرط کے کیا معنی؟ اگر میراث میں دیا تھا تو میراث تو وارثوں کی ملک ہوتی ہے، اور مالک کو اپنی چیز کا اختیار

ہوتا ہے، ورنہ ہر شخص سے بہ نسبت اراضی مملوکہ کے یہی عہد لیا جایا کرتا۔

دوئم پھر حضرت عمر کا یوں فرمانا کہ قیامت تک اس کے خلاف حکم نہ دوں گا۔

خود اسی بات کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت عمر نے ترکہ بنوی بطور تولیت حضرت علی اور حضرت

عباس کے حوالہ کر رکھا تھا۔ بطور میراث نہ دیا تھا۔ ورنہ مقصود حضرت عباس اور حضرت علی

فقط تقسیم کر دینا تھا۔ سو اس میں حضرت عمر کا کیا نقصان تھا کہ ایک شے مشترکہ کو فی

ما بین دو مالکوں کے تقسیم کر دیں؟ اگر بخل کرتے تو دینے ہی میں کرتے۔ جب دے چکے

پھر تقسیم میں کیا مشکل تھی۔ ہاں در صورت تولیت یہ اندیشہ تھا کہ ایک بیٹی اور ایک

چچا کا میراث میں آدھوں آدھ سا بھٹا ہوتا ہے، سو اگر حضرت علی جو حضرت فاطمہ کی طرف سے

وکیل تھے اور حضرت عباس کہ آدھوں آدھ بانٹ کر جدا جدا متولی کر دیجے تو مبادا رفتہ

رفتہ اگلے قریبوں میں اس تقسیم کو دیکھ کر دیکھنے برتنے والے یوں سمجھ جائیں کہ نصف حضرت

فاطمہ کی اولاد کا مملوک ہے اور نصف حضرت عباس کی اولاد کا مملوک ہے

حضرت علی و عباس نے بقسم حدیث | علاوہ بریں حضرت علی اور حضرت عباس کا قسم کھا کر

صدقہ کی تصدیق کی۔ | اس بات کا اقرار کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بیشک یوں ارشاد فرمایا ہے کہ لَا تُخْزِتُ مَا خَرَكْنَا ۚ صَدَقَۃٌ اور پھر میراث کا طلب

کرنا شیعوں ہی کی سمجھ میں آئے تو آئے۔ اور ان سب سے چڑھ کر یہ ہے کہ مولوی صاحب پہلے

یوں رقم فرما چکے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر نے (بہ نسبت) فدک کے معافی کا کاغذ لکھ دیا تھا

حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا۔ پھر جب حضرت عمر ابو بکر کی خلافت میں یوں ہوں تو اپنی خلافت

میں تو بدرجہ اولیٰ حاوی ہونے چاہئیں، پھر حضرت علی اور حضرت عباس نادان تھے؟

نعوذ باللہ کہ باوجود اس قصہ کے معلوم ہونے کے مفت خفیف اور رسوا بننے کے لئے

ایسی لغو حرکت اور نامعقول بات کرتے؟ اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض

بفرض محال یہ بات وقوع میں آئی بھی ہے؟ تو اول بار ہی حضرت علی اور حضرت عباس

کا حضرت عمر کے پاس آنا جب کہ حضرت عمر نے ترکہ بنوی ان کے حوالہ کیا تھا محض طلب گاری تولیت

کے لئے ہو۔ طلب گاری میراث کے لئے نہ ہو۔

کیونکہ جب یہ بات آنکھوں دیکھ چکے ہوں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جو جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک شخص نے لحاظ نہ کیا، دوسروں کا لکھا لکھایا کاغذ پھاڑ ڈالا ہو۔ وہ ہمارا کیا لحاظ کریں گے؟ اور وہ بھی اپنی حکومت میں ہم تو دوسری درجہ میں ہیں، خیر یہ بات تو غلط ہے کہ ابو بکر صدیق نے کاغذ لکھ دیا ہو اور حضرت عمر نے پھاڑ ڈالا، پر اتنی بات صحیح ہے کہ اول بار کا حضرت علی اور حضرت عباس کا آنا بھی محض طلب گاری تولیت کے لئے تھا۔ چنانچہ لفظ اَدْفَحْہَا اِلَیْنَا سے یہ بات خود ظاہر ہے، جو لوگ مذاق سخن شناسی رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں، باقی یہ بات کہ طلب تولیت میں ان دونوں صاحبوں کو کیا فائدہ تھا۔ جو خلیفان اپنے سر دھرنا تجویز کیا تو اس کا جواب یہ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال کہ وقف بنوئی منجملہ مصارف حق اقربائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقدم ہے۔ اس سے بچے تو اور کہیں صرف کیا جائے، خاص کرنے میں تو اشارہ خداوندی بھی موجود ہے چنانچہ اس لئے ذی القربے کو اور دوسرے مقدم ذکر فرمایا، اور حدیثوں سے بھی اس قسم کے مضمون نکلتے ہیں۔

مگر خلیفہ کو اول تو تمام خلافت کا انتظام درپیش ہے۔ فقط اوقات ہی کا انتظام ان کے ذمہ نہیں جو بہت تن اس کی طرف متوجہ ہو کر تردد کامل کر آئیں، معذرا جن کو کچھ اوقات سے توقع ہو جس قدر ان کے جی کو لگی ہوئی ہوگی۔ وہ دوسرے کے دل کو کاہے کو لگی ہوئی ہوگی اس لئے حضرت علی اور حضرت عباس خواستگار تولیت ہوئے ہوں، اور حضرت عمر نے بھی بلحاظ وجہ مذکورہ اور نیز یوں سمجھ کر کہ جو حال بنی ہاشم کہ فلانا محتاج ہے فلانا نہیں، فلانے کو اس قدر حاجت ہے فلانے کو اس قدر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو معلوم ہوگا۔ وہ مجھے کاہے کو معلوم ہوگا۔ اور یہ اندیشہ باقی ہی نہیں رہا کہ کوئی اس دینے کو میراث کا دینا سمجھے، کیونکہ کَاْخُوْرَتْ مَا تَرَ کُنَّا کَاْصَدَقَۃً کا گھر گھر غل پڑ گیا، یہ بات قبول فرمائی ہو، اور یا انہم بنظر احتیاط تقسیم نہ فرمایا۔ تاکہ مبادا رفتہ رفتہ بہت زمانوں کے بعد کوئی جاہل یوں نہ سمجھ جائے کہ حضرت فاطمہ اور حضرت عباس کو مالک سمجھا تھا۔ جب تقسیم کر دیا۔

مگر حضرت ابوبکر صدیق نے بطور تولیت بھی کسی کو دینا گوارا نہ کیا۔ کیونکہ حضرت فاطمہ کی طلب میراث کا تازہ قصہ تھا، اس قصہ سے سب کے کان پڑتھے۔ اس وقت اگر بطور تولیت ہی دیتے۔ ہر کوئی اس دینے کو بطور میراث ہی سمجھتا کہ خود شاعت کتناہ صدقہ اگر سنا بھی ہوتا تب کسے دھیان آتا۔ ؟

خائن و غادر مبالغہ استعمال اور یہی وجہ فی الجملہ موجب گرانی خاطر حضرت علی اور حضرت ہوئے۔ جیسا کہ محاورہ ہے عباس معلوم ہوتی ہے، جس کو حضرت عمر غصہ کے باعث بایں الفاظ تعبیر فرماتے ہیں کہ تم ابوبکر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھتے تھے کیونکہ تمام جہان کا دستور ہے اور نیز کلام اللہ اور احادیث سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی سے کسی موقع میں معاملہ قلبی کے برخلاف کوئی بات ظہور میں آتی ہے، تو بطور مبالغہ اس کے ساتھ معاملہ قلبی کی بھی نفی کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً فی ما بین اقرباء احباب اگر کسی سے کسی قسم کی بے اعتنائی اور بے پرواہی کسی وجہ خارجی کے باعث ظاہر ہوتی ہے، تو مبالغہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ ہمارے قریب یا دوست کیوں ہوئے تھے یا یہ ہم کو اپنا قریب اور دوست ہی نہیں سمجھتے۔

سو قرابت اور رشتہ داری نسبی کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ تو کسی طرح زائل ہو ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ بے اعتنائی اور بے پرواہی سے، اور دوستی کا حال بھی تو ظاہر ہے کیونکہ بے اعتنائی اور بے پرواہی کی جو احباب کو شکایت ہوتی ہے۔ تو بوجہ ثبوت محبت اور بقائے الفت ہوتی ہے۔ ورنہ اجنبیوں سے کون شکایت کرتا ہے، علی ہذا القیاس حضرت علی اور حضرت عباس کی جانب سے جو فی الجملہ کشیدگی اور گرانی خاطر حضرت صدیق اکبر سے جس کا ابھی بیان تھا، ظہور میں آئی۔ تو یہ گرانی خاطر اور یہ کشیدگی جو بظاہر فی الجملہ اطمینان قلبی اور اعتبار دلی کے مخالف تھی۔ جو ان دونوں کو (بہ نسبت) صدیق اکبر کے حاصل تھی۔ کیونکہ اس سے نظر عوام میں بے اعتباری کی پو آتی تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس اعتبار کو جو ان کے دل میں مرکوز تھا نفی کر کے مبالغہ ان کی طرف بے اعتباری کو منسوب کیا اور دلیل اس بات کی کہ یہ کلمہ مبالغہ فرمایا تھا بیان حقیقت مد نظر نہ تھا،

خود ظاہر ہے کیونکہ حدیث کا خورث ما ترکنا صدقہ کے خود مقرر تھے۔ نہیں تو یوں بھی کہتے کہ ان کے نزدیک صدیق اکبر نے متروکہ نبوی زبردستی سے دبا رکھا تھا۔ اور ان کے عقیدہ کے موافق وہ غادر خائن کاذب آثم تھے۔

حضرت عمر کا عقد مبالغہ کی دلیل ہے | معہذا حضرت عمر کا قرینہ غضب خود اس کے ارادہ کے لئے مصحح ہے۔ لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کے فہم پر اور جن کے ہنوں نے ایسی تعلیم پائی ان کے فہم پر کہ ایسی بات کو جو تمام عالم میں مروج ہو۔ اس زمانہ میں بھی کہ پیشوا شیعہ ہو گزرنے نہیں سمجھتے کوئی ان کا مدار بہت سے بہت تو جیسہ کرے۔ تو یہ کربے کہ مولوی صاحب سمجھتے تو ہیں۔ لیکن ابلیس بعین کی روح کو خوش کرنے کے لئے دیدہ و دانستہ فریب سے تحریف معافی کرتے ہیں یہ سب نہیں کہ حضرت عمر کا یہ کہنا تو انہیں یاد رہا کہ تم حضرت صدیق اکبر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھتے تھے۔ اور یہ یاد نہ رہا کہ انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا وَاللّٰهُ يَغْلِبُ اِنَّهُ لَصَادِقٌ بَاثِلٌ اَشِدُّ تَابِعَ الْحَقِّ يَعْنِي اللّٰهُ خُوب جانتا ہے کہ ابوبکر صدیق بیشک سچے نیک اطوار ہدایت پر حق کے تابع تھے۔ الحاصل مولوی صاحب کی کم فہمی یا فریب بازی ہے۔ جو ایسی یہودہ باتیں فرماتے ہیں کہ کہیں کا سر کہیں کا پاؤں، ورنہ بمعنی مذکور عرف میں ایسے کلاموں کا مروج ہونا وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنکو عقل نہیں، چہ جائیکہ اہل عقل۔

مبالغہ کلام اللہ میں۔ بطور محاورہ | اور اگر اس پر بھی اس قسم کے محاورات کی تصحیح کے لئے کلام ربانی ہی کی سند مطلوب ہو تو اپنی پڑی کو ہم اس سے بھی درگزر نہیں کرتے اس لئے یہ آیت حَتّٰی اِذَا سْتَيْسَسَ الرَّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوْۤا جَاۤءَهُمْ نَصْرُنَا جو سورہ یوسف کے رکوع آخر میں موجود ہے۔ گوش گزار ہے، اس کے بظاہر یہ معنی ہیں یہاں تک کہ جب رسولوں کو ناامیدی ہونے لگی، اور وہ یوں خیال کرنے لگے کہ ان سے جو کچھ امداد کے باب میں خدا کی طرف سے وعدہ وعید تھے۔ سب جھوٹ تھے، ہماری مدد ان کے لئے آپہنچی فقط، مگر سب اہل اسلام جانتے ہیں کہ انبیاء کی شان بہت بعید ہے کہ خدا سے ناامید ہوں۔ اور کیوں کر ناامید ہوں۔ اس صورت میں اس رکوع سے پہلے

رکوع میں یہ جملہ بھی موجود ہے اِنَّهٗ لَا يَنْتَظِرُ مِنْ سَرَفِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ جس کا یہ مطلب ہے، بیشک ناامید نہیں اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔ پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکتا ہے کہ رسول اور ناامید ہو جائیں، سو اگر حضرت عمر کی صدق روایات کے بھروسے باتباع مرتضوی صدیق اکبر کو مولوی صاحب کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہیں تو خداوند کریم تو حضرت عمر سے زیادہ ہی سچے ہیں۔ خدا کے فرمانے کی تصدیق کر کے رسولوں کو خدا کی امداد سے ناامید سمجھ کر حسب ایمان آیت اِنَّهٗ لَا يَنْتَظِرُ اِلَّا الْعَوْدَ بِاللّٰهِ کافر سمجھنے لگیں۔

علیٰ ہذا القیاس رسولوں کی نسبت جو اسی آیت میں مذکور ہے کہ دعائے خداوندی میں ان کو خیال دروغ ہوا تو اس میں لازم ہے کہ مولوی صاحب رسولوں کی اتباع میں کمرچسپ باندھیں۔ سو اول تو اکثر محاورات کلام اللہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خیال بال جو کسی وجہ سے جی میں جم جایا کرتا ہے۔ اور اس کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس کو ظن کہا کرتے ہیں چنانچہ سورہ جاثیہ میں کفار کے اس عقیدہ کی نسبت کہ مرنے کے بعد پھر کوئی اٹھایا نہ جائے گا۔ اور لوگوں کا مارنے والا زمانہ ہے، یوں ارشاد ہے کہ اِنَّهُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ یعنی وہ یوہی اُٹھوں کی باتیں کرتے ہیں۔ الغرض کفار کو اپنے اس عقیدہ میں شک تھا۔ مگر چونکہ ایک خیال غلط تھا جناب ہاری نے اس کو بلفظ ظن تعبیر فرمایا، ایسے ہی اس مضمون میں سورہ الشقت میں اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحْوِطَ فرمایا۔ سو اس محاورہ کے موافق اگر ظَنُّوا اِنَّهٗم قَدْ کَذَبُوْا کے معنی لیجئے تب تو مولوی صاحب کو لازم ہے کہ نعوذ باللہ بزعم خود باتباع پیغمبران برگزیدہ خداوند کریم کے وعدوں کو بالیقین چھوٹا سمجھیں۔ اور اگر موافق مشہور ظن کے معنی گمان غالب یا شک سمجھتے تب مناسب یوں ہے، کہ رسولوں کو تو یوں سمجھیں کہ ان کو خدا کے کہے کا یقین نہ تھا۔ اور اس وجہ سے نعوذ باللہ انہیں کافر سمجھیں۔ اور اپنے آپ ان کا اتباع کر کے دین و ایمان کو برباد کریں۔

اور اگر یوں تاویل کیجئے کہ رسولوں کو جو ظن دروغ تھا یہ نسبت خداوند

صادق القول نہ تھا۔ بلکہ نصرت کے دیر ہونے سے یوں سمجھے کہ اگر وعدہ ہائے نصرت وعدہ ہائے خداوندی ہوتے، تو لاجرم ان وعدوں کا ظہور ہو لیتا اتنی دیر نہ لگتی، ہونہ ہو یہ وسوسہ شیطانی تھے وعدہ ہائے خداوندی نہ تھے تو اس صورت میں اول تو ہمیں کچھ نقصان نہیں، جو کچھ بہ نسبت یا س مرقوم ہو چکا وہی کافی ہے، دوسرے ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ انبیاء کو وحی پر اطمینان نہ ہو، نعوذ باللہ، سو یہ تو ہم جانتے ہیں۔ شیعہ بھی تسلیم نہ کریں، کیونکہ جب انہیں ہی یقین نہیں تو پھر کس کو ہوگا؟ پھر چاہیے کہ ایمان ایک معنی بے مصداق ہو جائے، کیونکہ ایمان کو یقین لازم ہے، پھر اگر اپنے اطمینان کے لئے معنی اس طرح کریں گے کہ ان کو بمقتضائے بشریت بے اختیار یہ خطرات دل میں گذرتے تھے۔ اس کو خداوند کریم نے بلفظ ظن (خواہ اپنے معنی میں ہو یا بمعنی یقین) مبالغتہ تعبیر کر دیا ہے۔ تو یہ وہی بات ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے۔ سو حضرت عمر کی بات کو بھی ایسا ہی سمجھئے

مگر ہاں اگر یوں کہیے کہ نعوذ باللہ خدا کی طرف بوجہ بد ا کذب کا احتمال ہو سکتا ہے۔ حضرت عمر کی طرف یہ احتمال نہیں، تو البتہ ہم کو مشکل ہی مگر اس کے لئے بد ا کے ابطال کی تقریر کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ بہر حال انبیاء کی نسبت خداوند کریم کا یہ فرمانا کہ وہ مایوس ہو گئے، یا ان کو خدا کی نسبت یا وحی کی نسبت احتمال دروغ ہوا، بجز اس کے صحیح نہیں ہو سکتا، کہ موقع تعریض و عتاب میں مبالغتہ فرما دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبت رہا، اور آپ ایسے خیالات میں نہ پڑ جائیں یا کسی اور وجہ سے مبالغتہ فرما دیا ہے، سو ایسے ہی حضرت عمر کے قول مذکور کو بھی سمجھئے۔ بہر حال یہ آیت ہمارے مطلب کے لئے ثبوت کامل ہے۔ اور اسی قسم کی اور بہت سی نظیریں اہل فہم کلام اللہ سے نکال سکتے ہیں، کہ اگر معنی ظاہری مراد لیجئے۔ اور قرآن صاف کہ کچھ خیال نہ کیجئے۔ تو دین ایمان کی خیر نہیں، سو اگر مولوی صاحب کو کچھ ایمان کا درد ہے تو پھر خواہ مخواہ معنی ظاہری پر جو بے لحاظ قرآن خارجیہ کے متبادر الی الفہم میں کچھ لحاظ نہ کریں، بلکہ معنی مقصود ربانی پر نظر رکھیں۔

یعنی آیت حتی اذا اسیس المرسل کے یہ معنی لیں کہ انبیاء کے تہ دل میں تو یقین ہی تھا کہ وعدہائے الہی صادق ہیں۔ ایک نہ ایک روز بیشک امداد الہی آنے والی ہے غرض دل سے کوئی صورت انقطاع امید اور ظن دروغ کی نہ تھی پر جیسے بمقتضائے بشریت ہمارے تمہارے دل میں خداوند اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خیالات فاسد اوپر کے دل میں آجاتے ہیں۔ اور اس سے اعتقاد قلبی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ایسے ہی انبیاء کے دل میں بھی بمقتضائے بشریت بہ نسبت وعدہائے الہی خیالات فاسد بے اختیار گزر جاتے تھے۔ اور خدا نخواستہ اطمینان قلبی میں کچھ فتور نہ تھا، جو یوں کہیے کہ وہ واقعی ناامید ہو گئے تھے۔ اور یقین ہو گیا تھا کہ وعدہائے الہی محض دروغ تھے یا ان کے صدق کا یقین نہ رہا تھا مگر چونکہ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے (کوئی تہ دل میں نہ ہوں) اور بے اختیار ہی آتے ہوں، ظاہر نظر میں یوں ہی کہتے ہیں کہ دل میں اعتقاد ہی نہیں یہ بات بعد تامل ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فقط اوپر کے خیالات ہیں،

تو خداوند کریم نے بھی برعایت ظاہر بطور مبالغہ متعارف ان خیالات کو ملفوظ ظن اور بے قراری اور بتیابی بشری کو جس کے لوازم میں سے یہ خیالات ہیں، ملفوظ یا تعبیر فرمایا، لیکن اسی طرح اگر حضرت علی اور حضرت عباس کی نسبت حضرت عمر کے اس فرمانے کو کہ تم صدیق اکبر کو اور مجھ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہو، حضرت علی اور حضرت عباس کی کشیدگی اور شکایت دلی پر (جو بمقتضائے بشریت برخلاف اعتقاد اور محبت قلبی کے جو تہ دل میں جمی ہوئی تھی، اوپر کے دل میں گذرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی) ان محمول کریں، تو اس سے زیادہ اور تو کچھ گناہ نہ ہو گا۔ کہ کلام اللہ کی ایک روش اختیار کی اور یہ بات تو حضرت علی اور حضرت عباس نے منہ سے نکالی بھی نہ تھی، احتمال ہے کہ حضرت عمر ہی غلط سمجھ گئے ہوں، کہ دونوں صاحب کچھ اس قسم کا خیال تہ دل میں یا اوپر کے دل میں رکھتے ہیں۔

حضرت عباس نے ہی الفاظ حضرت علی کے ہم تو اس کے یہی معنی سمجھتے ہیں۔ جو حضرت عباس لئے گئے جو حضرت عمرؓ نے ان کی نسبت کہے

حضرت علی کو بالموافقہ مجمع عام میں اسی جگہ

میں بعینہ ہی الفاظ کہے ہیں، چنانچہ اسی حدیث میں جس کے حوالہ سے مولوی صاحب
حضرت عمر کا حضرت علی اور حضرت عباس کو یوں کہنا کہ تم صدیق اکبر کو کاذب خائن
وغیرہ سمجھتے ہو ثابت کرتے ہیں موجود ہے، مگر اس کو کالہے کو نقل کرتے، یہ تو صدیق
اکبر ہی سے ضد ہے، بہر حال سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے۔ جو میں نے عرض
کی، ورنہ حاشا دلا جو حضرت علی اور حضرت عباس کے دل میں ذرہ برابر صدیق کی طرف
سے بدگمانی ہو۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنی تیرہ درونی کے باعث حضرت
عمر بھی اگر لحاظ ظاہریوں فرمادیں۔ کہ حضرت علی کے دل میں صدیق اکبر کی طرف سے
کچھ فرق ہے تو بے تحقیق اعتبار کر لیں۔ اور حضرت خود اپنی زبان مبارک تمہیں کھا کھا
کر ایسے کمالات جو لگ بھگ مرتبہ نبوت کے ہیں۔ صدیق اکبر کی تعریف میں بیان
فرمائیں۔ اور علیؑ ہذا القیاس اور ائمہ نے چنانچہ سابقاً بحوالہ کتب معتبرہ شیعہ
مفصلاً مرقوم ہو چکا ہے۔

لیکن اس پر بھی کیا امکان جو مولوی صاحب کے اور سوان کے اور شیعوں
کے دل میں کافر ٹوٹے۔ سبحان اللہ کیا سمجھ ہے۔ صدیق اکبر کی ہجو کریں، تو حضرت عمر
بھی معتبر ہو جائیں، اور تعریف ہو تو پھر حضرت علیؑ بھی کہے جائیں، کوئی نہیں سنتا، کسی
نے سچ کہا کُلُّ شَیْءٍ یَزِجُ اِلٰی اَصْلِهِ۔ ہم تو نہیں سمجھ سکتے۔ پر شیعوں کے طور پر مولوی صاحب
کی وہی مثل ہے کہ حضرت موسیٰ کے سینکڑوں معجزوں پر بھی بنی اسرائیل سیدھے نہ ہوئے
اور سامری کے ایک طلسم پر دین ایمان کھو بیٹھے۔ اس تقریر کے بعد مولوی صاحب کو اپنے
اس چرپوز اعتراض کی فلعی کھل گئی ہوگی۔ اور اگر بائیں ہمہ بوجہ بلاغت نہ سمجھیں۔ اور
یہ دل نشین رہے کہ حضرت عمرؓ نے جو کہا وہ واقعی تھا، نہ اس میں کچھ غلطی ہے نہ اس
کے سوائے ظاہری معنوں کے اور کوئی معنی۔

تو میری عرض یہ ہے کہ بیش بریں نیست حضرت علی اور حضرت عباس کے
دل میں بھی بات ایک دفعہ کو جم گئی ہو، کہ صدیق اکبر نے خیانت کی اور جھوٹ
بول دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاذب و مکرر کناہ صدقہ فرمایا،

لیکن مولوی صاحب فرمائیں تو سہی کہ اتنی بات سے ان کے کیا ہاتھ لگا؟ حضرت
 موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے دست و گریبان ہونے کا قصہ مشہور و معروف
 ہے، اس کا سبب بجز اس کے اور بھی کچھ تھا کہ حضرت موسیٰ بایں وجہ کہ ان کی یہ خلقی
 بات تھی، کہ خلاف شریعت اور مخالف حکم الہی دیکھا نہیں۔ اور ان کے تن بدن میں
 آگ لگی نہیں، ذرہ برابر اگر کہیں خدا کی نافرمانی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر تھکے نہیں تھمتے
 تھے، طور سے لوٹ کر جب پھڑے کی پوجا پاٹ دیکھی۔ تو ایک دفعہ ہی یوں سمجھ گئے
 کہ بنی اسرائیل نے کیا تو کیا حضرت ہارون بھی ان کے شریک حال ہو گئے یا انہوں
 نے بنی اسرائیل کو نہ روکا۔ جو یہ فساد پھیل گیا۔ بہر حال ان کو شریک حال سمجھایا یوں
 سمجھا۔ کہ انہوں نے کسی کو روکا نہیں، لیکن اس سمجھنے میں اول تو حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کو کچھ شک نہیں رہا تھا۔ نہیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی کہ ان کے سر بال اور ڈوڑھی
 پیکر کر اپنی طرف کو کھینچتے، فقط شک اور تردد میں اتنی پیش قدمی تو کم عقل بھی نہیں
 کرتے چہ جائیکہ حضرت موسیٰ جن کا کمال عقل بالیقین معلوم ہے۔

حضرت علی اور حضرت عباس خطا و بدگمان تھے | دوسرے بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت
 موسیٰ علیہ السلام کی غلط فہمی تھی۔ جو یوں سمجھے حضرت ہارون علیہ السلام
 اول تو بنی معصوم تھے ایسے امور میں شریک ہونا یا منع نہ کرنا، ان سے منجملہ محالات
 دوسرے اگر معصوم نہ ہوتے، تب واقع میں ان سے کچھ خطا نہ ہوتی تھی، بے تحقیق
 فقط ظاہر حال کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ حضرت ہارون سے درباب نہیں عن المنکر تقصیر ہوئی یا
 خود ان کے شریک حال ہو گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ سے باہر نکل گئے۔ ورنہ
 حضرت ہارون بہر طور بے خطا تھے، شریک حال ہونا تو کجا؟ منع اور زجر و توہین
 میں انہوں نے اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی تھی، تقدیر بات راست نہ آئی

اب دیکھئے کہ جب ایک معصوم دوسرے معصوم سے اتنے بدظن ہو جاتے
 ہوں کہ نوبت ہشت مشیت کی پہنچی۔ تو حضرت علی اگر فی الجملہ کچھ حضرت ابو بکر کی طرف
 سے بدگمان ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ اور اہل سنت کو اس کی تسلیم میں کیا

دشواری ہے۔ نہ ابو بکر صدیق ان کے نزدیک معصوم! جو ان کے کذب و خیانت کے منسوب ہونے میں کسی رکن ایمان کا تھامنا مشکل پڑ جائے، نہ حضرت علی ان کے اعتقاد میں معصوم، کہ ان کی طرف غلط نہی کی نسبت کرتے کچھ جی ڈرے اور پھر باہنہ ہنوز یہ بھی متحقق نہیں کہ بالیقین حضرت علی کے جی میں صدیق اکبر کی طرف سے کچھ گمان فاسد ہوا فقط حضرت عمر نے اپنے عندیہ کے موافق وہ بھی مبالغہ ایک بات کہہ دی ہے، ورنہ حضرت علی کا بہ نسبت حدیث لاخوڑت و اترکنا صدقہ اقرار کرنا۔ اور پھر حد سے بڑھ کر صدیق اکبر کی تعریفیں کرنا چنانچہ سابقاً مرقوم ہو چکا ہے، خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ دل مرتضوی لبریز حسن اعتقاد صدیق اکبر تھا

اس پر بھی اگر مولوی صاحب (نہ عم خود) باتباع حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، صدیق اکبر کو کاذب و خائن و غادر و آثم سمجھتے ہیں، تو بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام تو دو قدم آگے بڑھ کر ان کے عصیان اور شراکتِ شرک کا چھاتی ٹھوک کر اقرار کریں گے، کیونکہ اول تو حضرت موسیٰ علیہ السلام معصوم اور نہ عم شیعہ معصوم غلط نہی سے بھی معصوم، ورنہ پہل سنت پر یہ طعن کیوں ہوتا کہ ان کے امام ابو حنیفہ وغیرہ غلطی کھا سکتے ہیں، دوسرے حضرت موسیٰ کا بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام بالیقین خطا وار سمجھنا بالیقین معلوم ہے۔ تو اس صورت میں کوئی صورت مولوی صاحب کو اس عقیدہ میں کمی کرنے کی نہیں۔

امام کی اتباع میں شیعہ اگر صدیق کو برا کہیں | اور حضرت عباس حضرت علی کے بھی جبرگ ہیں تو حضرت عباس کے اتباع میں امام کو بھی کہیں | دین کے نہیں۔ نسب ہی کے سہی۔ تھوڑا بہت کچھ ان کا بھی اتباع چاہیے بہت نہیں۔ تھوڑا ہی سہی۔ معہذا حضرت عباس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، چنانچہ بحوالہ قاضی نور اللہ شوستری مرقوم ہو لیا، تو ان کی بات بادلن تولہ پاؤرتی کی نہیں، تو کچھ تو اعتبار رکھتی ہوگی، جو جس سند سے مولوی صاحب کو صدیق اکبر کی نسبت حضرت علی کا کاذب سمجھنا کچھ معلوم ہوا ہے! اسی روایت میں حضرت عباس کا حضرت علی مرتضیٰ کو بے بینہ اسی طرح برا کہنا، اس سے بھی پہلے مذکور

بلکہ شاید حضرت عمرؓ نے بھی انہیں کی بات سے سمجھا ہو کہ ایسے معاملات میں اتنے رنج میں ایک دوسرے کو کاذب وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اسی قیاس پر انہوں نے کہہ دیا کہ تم صدیق اکبرؓ کو ایسا سمجھتے ہو۔ سو بحکم محبوبیت پیغمبر ﷺ و سلم اور بزرگی حضرت علیؓ حضرت عباسؓ کا بھی اقتداء چاہیئے۔ اگر عذر بے اعتفادی ہے تو بہت نہیں تھوڑا ہی سہی، وہ؟ کیا دین و کیا آئین ہے جس مذہب کے ایسے دلائل ہیں وہ خود مذہب کیا ہوگا؟

ع. ب. قیاس کن ز گلستان من بهار مرا

اب ایک بات شرح دلب باقی رہی، مگر اس کے بیان میں متردو
بایں خیال کہ وہ بات شاید کسی کے خیال میں آجائے تو یہ اندیشہ ہے کہ مبارا کسی متردو
کو تردد پیدا ہو۔ یا کسی متعصب کو جاگشت نہاد ملے، اور جب یہ بھی خیال آتا ہے
کہ کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ روٹی نہ کھائیے۔ تو بھوکے مرئے، اور کھائیے تو ہیفہ میں جان
سے گذریے، ڈرتا ہوں کہ شاید کم فہم نہ سمجھیں۔ اور بیٹھے بٹھلائے گمراہ ہوں۔ میں اگر نہ
لکھوں تو شاید خبر بھی نہ ہو۔ لیکن بایں خیال کہ روٹی کو خداوند کریم نے نفع ہی کے لئے بنایا ہے
نقصان ہو جائے تو اتفاق ہے۔ اس لئے ہیفہ کے اندیشہ سے کوئی کھانا نہیں چھوڑ دیتا
میرا کلام تو کیا چیز ہو۔ خود کلام ربانی میں کلام ربانی کی نسبت یوں فرماتے ہیں۔
يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَ يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا لَّا تَحْزَنُ اَلْمَـٰرَاةُ اَوَّلُ هِيَ هَادِيَةٌ لِّلْاِنْسَانِ اَسْوَءُ مِنْ شَرِّ الْكَلْبِ اِنَّهُ يُصِيبُ النَّاسَ وَ لَا يَعْلَمُونَ
جب خداوند کریم نے اپنی بات کو کسی سے نہ چھپایا ہو۔ میں اپنے جی کی بات
کیوں چھپاؤں۔

جیسے کلام ربانی اصل ہدایت کے لئے ہے، یوں کوئی اپنی کج فہمی سے بے راہ ہو
تو ہو، ایسے ہی وہ باتیں جو کلام اللہ و حدیث سے مستنبط ہوتی ہیں۔ اصل میں ہدایت
ہی کے لئے ہیں۔ یوں کوئی بات کے مغز کو نہ سمجھے، اور بہک جائے تو اپنا سر کھائے
بہر حال اُنکھنا ہی مناسب سمجھ کر لکھتا ہوں۔

ترکہ نبوی کے میراث ہوتے ہیں | حدیث مالک بن انس مذکور میں جس کے بعض مضامین استدلال اور اس کے جوابات مولوی صاحب نے رقمہ کریمہ میں درج فرمائے ہیں، اور

اس کو روایت صحیح مسلم کہا ہے، یوں مرقوم ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی اور حضرت عباس کو اسی جلسہ میں جس میں یہ دونوں صاحب جھگڑتے ہوئے آئے تھے بغرض الزام یوں بھی فرمایا تھا۔

قُلْنَا تُوْفِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَبُو بَكْرٍ أَنَا وَبَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ نَتَّظِلُ بِمِيرَاثِكَ مِنْ ابْنِ أَخِيكَ وَمِثْلُكَ هَذَا مِيرَاثُ امْرَأَتِهِ مِنْ أَبْنَاهَا فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا خَوْرِثُ مَا تَرَكَنَا هُ صَدَقَةٌ. اس کے بعد یہ ہے قُرْأَيْمًا كَا كَا ذِبَا اَثْمًا غَادِرًا خَائِنًا

حاصل مطلب یہ ہے کہ «بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ وسلم جب حضرت صدیق اکبر خلیفہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اب میں ہوں ساری باتوں کا دل اور مولے تو تم دونوں آئے تم تو اپنے بھتیجے کی میراث مانگتے تھے، اور یہ اپنی بیوی کی طرف سے ان کے باپ کی میراث مانگتے تھے، اس پر صدیق اکبر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے لَا خَوْرِثُ مَا تَرَكَنَا هُ صَدَقَةٌ سو تم نے انہیں کاذب آثم غادر خائن سمجھا، فقط

اس سے دو باتیں اہل سنت کے قول کے خلاف معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ حدیث لَا خَوْرِثُ مَا تَرَكَنَا هُ صَدَقَةٌ کو اہل سنت یوں کہتے ہیں کہ اس کے راوی حضرت علی اور حضرت عباس بھی ہیں، اور اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خبر بھی نہ تھی۔ ورنہ اہل سنت کے اعتقاد کے موافق حضرت علی تو حضرت علی ہیں حضرت عباس کی طرف بھی گمان نہیں ہو سکتا، کہ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیا ہو کہ لَا خَوْرِثُ مَا تَرَكَنَا هُ صَدَقَةٌ پھر طلب گار میراث ہوں، دوسرے یہ بات ہے کہ لفظ میراثک اور لفظ میراث امر اتہ اور نیز صدیق اکبر کا یہ جواب دنیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ لَا خَوْرِثُ مَا تَرَكَنَا هُ صَدَقَةٌ صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ دونوں طالب میراث ہوئے پھر حبانوں صاحبوں کو حدیث مذکور کی خبر ہی نہ ہوئی۔ ثواب یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا صدیق اکبر کو کاذب وغیرہ سمجھنا

اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے ان کی میراث نہ دی۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی اس نہ دینے ہی کی تفریع میں یہ بیان فرمایا ہے۔
 فرایتما کہ کاذباً الخ یواس صورت میں یہ توجیہ ہی غلط ہو گئی کہ حضرت علیؓ کو صدیق اکبرؓ
 باینوجہ کچھ کشیدگی تھی کہ وہ ان کی تولیت تک کے روادار نہ ہوئے۔ اور اس
 کشیدگی ہی کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم صدیق اکبرؓ کو کاذب سمجھتے تھے اور یا انہم
 جب میراث کے نہ دینے کی وجہ سے ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبرؓ کو کاذب
 خائن وغیرہ سمجھا، تو اب بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتا۔ تہ دل سے کاذب وغیرہ سمجھا
 ہو، کیونکہ کسی کی میراث کا نہ دینے والا بالیقین خائن ہے۔ البتہ اگر اس حدیث میں
 یوں مذکور ہوتا، کہ ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبرؓ سے بھی تولیت ہی مانگی،
 جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مانگی تھی پر صدیق اکبرؓ نے تولیت سے بوجہ مذکورہ یا بوجہ
 دیگر انکار کیا۔ تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی، کہ تولیت کے نہ دینے میں کچھ ستم
 نہیں، تولیت کسی کا حق نہیں، خلیفہ کو اختیار ہے، جسے چاہے اپنی سمجھ کے
 موافق متولی کرے۔

جواب اول | اب ان دونوں اعتراضوں کا جواب بگوش ہوش سنئے۔ اول تو اگر ہم
 فرض کریں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے تولیت ہی صدیق اکبرؓ سے طلب کی تھی
 تب ان الفاظ سے کچھ اس کے مخالف اشاء اللہ تعالیٰ نہ نکلے گا۔ اور یہی الفاظ جو
 حدیث میں مذکور ہیں طلب تولیت پر محمول ہو جائیں گے، گو ظاہر میں طلب میراث
 ہی پر دلالت کریں وجہ اس کی یہ ہے کہ سابق میں معنی میراث کی تحقیق میں گزر چکا ہے
 کہ میراث کے معنی حقیقی بھی قائم مقام ہونا ہے۔ پر اصطلاح فقہاء میں میراث بمعنی
 مشہور میں مخصوص ہو گیا ہے۔

دوسرا جواب | اور اگر معنی حقیقی نہیں تب اس میں تو کلام ہی نہیں کہ مجاز متعارف ہے
 چنانچہ محاورات قرآنی میں بہت مواقع میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔

إِنَّ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ بِدِينِهِمْ وَأَوْثَرُ النَّاسِ الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا

يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا خُزُنٌ
ثَرَاتُ الْأَرْضِ وَمَنْ عَلَيْهَا

اور سوا ان کے اور بھی آیات میں یہی معنی مراد ہیں، اول دو آیتوں کا ترجمہ تو گزری چکا ہے۔ اور تیسری آیت کا حاصل یہ ہے کہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے ہم زمین کے وارث ہوں گے اور جو زمین پر رہنے والے ہیں ان کے بھی، اور ظاہر ہے کہ بمعنی مشہور خداوند کریم کسی کا وارث نہیں، الحاصل ان آیات میں میراث سے میراث بمعنی قائم مقام ہونے کے مراد ہے۔ سو تولیت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ متولی وقف کرنے والے کا قائم مقام ہوتا ہے، اس صورت میں میثرائٹ من ابن اخیک اور میراث امراتہ میں ابیہا کے یا تو یہ معنی ہوں گے کہ تم تو اے عباس اپنے بھتیجے یعنی سرور کائنات علی آلہ افضل الصلوات کے قائم مقام ہونے کے اور ان کے ترکہ کے متولی ہونے کے طلبگار تھے اور یہ یعنی حضرت علی اس ترکہ میں اپنے خسر یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہونے کے خواستگار تھے۔

اس تقریر پر تو کلمہ من جو من ابن اخیک اور من ابیہا میں ہے صلہ میراث ہوگا۔ اور مجموعہ صلہ اور موصول کا حاصل قائم مقام ہونا نکالے گا۔ اور یا یوں کہیے۔ کہ قائم مقام ہونا فقط لفظ میراث کا مدلول ہے اور لفظ میراث کا صلہ اگر ہے تو مخدوم ہے اور کلمہ من مذکور سبب یہ ہے اور حاصل مطلب یہ ہو کہ تم تو بھتیجے کی وجہ سے تولیت کے قائم مقام ہونے کے طالب ہوئے اور حضرت علی خسر کر کے طلبگار ہوئے یہ دو وجہ ہیں تو بایں نظر ہیں کہ میراث کے یہ معنی نہیں جواب معروف ہیں۔

تیسرا جواب اور اگر پاس خاطر شیعہ میراث کو باعتبار معنی حقیقی معنی معروف ہی میں منحصر رکھیں اور پھر اس کو کسی دوسرے معنی کی طرف منقول بھی نہ کہیں، یا اس جگہ بجز معنی معروف عوام کے اور معنی مستبعد معلوم ہوں۔ تب بھی یہ کلام معنی مذکور پر دلالت کرنے میں کمی نہ کرے گا، ہو سکتا ہے کہ بطور تشبیہ حضرت عمر نے طلبگاری تولیت کو بوجہ استحقاق قرابت میراث فرمایا ہو اور بوجہ قرابت استحقاق جہاں تولیت کے طلب کرنے کو

طلب میراث سے حسب قدر مشابہت ہے، ظاہر ہے اور یہ تو جیہہ جب ہی بن پڑتی ہے۔
 جبکہ مادہ میراث کو معنی معروف میں منحصر نہ رکھئے، بلکہ بدستور معنی معروف غیر معروف
 میں عام سمجھئے۔ چنانچہ ظاہر ہے باقی اس صورت میں اگر کوئی طالب قرینہ صارفہ ہے
 جو ارادہ معنی حقیقی سے روکے، تو اس سے زیادہ اور کیا قرینہ ہوگا کہ دو چار سطریں
 پہلے حضرت علی اور حضرت عباس کا اقرار گزرا ہے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم نے فرمایا ہے کہ لا خورث ما ترکنا صدقہ

لیکن یہ بات قابل بیان باقی رہی، کہ ہم نے مانا یہ تینوں توجہیں صحیح ہیں؛
 اور حضرت علی اور حضرت عباس تولیت ہی کے طلبگار ہوئے تھے طالب میراث نہ ہو
 تھے۔ لیکن صدیق اکبر کے اس جواب کو کہ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 لَا خَورِثَ مَا تَرَكَنَا صَدَقَةٌ طَلَبُ تَوَلِيَّتٍ سے کیا علاقہ؟ کیونکہ بالیقین اس حدیث
 میں میراث سے معنی معروف مراد ہیں، اس صورت میں اس سوال و جواب کا وہی حال
 ہوگا جیسا مشہور ہے ”سوال از آسمان جواب از زمین“ یا جیسے مثل مشہور ہے
 ”وزمین کی کہیں تو آسمان کی سنیں“ اس لئے ہمیں اور بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔ خیر
 ع۔ یہ برسرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد

اس تحریر کے مشغلہ کی کلفت بھی آخر انشا، اللہ ایک روز رفع ہونے
 والی ہے۔ سو چشم انصاف اور بگوشت ہوش دیکھئے اور سنئے کہ یہ جواب سوال مذکور
 کے کس طرح مطابق آتا ہے۔

جناب من جواب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مطابق، دوسرا التزامی، مطابق
 کے معنی تو یہ مجھے کہ اس کلام کے معنی مطابق عین جواب ہو۔ اور جواب
 التزامی کے ہماری اصطلاح میں یہ معنی ہیں کہ اس کے معنی مطابق کو اقرار یا انکار لازم
 ہو۔ اس جواب کو در صورتیکہ حضرت علی اور حضرت عباس کی طرف سے طلب میراث
 بمعنی معروف ظہور میں آتی بہ منزلہ جواب مطابق سمجھنا چاہیے۔ گو حقیقت میں التزامی
 ہے۔ کیونکہ ان الفاظ میں سے کسی کے معنی مطابق یہ نہیں کہ میں دوں گا یا نہ دوں گا

چونکہ اس جواب سے انکار ایسا ہی ظاہر ہے، جیسے یوں کہہ دیتے ہیں کہ میں نہیں دیتا اس لئے اس جواب کو بمنزلہ جواب مطابق سمجھئے۔ اور در صورتیکہ حضرت علی اور حضرت عباس طالب تولیت ہوئے ہوں تب اس جواب کو جواب التزمی سمجھئے۔ اس لئے کہ اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تمہارے متولی کر دینے میں یہ بندش ہے۔ مبادا حضرت فاطمہ کے طلب میراث کے قرینے سے خلافت کے یہ ذہن نشین نہ ہو جائے کہ ہمیں جو دیا ہے تو بطور میراث دیا ہے

اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات منقول ہوتی ہے یہاں تک کہ تمہارے ہمارے بعد اس میں تصرفات مالکانہ ہونے لگیں۔ اور آگے جو پیدا ہونے والے ہیں اس کو میراث سمجھ کر بانٹ بونٹ برابر کریں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے۔ لا خورث ما ترکناہ صدقہ ہر چند بعد اس تقریر کے اس ایک جواب کے دو مختلف سوالوں پر مطابق آنے میں کسی بلیہ ہی کو شامل ہے تو رہے مگر بنظر احتیاط و مزید توضیح ایک مثال مرتوم ہے، اگر کوئی بادشاہ کسی امیر کی جاگیر اس کے انتقال کے بعد ضبط کر کے کسی افسر کو یوں حکم دے کہ تم بطور خود لوگوں کو نوکر چاکر رکھ کر اس کا انتظام کر لو تو اگر اس امیر کی اولاد جس کی جاگیر ضبط ہوتی ہے کسی وجہ سے یوں سمجھتے ہوں کہ یہ جاگیر دوام کے لئے تھی۔ اور اس افسر کے اچانک نظم و نسق کو دیکھ کر اس سے یوں کہیں کہ یہ جائداد تو ہماری ہے تم اسے کیوں دباتے ہو، لازم یوں ہے کہ اسے ہمارے حوالہ کر دو، تو اس کا یہ جواب کہ بادشاہ نے اس جاگیر کو ضبط کر لیا ہے تمہیں نہیں مل سکتی، جیسا صحیح ہے، ویسا ہی اس صورت میں بھی صحیح ہے کہ اس امیر کی اولاد اپنی جاگیر کے ضبط ہونے سے مطلع ہو، پر ضرورت طلب معیشت اس افسر سے اس بات کے ملتجی ہو کہ تم آخر کسی نہ کسی کو اس کے انتظام کے لئے نوکر رکھو گے اگر ہمارے ہی ہاتھوں اس کا انتظام کرادو، تو ہم اس کا استحقاق بھی رکھتے ہیں۔ امیر متولی کی اولاد ہیں۔

مگر اس صورت میں اور اس صورت میں اتنا فرق ہوگا کہ پہلی صورت

میں تو جواب مذکور کافی وافی ہے۔ اور دوسری صورت میں بعض مقدمات جو اب التراما سمجھے جاتے ہیں، اور حاصل جواب یہ ہے کہ یہ جائداد ضبط ہو چکی ہے۔ اگر تم کو نوکر بھی رکھا جائے، تب یہ اندیشہ ہے کہ کوئی غماز بادشاہ کے کان میں کچھ جا بڑے اور بادشاہ کے دل میں یہ خیال بیٹھ جائے کہ افسر نے امیرزادوں سے کچھ سازش کر کے جائداد کو بدستور رہنے دیا ہے، پھر نہ تمہاری خیر نہ میری خیر۔

حضرت علیؑ وعباسؑ نے بھول سے دوسرا جواب حضرات شیعہ اپنے حسب وخواہ لیں یعنی مطالبہ کیا۔ اور بھولنا عیب نہیں، یہ ہی سہی کہ حضرت علیؑ اور حضرت عباسؑ طالب میراث

ہی ہوئے تھے۔ لیکن باوجود اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ خورث مائترکنا صدقہ، پھر اس طلب کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ آدمی تھے، بھول گئے، جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا، تب یاد آیا، سو اس بھول جانے میں حضرت علیؑ کی شان میں کچھ فرق نہیں آنا، بڑے بڑے رسول بھولے چو کے ہیں۔

حضرت آدمؑ کی بھول | حضرت آدمؑ کی شان میں خداوند کریم فرماتے ہیں، وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلِ فَنَسَىٰ یعنی ہم نے حضرت آدمؑ کو پہلے سے تقید و تاکید سب کچھ کر دی تھی، پھر بھی بھول گئے، جب حضرت آدمؑ پیغمبر و نشان ہو کر خود خدا کی تقید و تاکید کو بھول جائیں، تو حضرت علیؑ تو امام ہی تھے، وہ بھی پھر حضرت آدمؑ ہی کی اولاد ہیں اور بحکم اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِآبَائِهِ ان کے نسیان کے وارث، وہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات کو بھول جائیں جس میں کسی قسم کی تاکید اور تقید نہیں، نہ علیؑ العموم نہ بالخصوص حضرت علیؑ کو، تو فرمائیے کیا قباحت ہے؟

حضرت موسیٰؑ کی بھول | علیؑ انذا القیاس حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کا حسب ہدایت خداوندی حضرت خضرؑ کے پاس جانا اور حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کا حضرت خضرؑ علیہ السلام سے بغرض تعلیم علم ملازمت کی درخواست کرنا۔ اور حضرت خضرؑ کا بتا کر تمام یوں کہنا کہ تم سے میرے ساتھ نہ رہا جائے گا، یعنی میری باتیں تمہارے خیال میں نہ آئیں گی تم خواہ مخواہ اعتراض کئے جاؤ گے۔ پھر ہماری تمہاری کیسے بنے گی

پھر ان سب کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ سے عہد لینا کہ اگر میری ہمراہی مد نظر ہے تو جب تک میں نہ بتاؤں تم کسی بات کو نہ پوچھو، یہ سارا قصہ سورہ کہف میں سوٹھویں سیپارہ کے شروع سے کچھ پہلے مذکور ہے، اس اعتقاد پر کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے۔ اور اس اہتمام پر کہ سفر دور دراز قطع کیا۔ اور پھر کیا کیا انکار اور اقرار ہوئے، حضرت خضر کی جلالت قدر اور ان کی باتوں کا معقول ہونا ایک لخت دل سے نکل گیا، اور اس پر اپنا عہد بھی بھول گئے

چنانچہ حضرت خضر کو مع حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ایک گھاٹ کے ملاحوں نے بوجہ اعتقاد بے لٹے دیئے سوار کر لیا اور انہوں نے بیچ میں جا کر اس کشتی کا تختہ توڑ ڈالا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا۔ اور یہ کہہ اٹھے۔ اَخْرَجْتَهَا لِيُفْرَقَ أَهْلُهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اُخْرًا یعنی اے خضر کیا تم نے اس کشتی کو اس لئے توڑ دیا کہ بیٹھنے والوں کو ڈوب دو، تم نے بھی عجیب کام کیا کہ کشتی والوں کے احسان کے بدلے یہ نقصان کیا۔ اس کے جواب میں جب حضرت خضر نے یوں فرمایا اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا، یعنی میں نے تم سے کہا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ غدر کیا کہ تَوَخَّضْتُ لِي بِمَا نَسِيتُ یعنی میں بھول گیا تھا تم مواخذہ نہ کرو۔

الحاصل اس اہتمام اور اس تقید پر اتنی جلدی حضرت موسیٰ بھول گئے ہوں تو پھر حضرت علی کا اتنی دیر کے بعد بھول جانا کچھ بات ہی نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول اولو العزم، اور حضرت علی نہ رسول نہ بنی نہ اولو العزم۔۔۔ نہ غیر الو العزم، بائینہم کوئی اہتمام اور پیش بندی نہ تھی۔ فقط اتفاقاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات چلتی چال سن لی وہ بھی اس طور پر کہ علی العموم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی۔ کچھ حضرت علی کے سنانے کی اس میں تخصیص نہ تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالخصوص یہ بات پیش آئی کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے۔ اور آگے جو کچھ گذر سو گذر، سید الخلق کی بھول اور اگر نا انصافان شیعہ حضرت موسیٰ اور حضرت آدم علیہما السلام

کے نسیان پر نہ شرمائیں تو خود سرور کائنات علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کو جناب
باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا أَنْسَيْتَ لَعَلَّكَ يَادُورُ رَبُّكَ
جب بھول جایا کرے، اس سے صاف امکان نسیان بہ نسبت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ
علیہ وسلم ثابت ہے، بلکہ شان نزول اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے کفار سے ایک بات کا وعدہ کیا کہ کل تباؤں گا، اتفاق سے انشاء اللہ کہنا بھول
گئے، اس پر خدا کی طرف سے نصیحت ہوئی۔

معتمد کتب صحاح شیعہ مثل کافی کلینی اور تہذیب ابو جعفر طوسی میں اس سید
صحیح سے مروی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو ہوا، اور چار رکعت
کی بجائے فقط دو ہی ادا کیں، پھر جب سرور مرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اجماعی کو
امور دینی میں سہو ہوتا ہو، تو حضرت علی کو امتی ہی ہیں، الحاصل ظاہر الامکان یہ بات ہے
کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو باوجود حدیث مذکور کے اپنے کانوں
سے سن لینے کے سہو واقع ہوا ہو، اور وقت پر یاد نہ رہا ہو، اور وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ
میراث کا قصہ تو ایسا عام ہے کہ سارا جہان اس میں شریک، حسب عادت نبی نور
اگر طلب کر بیٹھے ہوں، تو کیا بعید ہے۔

لیکن جب صدیق اکبرؓ نے یاد دلایا، تب یاد آگیا اسی واسطے حضرت عمرؓ نے جب
دونوں کو متولی کر دیا۔ تو حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کا قبضہ اٹھا دیا، ورنہ متروکہ نبوی
میں حق میراث سمجھتے، تو گو حضرت عمرؓ نے متولی کر کے دیا تھا، حضرت عباسؓ کے
قبضہ کو اپنے قبضہ سے مقدم سمجھتے۔ اس لئے کہ وہ حقیقہ وارث تھے اور حضرت علیؓ خود
وارث نہ تھے، حضرت فاطمہؓ کی طرف سے وکیل تھے، پھر اپنی خلافت میں سب حقداروں
کو ان کا حق پہنچاتے، ازواج مطہرات کو ازواج مطہرات کا حصہ بانٹ دیتے حضرت
عباسؓ کی اولاد کو ان کا حصہ الگ کر دیتے، چونکہ اپنی خلافت میں بیکار و سربالقی رہنے
دیا، اور تقسیم نہ کیا، اور کسی کا حصہ نہ دیا۔ چنانچہ بحوالہ اجماع غریبین مرقوم ہو چکا ہے، تو
پھر بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے یاد دلانے سے بات یاد

آگئی۔ اور اس لئے حضرت عمر کے سامنے اقرار کیا۔

صدیقؓ سے عم داہن عم کی | باقی رہی یہ بات کہ اس صورت میں پھر صدیق اکبر کی طرف سے
بدگمانی کی وجہ بشریت ہے | بدگمانی کی کوئی صورت نہیں، جو حضرت عمر نے یوں فرمایا کہ تم

ابوبکر کو کاذب آثم وغیرہ سمجھتے تھے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بمقتضائے بشریت
چنانچہ مرقوم ہوا۔ اوپر کے دل میں کہ ویرگاہ یہ خیال گذرا ہو کہ ہر چند یہ حدیث صحیح ہے
لیکن پھر استحقاق تولیت میں ہی تھا۔ یا نہم جو صدیق اکبر نے قبضہ رکھا ہے تو ہونہو
کچھ دال میں کالا ہے۔ اور یہ خیال پیرائے حال سے یا کسی قال سے حضرت عمر کو مترشح ہوا
ہو۔ اس لئے انہوں نے بطور تنبیہ و شکایت ان کے منہ پر کہہ دیا، اور اس لئے انہوں نے
بنظر انصاف سکوت فرما دیا، واللہ اعلم بحقیقتہ الحال۔

اس تقریر کے بعد امید یوں ہے کہ جن کو خداوند کریم نے عقل سلیم عطا فرمائی ہے
اگر کسی نابکار کی صحبت سے بڑا ہ بھی ہیں تو راہ پر آجائیں، اور جو نہ آئیں تو اپنا سر رکھائیں۔
مَنْ يَضِلُّ اللَّهُ فَلَآ هَادِيَ لَهُ اب الحمد للہ کہ جمیع امور متعلقہ حدیث صحیح مسلم کے
بیان سے فراغت پائی، لازم یوں ہے کہ بقیہ خرافات خط مولوی صاحب کا بھی
جواب دندان شکن جو مولوی عمار علی صاحب اور نیز دیگر پیشوایان شیعہ کے دانت کب
توڑے۔ منہ ہی سی دیے۔ انشاء اللہ بیان کر کے صفحہ قرطاس اور قلم و دوات کو ہاتھ سے دھر
دیجئے۔ اس لئے التماس یوں ہے کہ آگے مولوی عمار علی صاحب لقم فرماتے ہیں
”اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت ابوبکر نے فدک کے دینے سے انکار کیا۔

فاطمہؓ ہر اس پر غضبناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا۔ اور صحیح مسلم میں
لکھا ہے کہ فاطمہؓ نے وقت مرنے کے وصیت کی، کہ ابوبکر اور عمر میرے جنازہ پر نہ آئے یا میں انتہی“
یہ خط کی آخری عبارت ہے۔ اور یہاں مولوی صاحب کی ترکی تمام ہولی میگر
اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گا کہ بعد ثبوت مضامین مسطورہ بالا خصوصاً اشارہ آیت
یٰوَصِیْکُمُ اللّٰہُ (دوبارہ مستثنیٰ ہونے سے) و عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم میراث سے
اور صراحت آیت هَا اَفْءَءَ اللّٰہُ (دوبارہ وقف ہونے سے) فدک وغیرہ اموال فتنے کے

صدیق اکبر پر (بوجہ نہ دینے فدک کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو) کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا، ہاں الثا بطور حضرات شیعہ خوارج و نواصب کو گناہش لبتائی ہے کہ حضرت فاطمہ باوجود معصوم ہونے کے۔ چنانچہ عقیدہ شیعہ یہی ہے، فدک وغیرہ اموال وقف میں سے کس لئے طلب کار میراث ہوئیں؟ اور پھر وہ بھی استقدر کہ صدیق اکبر نے ایک حق بات کہدی تو الثا غصہ کے مارے ملنا جلنا میل ملاقات سب ترک کر دی، مگر چونکہ سابع کو آج نہیں، سچی بات ہر طرح در رہتی ہے، اہلسنت کو اس مقدمہ میں کچھ دشواری نہیں، جیسے وہ صدیق اکبر کو اس مقدمہ میں بے قصور سمجھتے ہیں حضرت فاطمہ زہرا جگر گوشہ اس ایدلورائے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی طرح مورد اعتراض نہیں سمجھتے۔ اور بایں ہمہ کوئی قاعدہ ان کے دین و مذہب کا منقوض نہیں ہوتا، اول تو عیال راجحہ بیان۔

قرآن فہمی میں آنحضرت کے تمام امتی محتاج ہیں | دوسرے بات کچھ دور نہیں، کان درست کیجئے، اور سنئے۔ حضرت فاطمہ زہرا ہر چند سیدۃ النساء بلکہ ان کے خاکیا، سرمہ اکابر اولیاء ان کے غلامان غلام مورد افضال کبریا، ان کی محبت جو محبت کے طور پر ہو باعث نجات استیقا۔ ان کا اعتقاد جو اعتقاد کی طرح پر ہو باعث ترقی درجات اعلیٰ۔ لیکن پھر بھی امتی تھیں نبی نہ تھیں، فہم قرآن مجید میں کچھ نہ کچھ حاجت تفسیر بنوی رکھتی تھیں۔ کیونکہ فقط زبان دانی اور قوت فہم و فائق معانی سے اس جگہ کام نہیں چلنا۔ تفصیل اجمال کلام ربانی۔ اور شرح اشکال آیات فرقانی، بجز مورد وحی آسمانی معنی سرور دو جہاں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ و ازواجہ و اہل بیتہ و اصحابہ وسلم کے متصور نہیں، چنانچہ خود خداوند کریم فرماتا ہے اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْنَكُمْ اٰیٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ط یعنی بھیجا ہم نے تم میں رسول تمہیں میں سے جو پڑھتا ہے تم پر ہماری آیات، اور سنوارتا ہے تم کو، اور تعلیم کرتا ہے تم کو قرآن اور حق بات فقط،

اب غور فرمائیے کہ تِلْوَ عَلَيْنَكُمْ کہ جس کے یہ معنی ہیں کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں، تعلیم الفاظ قرآنی پر دلالت کرتا ہے اور يُزَكِّيْكُمْ جس کے یہ معنی ہیں کہ سنوارتا ہے۔

اور پاک صاف کرتا ہے، تزکیہ باطن کی طرف مشیر ہے، بعد میں جو عَلَیْکُمْ اَلْکِتَابُ فرمایا۔ تو قطع نظر اس کے کہ تعلیم عرب میں معانی ہی سے متعلق ہے بعدِ یَسْأَلُوا عَلَیْکُمْ کے یہ فرمانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ یہ تعلیم معانی کی تعلیم ہے، پھر جب عَلَیْکُمْ میں خطاب تمام امت کی جانب ہو، خاص کر مسلمانان ملک عرب کی طرف جو صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مشرف باسلام ہو چکے تھے، چنانچہ لفظ منکم سے عیاں ہے، تو معلوم ہوا کہ اور سب علم معانی قرآن میں محتاج سرور و جہاں صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور نیز یہ بھی متحقق ہو گیا کہ تعلیم معانی قرآنی کی قابلیت بھی ہر کسی میں نہیں جب تک تزکیہ تام نہ ہو، تب تک تعلیم معانی قرآنی بے موقع ہے۔ اسی واسطے بعلمکم کے بعد تزکیہ فرمایا اور شواہد اس دلیل کے قرآن میں بہت ہیں حافظان علم پر مخفی نہ رہے گا۔ منجملہ ان کے ایک جگہ شان قرآن میں وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ بَیِّنَاتٍ لِّکُلِّ شَیْءٍ مُّفْرَاةٍ ہیں یعنی اتاری ہم نے تجھ پر کتاب۔ جس میں ہر چیز کی تفصیل اور بیان ہے

وَمَا اَوْتِیْتُمْ سِرًّا وَّ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ اور ایک جگہ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ اور اس کو فرماتے ہیں وَمَا اَوْتِیْتُمْ سِرًّا وَّ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ عَلَیْکُمْ سے مگر ٹھوڑا، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ لفظ قُلْ لِّلرَّحْمٰنِ جو اس سے پہلے ہے اس بات پر شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ قاصد اس خطاب اور اس فرمان کے پہنچانے والے ہیں، داخل زمزمہ مخاطبین نہیں اور بایں ہمہ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کے ذوق کو خدا کے برابر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اوروں سے سب زیادہ سمجھتے ہیں۔ القصہ ناظرین فہمیدہ کو کلام اللہ میں سے اس قسم کے بہت سے مضامین ملیں گے جن سے دعوائے حق کی تصدیق ہو اور اگر کوئی بسبب کج طبیعت کے ان کے موید ہونے میں کسی وجہ سے تکرار کرے تو کرے، بدستور آیت اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْ خِمْسٍ سَبْعَةٍ

حضرت فاطمہ بھی فہم قرآن میں | خیر بہر حال حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا درباب فہم معانی
آنحضرت کی محتاج تھیں | قرآنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو محتاج ہونا کلام اللہ سے

ثابت ہونہ ہو، پر اہل سنت کے نزدیک تو یہ بات لاریب مسلم ہے، اور اس کے مخالف
کسی دلیل عقلی یا نقلی سے آج تک کوئی بات ان کو ثبوت کے ساتھ نہیں پہنچی اور کیونکر
پہنچے؟ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا دربارہ فہم قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا محتاج ہونا اظہر من الشمس ہے، محتاج دلیل نہیں، اس کے خلاف کا غلط ہونا بھی
کسی کے نزدیک روشن، پھر اگر کسی آیت کے فہم میں بسبب اس کے کہ اس کی تفسیر
زبان گوہر زہرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو، فی الجملہ غلطی ہو جائے اور اس کے
کسی اشارہ مخفی کو نہ سمجھیں تو اہل انصاف فرمائیں کہ اس میں کیا محال ہے؟

علیٰ ہذا القیاس اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلکہ آج کل کوئی شخص اہل فہم میں
سے اس اشارہ مخفی کو، جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے رہ گیا ہو، تہنیدہ نسبت
و تفسیر نبوی، سمجھ جائے تو کیا قباحت ہے؟ نہ اس بات سے کچھ کسر شان حضرت زہرا
رضی اللہ عنہا لازم آتی ہے۔ اور نہ اس وجہ سے دوسروں کو ان پر فوقیت
ہو سکتی ہے۔

اگر کسی ایک بات جاننے سے کسی کو فضیلت | اگر ایک بات کے سمجھ لینے سے سمجھنے والوں کو نہ سمجھنے
ہو تو حضرت خضر حضرت موسیٰ سے افضل آتے | والوں پر فوقیت ہوا کرتی، تو حضرت خضر کو حضرت
موسیٰ علیہ السلام پر فوقیت ہوتی۔ کیونکہ کشتی کے ٹوڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کی وجہ
باوجودیکہ یہ سب حضرت خضر نے بامر خداوندی کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھے،
اور حضرت خضر ان سب کے وجہ جانتے تھے، چنانچہ واقفان کلام ربانی جانتے ہیں حالانکہ
مذہب صحیح یہی ہے کہ حضرت خضر بنی تھے اور اگر تھے بھی تو باجماع امت حضرت موسیٰ
علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں۔

ادھر حضرت داؤد علیہ السلام کا کھیتی کے مقدمہ میں غلطی کھانا، اور حضرت
سلیمان علیہ السلام کا حکم خداوندی کا سمجھ جانا معروف و مشہور ہے، اور قرآن میں مذکور حالانکہ

جس وقت یہ قصہ پیش آیا۔ اس وقت حضرت داؤد پیغمبر وقت تھے، اور پیغمبر بھی
 کیسے اولوالعزم، اور حضرت سلیمان جب تک نہ بنی ہوئے تھے اور نہ امام تھے۔ اور
 بائینہم صغیر السن، کیونکہ وقت وفات حضرت داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام
 کی عمر کل بارہ برس کی تھی جب یہ قصہ پیش آیا۔ جب تو اور بھی چھوٹی عمر ہوگی۔ پھر جب
 حضرت داؤد علیہ السلام (حالانکہ بنی وقت اور رسول الوالعزم تھے)، ایک مسئلہ میں غلطی کریں
 اور ایک لڑکا نو عمر بات صحیح کہہ دے،

تو اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اگر ایک اشارہ بے تعلیم نہ سمجھیں
 وہ بھی آیت یوصیکم اللہ کا اشارہ، جو مجملہ آیات قرآن مجید ہے، جس کا فہم کامل مجتہد
 تفہیم و تعلیم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ممکن نہیں، چنانچہ معلوم ہو چکا، اور حضرت صدیق
 اکبر بلکہ آج کل کے پڑھنے لکھنے والے جو کسی طرح حضرت فاطمہ بلکہ ان کے خاکپا اور ان کے
 سنگ در کے برابر نہیں ہو سکتے، بوجہ تعلیم نبوی سمجھ جائیں تو کچھ حرج نہیں، علیٰ ہذا القیاس
 ممکن ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اول فدک کا فئے ہونا نہ معلوم ہو کیونکہ ایسے قصے اکثر
 مجاہدین اور غنائیں کو معلوم ہوتے ہیں، اور با ایں ہمہ آیت ما افاض اللہ سے بھی اراضی فئے
 کا غیر ملوک ہونا بتا مل ہی سکتا ہے، چنانچہ ناظرین وجوہ مسطورہ بالا پر جو در بارہ تحقیق
 غیر ملوک ہونے اراضی فئے لکھے گئے ہیں، پوشیدہ نہ رہیگا۔

اور اس نہ سمجھنے اور اس بے علمی کے باعث بعد وفات سرور کائنات علیہ و علی
 آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات حضرت صدیق اکبر سے طلب میراث ہوئیں۔ کیونکہ
 جب تک اشارہ وجوہ اراضی فئے یوصی اور اشارات مذکورہ پر اور علیٰ ہذا القیاس وجوہ
 غیر ملوک ہونے اراضی فئے پر جو آیت ما افاض اللہ کے پس و پیش سے مستنبط ہیں نظر نہ ہو تب تک
 ظاہر آیت یوصیکم اسی طرف ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم بھی حکم میراث
 میں شریک امت ہیں۔

سید نے سماع حدیث کے بعد مگر جب صدیق اکبر نے حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنائی
 ندامت کے سبب بات چیت بند کی | ہو، تب اس طلب گاری سے ایک گونہ ندامت اور رنج حاصل

ہوا ہو، کیونکہ انبیاء اور مرسلین اور صدیقین اور کاملین کو لازم ہے، کہ اگر کوئی بے اعتدالی ان سے ظہور میں آئے تو بعد اطلاع اس پر مدامت ہو کرے، چنانچہ حضرت آدم کا گہوٹ کھا لینے پر نادم ہونا، اور علی ہذا القیاس حضرت نوح علیہ السلام کا دعائے نجات فرزند سے نادم اور پشیمان ہونا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل قبطی سے شرمندہ ہونا، خود قرآن میں موجود ہے۔

اور اس ندامت کے باعث حضرت صدیق اکبر سے ربط و ضبط میں فرتی آگیا ہو، اور ملنا جلنا بدستور سابق نہ رہا ہو۔ نہ یہ کہ ملے پر بھی کلام و سلام کی نوبت نہ آتی ہو، کیونکہ اس طرح کی متارکت تین دن سے زیادہ حرام ہے۔ چہ جائیکہ تمام عمر؟ وہ بھی ایسے مسلمانوں میں، بہر حال ترک کلام میں جو بعض روایات میں ہے، اہلسنت کے نزدیک حضرت فاطمہ کی طرف کچھ حرف نہیں۔

سماج حدیث کے بعد سیدہ کم اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کلام نہ کرنے سے یہ مراد ہے کلام کی حاجت ہی نہ رہی۔ کہ جب حدیث لاخورت سن لی، تو پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ چون و چرا نہیں کی، اور صدیق اکبر کے چھوڑ دینے سے یہ مراد ہے کہ چپے ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ رہیں۔ اور حدیث مذکورہ سن لینے کے بعد پھر ان کا پیچھا نہیں لیا، اور کیونکر لیں؟ اگر ایسا ہو تو حضرت فاطمہؓ اور دنیا داروں میں کیا فرق رہا مگر حضرت صدیق اکبر بتقاضا محبت و اعتقاد و نیاز مندی و انقیاد اس نہ ملنے کو غصہ پر محمول کر کے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے ہوں، اور علی ہذا القیاس اور لوگ بھی اسے غصہ ہی سمجھتے ہوں، اور اس لئے صدیق اکبرؓ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لئے اندر بھیجا ہو، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے تسکین صدیق اکبر کے لئے اظہارِ رفاہ اور خوشی کر دیا ہو۔

وَجَدَتْ كَيْفَ لَفْظِ تَشْرِيعٍ | باقی کسی کے دل میں یہ ظہان رہے کہ روایات میں تبصرہ مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر سے غصہ ہو گئیں۔ تو اس کا جواب ہے کہ اول تو روایات صحیحہ مثل روایات مسلم و بخاری میں فَوَجَدَتْ فَاطِمَةُ وَاقِعَ ہے

اور وَجَدَتْ جیسا بمعنی غَضِبَتْ ہے جو غصہ پر دلالت کرتا ہے ویسا ہی بمعنی حَزَنْتْ بھی ہے جو حزن و غم پر دلالت کرے۔ چنانچہ قاموس وغیرہ کتب لغت نایاب نہیں، جسے تامل ہو دیکھ لے۔ پھر کوئی ضرورت ہے کہ وَجَدَتْ بمعنی غَضِبَتْ ہی لیجئے۔ اور خواہی خواہی حضرت فاطمہؑ کا غصہ ثابت کیجئے

وَجَدَتْ کے صلہ پر بحث | اور اگر کوئی یہی یوں بکرا کرے کہ ہم نے مافا وَجَدَتْ دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر کلمہ علی ہوتا ہے تو غصہ ہی کے معنی ہوتے ہیں، ہاں اگر اس کے صلہ میں حرف با واقع ہو تو پھر معنی حزن کی گنجائش ہے۔ مگر اس مقام میں بعد وَجَدَتْ صحیح مسلم میں فقط علی ابی بکر ہی واقع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وَجَدَتْ بمعنی غَضِبَتْ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عندیہ کے موافق دوسرے کے کلام کے معنی سمجھتا ہے، اسی واسطے روایت بالمعنی: اول تو ہر کسی کی مقبول نہیں، اور مقبول بھی ہو تو ہم پایہ روایت باللفظ نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ حقیقت الامر کچھ اور ہو، اور راوی کچھ اور سمجھ گیا ہو۔

آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا، اور اپنے معاملات میں اگر آدمی تامل کرے تو اکثر ایسے قصے پیش آتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کہنے والے نے فقط وَجَدَتْ فاطمہؑ کہا ہو۔ اور سننے والے نے بایں خیال کہ حضرت فاطمہؑ زہرا رضی اللہ عنہا کی کبیرگی کو جو درحقیقت بوجہ ندامت تھی، بوجہ غضب سمجھ رہا تھا، وَجَدَتْ کو بمعنی غَضِبَتْ محمول کر کے روایت کے وقت روایت بالمعنی کی ہو۔ اور پی سمجھ کے موافق لفظ علی ابی بکر بھی زیادہ کر دیا ہو بہر حال جب تک احتمالات صحیحہ پیدا ہو سکیں تب تک اہل عقل کو لازم یہی ہے کہ اہل کمال کی طرف سے بد گمان نہ ہوا کریں۔

اہل کمال کے کلام کا وہ محل تلاش جناب باری تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کا سورہ کہف میں بیان کیا ہے جس میں حضرت خضر کا ان ملاحوں کی کشتی کا توڑنا، جنہوں نے ان کے ساتھ احسان کیا تھا۔ اور

بے لے دیئے ان کو پار آتا رہا، اور بے گناہ صغیر السن لڑکے کو قتل کر دینا۔ اور حضرت
 موسیٰ علیہ السلام کا ان دونوں پر اعتراض کرنا مذکور ہے۔ اس کے بیان کرنے میں ایک یہ بھی
 حکمت ہے کہ مردمان کوتاہ بین کو اگر بزرگان دین کا کوئی امر خلاف عقل یا نقل نظر آئے تو اپنی
 نظر کا قصور سمجھیں اور ان کی نسبت گمان فاسد نہ کریں۔

علیٰ ہذا القیاس پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ظَنُّوا الْمُؤْمِنِينَ خَيْرًا فَرِيًّا
 ہے تو اس سے بھی غرض یہی ہے کہ اگر تمہاری نظر میں کسی مومن کا کوئی کام خلاف
 شرع نظر آئے، تو گویا ہر میں روک ٹوک کرو۔ تاکہ اگر واقع میں برا ہو تو اس کا انسداد ہو جا
 پردل سے بدگمان نہ ہو، اپنی طرف سے نیک ہی گمان کرتے رہو، نہ یہ کہ اچھے کاموں کو
 اچھا سمجھو، کیونکہ اچھے کاموں کو ہر کوئی خود بخود اچھا سمجھتا ہے حکم کی کیا حاجت تھی؟ اس تقریب
 سے اگر کسی کے جی میں یہ روگ بھی ہو گا، کہ ان احتمالات سے کیا کام چلنا ہے۔ ظاہر میں جو
 کچھ سمجھ میں آئے۔ ہم تو جانیں وہی بات ٹھیک ہوگی، تو ان شاء اللہ ترفع ہو جائے
 گا، بہر حال گویہ احتمال بہت سے نظر آتے ہیں مگر عقل سلیم ہو تو پایہ تحقیق سے کم
 نہیں۔ کیونکہ مناسب حال حضرت فاطمہ اور حضرت صدیق اکبر یہی ہے معہذا منصب
 دعوائے منکران صدیق اکبر کی طرف ہی اور ظاہر ہے کہ دلیل مدعی جب ہی مفید مطلوب بتی
 ہے کہ کوئی احتمال خلاف مطلوب نہ بن سکے، ورنہ مدعا علیہ کی نفع ایک لانسلم میں شیخ چلی
 کا گھر بنا بنایا ڈھ جائے گا۔ سو اگر دشمنان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ منظور ہو کہ لفظ
 وحدت اور قصہ مندرجہ روایات سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا غصہ ہونا ثابت
 کریں، تو اول ان احتمالات کو باطل کریں۔ جب اس طریق سے اپنی عاقبت خراب
 کرنے کا ارادہ کریں۔

سیدہ صدیق شے بوجہ غلطی آزرده ہوئیں اور ہم نے مانا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا
 اس مقدمہ میں حضرت صدیق اکبر سے آزرده خاطر ہوئیں۔ لیکن اس سے حضرت
 صدیق اکبر کا قصور وار ہونا کہاں سے ثابت ہوا۔ نہایت تہا ثابت ہو تو یہ ہو، کہ حضرت
 فاطمہ زہرا بوجہ غلطی صدیق اکبر کو قصور وار سمجھ کر ان پر غضبناک ہوئی ہوں۔ سو ایسا بے

اوقات انبیاء و مرسلین کو بھی باہم پیش آتا ہے۔ حالانکہ وہ بالیقین معصوم ہیں،
جہ جائیکہ صدیق؟ حضرت ہارون علیہ السلام کا بچھڑے کو پوجنے کے مقدمہ بے قصور
ہونا کلام اللہ سے ثابت ہے۔ اور پھر بایں ہمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان پر غصہ ہونا،
یہاں تک کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بال کھینچنے تک کی نوبت آئی
خود کلام اللہ ہی میں موجود ہے، سو جیسا حضرت ہارون تو یوں بے قصور کہ وہ بے قصور
تھے ہی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں، کہ وہ اپنے عندیہ
میں بے جا غصہ نہیں ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ غلطی سے حضرت ہارون پر ناراض ہوئے بلکہ بایں نظر کہ ان کا بڑے بھائی پر غصہ ہونے
کا کوئی منصب نہ تھا۔ اگر خدا واسطے کی بات نہ ہوتی تو حضرت ہارون ان کا خون بھی کر دیتے
تو دم نہ مارتے۔ چہ جائیکہ یوں دست و گریباں ہونے کی نوبت آئی، پر مسلمان کو یقین ہے
کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس غیظ و غضب میں اجر عظیم ملے، اب لازم یوں ہے کہ
اسی طرح حضرت فاطمہ سیدۃ النساء، اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کی باہم رنجش اور حق پرش
کو سمجھئے، اور دونوں کو اس مقدمہ میں بے قصور اور دونوں کو ماجور سمجھئے، اور ہم نے اسی دن
کے لئے اس کی تحقیق آیت محمد رسول اللہ الخ کے ذیل میں بخوبی کی ہے، اگر کسی کو زیادہ تر
تسکین مد نظر ہو تو پلٹ کر دیکھ لے۔

بالفرض اگر صدیق ہی کی غلطی | اور اس سے بھی درگزر کیجئے، ہم کہتے ہیں شیعہ ہی سچ فرماتے ہیں
تھی تو توبہ کر لی (کتب شیعہ) | صدیق اکبر ہی قصور وار تھے۔ لیکن جب انہوں نے توبہ کر لی،
تو پھر کیا گناہ باقی رہ گیا؟ جو شیعوں کی زبان نہیں تھمتی مٹا ہوا ہے التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ
كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ ہاں توبہ کرنے کا ثبوت اگر مد نظر ہو تو یہ بات معقول۔ لیکن ہم سند
بھی ایسی رکھتے ہیں، جسے شیعہ سلنا سلنا کہتے کہتے تھک جائیں۔ اور برسر و چشم
رکھتے رکھتے مر جائیں۔ شیخ ابن مہر حل۔ منہج الکرامت میں یوں ارشاد فرماتے
ہیں کَمَا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ أَبَا بَكْرٍ فِي ذَلِكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا يَعْنِي حَبِ
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و نپید کیا تو انہوں

نے فدک کو ان کے نام لکھ کر فدک کو ان کے حوالہ کر دیا۔

یہ روایت ہر چند چند بار گزر چکی ہے لیکن بحکم نقل مشہور ہو اَلْمَشْكُوكُ كَرَّتَهُ
قِفْوُوعٌ یعنی مشک کو جتنا گھسوا یا جتنی بار لگاؤ زیادہ ہی زیادہ خوشبودار ہو گا۔ بار بار
اس روایت کے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، یہ بھی ایک حضرت فاطمہ زہرا سیدۃ النساء
کی کرامت ہے کہ حق نے تہمت سبج ناحق سے شیعوں ہی کے منہ سے ان کو بری کر دیا
ادھر صدیق اکبر کی نیک نیتی کو ماننا چاہیے، کہ کیسے طوفان سے ان کو بچا لیا۔ اور شیعوں ہی
کے منہ سے ان کے سب اعترافوں کا جواب دلوادیا۔ اب کسی شیعہ مذہب کا منہ نہیں، کہ نسبت
صدیق اکبر بوجہ غصب فدک اہلسنت سے ناشی ہو۔ اس روایت نے شیعوں کے سب
دعوؤں کو ڈھس مس کر دیا، ہبہ کا ہو، یا میراث کا، وصیت کا یا کسی اور وجہ کا، بہر حال
خداوند ذوالجلال نے شان و کفی اللہ المومنین القتال دکھا دی۔

اور اگر بالفرض بفرض محال یہ روایت شیعوں کی ایسی معتبر کتابوں میں نہ ہوتی۔
تب دوسری دستاویز حضرت صدیق اکبر کے بری الذمہ ہونے کی موجود ہے۔
مجاج السالکین میں جو عمدہ کتب فرقہ امامیہ ہے۔ اور نیز اور کتابوں میں یہ
روایت موجود ہے۔ اور اسی کے لکھنے کا وعدہ بہت دور سے ہم کرتے چلے آتے ہیں، سو
آج بفضلہ تعالیٰ اس کا وقت آپہنچا کُلُّ أَمْرٍ مَرَّةٌ وَتَوَقُّتٌ خیر یہ روایت
قابل مطالعہ ہے۔

إِنَّ أَبَا بَكْرٍ لَمَّا رَأَى أَنَّ فَاطِمَةَ الْقِبْضَتْ عَنْهُ وَهَجَرَتْهُ وَلَمْ تَكَلِّمْهُ بَعْدَ
ذَلِكَ فِي أَمْرِ نِدَاكَ كَبْرُ ذَاكَ عِنْدَهُ فَأَرَادَ اسْتَرْضَاءَ حَافَاتِهَا فَقَالَ لَهَا صَدِّقِي
يَا ابْنَةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا ادَّعَيْتِ وَلَكِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
بَعْدَ أَنْ يُوْتِيَ مِنْهَا قُوَّتُكُمْ وَالصَّالِعِينَ بِهَا فَقَالَتْ إِنْ فَعَلْتُ فِيمَا كُنْتُ
أَبَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ فِيمَا فَقَالَ ذَلِكَ اللَّهُ عَلَى
أَنْ فَعَلَ مَا كَانَ يَفْعَلُ الْبُؤْسُ فَقَالَتْ وَاللَّهِ لَأَفْعَلَنَّ ذَلِكَ فَقَالَتْ

اللَّهُمَّ اشْرَحْ قُرْصِيْثَ بَيْتِكَ وَأَخْذَتِ الْعَمَدَ وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ
يُغْطِيْهِمْ مِنْهَا قُوْتَهُمْ وَيُقْسِمُ الْبَاقِي فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسْكِيْنَ
وَابْنُ السَّبِيلِ -

حاصل اس روایت کا یہ ہے۔ دو کہ جب ابو بکر نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ ان سے کشیدہ
خاطر ہو کر گئیں، اور ان کو چھوڑ بیٹھیں اور پھر قذک کے مقابلہ میں کچھ گفتگو نہ کی، تو یہ بات
انہیں دشوار معلوم ہوئی۔ سوان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے پاس حاضر ہو کر یہ عرض
کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تم اپنے دعوے میں سچی ہو، تم کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبہ کر دیا ہو گا۔ مگر میں کیا کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے
یوں دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور تمہارے کھانے پینے کا خرچ
اور محصلوں کی مزدوری دیکر جو کچھ بچتا تھا۔ فقیروں مسکینوں کو دیا کرتے تھے۔ اس پر حضرت
فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ اچھا تم بھی وہی کئے جاؤ جس طرح میرے والد زیدؑ اور سیدہ ابیہؑ
مختار صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، انہوں نے کہا اس بات پر تم مجھے قسم لے لو میں
وہی کرتا ہوں گا جو تمہارے والد زیدؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، اس پر
حضرت فاطمہ زہراؑ رضی اللہ عنہا نے قسم سے پوچھا۔ کیا تم سچ ہی اس طرح کرو گے؟ صدیق
اکبرؑ نے قسم کھا کر عرض کی، میں یہی کروں گا جو اب پھر ہے۔ اس پر حضرت فاطمہ نے یوں کہا
کہ الہی تو گواہ رہیو۔ سو اس بات پر راضی ہو گئیں۔ اور صدیق اکبرؑ سے عہد لے لیا۔ سو صدیق
اکبرؑ انہیں اس میں سے ان کے کھانے پینے کا خرچ دیکر باقی کو فقراء اور مساکین اور مسافروں
کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ (انتہی)۔

سلسلہ برات صدیق روایت کے چند فائدے | اس روایت سے چند فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ
صدیق اکبرؑ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو دعویٰ ہبہ میں جھوٹا نہیں سمجھا، پر یوں سمجھ کر کہ
ہبہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا چنانچہ متفق علیہ شیعہ و سنی ہے، اور اس کی
تحقیق سابقاً گذر چکی ہے، دینے سے غدر کیا۔ سو اگر بالفرض والتقدم یہ روایت ہبہ
صحیح بھی ہو جائے تو شیعوں کا یہ تاںسف کہ صدیق اکبرؑ نے حضرت فاطمہؑ کو جھوٹا سمجھا

چنانچہ حضرت مولوی صاحب نے بھی اس بات کو نامہ رسمی میرزا نور علی میں لکھ کر اپنا نامہ سیاہ کیا ہے۔ محض بجا اور بے موقع ہے، دوسرا قائد یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر نے فدک کی آمدنی میں سے ایک جہہ تک نہیں چھوڑا، بلکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے خرچ سے جو کچھ بچا، فقرا و غیر ہم کو دے دلا دیا۔

سو معلوم ہوا کہ فدک کے نہ دینے میں کوئی غرض دنیاوی نہ تھی، ہو نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں بیشک کچھ سن لیا تھا، جو باوجود اس بے غرضی اور اس بے طمعی کے حضرت فاطمہ زہرا کو نہ دیا۔ ان دونوں فائدوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت ام المین اور حضرت علی کی گواہی کا قصہ شیعوں کا ڈھکوسلا بنایا ہوا ہے۔ کیونکہ گواہوں کا مطالبہ تو جب ہی ہوتا ہے کہ مدعی کی طرف دروغ کا احتمال ہو۔ ہاں اگر اپنے آپ خود برد کرنا مدنظر ہوتا تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ فقط ٹال ٹلاؤ تھی۔ مگر بدگمانوں کو اب بھی شاید یہ گمان ہو کہ اول نہ دنیا ہی مدنظر ہو گا۔ اور اس وقت گواہ بھی طلب کئے ہوں انجام کار خدا تعالیٰ یا اندیشہ ملامت خلق سے حضرت زہرا کے پاس آکر اپنی بات کے بنانے کے لئے یہ حیلہ برپا کیا ہو۔ سو اس کا جواب اول تو یہ ہی ہے کہ

ع۔ بدگمان و ہم کی دار نہیں لقمان کے پاس

دوسرے ہم نے تسلیم کیا یونہی تھا۔ لیکن غصب فدک اگر ہوا تھا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی ناخوشی کی وجہ سے ہوا تھا۔ جب وہ راضی ہو گئیں تو شیعوں کو رنج کیوں ہے؟ مگر اس صورت میں بوجہ مخالفت حضرت زہرا کچھ انھیں پر وہاں پڑے تو پڑے، حضرت صدیق کو تو خدا نے بچا ہی لیا، تیسرا قائد یہ ہے کہ فدک تاحین حیات سرور کائنات علی آلہ افضل الصلوٰت و اکمل التحیات ہی کے قبضہ و تصرف میں رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور ذخیل ہوتی تھیں، ورنہ صدیق اکبر کی اس بات کے جواب میں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں دیکھا ہے کہ تمہیں تمہارا خرچ اور محصلوں کی محصلی دیکر فقرا و غیر ہم کو بانٹ دیا کرتے تھے، یوں نہ فرماتیں کہ اچھا یوں ہی کیا کرو، بلکہ اپنا قبضہ جتا تیں، جہاں سو، وہاں سوائے ر

جب مہبہ کا دعوے کیا، حالانکہ یہ ایک مخفی بات ہے ہر کوئی اسے نہیں جان سکتا،
تو قبضہ تو کھلی بات ہے، اس کے دعوے میں کیا دشواری ہے۔ مہبہ کے دو تین ہی گواہ
تھے، اس کے تو ہزاروں نکل آتے۔ چوتھا یہ کہ صدیق اکبرؓ دل سے ہی چاہتے تھے
کہ فدک سیدۃ النساء کے پاس چلا جائے۔ اور ان کی خاطر مبارک پر کسی طرح میل
نہ آئے۔ ورنہ ان کو ان کے ناخوش ہونے میں کیا دشواری تھی؟ اور ان کے خوش کرنے
کی کیا ضرورت ہوتی؟ اور یہ پہلے آیت محمد رسول اللہ کے ذیل میں ثابت ہو چکا ہے کہ
طالب رضا بجز محبت اور کوئی نہیں ہوتا، اور اگر کوئی یوں خیال کرے کہ یہ سارا مملوک
اور ظاہر واری فقط دفع بدنامی کے لئے تھا۔ تو اول تو لفظ کبر ذالک علیہ فاراد
استرضاء تھا، جس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت فاطمہؓ کا ناخوش ہو جانا انہیں بھاری
پڑا، اور ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ واقعی ابو بکر
کو یہ بات بہت شق تھی، اور اسی واسطے ان کے راضی کرنے کی فکر میں تھے۔

دوسرے اگر بدنامی کا اندیشہ تھا تو مخالفین سے تھا موافقین تو بہر حال
ان کی طرف سے مطمئن ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اول تو فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا مملوک نہ تھا۔ پھر تم کہ نبوی میں میراث نہیں چلتی مگر مخالفین نے اب کونسی کمی کی؟
جو راضی کر کے ان کی زبان بند کرنا چاہتے تھے۔ سو اس سے بہتر تو یہی تھا کہ جب اپنے
آپ لینا مد نظر ہیں تو حضرت فاطمہؓ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیتے، اس عقل و
دانی پر کہ موافق مخالف ہندو، مسلمان یہود و نصاریٰ سب قائل ہیں۔ ایسی حرکت
ان سے تصور میں نہیں آتی شیعوں جیسے کم عقل ہوں تو مضائقہ بھی نہ تھا بلکہ نقل
سلیم اس روایت کو دیکھ کر صدیق اکبر کے صدق و دیانت پر شاید ہے۔ اور بالیقین ان
کو اس مقدمہ میں بری الذمہ سمجھ کر ان کی طرف سے معذرت ہے کہ در صورت صحت روایت
مہبہ فدک بلکہ بہر صورت جو صدیق اکبر نے فدک دینے میں امداد کی کی۔ حالانکہ حضرت سیدۃ
النساء کا یہ منصب نہ تھا کہ کسی طرف ان کا گوشہ خاطر مائل ہو۔ اور پھر اس کے موافق
نہ ہو تو یہ وجہ نہیں ہوتی کہ صدیق اکبر کو ان کی رضا کی کچھ پرواہی نہ تھی۔ ورنہ اس کے

کیا معنی تھے کہ دنیا دار صاحب اختیار ہو کر حضرت فاطمہ کی ناخوشی سے کچھ دشواری ہو یا ان کا رنجیدہ ہو جانا۔ ان پر شاق ہو؟ بلکہ تہ دل سے ان کی رضا کے خواہاں تھے، پھر بایں ہمہ جو فدک نہ دیا۔ حالانکہ اپنے لئے بھی نہ رکھا تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کسی حکم خداوندی کی پابندی اور تا بعد اری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ناچاری بھی اور مصلحتہا دینی و دنیوی کی رعایت تھی۔

سو پابندی خداوندی کا تو یہ حال جسکے آیت یوحیکم اللہ اور آیت
 عافاء اللہ خود اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہو چکا اور اطاعت
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے۔ سو اس سے معلوم
 ہوتا ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاخو رث ماتر کنا صدقہ فرمایا
 ہو اور زیادہ اس کی تصدیق کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مصدق اور اس کے موافق روایتیں
 شیعوں کی معتبر کتابوں سے نقل بھی ہوئی ہیں۔ اور مصلحتوں کی یہ صورت سے کہ اول
 تو احکام خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سہرا پا حکمت اور مصلحت ہی ہوتے ہیں۔
 ماسوا اس کے اگر صدیق اکبر بیاس خاطر حضرت زہرا رضہ فدک ان کے حوالہ کر دیتے۔
 اور در صورت صحت روایات ہبہ فدک اس بات کی رعایت نہ کرتے کہ ہنوز دعویٰ
 ہے، کوئی دستاویز کامل نہیں، کیونکہ حضرت علی اور حضرت ام ایمن بلکہ ان کے
 ساتھ حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی گوامی موافق قانون خداوندی
 قابل اعتبار نہیں۔

تو اول تو عام و خاص کے دل میں یہ بات تہ نشین ہو جاتی کہ خلیفہ سب
 مستغیثوں کو برابر نہیں سمجھتے۔ روادروں کو بے ثبوت بھی کامیاب کر دیتا ہے۔ اور سوا
 ان کے اوروں سے قرار واقعی مجتہدین طلب کرتا ہے۔ اور واقعی یہ بات شیوہ اللہ
 سے بہت بعید ہے۔ معہذا باعث تنفر خلافت اور درہمی امور خلافت جو موجب انظامی
 دین ہے۔ ہر جاتا، اور پھر یہ آگ ہرگز بجھائے نہ بجھتی، اور اگر بالفرض استحکام خلافت
 میں کچھ فرق نہ تھا۔ تو یہ وبال کس کی گردن پر رہتا، کہ قیامت تک حکام اسلام ہی شیوہ

برتنے اور ان کے لئے یہ حجت اور دستاویز ہو جاتی، کہ خلیفہ راشد نے جب ایسا کیا تو ہم بھی ایسا کر نیچے، روداروں کو منہ مانگے موتی دینے کی غیروں کی سنیں گے۔

دوسرے اس صورت میں لازم آتا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کے مصداق ہو جائیں اَلْعَائِدُ فِيْ صَدَقَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُوْذُ فِيْ قَبِيْهِ یعنی کسی چیز کو کسی کو اللہ دے کر پھر اس سے لوٹانے والا ایسا ہے جیسا کتا قے کر کے پھر پاٹ لیوے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہوں لاخورت ما ترکنا صدقة تو جو جو چیزیں وقت وفات آپ کے ملک میں تھیں سب صدقہ ہو گئی، اور یہ بات باتفاق فریقین ثابت ہے کہ یہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا اور اب اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تادم وفات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں رہا، تو اگر یہ بھی کیا تب بھی قبضہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نہ ہونے پایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہمیشہ قبضہ رہا، تو یہ یہ باتفاق فریقین موجب ملک سیدۃ النساء ہوا بلکہ ہمیشہ دم وفات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں رہا تو بیشک یہ بھی صدقہ ہو گیا۔

سودر صورتیکہ دعوائے یہیہ کے قبول نہ ہونے کے بعد برعم شیعہ دعوائے میراث کیا ہو۔ تو جیسے یہیہ کی صورت میں صدیق بغرض پاس خاطر سیدۃ النساء بوجہ مذکور نہ دے سکے میراث کی صورت میں اس وجہ سے نہ دے سکے، کیونکہ وارث کی ملک نائب ملک مورث ہوتی ہے۔ جب یہ متحقق ہو تو وہ پہلے متحقق ہو۔ سو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز بقول لاخورت ما ترکنا صدقة حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ ہو چکی ہے۔ اور ملک سے نکل گئی تھی، پھر ملک نبوی میں آئے، ورنہ جو چیز خارج از ملک مورث ہو۔ اس میں میراث کا جاری ہونا محال ہی، سو ایسی حرکت لغو صدیق اکبر سے کب ہو سکتی تھی؟ جس سے ایسا حرف بیجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہو معہذا لاخورت، اور صدقة ہونا جب صحیح ہو

کہ قابل ملک و ارث نہ ہے۔ پھر بھی اگر ملک و ارث اس میں جاری ہو تو اجتماع
تقیضین لازم لائے۔

علاوہ بریں الانورث مائرکناہ صدقۃ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ رضائے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ وارثوں کو نہ دیا جائے۔ اور رضا حضرت زہراؑ اس
طرف تھی کہ ان کو دیا جائے، ناچار ہو کر صدیق اکبر نے رضائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو
مقدم سمجھ کر اول تو ان کے فرمانے کے موافق عمل کیا اور پھر بائینہم جس طرح سے بن پڑا حضرت
فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بھی راضی کیا چنانچہ اس حدیث میں مہر ج ہے سو یہ کمال القیاد
اور اطاعت صدیق اکبر پر دلالت کرتا ہے کہ بایں ہمہ رضائے سیدۃ النساء کو بھی ہاتھ
سے نہ جانے دیا۔ اور نہ رضائے نبوی کو۔ در صورتیکہ موافق رضائے نبوی کرتا ان کی ناخوشی
کا باعث ہوا ہو، تو عقلاً اور نفلاً ان کے ذمہ حضرت فاطمہ کا راضی کرنا لازم نہ تھا
چنانچہ ظاہر ہے۔

تیسری مصلحت دنیوی اس میں یہ تھی کہ اگر آپ حضرت فاطمہ زہراؑ کو کچھ
بھی حوالہ کرتے، تو پھر حضرت عباس اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین جدا
جدا ہر کوئی اپنی جاگیر کے گاؤں مانگتا۔ سو اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا
لغوی جاتا۔ کیونکہ متروکہ نبوی اس قدر نہ تھا، جو اس بات کو وفاق کرے، کہ ہر کسی کو اس
اس قدر دیجئے۔ دوسرے پھر خلافت ہی کیا ہوئی کہ جو بیت المال کو اس طرح لٹا دیا،
اور مستحق غیر مستحق کو نہ دیکھا، پانچواں فائدہ حدیث حجاج السالکین سے یہ ثابت ہوا کہ
گو حضرت فاطمہ زہراؑ ایک بار ناخوش ہو گئی تھیں، پر حضرت صدیق اکبر نے عذر معقول
کے۔ اور اسی سبب حضرت فاطمہ زہرا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئیں اور
خاتمہ بالخیر ہوا۔ اور اسی فائدہ کی غرض سے آج تک اس حدیث کو رکھ چھوڑا تھا۔ اظہر
ہے کہ جب رنج مبدل بخوشی ہو جائے، تو پھر اس رنج کا زبان پر لانا اہل فہم کے نزدیک
نازیبا ہے، خیر الحمد للہ کہ امامیوں ہی کی روایت سے حضرت سیدۃ النساء کا صدیق
اکبر سے راضی ہو جانا ثابت ہو گیا۔ اور پھر روایت بھی کیسی؟ معتبر کتابوں کی۔ اور وہ

بھی ایک کتاب کی روایت نہیں۔ بلکہ سوائے محاج السالکین کے اور کتابوں میں بھی مروی ہے۔

روایات اہل سنت میں سیدہ کی باقی رہیں روایات اہلسنت، سومدارج البنوۃ اور کتاب الوفا خوشنودی کا بیان موجود ہے | یہی ہقی اور شرح مشکوٰۃ میں یہ بات موجود ہے۔ کہ

حضرت فاطمہ زہراؑ کا ناخوش ہو جانا جو بظاہر کبیدگی ظاہر سے معلوم ہوتا تھا، ابو بکر صدیقؓ پر شاق ہوا۔ حضرت فاطمہ کے دردِ دولت پر حاضر ہوئے۔ اور حضرت علیؓ سے سفارش کرائی، یہاں تک کہ حضرت زہراؑ ان سے خوشنود ہو گئیں۔ بلکہ شیخ عبدالحق نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے، کہ اس قصہ کے بعد صدیق اکبرؓ حضرت زہراؑ کے گھر گئے اور دھوپ میں دروازہ پر کھڑے رہے اور خدرِ مغدرت کی۔ اور حضرت زہراؑ ان سے خوش ہو گئیں۔ اور ریاض النضرۃ میں یہ قصہ بہ تفصیل مذکور ہے اور فصل الخطاب میں میں بروایت یہی شعبی سے یہ قصہ مروی ہے۔

اور ابن سحان نے کتاب الموائفت میں اوزاعی سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت صدیق اکبرؓ گرمی کے دن حضرت فاطمہ زہراؑ کے دردِ دولت پر حاضر ہوئے، اور یہ عرض کی کہ میں یہاں سے کبھی نہ ٹلوں گا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی مجھ سے راضی نہ ہو جائیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ اندر تشریف لے گئے، اور حضرت فاطمہ زہراؑ کو قسم دی کہ تم راضی ہی ہو جاؤ۔ سو وہ راضی ہو گئیں۔ علیؓ ہذا القیاس شیعوں میں سے زیدیوں کی روایتیں بھی بعینہ اہل سنت کی روایات کے مطابق اور موافق ہیں۔

ان روایات کے ملاحظہ سے اہل انصاف کو نا مل نہ رہے گا کہ صدیق اکبرؓ کے دل میں عداوت خاندان بنوی ذرہ برابر نہ تھی۔ بلکہ ان کی محبت اور اعتقاد اور انکی تعظیم و تکریم میں ایسے فنا تھے کہ باوجود عروج خلافت اور شوکت سلطنت حضرت فاطمہ زہراؑ رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنے آپ کو مثل غلامانِ غلام اور کمترین خدام سمجھتے تھے۔ سو یہ بات بجز اس کے متصور نہیں کہ مرتبہ کمالِ صدق و وفا کو پہنچے ہوئے تھے، ورنہ اگر دنیا داری کی

ہوتی تو ایسے امور ان سے ہرگز ظہور میں نہ آتے۔ ان کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ اس شان و شوکت پر اتنی منتیں سما جیتیں کرتے؟ بلکہ خود سیدۃ النساء کا ان سے روٹھ جانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ حضرت سیدۃ النساء کو صدیق اکبر پر کمال ہی بھروسہ تھا، ورنہ کس کے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی فقیر بادشاہان جبار کے سامنے ایسی باتیں کرے اور وہ بادشاہ ان کو ایسی ایسی منتوں سے منائے۔

جنارہ میں شرکت روکنے کا فائدہ | اور بالبدایت اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر بالفرض تقدیر حضرت فاطمہ زہرا نے مرتے دم اس بات کی وصیت بھی کی ہو کہ میرے جنازہ پر ابو بکر صدیق نہ آنے پائیں تو یہ سبب کمال حیا اور پردہ داری کو یہ وصیت کیسے ہوگی۔ اور ابو بکر صدیق کو روکنے کی تخصیص اس وجہ سے ہو کہ ان کو حضرت زہرا ایسا سمجھتی تھیں کہ یہ خواہ مخواہ حاضری ہوں گے، کیونکہ ان کو جس قدر تعظیم و تکریم اہل بیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش نہاد خاطر ہے اور ان کو نہیں بمعہذا ابو بکر ایک باری بخشش سے شرمائے ہوئے ہیں۔ اس کے تدارک کے لئے وہ کوئی موقع ایسا نہ چھوڑیں گے جو اس میں غیر حاضری باعث اشتباہ اور موجب بدگمانی اہلبیت ہو، علاوہ بریں وہ خلیفہ وقت تھے۔ امامت نماز اور امامت جنازہ دونوں انہیں سے متعلق تھیں، اس لئے بالخصوص ان کا نام لے کر منع کیا ہو غرض اگر تخصیص کہیں سے ثابت ہو بھی جائے تو اس کے یہ وجوہ ہیں

سیدہ کی وصیت میں عام ممانعت تھی تخصیص نہ تھی | ورنہ علی العموم مردان نامحرم کے حاضر ہونے کی آپ روادار نہ تھیں، اس لئے یہ وصیت کی کہ مجھ کو شب کو دفن کر دینا۔ اور دلیل اس بات کی کہ بوجہ حیا و پردہ داری علی العموم ممانعت تھی صدیق اکبر ہی کی کچھ تخصیص نہ تھی یہ ہے کہ بروایت صحیحہ یہ بات مروی ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے اپنے مرض موت میں فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ بعد موت بے پردہ مردوں کے سامنے مجھ کو لائیں۔ اور اس زمانہ کی عادت یہ تھی کہ حورتوں کو مثل مردوں کے بے پردہ یعنی بے گہوارہ دفنانے کو لے جایا کرتے تھے، اس پر اسما بنت عمیس نے عرض کیا کہ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ خرما کی شاخوں سے کجاوہ کی صورت کی نعلین بناتے ہیں، حضرت زہرا نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے بنا کر دکھلاؤ

حضرت اسماعیل نے بنا کر دکھلایا۔ تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بہت خوش ہوئیں اور تبسم کیا اور ہرگز بعد وفات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کبھی کسی نے تبسم کرتے نہ دیکھا تھا۔

اس وجہ سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد تو ہی مجھے غسل دیجو، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ساتھ رہیں کسی دوسرے کو نہ آنے دیجو، اب غور کیجئے کہ غسل کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آنے کی کوئی سورت ہی نہ تھی، بلکہ کسی مرد کے آنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس وقت جو آدمی اس وقت سے مانعت ہوئی۔ تو یہ مطلب ہوا کہ عورتوں کو بھی نہ آنے دیجو۔ سو جسے عورتوں سے اس قدر شرم ہوا کہ بعد مردن ننگے بدن ان کے سامنے ہونے سے شرمائے۔ وہ مردوں کے جنازہ پر آنے سے کیونکر نہ شرمائے۔ سو اس لئے حضرت علی نے ان کو رات ہی کو دفن کر دیا۔ اور کسی کو اطلاع نہ کی۔

القصة بوجہ تشرب و بعاث جیہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس بات کی روادار نہ ہوئیں کہ میرے جنازہ پر کوئی مرد حاضر ہو، ورنہ حضرت ابوبکر کی کوئی تخصیص نہ تھی، اور ہرگز کسی روایت میں اہل سنت کی روایات میں سے یہ بات نہیں، کہ بالخصوص حضرت صدیق اکبر کے نام سے مانعت ہوئی ہو۔ علی العموم مانعت ہوئی تھی۔ یہ شیعوں کی شرارت سے کہ مانعت ان کے نام لگادی۔ اور پھر دلاوری یہ کہ عوام اہلسنت کے سامنے ان کی کتابوں کا حوالہ بتا دیتے ہیں، اس پر مولوی عمار علی صاحب نے تو یہ طوفان جوڑے، کہ شرم کی آنکھیں پھوٹ کر صحیح مسلم کا نام لے دیا۔ کہ اس میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے وقت وفات یہ وصیت کی تھی کہ ابوبکر اور عمر میرے جنازہ پر نہ آئیں۔ خدا جانے یہ بے حیائی کہاں سے اڑائی ہے، یا ایجادِ فقر ہے؟ کہ اصلاً و مطلقاً جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ صحیح مسلم کوئی نایاب کتاب نہیں۔ ہزاروں نسخے اس کے موجود ہیں حذف کرنے کی گنجائش نہیں۔ اگر یہ روایت ہو تو کوئی کہیں سے نکال دے۔ فقط اس میں اتنی بات ہے۔

در کہ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تو حضرت علیؑ نے ان کو شب ہی کو دفن کر دیا۔ اور صدیق اکبر کو اطلاع نہ کی۔ اور نماز پڑھی ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے، چنانچہ تسکین خاطر ناظرین کے لئے عبارت روایت صحیح مسلم منقول ہے۔ اس کا ترجمہ بلا کم و کاست یہی ہے جو میں نے عرض کیا، وہ عبارت یہ ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتُمْ لَا تُصَادِقُوا جُمُعَةَ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ لَئِن لَّمْ يُوَفِّدْكُمْ بِهَا
أَبَا بَكْرٍ وَصَلَّ عَلَيْهَا عَلِيٌّ

اور اس عبارت سے آگے نہ پیچھے کہیں وصیت کا ذکر نہیں، خدا جانے مولوی صاحب نے اس عبارت میں سے یہ معنی کہ حضرت زہرا نے صدیق اکبر اور حضرت عمرؓ کے نہ آنے دینے کی وصیت کی تھی کون سی لغت اور کونسی زبان اور کون سے محاورہ کے موافق نکال لئے ہیں۔ سبحان اللہ علماء شیعہ کی یہ امانت و دیانت اور صدق گفتار ہے کہ دیدہ دانستہ ایسے جھوٹ بولتے ہیں، غرض صحیح مسلم میں تو فقط اتنی بات ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت سیدۃ النساء کو شب کو دفن کر دیا، اور صدیق اکبر کو اطلاع نہ کی، اور اپنے آپ نماز جنازہ پڑھی۔ اور یوں بھی ایک قول ہے کہ حضرت عباسؓ نے چند ایک لمبیت کے ساتھ نماز پڑھ کے رات ہی کو دفن کر دیا، مگر ہر حال صحیح مسلم میں وصیت کا ذکر معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر بالفرض کسی روایت میں اس باب میں کوئی وصیت بھی ہو تو اس بات کی وصیت ہوگی کہ مردوں میں سے میرے جنازہ پر کوئی نہ آئے، چنانچہ بعضی روایات میں آیا ہے کہ دوسرے دن جو حضرت صدیق اور حضرت عمرؓ اور سوا ان کے اور اصحاب رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تعزیت کے لئے حاضر ہوئے تو شکایت کی کہ ہمیں آپؑ نے خبر نہ کی، ہمیں بھی شرف نماز اور شرف حضورؐ میسر آجانا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ جب میں دنیا سے اٹھوں تو مجھے رات ہی کو دفن کر دینا تاکہ میرے جنازہ پر کسی نامحرم کی نگاہ نہ پڑے۔ سو میں نے ان کی وصیت کے موافق عمل کیا ہے غرض اس روایت سے اور یہی روایت مشہور ہے۔

علی العموم نامحرموں کے آنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تخصیص کا اشارہ بھی نہیں۔

مگر شیعوں کی بدگمانی کا یہ حال ہے۔ کہ اہل بیت کی تمام حرکات سکنت کو مطابق بیٹھیں یا نہ بیٹھیں، صدیق اکبر کی عداوت پر محمول کرتے ہیں اور عمل و نقل کا کچھ لحاظ نہیں کرتے، ان کی وہی مثل ہے۔ جیسے شہر ہر سبکے سنا ہوگا۔

شعر یہ سگے راپوں کلو خے بر سر آید ز شادی بر جہد کیں استخوان است
وگر نغشی دو کس بردوش دارد اینم الطبع پندار و کہ خوان است

القصة ابو بکر صدیق کی ممانعت کی یا حضرت عمر کی ممانعت کی کہیں تخصیص و

تصریح نہیں۔

سیدہ کا جنازہ صدیق ہی نے پڑھایا | بلکہ فصل الخطاب کی روایت سے تو یوں ثابت ہوتا ہے

کہ دیگر گوں ہے۔ اس لئے کہ اس میں یوں مذکور ہے کہ ابو بکر صدیق اور حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف نہ عشا کی نماز کے وقت حاضر ہوئے، اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رحلت مغرب عشا کے بیچ منگل کے دن رمضان شریف کی تیسری تاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے چھ مہینہ بعد ہوئی تھی اور آپ کی عمر شریف اٹھائیس برس کی تھی، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب فرمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیش امام ہوئے، چار تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھائی، اس روایت سے تو قدر شناسا علی رضی اللہ عنہ کو بھی متحقق ہوتا ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے ہرگز صدیق اکبر کے نہ آنے دینے وصیت نہ کی تھی۔ کیونکہ جب حضرت امام حسین یہ عزم رکھتے ہوں۔ کہ سعید بن العاص کو (حالانکہ وہ کچھ مودب نہ تھا) امام نہ ہونے دیں، تو حضرت علی تو حضرت علی ہیں۔

ادھر صدیق اکبر کا یہ ادب کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے کیا کیا کر رہے تھے

۱۰ کتے کے سر پر جب پتھر آکر لگتا ہے۔ تو اس کو ہڈی سمجھ کر خوشی سے اچھلا ہو

اور اگر وہ شخصوں کو نشان اٹھائے ہو جائے دیکھے تو یہ بد طبیعت اسکو در ستر خواں سمجھتا ہے

سو اگر حضرت فاطمہ وصیت کرتیں۔ تو اول تو صدیق اکبر کو دے دیتے، ورنہ نماز کا تو کیا ذکر؟ کیونکہ اپنی شجاعت اور صدیق اکبر کے ادب کے باعث کوئی وجہ تقصیر کی بھی نہ تھی۔ القصد صدیق اکبر کی ممانعت کی کوئی روایت نہیں، ہاں ایسی روایتیں ہیں جن سے عموم ممانعت ثابت ہے، اور اگر بالفرض تخصیص کر کے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کا نام بھی ہو تو حضرت ابو بکر کے منع کی وجہ تو مذکور ہو لیں، باقی رہے حضرت عمر سوا دل وجہ میں تو وہ صدیق اکبر کے شریک ہی ہیں۔ اور علیؑ ملا القیاس دوسری وجہ میں بھی۔ کیونکہ یہ صدیق اکبر کے سامنے بمنزلہ وزیر مشیر تھے۔ سو صدیق اکبر کے سب کام انہیں کے مشورے سے ہوتے تھے، سو اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو (بوجہ نہ دینے فدک کے) کچھ صدیق اکبر سے رنج تھا، اور اس سبب وہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے شرمائے ہوئے ہیں، تو حضرت عمر سے پہلے تھا، اور یہ ان سے پہلے شرمائے ہوئے تھے۔

باقی رہی تیسری وجہ اس میں بھی حضرت عمر صدیق اکبر کے ایک وجہ سے شریک ہیں۔ کیونکہ حضرت عمر اور حضرت صدیق اکبر بمنزلہ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ صدیق اکبر بلائے جائیں، اور حضرت عمر کو خبر نہ ہو۔ سو اگر بالفرض والتقدیر کسی روایت میں اہلسنت کی ممانعت تخصیص نام ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی نکل آئے۔ تو ان کے وجہ یہ ہیں جو میں نے عرض کئے۔ عداوت اور بغض صدیق اکبر یا حضرت عمر نہ تھا۔ اور دلیل عقلی اس بات کی کہ حضرت صدیق اکبر کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے جنازہ پر نہ بلوانا۔ بوجہ حیا و سیدۃ النساء اور باعث پردہ داری حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تھا، نہ بوجہ کدورت اور ناخوشی، یہ ہے کہ اگر بوجہ کدورت اور ناخوشی ہوتا تو اس وجہ سے ہوتا کہ مبادا صدیق اکبر ان کے جنازہ کی نماز نہ پڑھائیں۔ کیونکہ وہ خلیفہ تھے۔ امامت نماز پنجگانہ اور امامت نماز جنازہ انہی سے متعلق تھا۔ سو یہ بات کسی وجہ سے درست نہیں ہو سکتی۔

اس لئے کہ باجماع مورخین طرفین شیعہ سنی جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ باہر لائے۔ امام حسینؑ نے سعید بن العاص کو جو امیر معاویہ کی طرف سے مدینہ کا امیر تھا۔ نماز پڑھانے کے لئے اشارہ کیا۔ اور یہ فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی سنت یوں نہ ہوتی، کہ کہ امام جنازہ امیر ہوا کرے۔ تو مجھے ہرگز آگے نہ بڑھانا
سو معلوم ہوا کہ حضرت سیدۃ النساء نے حضرت ابو بکر کی نماز پڑھانے کے اندیشہ سے
یہ وصیت نہ فرمائی تھی۔ ورنہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کس طرح حضرت زہرا
رضی اللہ عنہا کے خلاف کرتے، اور ظاہر ہے کہ سعید بن العاص ہزاروں مرتبہ ابو بکر رضی اللہ
عنہ سے کتر تھے۔ خاص کر لیاقت نماز میں۔

کیونکہ کوئی چھپی مہینہ گزرے تھے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امام نماز تمام ہاجروانصار کا کیا تھا۔ اور اس باب میں کمال ہی تاکید
فرمائی تھی۔ پھر کیونکر احتمال ہو کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس تھوڑی سی مدت میں یہ
تمام واقعات بھول گئی ہوں، الحاصل دلائل نقلیہ و عقلیہ دونوں اس بات پر شاہد
ہیں کہ شیعوں کا یہ وہم کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر کو جنازہ پر آنے دینے
کی روادار نہ تھیں، عقل کے نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ اور ان وجوہ کو بھی جانے
دو، ہمیں فقط روایت مجاہد السالکین جو ابھی مرقوم ہوئی ہے کافی ہے۔ کیونکہ حضرت
فاطمہ زہرا سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا اگر صدیق اکبرؓ کے (بالخصوص) جنازہ پر آنے کی روادار
نہ ہوتیں، تو بوجہ رنج روادار نہ ہوتیں۔ مواس روایت سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت
زہرا رضی اللہ عنہا کے دل مبارک میں اگر بالفرض رنج تھا بھی تو وہ زائل ہو گیا تھا، اور
دونوں باہم راضی خوشی ہو گئے تھے۔

مگر کوئی شیعہ منافق پیشہ حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو بھی نعوذ باللہ
منافق سمجھے، اور یوں کہے کہ یہ راضی ہو جانا فقط ظاہر داری کے لئے ہو گا۔ تو یہ بات علیحدہ
ہے، پر یہ بات شیعوں ہی کے سمجھنے کی ہے، کیونکہ المرء لیتیس علی نفسه جیسے وہ خود ہیں ایسے
ہی بزرگان دین کو سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔

کارپا کان راقیاس از خود مگیر پڑ گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر
اور بایں ہمہ پھر کیا ہوتا ہے۔ شیعوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔
یہ ممکن نہیں۔

خداوند رسول راضی ہیں تو سیدہ اگر بالفرض والتقدیر بزعم شیعہ حضرت فاطمہ زہرا کی ناراضی سے کچھ نقصان نہیں رضی اللہ عنہا صدیق اکبر سے اس جہان سے ناخوش ہی گئی ہوں۔ تو در صورتیکہ خداوند رسول خوش ہوں۔ کچھ نقصان نہیں، اور جو کچھ نقصان تھا بھی۔ تو اس کی تدبیر اور اس کا بندوبست خود خداوند کریم نے لکھو کھا برس پہلے کر دیا۔ سورہ ہجر میں فرماتے ہیں۔ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍ إِخْوَآنًا عَلٰی سُرُرٍ مَّتَقَابِلَتٍ ۖ اس آیت میں متقیوں کے جنت میں داخل ہونے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اور نکال ڈالی ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں خفگیاں تھیں، وہ بھائی ہو گئے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ متقیوں اور پرہیزگاروں میں آپس میں رنج بھی ہو جایا کرتے ہیں، اور وہ رنج انکو کچھ مضر نہیں ہوتے۔ بعنایت خداوندی جنت میں جانے کے خارج نہیں ہوتے، بلکہ جنتی ہونے کی وجہ سے وہ رنج خود ہی زائل ہو جاتے ہیں۔

سو اگر بالفرض بزعم شیعہ حضرت فاطمہ زہرا حضرت صدیق اکبر سے رنجیدہ ہی اس جہان سے گئیں ہوں، تب اس آیت بشارت آمین نے صدیق اکبر اور ان کے ہوا خواہوں کی تسلی کر دی۔ اور شیعوں کی آنکھوں میں خاک ڈال دی، مگر شاید کوئی شیعہ چہرہ پوزیوں میں سے ٹکرا کر رہے۔ کہ ہر حین اس آیت میں یہ بشارت ہے جو مذکور ہے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوروں ہی کے لئے یہ بشارت ہے جن سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ناخوش ہوں۔ ان کے لئے اس بشارت میں حصہ نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کی شان میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ حدیث متفق علیہ طرین ہے۔ اَلَا اِنَّ فَاطِمَةَ بَضْعَةٌ مِّنِّيْ يُؤْذِيْنِيْ مَا اُذَاهَا وَيُرِيْنِيْ مَا رَا بَهَا فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔ کہ یاد رہے یہ بات کہ فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے۔ جس سے اسے تکلیف ہو۔ اس سے مجھے بھی تکلیف ہو جس بات سے وہ گھبرائے۔ اس سے میں بھی گھبراتا ہوں۔ سو جو شخص اسے غصہ کرے گا۔ وہ مجھے غصہ کرے گا۔ فقط، اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے غصہ کرنے والا کون ہوتا ہے ۔

بضعۃ منیٰ سے اشکال اور اس کے جوابات اسو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پہلے ہی رعایت کر گئے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِي جس کے یہ معنی ہیں کہ جو اسے غصہ کرے گا۔ وہ مجھ کو غصہ کرے گا، اور یوں نہیں فرمایا مَنْ غَضِبْتُ عَلَيْهِ غَضِبْتُ عَلَيْهِ یعنی جس پر وہ غصہ ہو گا اس پر میں بھی غصہ ہوں گا۔ ظاہر ہے کہ کسی کو غصہ کر دینے کی یہ صورت ہے کہ دیرہ و دانتہ کسی بات یا کلام سے کوئی شخص اسے غصہ لانے کا ارادہ کرے، سو کمال نادانی کی بات ہے کہ کوئی شخص صدیق اکبر کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ انہوں نے بالقصد حضرت فاطمہ کو غصہ دلایا تھا جو جانتے تھے، وہ تو جانتے ہی تھے۔ پر وہ جو نہ جانتے تھے، اب تو ان پر بھی واضح ہو گیا کہ صدیق اکبرؓ اس قسم میں معذور تھے، اور یا نہم پھر عند معذرت کیا کیا کچھ نہ کیا۔

روایات کو ٹوٹے تو معلوم ہو جائے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکرریں عرض کیا کہ وَاللَّيْلِيَا اِنَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنَّ قَرَابَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ اِلَيَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِي۔ یعنی اللہ کی قسم اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے ساتھ صلہ کرنا، اور ان کی خدمت کرنا بہت ہی زیادہ محبوب ہے میرے نزدیک اپنے قرابتیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے اور حب ان کی طرف سے اغصاب ہی نہ ہوا یعنی انہوں نے بالقصد ان کو غصہ نہ دلایا۔ بلکہ حتی المقدور اس کا بچاؤ ہی کیا ہو، تو وہ پھر کس طرح اس وعید میں داخل ہوں گے اگر بالفرض کچھ ہوا بھی ہو تو اتنا ہوا ہو کہ حضرت فاطمہ بمقتضائے بشریت غصہ ہو گئی ہوں اس کو اگر ہم مان لیں۔ اور ان توجہات کا جو مذکور ہو لیں۔ کچھ خیال نہ کریں، تو بیش بریں نیست کہ موافق وعده وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ قِيَامَتِ كُوسَيْنِ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے وہ رنج نکالا جائے۔ اور دونوں میں سے کسی کو وہ آپس کی شکر رنجی مضر نہ ہو۔

بضعۃ منیٰ کا شان و رود اور حضرت علی کا شکر بارہا غصناک کرنا اور اگر قطع نظر غصہ کرنے سے حضرت

فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا خود بخود غصہ ہو جانا بھی اس وعید میں داخل کر دیں، تو شیعوں کو ہم سے زیادہ مشکل پڑے گی کیونکہ ابوبکر صدیق تو معصوم نہیں۔ اگر ان سے کوئی حرکت بجا ہو جائے اور اس سبب سے کسی وعید میں شامل ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں، پر حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ تو شیعوں کے نزدیک معصوم تھے، ان سے جو بارہا مقدمات خانگی میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو رنج ہو گیا ہے۔ تو اس کا کیا سبب؟ بلکہ اس فرمانے کا اعلان فاطمہ بضعتہ منی یوزینی الخ سبب یہی ہوا تھا کہ حضرت زہرا اور اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اس وجہ سے فی الجملہ ناچاقی ہو گئی تھی کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا پیام بھیجا تھا، اس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا روتی ہوئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس تقریب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خطبہ یہ ارشاد فرمایا اعلان فاطمہ بضعتہ الخ۔ سو اگر فقط حضرت فاطمہ زہرا کے غصہ ہو جانے کے باعث صدیق اکبر وعید مذکور میں داخل ہو جائیں، تو حضرت امیر پہلے داخل ہوں گے۔ کیونکہ اول تو خطبہ نہیں کے سمجھانے سنانے کو فرمایا تھا، دوسرے حضرت صدیق اکبر تو بوجہ ارشادات خداوندی اور ارشاد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے نہ دینے میں معذور تھے۔ اور پھر بائیں ہمہ بشارہ حدیث محتاج یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکم خداوندی نہ ہوتا، تب بھی ان کے دل میں یہی تمنا تھی، کہ فدک حضرت فاطمہ کے پاس رہے لیکن حضرت علی نے جو ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو انکو کیا دشواری تھی؟ اور پھر یہ ہی نہیں کہ تہ دل سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کے موافق ہوں۔

علی اند القیاس ایک بار حضرت امیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے رنجیدہ ہو کر گھر سے باہر تشریف لے آئے اور مسجد میں زمین ہی پر بدو ن نیکیہ بچھونے کے سو گئے۔ جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصہ کی خبر ہوئی، آپ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور پوچھا، تیرے چچا کا بیٹا یعنی علی مرتضیٰ کہاں ہیں؟ عرب میں ایسے موقع میں اکثر ایک دوسرے کو چچا کا بیٹا بولتے ہیں، خیر حضرت زہرا نے عرض کیا کہ مجھ کو

لڑکے نکل گئے اور دوپہر کو بھی یہاں نہیں سوئے، اور یہ دونوں روایتیں کچھ شیعوں
ہی کی کتابوں میں نہیں شیعوں کی کتابوں میں بھی موجود ہیں

پیغام نکاح کوئی گناہ نہ تھا۔ مگر سیدہ | باقی روایت اول سے سوائے مطلب پیش آمدہ کے
کو بشریت کی وجہ سے غصہ آیا۔ ایک اور بات بھی نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ

آخر بشر تھیں بمقتضائے بشریت غصہ آجاتا تھا۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو
الوجہ کی بٹی سے نکاح کا ارادہ کیا۔ تو انہوں نے موافق حکم خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کوئی گناہ یا کسی گناہ کا ارادہ کیا تھا۔ پھر اب غصہ کی وجہ بجز مقتضائے بشریت اور کچھ
نہیں۔ بلکہ دونوں روایتوں سے اتنی بات نکلتی ہے کہ معصوم کو بمقتضائے بشریت غصہ
آجانا محال نہیں بلکہ بسا اوقات پیش آجاتا ہے۔ کیونکہ حضرت علی اور حضرت زہرا رضی اللہ
عنہما دونوں ہی معصوم تھے، پھر جو آپس میں رنج ہو جاتا تھا، تو قصور واکسی کو بھی نہیں کہہ
سکتے۔ بجز اس کے کہ بمقتضائے بشریت ایک کو دوسرے کی نسبت کچھ خیال فاسد دل
میں آجائے۔ اور اس سبب بے اختیار غصہ چڑھ جائے، اور اس غصہ میں دوسرے
کی معصومیت کا بھی لحاظ نہ رہے۔ اور کوئی صورت نہیں۔ سوائے ہی ہم بمقتضائے
بشریت کہتے ہیں۔

اسی طرح اگر حضرت فاطمہ کو صدیق اکبر پر بھی بمقتضائے بشریت غصہ آجائے
اور ان کا کچھ قصور نہ ہو تو کیا دشواری ہے؟ اور کیوں انکار ہے۔ القصہ فقط بمقتضائے بشریت
حضرت فاطمہ کے غصہ ہو جانے سے، بے اس کے کہ کوئی دیدہ و دانستہ بے وجہ ان کو غصہ
دلائے، آدمی وعید مذکور میں داخل نہیں ہو سکتا، علاوہ بریں سب جانتے ہیں کہ حضرت
موسیٰ علیہ السلام بشریت کی وجہ سے حضرت ہارون پر جو ان کے بڑے بھائی تھے اور نبی
مقرب تھے غصہ ہوئے یہاں تک کہ سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر کھینچنے کی نوبت آئی اور
یہ سب کو یقین ہے کہ حضرت ہارون علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے کچھ حضرت موسیٰ
علیہ السلام کے غصہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ نبی کا بالقصد غصہ دلانا کفر ہی مگر تاہم
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ ہونے میں کچھ شک نہیں، پس اگر اتنے غصہ ہو جانے

کویوں کہیے کہ یہ بھی غضاب ہے یعنی انہیں کی طرف سے ہے تو لعوز باللہ حضرت ہارون
کویوں کہنا پڑے کہ اس وقت کافر تھے

اس سے انصافاً معلوم ہو گیا کہ فقط بمقتضائے بشریت کوئی شخص کسی پر غصہ
ہو جائے، تو اسے غضاب نہیں کہتے، اور یہی قصیدہ بعینہ حضرت صدیق اکبر اور حضرت زہرا رضی اللہ
عنہما کا ہے کہ صدیق اکبر کی طرف سے غضاب نہیں فقط حضرت فاطمہ کی طرف سے اگر تھا
تو غضب تھا۔ ہاں ہم کہتے ہوئے ڈرتے ہیں غضاب ہوا ہے، تو بظاہر حضرت علی سے ہوا ہوگا
کیونکہ وہ خاوند تھے ان کو اتنا ادب نہ ہوگا۔ جتنا ابوبکر صدیق کو ہوگا۔ علاوہ بریں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی کو بوجہ معلوم سنا کہ خطبہ پڑھنا جس میں لفظ اغضبہا
اس بات پر گو نہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے غضاب پیش آیا ہو اور جب
صدیق اکبر کی طرف سے غضاب ہی نہیں۔ تو پھر ان کو وعید فمن اغضبہا اغضبہ فی میں داخل
سمجھنا اپنے آپ اس میں داخل ہونا ہے۔

کیونکہ عقیدہ باطل سے حضرت فاطمہ اور خود بدولت جناب رسالت مآب
صلی اللہ علیہ وسلم بھی بیشک ناخوش اور غصہ ہوتے ہیں تو اس صورت میں رسول اللہ
صلی اللہ وسلم کو دو وجہ سے رنج اور غصہ ہوگا، ایک اپنے آپ؛ دوسرا حضرت فاطمہ کے
سبب، اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ غضاب ہے، فقط بمقتضائے بشریت ہی
نہیں۔ اس سبب سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ بدگویان صدیق اکبر باینطور کہ وہ وعید
فمن اغضبہا میں داخل ہیں، آپ اس وعید میں داخل ہوتے ہیں۔ سو جو لوگ بدگویا
مذکور میں سے اس دار دنیا سے چل دیے، وہ تو چل دیے، پر مولوی عمار علی صاحب رحمۃ
باقیان شیعہ تو اپنا فکر کریں۔ اور اس عقیدہ بد سے باز آکر توبہ استغفار سے تدارک یافت
کریں آئندہ نہ مانیں تو وہ جانیں۔

انصیحت بجائے خود کر دیم

ورنیاں دیکھو انڈر کس

رذر گارے دیرین بسر بردیم

بر رسولان بلاغ بات دلیس

اب لازم یوں ہے کہ بس کیجیے کیونکہ کوئی بات مولوی صاحب کی خرافات میں

سے باقی نہیں رہی جس کا جواب شافی بفضلہ تعالیٰ اس رسالہ میں درج نہیں ہوا اس
لئے ان کلمات طیبات پر ختم کرتا ہوں۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوات والسلام
علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ واهل بیتہ وذریئہ اجمعین۔
والمرجو منک یا ارحم الراحمین ان تتقبل ہذی السآلۃ منی وتجعلہ وسیلۃ لی
الی رفعتک ورفاء رسولک صلی اللہ علیہ وسلم ورفاء اہل بیتہ ورفاء صالحہ
فی الغار سیدنا ابی بکر الصدیقؓ ومن سواہ من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم
رضوان اللہ علیہم اجمعین وان تغفر لی وترحمنی بجمۃ الاوراق فی الدنیا
والآخرة مغفرة ورحمة تحیط بہما والدی واکبائی المافیہین وذریئتی واقاربی
واحبابی خصوصاً من امرنی بالقیام لہذا الامر العظیم برحمتک یا ارحم الراحمین

خلاصہ جواب طعن فدک

جو صاحب مذہب شیعہ کی حمایت کریں اور بوجہ بیہ فدک یا میراث فدک
اول الخلفاء کی شکایت کریں تو ان کو در صورت دعویٰ بیہ ہی تین مقدموں کا اثبات
لازم ہے۔ اور در صورت ادعائے میراث بھی تین باتوں کی تحقیق واجب، بیہ کی صورت
میں تو اول مملوک نبوی ہونا فدک کا، دوسرے وقوع بیہ۔ تیسرے۔۔۔۔۔
حصول قبض، علیٰ ہذا القیاس در صورت میراث اول مملوک نبوی ہونا فدک کا۔ دوسرے
زوال حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور انقطاع تعلق روح پر فتوح حضرت سلی اللہ
علیہ وسلم، جو جسم اطہر سے حاصل تھا، تیسرے عموم خطاب یوحیکم اللہ فی اولادکم
لذکر مثل حظ الانثیین یہاں تک کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل
زمرہ مخاطبین ہوں، اور یہ خطاب مثل دیگر اشخاص مومنین امت آپکو بھی شامل ہو
لیکن واقفان فن مناظرہ اور الشوران فنون دانشمندی پر واضح ہو گا کہ اہل سنت کو
جو اس مقدمہ میں مدعا علیہ میں قبل استماع دلیل دعویٰ فقط لافسلفہ اعنی
محض انکار اور عدم تسلیم ہی کافی ہے۔ دونوں دعوؤں کے تینوں مقدموں میں سے

اگر ایک مقدمہ کو بھی تسلیم نہ کریں، تو نہ خود مورد طعن ہو سکیں، اور نہ طعن مند کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر واقع ہو سکے۔ چہ جائیکہ تینوں مقدموں کو نہ مانیں؟ اور اگر مقدمات ثلاثہ مذکورہ کو بدلائل واضحہ باطل کر دیں، یا ان کے نقائص کو بدلائل قوی ثابت کر دیں، تو پھر تو میدان ان سے کون لے سکتا ہے؟

ناظران ہدیتہ الشیعہ پر مخفی نہ رہے گا کہ ہبہ کے تین مقدموں میں سے آخر کے دو مقدمے تاہنوز اہل تشیع سے ثابت نہ ہوئے، بلکہ موافق اصول اہلسنت ان کی نقیض ثابت ہے، اور میراث کے دعوے کے لئے جو تین مقدمے موقوف علیہ ہیں ان میں سے دوسرے مقدمہ کا ابطال اگرچہ بظاہر دشوار ہے، پر اس ہیچدان نے اس باب خاص میں ایک رسالہ مسمیٰ بآب حیات لکھا ہے جس کی ضخامت پانچ چھ جہز سے کم نہ ہوگی، اور انشاء اللہ اگر منشی محمد حیات صاحب کی عنایت ہے، تو وہ بھی قریب ہی مطبوع ہو کر مطبوع طبائع ہوتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے بعد امید خدا سے یوں ہے کہ شیعوں میں سے بھی جو صاحب انصاف پرست ہوں۔ حق بول اٹھیں، ورنہ اہل حق یعنی اہل سنت کا تو کام یہی ہے کہ حق کو حق مانیں۔ اور باطل کو باطل جانیں۔

دہا اول مقدمہ ہبہ اور میراث کا، اور تیسرا مقدمہ میراث کا، ان کا ابطال اور ان کی نقیضوں کا اثبات رسالہ ہدیتہ الشیعہ میں تفصیل تمام مرقوم ہے، خصوصاً مقدمہ اولیٰ ہبہ میراث کا ابطال تو ایسا واضح ہے کہ بجز تیرہ دروں کو رہا طن اس میں اور کوئی متامل نہ ہوگا، یہی وجہ ہوئی کہ ۱۳۳۵ھ میں جو مرکز دائرہ تشیع نصیر الدین طوسی ثانی نورال شوستری مکانی مفتی محمد علی کے قریۃ العین مولوی حامد حسین جو اٹنا سفر لدھیانہ وارد میرٹھ ہوئے اور میر مہدی علی فرزند ارجمند عمر درازہ علی خان کے مکان پر تشریف لائے، اور یہ پریشان روزگار جو بوجہ پابندی علاقہ مطبع مجتہائی وصال ان دنوں شب و روز گزار رہا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کچھ اس قسم کا مذکور آیا، تو مولوی صاحب موصوف کو کچھ جواب نہ آیا۔ واللہ لا یجیدی القوم الظالمین۔ فقط

بارہویں صدی ہجری کی لاجواب و نادند وزگار تالیف

محکم دلائل تحفہ اشناہ

ترجمہ

مؤلف

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ابن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

ترجمہ - مولانا محمد عسکرمجید خاں

پیدائش و تاریخ مذہب شیعہ۔ ان کی مختلف شاخیں۔ ان کے اسلاف علماء اور کتب کا بیان، الوہیت، نبوت، امامت اور معاد کے بارے میں ان کے عقائد۔ ان کے مخفی مسائل فقہیہ صحابہ کرام ازواج مطہرات اور اہل بیت کے حق میں ان کے اقوال و افعال اور مطاعن۔ مکائد شیعہ کی تفصیل۔ ان کے اوہام، تعصبات، ہفوات کا بیان تو لا اور تبرائی حقیقت۔ یہ سب باتیں مذہب شیعہ کی معتبر کتب سے نقل کی گئی ہیں۔ نیز ان امور کا احاطہ۔ کمال تہذیب کے ساتھ ان پر سیر حاصل بحث بشمار غلط فہمیوں کا ازالہ اور مدلل جوابات اس عجیب و غریب پیرایہ میں قلمزرد کئے گئے ہیں جو فی الحقیقت شاہ صاحب ہی کا حق تھا۔ اس تالیف سے ہزار ہا بندگان خدا کے شکوک مٹ گئے اور عقائد درست ہو گئے یہ کتاب متلاشیان حق کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

قیمت مجلد اڑتالیس روپے - ۴۸

ملنے کے سائیت

نعمانی خٹہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
مکتبہ نعمانیہ اردو بازار لاہور گوجرانوالہ

ازالة الخفاء

خلافة الخلفاء

تالیف

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

مع ترجمہ

مولانا اشتیاق احمد، مولانا محمد عبدالشکور فاروقی لکھنوی

حضرت شاہ صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں فرمایا ہے، کہ اس زمانہ میں بدعتِ تشیع آشکار ہو گئی ہے اور عام لوگوں کے دل اُن کے (پیدا کردہ) شبہات سے متاثر ہو گئے ہیں اور اس ملک کے اکثر لوگ خلفاءِ راشدین کی خلافت کے ثبوت میں شک کرنے لگے ہیں۔ (حالانکہ) ان بزرگوں کی خلافت اصولِ دین میں سے ایک اصل ہے۔ جب تک لوگ اس اصل کو مضبوط نہ پکڑیں گے کوئی مسئلہ مسائلِ شریعت سے مضبوط نہ ہو گا۔ جو شخص اس اصل کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ فی الحقیقت تمام فنونِ دینیہ کو مٹانا چاہتا ہے۔ اس کتاب میں مقامِ خلافتِ خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب، تفصیلِ حضراتِ شیخین، صحابہ کرام کے مراتب، خلفاءِ راشدین کے کارنامے، نیز امورِ خلافت سے متعلق تمام اہم اور محرکہ الآراء مسائل پر مدلل بحث ہے۔ یہ کتاب حضراتِ خلفائے راشدین کی بہترین سیرت اور بہترین تاریخ ہونے کے علاوہ بہت سے دینی علوم و معارف کا خزانہ ہے اور اپنے موضوع میں بے نظیر ہے۔

ادارہ نے اس کتاب کے شایانِ شان معیاری کتابت و طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ ایک کالم میں

اصل متن فارسی اور اس کے مقابل اردو ترجمہ درج ہے۔

۴ حصوں میں، قیمت مکمل سیٹ ۱۶۰ روپے

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

مکتبہ نعمانیہ، اردو بازار کے گجرانوالہ

آفتابِ ہدایت

رئی

رفض و بدعت

مؤلفہ

شیر اسلام رئیس المناظرین ابوالفضل

مولانا محمد کرم الدین صاحب

آٹھویں بار چھپ کر منظرِ عام پر آگئی

ردِ شیعہ طبع

لا جواب کتاب

رنگین ٹائیٹل • کاغذ سفید • صفحات ۳۸۴ -

قیمت اٹھارہ روپے - ۱۸/-

ملنے : نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
کا :
پتہ : مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ

تاریخ مذہب شیعہ

حسب ایما و پسند فرمودہ مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی
اس کتاب میں مذہب شیعہ کی پوری تاریخ بیان کی گئی ہے اور مذہب شیعہ کے بانی
ابن سبا یہودی کے حالات پوری تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ اس منافق نے
کس طرح ازراہ نفاق اسلام قبول کیا اور پھر مسلمانوں میں افتراق و انتشار ڈالنے میں
اسلام میں نئے مذہب کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا یہ کتاب متلاشیان حق کے
لئے ایک عظیم تحفہ ہے۔ عکسی طباعت سفید کاغذ بکس بورڈ جلد سائز ۳۰ × ۲۰
صفحات ۲۵۶۔ قیمت :- ۶/۷۵ روپے۔

ہدایت للشیعہ

از حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی
جس میں مسئلہ خلافت کی تفصیلی بحث۔ تقیہ کا پس منظر، کتاب اللہ میں صاحب
مقام اور مشاجرات صحابہ کی بحثیں، فدک اور وراثت انبیاء اور ایسے ہی دوسرے
بے شمار موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ اور شیعوں کی طرف سے کئے گئے دس سوالوں
کے ثنائی و محسک جواب۔ یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی اب تیار ہے عکسی
طباعت سفید کاغذ سائز ۲۳ × ۱۸ صفحات ۱۲۰ بکس بورڈ جلد قیمت ۶/۷۵ روپے
منے کا پتہ

نعمانی کتب خانہ، حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور
مکتبہ نعمانیہ: اردو بازار: گوجرانوالہ

ایک اہم کتاب

تہذیبِ المسلمان

جسے کامطالعدہ۔

ہر مسلمان خاتون کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ • اپنے کردار کو ارفع و اعلیٰ • اپنے اخلاق کو بلند و پاکیزہ • اپنی زندگی کو روشن و تابناک اور رضائے الہی کے مطابق بناسکے اور خدا پرستی اور دینداری و حق پسندی کا سبق پڑھ سکے۔ مجلد اعلیٰ کاغذ قیمت ۱۸/-

آفرت کی فکر پیدا کرنے والی

کتابیں

مرنے کے بعد کیا ہوگا مع موت کا منظر مولانا عاشق الہی	۱۳-۰۰
مسلمان کا سفر آخرت	۱۵-۰۰
عالم عقبہ	۱۵-۰۰
موت کا جھٹکا	۱۳-۰۰
موت کی یاد	۳-۰۰
دوزخ کا کھٹکا	۵-۰۰
جنت کی کنجی	۶-۰۰
جنت کی ضمانت	۲-۲۵
جنت کا منظر	۲۵-۰۰

ملنے کا پتہ

نعمانی کتب خانہ۔ حق سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

مکتبہ نعمانیہ۔ اردو بازار۔ گوجرانوالہ

آیت بیانات

کامل دو جلد چار جھٹے

محسن الملک سید محمد مہدی علی خان کی تردید شیعہ میں وہ ضعیف اور سنجیدہ تحقیقی کتاب جس کا صحیح جواب آج تک علمائے شیعہ نہ دے سکے اور جس نے ہزار ہا انسانوں کے شکوک و شبہات کو ختم کر دیا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خود شیعہ مذهب کی کتب اور ان کے علماء کے اقوال سے ہی ان کا رد لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب عرصے سے نایاب تھی اب ہمارے یہاں اس کے چاروں جھٹے دو جلدوں میں تیار ہو گئے ہیں۔ سفید کاغذ۔ جلد اول ۱۸/۰ جلد دوم

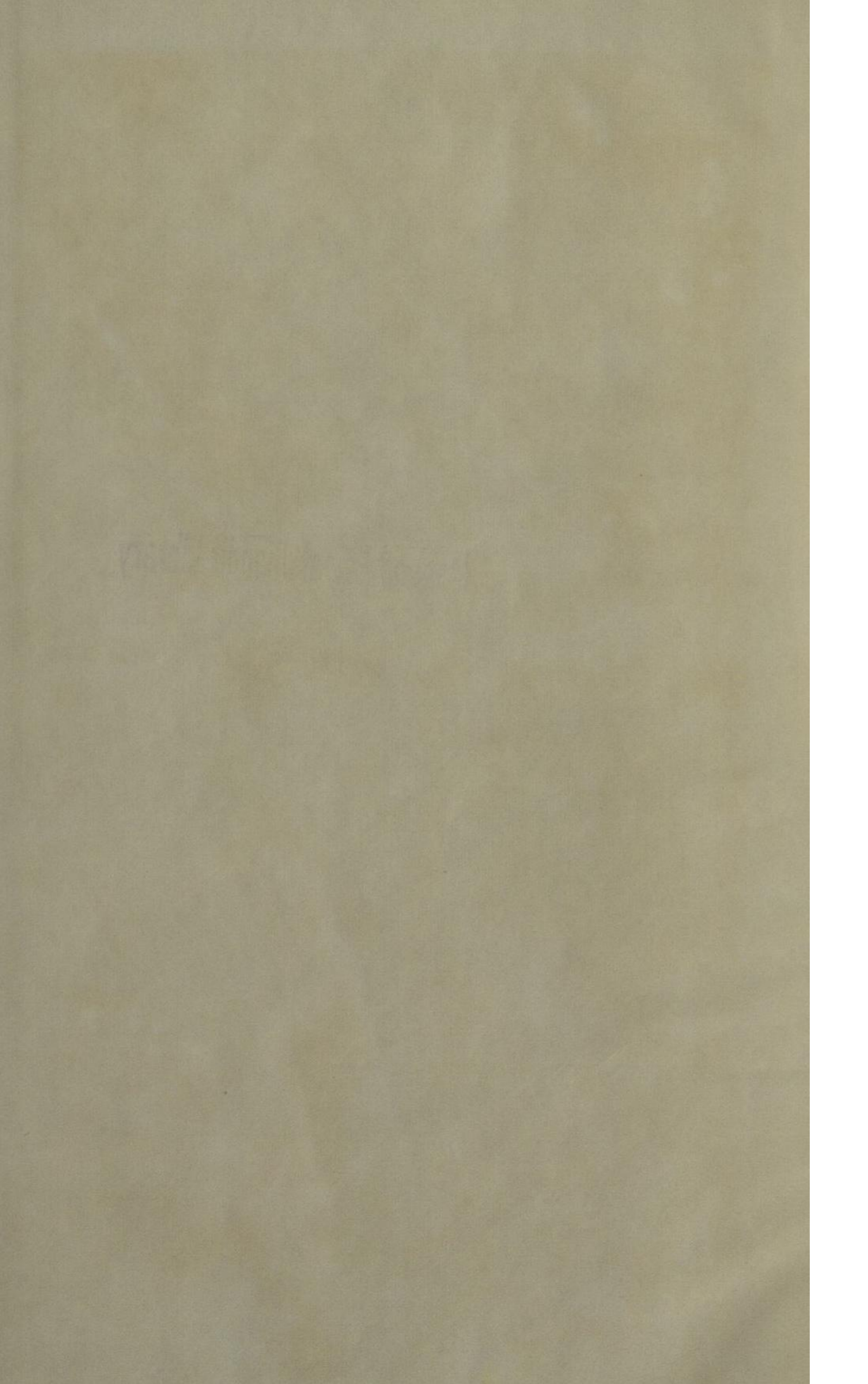
۱۸/۰ کامل دو جلد - ۳۶/۰

تاج کمپنی کے قرآن مجید

عربی۔ فارسی۔ اردو۔ اسلامی۔ مذہبی۔ تاریخی۔ ادبی۔ اصلاحی کتب کے علاوہ مدارس عربیہ کی درسی کتابیں اور قاعدے سیپارے مٹھوک و پرچون نر خوں پر حاصل کریں *

ملنے کا پتہ

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
مکتبہ نعمانیہ۔ اردو بازار گوجرانوالہ



سیکرین کرافٹ - ۶ - میلارام روڈ، حبیب بنک بلائی منزل، لاہور،